

PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

2014

مغز جوشیل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM



قائیں کی کرم فرمایا کسج ادا تیاں
نامہ دنیا کے مجتبیٰ معانی میں افسر کا بیت



آواش کی کڑی دھوپ میں آبلہ پاجا بازوں کا
سفر کجکیش حیات کی پل پل رنگ بدلتی کہانی



ایسا ج جس کی حقیقت نے وقت گزرنے
کے بعد اپنی اہمیت کو غیر اہم ثابت کر دیا



قاتل و قتل دونوں سامنے
تھے... مسگر قاتل
کی تلاش جاری تھی



ایک شخص کا قصہ... عجلت
پسندی نے اسے کامیابی
سے دوپانال میں پھیل دیا



نہاں اور عیاں حقائق کے شانہ بشانہ
سفر کرتی رشتوں کی تلاش و جستجو



تجیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا
ڈوبت اور پچسپ سلسلہ...
دو بھائیوں کے درمیان پاکی جانے
والی عداوت اور محبت کی عجیب کتھا...



جلد 44 • شماره 12 • دسمبر 2014 • ور سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

طز کتابت کالینا ہوسٹلکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) 35802551 (021) 35802551 E-mail: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مدیر اعلیٰ
عذرار رسول



جوابی چال

ایک اداکار اور اداکارہ کی
مڈمچیز..... دونوں ہی بڑے فنکار تھے

امجد رئیس

145

جواہری

زندگی کی بساط راندھنا جواکھینے
والے کھلاڑی کی ہوش رُ بادستان

احمد امین

150

خون آشام

دو دوستوں کی طویل رفاقت
میں دھن اندازہ ہونے والے
ناتوا بالقیہن معاملات

کاشف زبیر

206

تکمیل آرزو

عمدہ منصوبہ بندی کی حاصل
کہانی کا غیر متوقع انجام

سہیل انور

195

دھوکے باز

ایک ساغ رسا کی گفتیشی کاروائیاں...
کوئی اس پر غمت نہ کرے کہ تیار نہ تھا

سکندر علی

224

چوک

معتبر ہے
برآمد مختصر سی
کڑی کسلی تحسیر

حمیرا امین

222

شرفروش

سلیم فاروقی

264

سنگین

ایہ زبانی

237



لحمہ لہو رنگ بدلتا سرورق.....
ہر موڑ پر ایک نئی کہانی منتظر تھی

وجودِ زن سے رونما ہونے والے
فتنے کا خونی شاخسانہ

پبلشر و پریسٹر: عذرار رسول، مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیمپ کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



عزیز ان من... السلام علیکم!

سال کا آخری شمار و پیش خدمت ہے۔ نیا سال نئے سورج کے ساتھ طلوع ہونے کو ہے۔ ان لمحات میں ہم ذرا یہ دیکھ لیں کہ گزرے ہوئے سال میں ہم نے کیا کیا یا اور کیا کچھ کیا ہے۔ معاشرت کے گئے بندھے اصول آج شکستہ ہوتے جا رہے ہیں۔ برداشت کا عنصر و جبر سے دھیرے نہیں بلکہ تیزی سے مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ مگلی مخلوق سے ریاست و سیاست تک، افراد، جماعتیں اور گروہ اشتعال کا شکار نظر آتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑے اور قتل و خون کی توہمت آ جاتی ہے۔ غور کیا جائے تو یہ سب مایوسی کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ لوگوں کو توقع نہیں رہی کہ انہیں کسی مسئلہ سے انصاف مل سکے گا۔ سڑک پر دو گاڑیاں ٹکرا جاتی ہیں تو براہ راست کالم کلوچ اور توٹکار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں فریق جانتے ہیں کہ پولیس سے انصاف نہیں ملے گا۔ وہ دونوں کو الگ الگ ہماری دفعات سے ڈرا کر اپنا مختلانہ دھول کر رہیں گے۔ مٹی پاں، مختلانہ کیونکہ رشوت اب میب نہیں رہی۔ لوگ غریب بتاتے ہیں کہ اوپر کی آمدنی خوب ہو رہی ہے۔ دوسری طرف بڑھتا ہوا طبقاتی فرق ہے۔ ایک طرف لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور ان ہی کے آس پاس مقتدر لوگوں کے پُر شکوہ قافلے فائدہ زووں کے دلی رخ کھم میں ڈوب کر پُر تکلف ظہرانے اور مصرانے اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ برائی اوپر سے نیچے چلتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آج ابلاغ عام کی شہنشاہی کے دور میں ہمارے حکمران اپنے رنگ و دھنک بدل لیں تاکہ معاشرے میں بھی توازن پیدا ہو سکے۔ یاد رکھیں کہ آج کیمرے جو کچھ دکھا رہے ہیں وہ بے نیاز اشرافیہ کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ طاقت و اقتدار کے لئے میں آسمانوں میں پرواز کرنے کے بجائے زمین پر بے محروموں اور مجبوروں کی خبر گیری کر رہا ہوں کہ انہوں نے ہی آپ کو عزت و اقتدار سے سرفراز کیا ہے۔ ہم زمین کے لئے والے ہیں۔ آسمان زمین پر بھی اپنی محفل میں چلتے ہیں جہاں کے رنگ و دھنک نرالے اور دلکش ہیں۔

کراچی سے محمد اقبال کی آمد ”پچھلے ماہ کا شمار ختم ہوتے ہی نئے شمارے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے کیونکہ قسط دار سلیبل اس طرح ختم ہوتے ہیں کہ بے چینی سی رہتی ہے لیکن مصروفیت کے باعث اس بار جاسوسی ڈائجسٹ کچھ تاخیر سے یعنی 4 نومبر کو خرید سکا۔ تاہم نسل پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے فہرست دیکھی جہاں پر جاسوسی کے نامور راز نگار کے نام اپنی کہانیوں کے ساتھ جھگڑا رہے تھے جن میں احمد اقبال، ڈاکٹر عبدالرب، بی بی، عکرم آزاد، منظر امام، کاشف زبیر کے ساتھ اسما قادری کا نام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ کہانیاں شروع کرنے سے پہلے حسب معمول یہ جاننے کے لیے چینی کتب خانہ میں گئے کہ پہلے نمبر پر آنے والے خوش نصیب کا نام دیکھ کر مبارک باد دینے کا فریضہ انجام دے کر باقی دوستوں کی لوک بھوک اور تمبروں سے محظوظ ہو سکیں، سو محمد خواجہ صاحب کو بہت مبارکبادیں، دوبارہ مبارکبادیں، دوبارہ اس لیے کہ یہ ہماری کورنگی کے جو ہیں۔ روشنی روز، محمد قاسم رحمان کو خوش آمدید اکبر عباسی بھائی، اہل سانسے کا تعارف ذرا تفصیل سے کرواؤ۔ حاجہ ہاشمی ایڈیٹر مہربان دارا محمد تہرے کے ساتھ موجود تھیں۔ احسان عمر کو ساگرہ کی بہت مبارکبادیں۔ سید گل گل حسین کا لکھی اور انم ریاض کا تمبر اچھا تھا۔ کہانیوں میں پہلے آوارہ گرد شروع کی جس کا ٹیڈ تیز جا رہا ہے۔ اس قسط میں آسیہ کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ عابد اور شہزی کی سچ جہدائی کب ختم ہو گی؟ احمد اقبال صاحب نے جواری میں مراد کا کردار ختم کر کے روزینہ کی زندگی ویران کر دی۔ خادز عرفہ سلیم نورین کو ڈھونڈ سکے گا یا روزینہ میں نورین کو ڈھونڈ سکے گا۔ سرور قی کی ابتدائی کہانی اچھی تھی۔ کوکب کو مادی سے شادی کر لی چاہیے تھی، کاشف زبیر کی کہانی ٹھیک رہی۔ پیدل رنگ اسما قادری کے کلم سے تھا۔ بہت اچھا لگا۔ خیر کے ساتھ اچھا ہوا۔ رائے کے علاوہ دوسری لڑکیوں کو براہ کرنے والا انجام کو پہنچا۔ اسپیکر شاہد سلیم کو اپنی پسند کی لڑکی مل گئی۔ مجموعی طور پر شمارہ عمدہ رہا۔“

میانوالی سے نادر سیال کی دریا دلی ”10 تاریخ کو جاسوسی ج و ج کے ساتھ ہنسا مسکراتا اپنی اداؤں کے ساتھ مجھے آملہ۔ نومبر کے سرورق میں بکھری دلفوں والی خوب صورت سی دُنشیں کے لیے آپ کی خدمت میں عرض کروں گا:

ڈاک قیامت ہے کہ شام گزر جاتی ہے
تو نے دیکھا نہیں نقش میری عہدائی کا

میں نے ڈائجسٹ میں شامل ہونے کی پہلے بھی کوشش کی لیکن کہا کریں جناب وی آئی پی کلر ہونے کی وجہ سے مجھے انگری نہیں ملی لیکن اب کی بار میں وی آئی پی کلر کو سرورق کو کوشش کر کے انگری دوں گا، دیکھتے ہیں کس کی نصیب ہوتی ہے اور کون روکتا ہے مجھے۔ ڈائجسٹ میں پانچ سال سے پڑھ رہا ہوں۔ یعنی 18 سال کی عمر سے اور میرا پہلے بھی دل کہتا تھا کہ میں محفل میں شرکت کروں اور دوستوں کے پیٹھے پیٹھے الفاظ پڑھ کر خوش ہوتا تھا اور اب میں نے صحت کر کے خط لکھ دی ویا اور دوستوں کے الفاظ کا جواب دینے کے لیے کلم اٹھایا۔ سب سے پہلے خطوط کی طرف جاتے ہیں۔ سب کے خطوط پڑھے، بہت ہی اچھی اور علمی مٹھی باتیں لوک بھوک۔ چنانچہ کیا کیا، بہر حال دل خوش ہو گیا۔ ہمایوں فاروقی ساطی واد کیا نام ہے، ساطی! اپنا میں واقعی آپ ساطی ہی کرتے ہو؟ اسیلی کراچی جی آپ کہاں گم ہو، ناراض تو نہیں ہو، ڈائجسٹ سے میری طرح؟ کیا کریں ڈائجسٹ کے بطور مزہ جو نہیں آتا۔ چلتے ہیں آوارہ گرد کہانی کی طرف۔ ڈاکٹر عبدالرب ساطی می سوچا تھا لکھار کے بعد شاید ہی میں ایسی کوئی کہانی پڑھنے کو لے لیکن جناب آپ کے ہم مفکر ہیں۔ آپ نے ہمیں اتنی ذرا دست تحریر پڑھنے کو دی۔ جواری کا چنانچہ نہیں چل رہا اچھی تو۔ بھی ہم پڑھ کر تھک جاتے ہیں اور بھی ہم پڑھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ کہانیاں اور بھی بہت اچھی تھیں اگر اس

جاسوسی ڈائجسٹ 7 - دسمبر 2014ء

بارمجھے مکمل میں ہڈی گئی تو میں اگلے بار دوسرے اسٹاک میں حاضر ہوں گا۔ آپ سب مجھے دیکھتے رہ جائیں گے۔ دعا کرتا ہوں کہ ہاسپتال کے لیے۔“

ڈیر اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کا استفسار ”اس دلہہ معمول سے ڈرامہ کر جا سوسی 7 تاریخ کو ڈھاتی شام کے وقت خرید۔ دو ماہ کی غیر حاضری پر کسی دوست نے نوٹس ہی نہیں لیا تو سوچا خود ہی انٹری دیں۔ (یہ زیادہ اچھا سوچا اور عمل کیا) اسے وہاں سرورق پر اس دفعہ ہنسی مسکراتی حسینہ کو دیکھ کر دل کی کلیاں کل گئیں۔ پیچھے ہاپوں سعید بھی دکھڑی کانٹان بنا رہے تھے، نہ جانے کیا چکر ہے۔ خیر تبصروں کی مکمل میں شامل ہوئے تو ابتدائی تبصرہ محمد خواجہ کا تھا۔ تبصرہ جاندار تھا۔ فیصل آباد سے روشی روز کو جا سوسی میں خوش آمدید۔ ہاپوں سعید ہمیشہ کی طرح اچھے نظر آئے۔ باد تاب رانا گل آپ کی غیر حاضری کو بہت ٹوٹ گیا۔ زینب کو ہماری طرف سے ڈیروں بیاہ۔ سید کلید کاظمی اس دلہہ پر دن کا ذکر نہیں کیا آپ نے، کہیں جھڑا تو نہیں ہو گیا؟ محمد قاسم رحمان خوش آمدید۔ حائشہ رانی، ماہا ایمان، محی الدین اشفاق، ڈیروں انٹری دو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی۔ آسیہ کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ عابدہ اور شہزی کے جھگڑے کی نظر آ رہی ہے مجھے۔ خیر جواری نے تھوڑا لیا۔ مراد بے چارہ روزینہ کی زندگی ویران کر گیا۔ خاور عرف سلیم نورین کو کب ڈھونڈے گا۔ سرورق کی ابتدائی کہانی، ازل سے ماروی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوب کو ماروی سے شادی کرنی چاہیے تھی، فریجنڈی اینڈ۔ اسکا قوری اور کاشف لہیری کی کہانیاں بھی ٹھیک ٹھاک رہیں۔ کاشف دیر شادی اور تینور کہاں ہیں؟“

بہادر پور سے بشری افضل کی باتیں ”جا سوسی لیٹ ملا۔ لڑکی کی مسکان، روشن آنکھیں، بہت خوش دکھائی دے رہی ہے۔ واہ محی واہ، مصنفہ نازک درمیان میں اور سائنڈوں پر مصنفہ مخالف۔ اب تو خوش ہیں کہ اگلے آپ کو کاشف کی لذت بناتے ہیں لیکن خطرناکی بھی نظر آ رہی ہے، دیکھیں دونوں میں سے کون نمبر لے جاتا ہے۔ اپنی مکمل میں پہنچ، اگلے کی باتیں اگر ہمارے حکمران پڑھ لیں تو شاید راہ راست پر آ جائیں۔ محمد خواجہ کا تبصرہ اچھا تھا۔ روشی روز ویکم اخوش آمدید آپ کی آمد کی خوشی ہوئی۔ لا حاصل، آخر مائیکل اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اپنے بڑے کو چلانے کا مائیکل نے انوکھا طریقہ استعمال کیا۔ چارہ میں رالف نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے جم کو واقعی چارے کے طور پر استعمال کر کے شاکر کے حوالے کر دیا۔ منظر ابام کی باکمال تکمیل نے تو دل موہ لیا۔ مصور اتنے سفاک ہو سکتے ہیں کیا؟ ضروری تو نہیں کہ اپنے کام کو جا کر کرنے کے لیے دوسروں کو موت کے گھاٹ ہی اتار دو۔“

کراچی سے ایم کے احساس کے احساسات ”تمام یاران مکمل کو السلام علیکم، یکم محرم کا دن دین اسلام میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ دوم حضرت عمر فاروق کا یوم شہادت ہے۔ پچھلے مہینے میرے خط نہ لکھنے کی وجہ تو میرے دوستوں کو معلوم ہی ہو گی اور جن کو نہیں معلوم انہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ماہ اکتوبر میں میرا انگریڈینٹ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے تقریباً دو ہفتے میں اسپتال میں رہا، بالآخر آپ دوستوں کی دعاؤں اور اللہ کے رحم سے میں بالکل صحت یاب ہو چکا ہوں۔ میں آپ تمام دوستوں کے ساتھ ساتھ بالخصوص ماہنامہ سرگزشت کے تبصرہ کار عمران جونی، طاہرہ گلزار، رضوان سلطان جونی، ذبیحہ، ملک رحمت، قدرت اللہ یازدی، عامر ملک اور غامدہ چوہدری کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن لوگوں نے اس اذیت بھرے وقت میں مجھے حوصلہ دیا اور میری غیر خیریت در یافت کرتے رہے۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو جلد بالکل چاق و چوبند کر دے) سوچا تھا کہ مختصر خط لکھوں گا مگر وہ کہتے ہیں نہ کہ بات لکھنے کی تو بہت دور تک جاسے گی۔ منہ سے پہلے بات کی جائے جواری اور آوارہ گرد کی۔ دونوں کہانیوں میں کچھ مماثلت نظر آ رہی ہے۔ جواری تو خیر سے انا ڈی کا پارٹ ٹوکل ہے مجھے۔ آوارہ گرد اس بار پہلے سے کافی بہتر اور تیز رہی۔ آسیہ کی موت نے رنجیدہ کر دیا۔ ایچ اقبال کی جزدی گمشدگی بہترین اسٹوری تھی اگر اسے اسٹوری آف دی منٹ کا ٹیکل دیا جائے تو قطعاً نہ ہوگا۔ کوب کا کردار واقعی ایک مثالی کردار نظر آیا اس پر یکم صاحب کی حکمت بھی بہت بھلی تھی اور کوب کے لیے ان کی فکر انگیزی بہت مثالی تھی۔ تیز رو کا کردار بھی اپنی جگہ بہت ہی مناسب تھا۔ گاؤں دیہات میں آج بھی لوگ اپنے بزرگوں کی بات مانتے ہیں جس طرح تیز رو نے یکم صاحب کی بات مانی اور شہر میں کوب کے ساتھ رہا۔ مگر ماروی کے ساتھ بہت برا ہوا۔ میرے حساب سے یہاں ایچ اقبال صاحب کو ماروی کا انجام کچھ مختلف کرنا چاہیے تھے۔ اتنی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کا اس قدر دردناک انجام دل کو کافی رنجیدہ کر گیا۔ اس کے علاوہ چھوٹی کہانیاں بھی مناسب تھیں۔“

سرگودھا سے اسد عباس کی رائے ”خلاف توقع اس بار جا سوسی یکم نومبر کو ہی مل گیا۔ نائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ سب سے پہلے دوستوں کی مکمل میں حاضری دی۔ محمد خواجہ سرفہرست تھے، مبارکاں۔ ہاپوں سعید خان، کبیر عباس، افتخار رحمان اور طاہرہ چوہدری کو مکمل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جزدی گمشدگی پڑھی۔ کہانی ایچ اقبال صاحب کی روایت کے برعکس کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ جواری تیزی سے اپنے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ بے ضمیر پڑھ کر ضمیر شاد کی سوچ اور گمراہی پر بہت انوس ہو۔ بہر حال وہ اسی انجام کا شوق تھا۔ رالف نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا وہ حق دار تھا۔ قسمت آرماء کاشف لہیر صاحب کی نئے موضوع پر اچھی کاوش تھی۔ لیکن کہانی کا اختتام میری توقع کے مطابق نہیں ہوا۔ بہر حال یہ تو مصنف کا حق ہوتا ہے۔ مختصر کہانیوں میں چارہ، قیام گاؤں، نقی اول، لا حاصل اور سازش اچھی تھیں۔ معاوضہ اس شارے کی بلاشبہ ایک بہترین کہانی تھی۔ سرمایہ دار پھر غریب طبقے کا استحصال کرتا نظر آیا۔ پتا نہیں لوگ اتنا حساس کس لیے جمع کرتے ہیں۔ بقول شاعر

جو دریاں بھرتے ہیں لوگ مہر بھر کے لیے

موت کا فرشتہ رحمت نہیں لیتا

بنوں سے محمد ہاپوں سعید کی آمد ”مائیکل گرل کے فیس کمٹ اور مسکراہٹ کو بہترین فنکشن دے کر ڈاکٹر اگلے واہ کے حق دار ٹھہرے۔ ساتھ میں اپنی اور ہماری صنف کو ویسے ہی پینٹ کیا جیسے ہمیشہ کرتے ہیں۔ حالانکہ بہت سارے لوگوں نے احتجاجاً خود کو بطور قری لائبریری مال بھی پیش کیا ہے مگر حال کوئی شہنائی نہیں ہو سکی۔ ادارے میں آئرن مین پولس خان کو پیش کیا گیا خراج تحسین دل خوش کر گیا۔ جس کی مشکل سے مشکل وقت میں بھی چہرے پر مسکراہٹ ہے رہا مسکراہٹ اور لازوال حوصلہ اک اسیر لیشن ہے سب کے لیے۔ خواجہ صاحب آزاد و مشتق پر آپ کے تبصرے نے بے اختیار فرل اینس کے اسماعیل کی یاد دلانا

دی۔ اور پھر یوں ہوا کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ نہ جانے کہاں ہو گا وہ۔ روشی روز صاحبہ اشتہارات کی نظر اندازی کا اظہار سرعام مت کریں۔ ہمارے ڈائجسٹ کے فائنل سپرد رٹر ہوتے ہیں یہ۔ (بھانر مایا) ابن نہات ہم مشکور ہیں آپ کی محبت کے۔ کبیر مہاسی، انکل سیانے کے ساتھ مشترکہ دھماکے میں کافی بے لگ رہے تھے۔ مہرین ناز آپ لاہور کب سے شفٹ ہوئیں؟ خیر تصدیق کس نے کرتی ہے، بندہ یو یارک بھی لکھ سکتا ہے۔ کاشف علی برادر آپ سے کس نے کہا کہ ہماری کوئی ناراضی ہے۔ بس گونا گوں وجوہات آڑے آتی رہیں۔ دودھہ گوگو لکھتے ہوئے محل دھیان رکھا کہ کہیں کوئی نعرہ نہ لگ جائے۔ احسان عمر آپ کے جوان ہونے یا پینڈم جوان ہونے کی ہم تردید نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ آپ کی ذاتی رائے ہے لیکن 22 سال پر ہمیں شدید اعتراض ہے۔ ماہتاب گل صاحبہ آپ نے لاڈلی بیٹی کو کھن لگانے کی ابھی کوشش کی جو کہ ناکام رہی۔ اینڈ مجھے اتنی شدت سے یاد کرنے پر ہم مشکور ہیں۔ انور برادر آپ کا مطلب کہ پٹھانوں میں اپنی بیوی کو پیارے ہونے کی روایت نہیں؟ آپ سے پہلی بار سنا۔ ورنہ پٹھان ہونے کے دعویدار تو ہم بھی نہیں سے ہیں۔ ماریہ خان دھرم ناز دوشہر کے باسی ہونے کی وجہ سے آپ نظر انداز نہیں کی گئیں۔ بلکہ ہنگامہ خط بھیج کر پاکستان پوسٹ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش وجہ ہو سکتی ہے۔ طاہر میاں سرور قی کو دیکھتے ہی آپ کو کس سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ اس کی وضاحت نہیں کی آپ نے۔ ابتدائی صلحات پر بھی ایچ اقبال کی جڑی کشدگی مکمل طور پر غیر متاثر رہی۔ یا شاید اسے بڑے نام کا ٹک تو تھا بڑا حادثہ ہے۔ منظر امام کی تکمیل بھی ان کی حالیہ حقائق کو منظر عام پر لانے والی کہانیوں سے کافی ہٹ کر اور غیر حقیقی سی کہانی تھی۔ احمد صاحب کی نقش اول عام مغربی کہانیوں سے کافی ہٹ کر اور دلچسپ کہانی تھی۔ اپنے دام میں سیار آگیا شاید اسی موقع پر کہا جاتا ہے۔ جرم سے قلعہ نظر گجبرٹ کی پانچنگ متاثر کن تھی۔ سلیم فاروقی کی گردش ایام ان کی روایتی مادہ دھار کے برعکس جاسوسی کی تعریف پر پوری اتاری لا جواب تحریر ثابت ہوئی۔ نادر جیسے قائل اور ایماندار کو اپنے محسن کا اعتبار توڑتے دیکھ کر افسوس ہوا۔ نکتہ گر ایک معصف کی ذہنی اپروچ کو اجاگر کرتی بہترین کہانی تھی۔ سرور قی کی پہلی کہانی اساتذہ کی بے ضمیر لا جواب رہی۔ انشپٹر شاہ کا ایک بے ضمیر کے قتل پر پردہ ڈال کر ایک جتنے جتنے گھر کو آباد رکھنے کا فیصلہ گو کہ غیر قانونی مگر انسانیت پر مبنی تھا۔ آخری صلحات پر کاشف زہیر کی قسمت آزمائی بھی خوب رہی۔ لیکن ایک انجمن رہی کہ ڈیٹ کارڈ کے ذریعے اے ٹی ایم سے رقم نکالنے کی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ پھر وہ لوگ کیسے ایک ایک اکاؤنٹ سے لاکھوں روپے نکالتے رہے؟

نیول کالونی ڈائیاں، کراچی سے انجم ریاض کی یادیں "مگزین" چار سالوں سے جاسوسی ڈائجسٹ کی قاری ہوں لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ جاسوسی کیم کوئی دیکھنا نصیب ہو گیا۔ سرور قی پر ایک حیدر کو ہلکا سا تبسم چہرے پر سجائے دھندلے کے درمیان کھڑا دیکھ کر ہم نے اس کے اعتماد کو خوب سراہا۔ چینی بکتہ چینی میں محمد خواجہ نے ہمارا استقبال کیا اور ہم سر جھکائے آگے نکل گئے۔ روشی روز کو ہماری طرف سے بھی خوش آمدید۔ احسان عمر کا تبصرہ پڑھا کہ ہمیں ان کی زور آوری پر بہت فنی آئی۔ انصار حسین صاحب آپ نے اپنے علاقے کی ایسی منظر کشی کی کہ ہمارا جی کرنے لگا کہ کسی طرح ہم بھی وہاں پڑ جا کر یہ نظارے دیکھیں۔ ماہتاب گل آپ نے کیا خوب صورت انداز میں غیر حاضر تبصرہ نگاروں کو منظر عام پر لا کھڑا کر دیا۔ ساتھ ہی آپ نے کراچی کی سوہنی کڑیوں کو ویکلم کیا اس بات پر شکریہ بھی۔ انور یوسف صاحب اگر ہالیوڈ سعید اپنی ٹیکم پر پیارے ہو گئے تو کیا ہوا؟ شکر ہے آپ کی روایات پر نہیں گئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایچ اقبال کی جڑی کشدگی پڑی۔ کہانی کا اسٹارٹ اچھا تھا مگر اختتام بہت جلدی میں کیا گیا تھا۔ سرور قی کی پہلی کہانی اساتذہ کی بے ضمیر میں ضمیر دانتی بے ضمیر لکھا۔ دبیر سے میری بے انتہا محبت یادیں گزری ہیں اور زندگی کے دو حادثات بھی اسی ماہ میں ہوئے۔ لہذا دبیر کے آغاز پر یہ کہوں گی کہ دبیر؟ کر در پچوں میں ضمیر جانے تو... دبیر اور ان پہ کلینڈر بدلنے سے یادیں تو نہیں جانتیں

منظہر سلیم خان رحیم مارخان سے لکھتے ہیں "جب دھوپ کی راجدھانی دیر سے دیر سے ختم ہو رہی تھی اور افق پر گلابی رنگ پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تھا، تب ہم نے کاغذ کلم سنبھالا اور چٹھی ڈرائیاں جی "جینی جاسوسی کے نام لکھنے لگے۔ جاسوسی ڈائجسٹ اس بار چار تاریخ کو ہمارے غریب خانے پر ہا کر کے ہمراہ یوں آیا، جیسے ویرانے میں چمکے سے بہار آ جاتی ہے۔ جاسوسی کو دیکھ کر ہمیں اتنی خوشی ہوئی جتنی اپنی پڑوسن کو دیکھ کر کالگی صاحبہ کو ہوتی ہوئی۔ سرور قی کی حیدر پستول بردار اور زخم خوردہ شکر اہٹ کے حامل افراد کے بیچ میں بے خوف کلک لاتی نظر آئی۔ ادارہ حسب سابق اچھا لگا، بالخصوص آسٹریلیا کا فرد کرکٹ کے حوالے سے ذہین ہوس ہونے کی خبر نے سرخرو سے بلند کر دیا۔ اس بار تو ادنی ماسوں اور انکل سیانے، ادھتاتے ہوئے آئے اور محفل پر چما گئے۔ ویلڈن کبیر لالہ اور طاہر بھائی۔ سید نکیل حسین کالگی اور انصار احوال تو محفل کا سنگھار ہیں، ان کے تبصرے انفرادیت کے باعث لائق ملاحظہ ہوتے ہیں۔ انجم ریاض آپ کو محفل میں خوش آمدید، ہم اور کالگی صاحبہ اتنی بھی گاڑھی اور دلچسپ لکھتے کہ آپ لغت کھنگالتی پھرتی ہیں۔ باقی تبصرہ نگاروں میں ماہتاب گل رانا اور ہالیوڈ سعید نے اچھا لکھا۔ کہانیوں کی ابتدا اجاری سے کی۔ راہ احمد اقبال صاحب آپ کے اسلوب کے کیا کہنے۔ کہانی کے حالات روایات کو لکھتوں کا وہ پیر بن رہے ہیں کہ ہم سرزد ہو جاتے ہیں۔ بس صاحبہ تحریر سے اتنی گزارش ہے کہ لورین کی جلد اعری کروائیں۔ چوہدری الوری زندگی میں تبدیلی ابھی نکل۔ آوارہ گرد کی حالیہ قسط میں آسیہ کی موت تم سے ہسکتا کر مٹی۔ شہزی، چوہدری ممتاز خان کا گھبراہٹ توڑنے میں کامیاب، اب دیکھنا یہ ہے کہ شہزی اور خانم شاہ کیا پیش رفت کرتے ہیں۔ احتمالی قوتوں کے سیاہ کارناموں کو اجاگر کرتی معاونہ محسن قاطعہ کی ایک دل گردہ تحریر تھی۔ بیچ بیچ سے کہ معاشی بد حالی انسان سے زندگی کی ہر خوشی اور مسرت چھین لیتی ہے۔ فراڈ کی دیہاتوں میں روٹی بھاگتی کہانی سلیم فاروقی کی گردش ایام بہترین کہانی تھی۔ نادر کی آنکھیں دولت کی چکا چوند نے دھندلا دی تھیں۔ اب بات کرتے ہیں سرور قی کے رنگوں کی۔ بے ضمیر، بے صداقت اور احساسات سے عاری نہ تھے ہونے والی جھوٹ کی سنگین غریب کاریوں سے لبریز، اساتذہ کی تحریر بے ضمیر عمدہ کہانی تھی۔ کاشف زہیر کا تحریر کردہ رنگ قسمت سے جبراً ڈاکٹریوں کا جان لیوا کھیل "قسمت آزما" کی تعریف کے لیے لفظ بہت چھوٹے ہیں۔ ابتدائی صلحات کی سو فاق جڑی کشدگی انسانی زندگی کے مختلف مدتوں کی نشاندہی کرتی، سرور قی کی کشش کا احاطہ کرتی، زندگی کی حرارت سے بھرپور جوان کی داستان حیات پڑھ کر تار و تحریر کے سحر میں ڈوب رہے۔ کوب اور درخشاں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ لیکن ماریو یا دراشت کھونے کے بعد جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔"

ہے۔ اگر وہ محبت یعنی نورین کی تلاش میں ہے تو اسے مفت ملتی جائے اور اسے کچھ تو ذاتی مکان رہنے کے لیے اور اپنا کاروبار بنانا چاہیے۔ کچھ تو وہ اس کے پاس کہ اگر نورین مل جاتی ہے تو کیا سڑک پر بیٹھ کر بیک منگوانے کا ارادہ ہے اس کا۔ اب تو لگتا ہے اس کی شریک حیات روزینہ ہی بنے گی۔ آوارہ گرد، سازش اور قسمت آزمائندہ آئی۔ بے ضمیر پڑھ رہا ہوں اور گردشِ ایام میرے سامنے ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جاسوسی لیٹ ملا اور باقی زیرِ مطالعہ ہے۔ گزارش ہے کہ میں دوسرے لگانے میں ایک کہانی جو بالکل سچ ہے جس کا نام مقدس کا سکندر ہے بھیج رہا ہوں، اسے شمارے میں جگہ دیں۔ امید ہے پسند آئے گی۔“ (دیکھ لیں گے کہ قلمی اشاعت ہے)

احسان سحر کی میا نوالی سے تنقید و شاعری ”جاسوسی ایک ٹھنڈی صبح اور ٹھنڈی دھوپ میں ملا۔ بے چین آنکھوں اور بے لگام ہاتھوں کو قرار نہ آیا تو آنکھوں کی بے چینی ناکل سے ٹھنڈی کی اور ان میں کچھ ٹھنڈک صنفِ نازک کے خوب صورت سراپا کو دیکھ کر بڑھ گئی۔ کیا نازنین کے نازتے بھی جیسے بھول پر شبنم پڑی ہو جیسے آسمان پر دھنک لگی ہو، جیسے سات رنگوں کی تلی ہو ہو پستول بردار بھی اچھے اسٹائل کے ساتھ اچھے لگے۔ بے لگام ہاتھوں کو ڈھیل دی جنہوں نے شمارہ کھولتے ہی سکون کا سانس لیا، خوب صورت دنیا کے سارے لوگوں کے درمیان خود کو پا کر اتنی خوش گواریت محسوس ہوئی جتنی سردیوں میں ٹینگی دھوپ میں بیٹھ کر ہوتی ہے۔ پیارے ساتھیوں میں سب سے پہلے ملاقات محمد خواجہ سے ہوئی جنہوں نے اپنے دلی احساس اور جذبات سے ہمیں آگاہ کیا اور مہارک ہو جتا اب آپ کے یہ احساسات بڑوں کو پسند آئے بھی تو سب سے آگے آپ کو کر دیا۔ کبیر مہاسی اگلے سیانے کے ساتھ آئے جو اس دلدھ کا پی سست رستہ اگلے سیانے انہیں زکام کی شکایت تو نہیں ہے؟ ہمایوں سعید بھی کافی عرصہ بعد نظر آئے جو کافی کٹے کٹے سے تھے۔ لگتا ہے امید ہو چکی ہے ماضی قریب میں شادی کی، باقی سب لوگوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ پہلی کاوش جزدی کشدگی سے آغاز کیا اور جب آغاز ہی پھیکا اور بے رنگ رہے تو آگے بڑھنے میں حوصلہ نہیں آیا، یہاں بھی اچھے اقبال نے انہیں ڈراے کی شکل اتار کر بے رونق اور حقیقت سے کافی دور دھکیلے رکھا، معاف کرنا چاہتا ہوں تو کھدی حوصلہ نہیں آیا۔ یادداشت کم ہونا کوئی مذاق نہیں کہ کافیت چیزیں دیکھ کر آدی کا دماغ روشن ہوتا جائے۔ انجام بھی بیکار تھا۔ سازش ابھی کاوش تھی۔ یہ معنوی اور فنی دیا ہے ہی ایسی جہاں ایک دوسرے کو فریب اور دھوکے سے مار کر آگے بڑھنا نہیں ہی ہے۔ جہاں صرف جھوٹ ہی چلتا ہو وہاں گھس لوگ ہی ہوتے ہیں۔ سلیم فاروقی عرصے بعد نظر آئے اور دیہائی دولت کا کھیل دکھائے جو بہت سے لوگوں کے لیے پھندا ہی ثابت ہوتی ہے۔ جو ادھر سے تو خوب صورت ہی نظر آتی ہے پر اندر سے اس کی خطرناکی اور زہر جب باہر نکلتا ہے۔۔۔ ظاہر ہوتا ہے تو ہشتے بیٹے لوگ اور بستیاں تیار ہو جاتی ہیں۔ ٹھیک، ایسی خوب صورت کہانی رہی جسے اس ماہ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھا۔ سردی کا پہلا شاہکار بے ضمیر، کافی سچ ثابت ہوا۔ بے ضمیر کی بے ضمیریاں آخر جب نکلیں تو محبت کے بھائے نفرت ہی نفرت نظر آئی۔ کاشف زہیر کی قسمت آزمائشی ابھی کاوش رہی۔ خوامشیں ہی انسان کو ظالم اور مجرم بناتی ہیں خاص کر جب کسی خواہش کو انسان کو قفلہ اور کج کارٹی بھی بھلا دیتی ہے۔ مدلل بھی خواہشوں کا جیسا نکلا، پر انہوں نے یہاں بھی نہ دیا تھا۔ آئی۔ سلسلہ دار آوارہ گرد انکسشن میں ابھرتے ڈوبتے کردار سے سوز پر کا حزن ہو رہے ہیں روشن خان کو بے روشن اور چہرہ درمی مبتلا کی لہر سے فرار کے بعد شہزیادی کی پھونچ میں گرفتار ہو چکا ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہونے والا ہے۔“

عبدالجبار روی انصاری کی لاہور سے نصیحت ”دو تاریخ کو شہر ملا۔ دل باغ باغ ہو گیا دیکھ کر لیکن ایک دھڑکا سا بھی لگا ہوا تھا کہ عید اور بھر بھائی کی شادی کی وجہ سے خط خالصت ہو گیا تھا۔ چالے اب شائع بھی ہو کہ نا، مگر ساتویں نمبر پر ہی اپنا خط دیکھا تو سچ میں بے انتہا خوشی ہوئی۔ سردی کی خوب صورت سی حیدر تو اس دفعہ پر سکون مسکراہٹ کے ساتھ دکھائی دی جیسے کہہ رہی ہو اب کوئی مسئلہ نہیں ہے اور جیسے مردانہ مسکراہٹ بھی اس کی تائید کر رہی تھی۔ البتہ بچے چشمہ میں تو بادی دو فکروں کے دن کی طرح دھمک کے موڑ میں تھا۔ حیرت کا ایک اور جھکاؤ۔ بڑا اعلیٰ کارکن پر تبصرہ دواہ کمال کر دیا۔ نمن، چار دن پہلے ہی تو یوٹیس خان کی بے بازی دیکھی اور آج اسی کا ذکر جاسوسی میں یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی لی دی پر دیکھ رہے ہوں۔ بعد میں مصباح الحق کے چکوں نے بھی کمال کر دیا۔ پاک ٹیم اتنا اچھا نہیں رہی ہے تو اچھا لگ رہا تھا۔ ساتھ میں دل سے سرگوشی ابھری کہ کاش کوئی پاکستان میں کرپشن اور لوٹ مار کرنے والوں کے بھی جتنے چھوڑے تو کتنا اچھا ہو۔ اب ذرا مخطوط پر نظر دوڑا لیں۔ روٹی روڑ کو دیکھ کر تے ہیں۔ مختصر مگر بہت اچھا لکھا اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ابن غلامت بھی حیران نظر آئے، اچھی بیان بادی کی ہے۔ جاہر ہاشمی اور مرین ناز آپ نے بہا لیا یا لیکن اصل بات یہ کہ میں پرانا قاری ہوں البتہ اب لکھنا شروع کیا ہے تو وہی پر سننے والا نکھار سامنے آ رہا ہے۔ باقی آپ کا تبصرہ بھی جائز ہے، بہت اچھا لگا آپ کی تحریر پڑھ کر۔ ظاہر چہرہ درمی بھی ردیمینک انداز میں نظر آئے، بھی لے بہت اچھے تبصرے کیے۔ دل خوش ہو گیا۔ آوارہ گرد نے آسے کی موت پر سوگوار کر دیا۔ انڈس شہزیادی کی گرفتاری نے سوچ میں ڈال دیا۔ اب اگلی بار دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ارسلو مسز ادا، گراہم نکل اور آئن اسٹائن مجھے یاد ہیں لیکن میں اپنا نام بھول چکا ہوں۔ ال کوکب کی ماروی بھی ایڈر پر چل بسی۔ سندھ دھرتی کی جزدی کشدگی بھی زبردست رہی، جواری کی سواری کیوں آہستہ آہستہ چل رہی ہے؟ یہ بھی ہر ماہ کی طرح ایک نیا معادے جاتی ہے مگر بھی اچھی جارہی ہے۔ نادل لکھتے وقت ایسا ابھام پیدا نہ ہو جس سے قاری کے ذہن میں الجھنیں جنم لیں۔ کتنے گراہی میدان کی ابھی کاوش تھی۔ میرا کام ختم ہو گیا، انجم پر مصوراتی تحقیق کی تکمیل بھی خوف کے سامنے میں ڈراؤنا تاثر دے گئی۔ ٹھیک ابھی ہوئی برکت کی۔ مگر خود جہان قالی سے کوچ کر گیا۔ انسان اگر اپنی فطرتی کا احترام کرنے تو اس کے دل پر سے بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ اسپیکر شاہ نے بے ضمیر کا کس اچھے طریقے سے حل کرتے ہوئے اپنی زندگی کا کس فوٹن کی صورت میں حل کر لیا، بہت اچھی کہانی تھی۔ سردی کی دوسری کہانی بھی زبردست رہی۔ شادک کو حرکت کرتے ہوئے مدد سے مشق ہوتا ہے، رائف نے بڑی چالاکی سے ہم کو چار اپنا لیا۔ دوسرے کی کہانی بھی سنی خیر تھی۔ کاش اسے یاد رہتا کہ لیب کے سال میں فروری 28 دنوں کا ہوتا ہے تو یوں گردشِ ایام سے اس کے چہرہ طبعی نہ روشن ہوتے۔ لالچ کی منصوبہ بندی تو انجام بھی برپا ہو گا۔ ہر کہانی اپنے اندر منطقی انجام کا بہترین سبق لیے ہوئے ہے ہر دیکھیں ہمارے اندر ان کرداروں کی کہا خوبیاں اور خامیاں ہیں، پس اپنی شخصیت کو پرکھیں اور سنواریں۔“

رفیق ہونے سے سید محی الدین اشفاق کی حیرت انگیز ”چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد مکمل میں حاضر ہوں۔ اس بار جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ ناکل پر کبیر

مہاسی، ہمایوں سعید دونوں ناکمل گرل کو متاثر کرتے ہوئے نظر آئے۔ محمد خواجہ پہلے ہی منہ پر براجمان تھے۔ ردی روز محمد قاسم رحمان ویکم۔ کیر مہاسی ایار اکل سیالے کا تعارف ذرا تفصیل سے کرواؤ۔ حاجرہ ہاشمی اینڈ مہرین ناز دونوں اچھے تھمرے کے ساتھ موجود تھیں۔ احسان عمر ساگر کی مبارک باد۔ یار آپس کی بات ہے۔ آپ تو لڑکیوں کی طرح مہر چہار ہے تھے۔ ہمایوں سعید فیض احمد فیض کی محبت سچ میں محفل میں آپ سے کی جاتے ہے۔ سید کھلیل حسین کاظمی اور انعم ریاض کا تبصرہ اچھا تھا۔ کہانیوں میں جڑاری سے آغا کیا۔ خادہ کی زندگی میں مشکلات کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم وہ سکندر شاہ کے معاملات کو ویسے ہی حل کرتا جا رہا ہے۔ پلیز کہانی میں ہیروئن کو لے کر آئیں اکل۔ کہانی کا اینڈ بھی نہ کریں۔ آوارہ گرد میں شہزی کو ایکشن میں دیکھ کر اچھا لگا۔ مگر اس میں رکاوٹیں بھی ہیں۔ آسیہ نے اپنی جان بچ کے لیے نچھاور کر دی۔ تنیم صاحبہ پر آئی ہوئی مشکلات کو شہزی کیسے کم کرتا ہے اور کیا وہ خانم کے مشورے پر چل چلا جائے گا؟ قسمت آزمائش کا شرف ذہیر صاحب ہمیشہ کی طرح ایک زبردست تحریر کے ساتھ آئے اور چھانٹے۔ عدیل محبت میں ناکام ہوا مگر آخر میں اس نے ایک گہما محبت پائی اور اپنی سابقہ محبت کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجموعی طور پر جاسوسی شائد ارقا۔“

سند علیا لوالی سے علی رحمان کی بے قراری ”ماہ شمارہ نومبر معمول سے کافی ہٹ کر بڑی جلدی 2 تاریخ کو ملا۔ پہلی بار جاسوسی کا سرورق انتہائی خوب صورت سا لگا۔ خوشی سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جو سرورق کی صنف نازک نے پونچھ لیے۔ سرورق کی لڑکی جس کر کہہ رہی تھی میں ردوؤں یا ہسول اور تم سے کیا کہوں۔ سرورق کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ محفل میں جا پہنچے تو محمد ہمایوں سعید آئے مگر لگتا ہے گوشت زیادہ کھا لیا تھا اس بار سنجیدہ ہو کر آئے۔ عرفان راجہ بلیک لسٹ میں نظر آئے، میں محفل میں مصروفیت کے سبب نہ آ سکا۔ پتا نہیں اکل کو ہم سے کیا فہمی ہے جو کہانی لکھتے ہیں بتاتے نہیں ہیں کہ وہ قاضی اشاعت ہے یا نہیں۔ ماریہ خان اب تو شہرہ شائع ہو گیا خوش ہیں۔ ساگر مبارک احسان عمر کو۔ کیر مہاسی امری کا موسم کیسا ہے؟ محمد خواجہ کو کرسی صدارت مبارک۔ ردی روز کیسا نام ہے مگر خوش آمدید۔ ماہایمان کی کی محسوس ہوئی۔ انور یوسف زئی، کھلیل کاظمی، مہتاب گل رانا، انعم ریاض، کاشف علی میراں، احسن اودہ سوری احسان عمر اور ہمایوں سعید کے تھمرے بہترین تھے۔ کہانیوں کی ابتدا ایچ اقبال کی کہانی سے کی۔ ماشاء اللہ اچھا لکھتے ہیں۔ ایچ اقبال سے کوئی ناول کھولیں۔ کوب کے بھائی جیل نے اچھا نہ کیا۔ کوب کو درکشان قول گئی مگر ماروی بھی تو محبت کرتی تھی مگر آخر میں مرگئی، کہانی دیکھی تھی۔ اس کے بعد تیز ترین سلسلہ آوارہ گرد پڑھا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آسیہ کے ساتھ اچھا نہیں ہوا، بے موت ماری گئی۔ تنیم صاحبہ غائب ہیں۔ روشن خان نے شہزی کو قتل میں ڈاکٹر شہزی کو ذہیر خان کے آدمی لکال لے گئے۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا شہزی اتنا خوب صورت ہے کہ عابدہ، کھلیلہ ذہیر خان کی بیوی اور آسیہ جیسی خاتون اس پر مر نہیں۔ (شک کیوں ہے... کیا مردوں میں خوب صورتی مفقود ہوتی ہے؟) اس کے بعد جواری پڑی، یہ قسط بہترین تھی۔ مروا کی موت دیکھ کر کئی مگر سکندر کی دیوانگی سے حرا آپا۔ گردش ایام سلیم فاروقی کی بہترین کہانی تھی۔ نادر کو ٹھہرے مزہ پکھا دیا۔ نادر بے چارہ لپ سال کو بھول گیا تھا۔ پہلا رنگ اسما قادری کے قلم سے تھا۔ بڑا اچھا تھا۔ خمیر کے ساتھ اچھا ہوا۔ رافخہ کے علاوہ دوسری لڑکیوں کو برہادر کرنے والا انعام کو پتہ تھا۔ اسپیکر شاہد سلیم کی شادی ہو گئی۔ دوسرا رنگ کاشف ذہیر کے بہترین قلم سے تھا۔ کاشف ذہیر اگر تڑپتے نہ کریں تو اچھے لگتے ہیں۔ عدیل کو دولت تو مل گئی مگر محبت نہیں۔ تصویر کامیاب راہ روز آئنگ اچھی تھی۔“

پشاور سے طاہرہ گلزار کی داستان امیر حمزہ ”اپنا خط نہ پائے دل بہت دکھی ہوا۔ اتنی مصروفیت میں بھی اپنے سوئیٹ سوئیٹ جاسوسی کو پڑھنا اور خط لکھنا اور ستم اس پر یہ کہ شائع بھی نہ ہو تو محبت بھرا دل ٹوٹے گا نہیں تو اور کیا ہوگا؟ اسے روی کی ٹوکری اور ڈاک خانے کے کالے بکس اللہ کرے میرا خط آپ دونوں کو نہیں ملے۔ سرورق گزرا ہے لائق تھا۔ ایک صنف کرخت آگوشا دکھا کر مسکراتا نظر آیا تو دوسرا اس کو کھلایا دکھا کے ڈرا رہا ہے کہ خبردار میری باجی کو کچھ مت کہنا۔ رائٹر میں ڈاکٹر عبدالحرب بھئی اور احمد اقبال کے علاوہ جمال وستی، جی راز اودہ، منظر امام، اسما قادری اور کاشف ذہیر جیسے بڑے نام دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ اب دیکھتے ہیں کچھ دوستوں کے خطوط شاید کوئی نئی بات کا علم ہم جیسے کم علموں کو ہو جائے۔ کورنگی کے محمد خواجہ اپنے احساسات کے ساتھ حاضر تھے، مبارک کاں خواجہ صاحب۔ وجود ان سے ہے کائنات میں رنگ، واقعی خواجہ جی اس بار آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ محمد قاسم رحمان اٹھکر یہ بھائی یاد کرنے کا، آپ آتے رہیں۔ کیر مہاسی بھائی با جواب ادارے نے خوب دیا اور یہ آپ اکل سیالے نے متانے کو رکھ کر ہر وقت مری کی گیلیں میں کیا ہوا ہوا ہوا کر رہے ہوتے ہیں اور بھائی کیا یوں والوں نے رشوت میں فری منت دی ہے جیسا کیا؟ ڈاکم علی گور چالی کا خط بھی زبردست رہا۔ ڈاکم صاحب HEART CATCHER کو ڈرا پچھان کے تو بتائیں کہ یہ کون صاحب ہیں۔ روی انصاری صاحب کی زندگی قلام ذہین والی بات، شریاک ہومز بھی انسان ہے اور اولیٰ خیر بھی انسان ہے۔ دیسے تبصرہ اچھا کرتے ہو۔ اور یس احمد خان بھائی! یہ کیا، اتنا مختصر خط لکھا۔ قصور کے کاشف علی کا طویل خط۔ ادارے والے چند من پسند لوگوں کے تھمرے بہت طویل چھاپتے ہیں لیکن کچھ کہیں تو شکایات کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمارا تو دل بہت دکھی ہو جاتا ہے۔ ہمایوں سعید آپ اور ادارے والے با دام اور ماجون کھایا کریں اور دل و دھڑ سے نفرت کا پردہ ہٹا کر دیکھیں تو میرے خط کا ایک ایک لفظ ہیرے کی طرح جگمگا تا نظر آئے گا۔ قصب ختم کریں اور خوش رہیں۔ ہمایوں صاحب ہر بات کے لیے مغرب کو کیوں الزام دیتے ہو۔ بھی اپنے معاشرے کی منافقت ملاحظہ کی ہے۔ آزاد کشمیر کے افتخار حسین امان کا طویل اور دلچسپ خط اچھا لگا، بھائی یہ جادو مجھے بھی سکھائیں۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے میرے الفاظ ان کو کالنے لگتے ہیں۔ (یہ کیا بات کی ہے... ہمارے لیے سب بے حد محترم ہیں... اور اتنی بدگمان کیوں رہتی ہیں؟) اپنے طویل تبصرے کے ساتھ مہتاب گل رانا حاضر محفل تھیں۔ ذہیر نور کو بہت پیارا اور دھامیری طرف سے آئی رہا کریں۔ انور یوسف زئی بھی ہمایوں سعید کی تعریف گوئی کرتے نظر آئے۔ خیر تو ہے۔ بھائی ہم پٹان ہزاروں قوسوں سے اچھے ہیں۔ سید کھلیل حسین کاظمی کا خط بھی کافی دلچسپ لگا۔ طاہرہ چوہدری آخری مرحلے میں نظر آئے۔ آقا فریدہ، تمیز مہاس، بار مہاس، قدرت اللہ اینڈ ماہایمان پلیز حاضر ہوں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ پہلے ڈاکٹر عبدالحرب بھئی کی تحریر آوارہ گرد جاسوسی کی جان ہے۔ زبردست ایکشن سے بھرپور رقص، چوہدری ممتاز کی بدخلصت

کے ہاتھوں آسہ مرگنی اور شہزی کی مثال آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ احمد اقبال کی تحریر جواری اس بار تو سب اچھا ہی اچھا ہونے کا قلمی سین تھا۔ مراد مرگیا، باقی سب ٹھیک ہو گئے۔ سرور دق کی دوسری کہانی پہلے ہی کیونکہ انکشن کہانیوں کے رائٹر ز میں کاشف زبیر میر سے فیورٹ رائٹر ہیں۔ کاشف زبیر کی یہ شاہکار تحریر قسمت آزماء، ایک معاشرتی کہانی جو آج کل کیپیڑ اور موہاٹلز کے استعمال کی وجہ سے جو غیر اخلاقی اور مجرمانہ سرگرمیاں نوجوان کر رہے ہیں اور شارٹ کٹ کو اپنارہے ہیں۔ کہانی کا ایک ایک لفظ شاندار۔ ویلڈن کاشف زبیر۔ اساقادری ایک بڑی رائٹر جو معاشرتی مہاتوں کو اچا کر کرنے میں کمال رکھتی ہیں۔ ان کی شاہکار تحریر ہے ضمیر داغی ایک شاندار تحریر تھی۔ دولوں سرور دق کے رنگہ شاندار تھے۔ بہت عرصہ ہو گیا تھی ایڈیٹور کا کوئی چا کار نامہ سامنے نہیں آیا۔ ادارے والوں سے درخواست ہے کہ جاسوسی کے لیے ماسر ملک صاحب اور ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب سے کچھ شاہکار تحریر لکھوا لیں۔ مجھے یقین ہے میرے باقی تبصرہ نگار دوست بھی مجھ سے منتقل ہوں گے۔

اعجاز سرور کالونی سے عثمان راشدی درخواست میں نے آپ کے جاسوسی ڈائجسٹ کو بہت بار پڑھا ہے اور اس کی کہانیوں پر بھی بہت پڑا تبصرہ کیا ہے لیکن پہلی مرتبہ آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک چھوٹی سی کہانی لکھی ہے جو کہ آپ کے ڈائجسٹ میں شائع کروانے کا خواہش مند ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ کے رائٹر (لکھاری) بہت اچھے ہیں اور بڑی پڑا کہانی لکھتے ہیں اور ہر کہانی بہتر سے بہتر ہوتی ہے لیکن مجھے ان سے مقابلہ نہیں کرنا بلکہ ان کی کہانیوں کے مقابلے میں میری کہانی ایک ادنیٰ سے درجے کی ہے اور شاید ان کی یہ پڑا کہانیوں آپ کو اگر پسند آئے تو میری درخواست پر غور کریں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے اپنا تعارف جسے کرایا۔ میں جام پور کا ایک رہائشی ہوں اور سیکنڈ ایئر میں ہوں، میں آپ کے ڈائجسٹ کو مثالی مانتا ہوں کیونکہ اس کا مقابلہ نہیں۔ اس لیے اس میں شریک کا خواہش مند ہوں۔ اگر آپ کو میری کہانی پسند آئے جو کہ خط کے ساتھ ہی ہے تو اس پر غور فرمائیے گا۔ (کہانی پڑھ کے ہی پتا چلے گا کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں)

لاہور سے زویا اعجاز کی زور آدری "جاسوسی ڈائجسٹ حیرت انگیز اور ناقابل یقین طور پر پہلی ہی کوشش میں دونوں نمبر کو لے گیا اور نہ تو ڈاکٹری نسخے کے قصداً قمع دو پہر شام تک اسٹال کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ سینک والا جن ادوہ... سوری میرا مطلب ہے چیک دالے بھائی صاحب اپنی پستول سے ڈھسائی سے دانت کھوتے ہوئے بندے کو ڈرانے کی ناکام کوشش میں پٹکان نظر آئے اور ہونٹوں پر دلا دینے سے سکاٹے دوشیزہ ان دولوں ہی سے انہماں نظر آئی۔ ادارے میں ایڈیٹر نے کرکٹ کے میدان سے ملنے والی ٹاپ باؤنڈری کو موضوع گفتگو بنایا، ہماری طرف سے بھی قوم کو 32 سال بعد آسٹریلیا کے خلاف تاریخی فتح بہت مبارک ہو۔ اب ڈرا ہاتھ صاف کیا جائے اراکین اکھاڑ ادوہ سوری میرا مطلب ہے اراکین مغل پر۔ شہنشاہ جنات میرا مطلب ہے کہ شہزادہ کو ہمارے اگلے سیانے کچھ زیادہ ہی شوق سے جارتے جارہے ہیں۔ بابائی! اپنی صحت دے حساب مال کم کرو۔ حاجرہ باقی ایڈیٹر میں نارادcl آپ کو کس انگل سے dp کا ڈرا یہ وضاحت بھی کر دیتیں۔ کاشف علی میرا آپ کا دھر سے رستہ بھول آئے۔ دیکھیں ہیک۔ اب پھر سے کہیں گواچ نہ جانا۔ اپنی غلامت آپ بھی جاسوسی اور پاکستانی کرکٹ ٹیم کو انڈیا ٹیسٹ نہ کیجیے گا۔ یہ بھی کہیں بھی حیران کر سکتے ہیں۔ افتخار حسین ایہ چار پانچ ماہ کی غیر حاضری کی جو آپ نے توجیح دی ہے، اس کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ مانتا ہوں! آپ ہی کی طرح ہماری بھی تمام تر رائٹرز اور مصنفین سے ملاقات نہیں ہو سکی ہوئی۔ دوسرے شاہی ایجیٹس تین ماہ بعد ہم آئی گئے دانیس۔ رحیم یار خان دالے گئے چودھری بھی قلم غلام میں ہیں۔ شاہناش کا کامی، گئے رہو۔ کہانیوں میں اس مرتبہ بڑے بڑے نام نظر آئے۔ انج اقبال کی جردی کشمیری بس جردی سا ہی متاثر کر سکی۔ کہانی کا پلاٹ جن ہالی وڈ سودیہ کا پلاٹ لیے ہوئے تھی ان کا نام لکھنے میں تو سنسکرتی جینی جلال میں آجائے گی۔ کوکب کو بار بار خواہیوں میں دھبی یاد آتا اور سب کچھ خود بخود سامنے آتے چلے جانا، طبع کے انکشافات کو یا ایک لطیفہ ہی تھے (پھر تو آپ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئی ہوں گی، ہم ناروی اور حکیم صاحب کا کردار بہت جادہ تھا۔ مادی کی قلمی موت بھی مہم نہیں ہوئی۔ اس کی شہزاد کے حالات کچھ واضح ہونے چاہیے تھے۔ آوارہ گرد اور جواری کے ہیر و صا حبان کو فوری طبی معائنے کی اشد ضرورت ہے۔ لریڈ کو خواب دیکھنے کا کوئی مرض لاحق ہو چکا ہے اور ہمارے ملے نوٹے پہنے خان شہزی کا کا کو عارضہ ہلڈ پریشر۔ ہر دو منٹ بعد اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور کپٹیاں سامنے سامنے کرتی ہیں۔ آسہ کا انجام بہت دردناک تھا۔ درد و مصائب انسانی قدروں کا خاتمہ کر چکی ہے۔ اساقادری نے ایک نہایت نازک معاشرتی موضوع کو بہت مہارت سے بیان کیا۔ ضمیر جیسے ماسوروں کی افزائش میں ان خواتین کا بھی ہاتھ ہوتا ہے جو سب کچھ جانتے اور ہاشور ہوتے ہوئے بھی اس کہانی میں ہمدردی جاکرتی ہیں اور ساری زندگی کا داغ دامن پر لگائے نمونہ عبرت بن جاتی ہیں۔ جانے کیوں ان کو لگتا ہے کہ ان کی زندگی میں آنے والا فرد ہی دنیا سے نرالہ ہے جو بھی فلا نہیں ہوگا۔ کاشف زبیر کی قسمت آزماء نے بالکل پور نہیں ہونے دیا شریک جیسے کہتے ہی نوجوان موجودہ وقت میں اپنی لہان متنی جھکندوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ کہتے ہی بہترین دماغ فلڈ حکومتی پالیسیوں کی جھٹ چڑھ چکے ہیں۔ عدلی کی قسمت اچھی تھی جو اس دلدل سے نکل آیا۔ مھر امام کی تکمیل ایک حساس اور سر پھر سے آرٹسٹ کا عمدہ احوال تھی۔ چاراکا انجام بہت خوفناک تھا۔ گردش امام میں نادری کی منصوبہ بندیوں کا کل ایک ہی جھکے میں زمین پس ہو گیا۔ اختتام نے بہت بھڑکا کیا۔ نقش اول کا اختتام بھی بہت مزے کا تھا۔ آپ اپنے دام میں آگیا صیاد۔ کتہہ گرنے رائٹر حضرات کی بے بسی دجالا کیاں دونوں ہی کمال واضح کہیں۔ معاوضہ، قیام گاہ اور سازش بس ٹھیک تھیں۔ مریم کے خان کی طرف سے کسی ہارر اسٹوری کا اظہار ہے اور کیا کتر نہیں بھی ای میل کے ساتھ بھیجی جاسکتی ہیں؟" (بی ہاں)

ان قارئین کے اسلئے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

اردیس احمد خان، غم آباد، کراچی۔ کاشف عزیز، کوٹری۔ میرا اقبال، کراچی۔ دکار احمد، میرپور خاص۔

بدل ہوا زمانہ

احمد اقبال

ہر شخص کی زندگی کی اپنی حدیں ہوتی ہیں... ہزار ہا گزر گاہوں کے باوجود ہمارے خواب اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ لا محدود ہوتے ہیں... وہ وقت اور لمحات کی قہد میں ہوتے ہیں... لیکن ہمارے تصورات ان سے آزاد ہوتے ہیں... وہ بہت پہلے اس سرحد کو پار کر جاتے ہیں جہاں زندگی ایک لازوال اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے... ہمارا تصور... صدیوں کا فاصلہ طے کر لیتا ہے... خوابوں اور تصورات کی دنیا سے نکل کے حقیقی جہاں کا سامنا کرنے والے دوا سے ہی نوجوانوں کی داستان دگر گویں... جو گردشِ دوراں کے کمزور لمحوں کی کنھنائیوں میں ایسے الجھے کہ ان کی زندگی کے سنہرے دن تنگ و تاریک زنداں کی نذر ہو گئے... وہ دن کھلکھلانے... تپلیوں کے پیچھے بھاگنے... اور تعلیم کی عظیم و انشان منازل طے کرنے کے تھے مگر بادِ سموم نے انہیں بکھیر کے رکھ دیا... زمانے کے چلن سے نا آشنا... ناتجربہ کاروں کی بقا کا سنسنی خیز کھیل ہر موڑ... پر ایک بند گلی ان کی منتظر تھی... گندے ہوئے ماضی کا پر پل ان کے آنے والے کل کے لیے ایک خوفناک تازیانہ تھا...

آزمائش کی کڑی دھوپ میں آبلہ پا جانباڑوں کا سفر... بنگلہش حیات کی

پل پل رنگ بدلتی کہانی...

دوسری کال سے اس نے اندازہ کیا کہ رات

کتنی گزر چکی ہے اور کتنی باقی ہے۔

اس کے ساتھ فرش پر چٹ لیٹ کر جیت کو خاموشی سے گھورنے والا

ایاز خان بھی وہی سوچ رہا تھا جو قاسم۔ اس سے سوال کیے بغیر وہ بتا سکتا تھا

کہ آنے والی صبح دور نہیں۔ پھر بھی یہ ناقابلِ یقین ہی بات لگتی ہے کہ اس رات

کی صبح بھی ہوگی۔ اور دن ہر روز کی طرح طلوع نہیں ہوگا۔ صرف ان دونوں کے

لیے۔ باقی سب اسی لیے سکون سے تھے اور جس حال میں بھی تھے، گزرے ہوئے

دن کی ساری ٹھکن کا ازالہ کر کے آنے والے دن کی مشقت اور معمول بن جانے

والے تشدد کو برداشت کرنے کے لیے جسمانی قوت کو بحال کر رہے تھے۔

”اے قاسم! کیا سچ ہے؟“ ایاز خان پھر بولا۔ ”صبح ہم آزاد ہو جائیں گے؟“

قاسم نے اس کے ایک لات رسید کی۔ ”سچ سچ کی اولاد۔“

ایاز ہنسا۔ ”کچھ نہیں ہوتا لائیں مارنے سے۔ دراصل میں یہی حساب کر رہا تھا

کہ اس تمام عرصے میں کتنی ہار میری چھترول ہوئی۔ بالکل تھانہ اسٹاکل میں۔ ہزار

بار تو نہیں، دو سو بار تو ہوئی ہوگی۔“

”اچھا تھا ڈائری میں لکھتا جاتا۔ کتنی گالیاں، کتنے ڈنڈے، کتنے تھپڑ، کتنے اور

ٹھنڈے اور کتنی ہار چکی وارڈ کے منجرے میں دکھا گیا۔“

دسمبر 2014ء

14

ڈائجسٹ



WWW.PAKSOCIETY.COM



ہی رہتا ہے۔ جو میں پہلے بھی تھا اور نکل کے بھی رہوں گا...
لے سگریٹ پی۔“
قاسم نے اس سے سگریٹ لے لی۔ ”تجھے یہ دن یاد
آئیں گے...“

”ہاں، بہت عرصہ تو مجھے باہر کی دنیا بھی اندر کی دنیا
لگے گی۔ لوگ بھی ویسے ہی نظر آئیں گے۔ پہلے میں سوچتا تھا
کہ دو چار تو مستحق ہیں کہ میں انہیں اذیت دے کر نکل کروں
جیسے انہوں نے مجھے قتل کیا تھا۔ ایک شریف اور سیدھے
سادے لڑکے کو ہر رات گئی بار... مگر تو نے بڑیک لگا دیے
میرے خیالوں پر اور کیا تھا یہاں یاد رکھنے کو۔ ایک تو وہ
تھی جو خود کو میرا سمجھتی تھی۔ اس بڑھے کا شیل کی بیوی...
اس نے بہت اکسایا مجھے بھاگنے پر اور بھاگ گئی بالآخر کسی
کے ساتھ... ایک وہ تھی چار بچے ضائع کیے گئے اس کے
پھر خود ضائع ہو گئی۔ مجھے بہت اچھی لگتی تھی وہ۔ اگر میں
بھاگ سکتا تو اسے لے کر نکل جاتا۔“

خاموشی کے ایک اور وقفے میں وہ دونوں چھت پر
سینما اسکرین کی طرح چلنے والی فلم دیکھتے رہے جس میں
گزرے ہوئے وقت کے وہ سارے منظر تھے جو ان کی
یادداشت میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکے تھے۔ کسی طویل
سفر کے مسافر کی طرح جو ٹھکن اور بیزاری سے بد حال کسی
ریلوے اسٹیشن پر اترے تو انجن کی اس سیٹی کو یاد کرے جو
ٹرین کو کھینچنے والے انجن نے حرکت کرتے وقت بجائی تھی۔
وہ وقت... وہ جگہ کتنا پیچھے رہ گئے لیکن جیتے جاگتے منظر کی
طرح یادوں کے الہم میں محفوظ تھے۔

☆☆☆

قاسم نے کسی قلعے کے مضبوط نولادی اور بلند وبالہ
دروازے کے دو پٹ صرف اتنی دیر کے لیے جدا ہوتے
دیکھے جتنی دیر میں نووارد مہمان کا مظلوم وجود اس میں سے
گزر جائے۔ جیسے کوئی اثر دھا جو اپنے شکار کو منہ کھولے اور
بند کر کے لنگ جائے۔ آگے صرف اذیت اور عذاب کی دنیا
تھی جس میں سب اپنے اپنے حصے کی سزا کاٹ رہے تھے،
کسی نے بھی قاسم کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ جیسے کسی
ہسپتال کے جنرل وارڈ میں۔ نہ کوئی مرنے والے کی طرف
دیکھتا ہے نہ پیدا ہونے والے کی طرف... یہ تو ہر روز ہر
وقت ہوتا رہتا ہے... لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔

وہ بھی اس جہنم میں شامل کر لیا گیا۔ جیل کے
معمولات کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے میں چند دن ضرور
لگے جو سیکھنے اور سکھانے کا کریش پروگرام تھا۔ اٹھتے بیٹھتے

وہ سر ہلانے لگا۔ ”سچ بتاؤں قاسم، وہ سب میں بھول
جاؤں گا بلکہ بھول گیا مگر شروع شروع میں جب وہ مجھے رات کو
لے جاتے تھے۔ کم عمر ہی نہیں، میرا رنگ بھی گورا تھا اور میں
صرف ایک بار بولا تھا۔ ایسا جواب دیا تھا کہ سب کی ماں
بہن...“

”پھر بھگتا بھی تو تھا مگر جانے دے ایاز۔ ہم دونوں کا
وقت گزر گیا۔ کیسے قاعدے ضابطے، اخلاق کے تقاضے اور
انسانی اصول۔ یہ دنیا ہی الگ ہے کوئی جب تک یہاں کچھ
دن نہ رہے اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ جیل کیا ہوتی ہے۔ باہر
سڑک پر سے گزرنے والا ہر شخص سمجھتا ہے کہ ان اوپنی اوپنی
دیواروں کے پیچھے سلاخوں اور تالوں والی کوٹھریاں ہیں جن
میں مجرم بند ہوتے ہیں اور دن میں ان سے جیل مینز کے
مطابق کام لیا جاتا ہے۔ کھانے کو اچھا نہیں ملتا اور بس یہی
سزا سب کاٹتے ہیں اور پھر نکل آتے ہیں۔ اندر کے اصل
عذاب کی تو کسی کو خبر بھی نہیں۔ خیر چھوڑ، وقت گزر گیا اور ہم
زندہ سلامت ہیں۔“

”اب تو لگتا ہے کہ وہ زندگی کسی اور کی تھی۔ ہماری
جیل سے پہلے کی زندگی۔“ ایاز خان اٹھ بیٹھا۔

”ہاں، ہم کسی اور دنیا سے آئے تھے اور اب ایک نئی
دنیا میں پہلا قدم زمینیں گے۔“

ایاز ہنسنے لگا۔ ”اپنے باؤ آدم اور ماں خواں کا لے گئے
تھے جنت سے... ہم نکالے جائیں گے جہنم سے۔“

”آدمی جب دنیا میں آتا ہے۔ وہ پہلا دن سالگرہ
کے طور پر مناتا ہے اور بیس پچیس سال لگا دیتا ہے اپنے
بچوں پر کھڑے ہونے میں۔“

”بچہ گدھے کا ہو یا مرغی کا... اسے قدموں پر کھڑا
ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ معلوم نہیں میں کیا کروں گا۔ کم سے
کم آدمی تو گزر چکی۔ باقی آدمی گزارنے کے لیے میرے
دمار میں کوئی پلان نہیں۔ تجھ سے بھی کچھ نہیں سیکھا۔“

”کوئی کسی سے نہیں سیکھتا ایاز خان، وقت سکھاتا ہے
سب کچھ... اگر آدمی سیکھنے والا ہو۔ ورنہ راستے کا پتھر سو
سال وہیں پڑا رہتا ہے اور اس کے پیچھے سے پھوٹنے والا انصاف
سا پودا اتنا لمبا چڑھتا اور پھیلا ہوا درخت بن جاتا ہے۔“

”سچ کہتا ہے جانی۔ تیرے جیسے سارے ہوتے تو
سب ایم اے پاس کر کے نکلتے۔ مگر یہاں الٹی تربیت ملتی
ہے، الٹی کالج یہاں سے شیر بن کے نکلتا ہے۔ جیب کتر اہو تو
ڈاکو بنا دیا جاتا ہے۔ ورنہ کچھ نہیں بنا۔ میرے جیسا لوکا پشما

بدلا ہوا زمانہ

تھا۔ اپنے لیے بھی لے آؤں... لنگر بند ہو جائے گا۔
وہ کچھ دیر میں پھر نمودار ہوا۔ ”اویارادو... ابھی تک
رورہا ہے۔ اچھا چائے پی کے باقی آنسو بہاتا۔“
ایاز کی قاسم کو چائے پلانے کی کوشش ناکام رہی۔
گزشتہ رات کے تینوں ساتھی اس کے سامنے آکھڑے
ہوئے۔ ”کیسے رورہا ہے۔“ ایک نے ہنس کے وہ گالی دی
جو وہاں سب سے مقبول تھی۔

”ابے تکلیف میں کیا آدمی روئے گا بھی نہیں۔ دو
چار دن میں عادی ہو جائے گا۔“ دوسرا بولا۔

قاسم نے چائے اوپر... اچھا دی اور مگ اس کے
منہ پر دسے مارا۔ ایاز کی مداخلت رانگاں گئی۔ وہ پرانے
پانی تھے اور کچھ بھی کر سکتے تھے۔ انہوں نے قاسم کو لایا،
کے مار مار کے پیچے گرا دیا اور پھر اس کو نکا کر دیا۔ جیل کے
کسی محافظ نے مداخلت ضروری نہیں سمجھی۔ اس پہلے ہفتے میں
قاسم نے ہر قانونی، غیر قانونی اور غیر اخلاقی تشدد برداشت
کیا۔ صرف ایاز خان تھا جو اس سے بات کرتا تھا تو اسے
عقل سے کام لینے اور دماغ ٹھنڈا رکھنے کی تلقین کرتا رہتا
تھا۔ قاسم اسے بھی گالیاں دیتا مگر وہ ڈھٹ بننا ہنسا رہتا۔۔۔
بار بار وہی بات دہراتا کہ تھوڑے دن کی بات ہے پھر سب
ٹھیک ہو جائے گا۔ جب تو سمجھ لے گا کہ یہاں ایسے ہی ہوتا
ہے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ دو ہفتے بعد حالات بھی پہلے جیسے نہیں
رہے۔ جیل میں زندگی گزارنے کا عمل سبق اسے پڑھا دیا گیا
تھا۔ غصہ جو پہلے اس کے قابو میں نہیں تھا اب برداشت کی
حد میں آ گیا تھا۔ ایاز اس کے دماغ کی لگام مسلسل کھینچتا
رہتا۔ بریک لگا بریک قاسم... وہ بات بات پر کہتا۔ دیکھ
بچے! کتنی زندگی تو نے باہر اپنی مرضی سے گزاری۔ یہ تھوڑی
سی مشکل زندگی دوسروں کی مرضی سے گزار لے گا تو اس کے
بعد پھر اپنی مرضی سے جینے کا حق مل جائے گا۔ زندگی بڑی
لمبی ہے قاسم... عمر قید کاٹ کے بھی بہت دن ملیں گے۔
ابھی لو جوانی ہے، جوانی ساری پڑی ہے۔“

قاسم کو اس کی باتوں پر بہت حیرانی ہوتی مگر ایاز نے
رفتہ رفتہ اسے قائل کر لیا۔ ”عقل سے بڑی طاقت کوئی
نہیں۔ یہ جو ہمارے آس پاس ڈنڈے اور اسلحہ اٹھائے
پھرتے ہیں، سب حکم کے غلام ہیں۔ غریب بھی ہیں اور بے
وقوف بھی... میری تیری کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ بس ان کی
اتھارٹی کو چیلنج مت کرنا۔ فائدہ اٹھانا ہے تو انہیں سلام کر...
بائس پر چڑھا نہیں۔“

سوئے جاتے گالی... دلائیں... تشدد اور تذلیل... جتنا
چاہو جتنو چلاؤ اور گالیاں دو یا احتجاج کرو۔ صبر اور خاموشی
کے ساتھ سب قبول کرنے کے لیے ہفتہ دس دن کافی ہوتے
ہیں۔ نہ کوئی ہمدردی کرتا ہے نہ سمجھاتا ہے اور مشورہ دیتا
ہے۔ آدمی خود اپنی عقل اور حوصلے سے جیتا سیکھتا ہے اور
اپنی زندگی کو زیادہ مشکل یا آسان بناتا ہے۔ اس کو پہلے تین
افراد کے ساتھ ایک کوشری میں رکھا گیا۔ وہ سب قتل کے
جرم میں عمر قید کاٹنے والے بڑے پالی تھے۔ ان کو باہر سے
سگرٹ کیا، ہیر و سن اور دیسی شراب تک فراہم کر دی جاتی
تھی۔ ان کے ساتھ پہلی رات کے عذاب کو یاد کر کے آج
بھی قاسم کا دل چاہتا تھا کہ انہیں قتل کر دے اور پھر خود مر
جائے مگر پہلے اسباب میسر نہ تھے اور بعد میں... درود کا حد
سے گزرتا ہے دوا ہو جانا... دوائی کیفیت نے قاسم کو بے حس
بنادیا تھا۔ ایاز خان کا اسے زندہ رکھنے کی کوشش میں بڑا ہاتھ
تھا اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا۔

جیل کی پہلی صبح قاسم پر بہت بھاری تھی۔ حاضری
کے وقت اسے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ کوئی چیز اس کے
معلق میں انک گئی تھی جو باہر آنا چاہتی تھی۔ قاسم کو اس کی بو
گٹھ کے سیاہ پانی جیسی محسوس ہوتی تھی، مگر اندر ہی اندر اٹل
رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا اور چکرا کے گر گیا۔ اسے
مردہ گتے کی طرح ٹانگ پکڑ کے کھینچے ہوئے ایک طرف
ڈال دیا گیا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تو تقریباً اس کا ہم عمر
نوجوان چائے کا گگ لیے اس کے پاس بیٹھا تھا۔

”تیرا پہلا دن ہے؟ پہلے دیکھا نہیں تھے اس لیے
پوچھ رہا ہوں۔“ وہ چستو لہجے میں اردو بالکل صاف بول رہا
تھا۔ ”میرا نام ہے ایاز خان... مجھے سال ہونے والا ہے۔
قتل کے جرم میں عمر قید کاٹ رہا ہوں... ہمارا لمبا ساتھ
ہے۔“

قاسم اٹھ بیٹھا۔ ”نہیں... میں زعدہ رہتا نہیں
چاہتا۔“

”میں بھی ایسا ہی کہتا تھا۔ ایک ہفتے میں سب ٹھیک
ہو گیا۔ جو میرے ساتھ ہوا تھا تیرے ساتھ بھی ہوا۔ سب
کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن مرنا کوئی نہیں۔“

”میں ان سب کو مار دوں گا پہلے...“ وہ کھٹنوں میں
سروے کے روئے لگا۔

ایاز خان ہنسا۔ ”کھا شکوف سے؟ وہ اپنے ساتھ لایا
ہوگا تو... یار بس مجھے چھوڑ دینا۔ لیکن ابھی ایک کام کر...
یہ گت پکڑ اور چائے پی۔ گرم ہے ابھی۔ میں تیرے لیے لایا

بعد پتا چلا کہ وہ پاکستان میں بھی نہیں ہے۔ ولایت چلا گیا ہے۔ میں ایک ہی بیٹا تھا۔ ماں نے مجھے قسم دی کہ باپ کے قتل کا بدلہ لوں گا۔ وہ قسم نہ دیتی تب بھی یہ میرا فرض بنتا تھا۔ ایک ایک کر کے بہنوں کو رخصت کیا۔ پھر ماں کو سپرد خاک کیا۔ میں سات سال کے بچے سے پچیس سال کا جوان مرد بن گیا۔

”اٹھارہ سال تک تو نے کچھ نہیں کیا؟ میرا مطلب

ہے پڑھا نہیں؟“

”پڑھا۔۔۔ صرف میٹرک تک۔ ہمارے علاقے میں کالج نہیں ہے اور زیادہ پڑھ کے مجھے کیا کرنا تھا۔ پروفیسر بن جانا تو کیا ہوتا۔ یہاں نہ آتا تو مارا جاتا یا پھانسی ہو جاتی اسی لیے شادی بھی نہیں کی تھی کہ کوئی لڑکی بیوہ ہوگی اور بچے یتیم۔ سات سال تک میں اس کو تلاش کرتا رہا۔ خود ولایت نہیں جاسکتا تھا۔ آتے جاتے لوگوں سے پوچھتا تھا۔ جب اس کا باپ مرا تو وہ آیا۔ مجھے پتا نہیں چلا۔ وہ رات کو آیا اور پھر صبح نکل گیا۔ پھر جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تو میں سمجھ گیا کہ اب وہ آئے گا۔ ولایت سے آنے میں وقت تو لگتا ہے۔ میں پشاور ریل پورٹ پہنچ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جہاز سے ہی آئے گا۔ اسے نہ آنا ہوتا تو ماں کی میت رکھی نہ جاتی۔ جیسے باپ کی نہیں رکھی گئی تھی۔ اسے سیٹ نہیں ملی تو وہ تدفین کے بعد تیسرے دن پہنچا تھا۔ وہ باہر لکھا ہی تھا کہ میں نے سامنے جا کے اسے شوٹ کر دیا۔ پوری چھ گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں، میں وہیں گرفتار ہو گیا۔“

قاسم دم بخود سنا رہا۔ ”تو نے اسے جنازہ بھی نہ پڑھنے دیا یاں کا؟“

”یارا مجبوری تھی۔ وہ گاؤں پہنچ جاتا تو یہ کام نہ ہوتا۔

وہ جاتا تھا کہ میں اپنا بدلہ لینے کے لیے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کے قبیلے والے مجھے دیکھتے ہی مار دیتے۔ یہ انہوں نے نہیں سوچا تھا کہ میں ریل پورٹ پہنچ جاؤں گا۔ قبیلے والوں کو صرف یہ پتا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ کیسے اور کب۔۔۔ قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور میرا ساتھ دیا۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد قاسم نے کہا۔ ”تو اسے معاف نہیں کر سکتا تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ہماری روایت نہیں ہے۔

میں بزدل اور بے غیرت کہلاتا نہیں چاہتا تھا۔ طبع میری

بہنوں کو بھی سننے پڑے اور پھر ماں جو قسم دے گئی تھی۔“

”یہاں سے نکل کے تو کہاں جائے گا؟“

”پتا نہیں، کوشش کروں گا کہ روپوش ہو جاؤں۔ ورنہ

اس کے سمجھانے سے قاسم کے لیے سخت حالات میں بھی جینا کچھ آسان ہو گیا لیکن انہیں بات کرنے کا موقع ہی بہت کم ملتا تھا۔ قاسم نے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور جان لیا کہ اب سزا کی میعاد پوری کئے بغیر جیل کی دیواروں کے دوسری طرف کی دنیا میں واپسی کی کوئی صورت نہیں۔ ابھی تک نہ اسے ایاز خان سے پوچھنے کا موقع ملا تھا کہ اس نے کسے قتل کیا تھا اور کیوں۔ نہ ایاز خان نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔ شاید یہ طعیر اہم تھا۔ آدمی خود کب کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ حالات اسے مجبور کر دیتے ہیں اور حالات ہر نسل کے پیچھے دہی ہوتے ہیں۔ زر۔۔۔ زن۔۔۔ زمین۔۔۔ کردار یا واقعات بدل جانے سے حقائق نہیں بدلتے۔

ابھی صرف ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ ایاز خان اور قاسم ایک ساتھ ہو گئے۔ یہ کام ایاز نے اپنے تعلقات کی مدد سے کیا تھا جسے وہ ڈپلومیسی کہتا تھا۔ قاسم اور ایاز کے ساتھ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ ان کی کوٹھری آخر میں تھی جہاں جیل خانے کے اندر کی بے رحم آوازیں کم سنائی دیتی تھیں۔ قاسم نے جیل کے اندر آ کے پہلی ہارسکون کا سانس لیا۔

”اس رات پہلی ہارسکون کا سانس لیا۔ ایاز اس کو قتل کیا تھا تو نے؟“

”اپنے باپ کے قاتل کو۔۔۔ قتل نہیں کیا تھا پر اتنا قرض اتارا تھا۔ قصاص لیا تھا۔“ وہ بولا۔

”پر اتنا قرض؟“

”ہاں، بہت پرانا۔ پچیس سال پرانا۔“ وہ سگریٹ

پیتا رہا۔ ”یہ ہماری روایت ہے۔“

قاسم حیران ہوا۔ ”تو پچیس سال اسے تلاش کرتا

رہا؟“

”نہیں، اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ میں صرف

سات سال کا تھا جب صرف ایک ہزار کی معمولی رقم کے لیے

وہ میرے باپ کو قتل کر کے بھاگ گیا۔ وہ دونوں دوست

تھے اور ایک شادی میں شریک تھے۔ رات کو یار دوست

تاش لے کر بیٹھ گئے۔ جو میں نے سنا یہ تھا کہ دلھانے اپنی

موٹر سائیکل ہار دی اور پھر جیت لی۔ میرا باپ دس ہزار ہارا

اور جیتنے والے کو دسے دیے۔ اس نے گن کے نہیں لیے۔

جیب میں ڈال لیے۔ صبح لڑنے آ گیا کہ اسے نو ہزار ملے

ہیں۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ میرا باپ بغض تھا کہ رقم پوری

تھی۔ دوسرا پکھٹل ہو گیا کہ تو مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے۔ اور

بس۔۔۔ ڈر۔۔۔ ڈر۔۔۔ ریلوے دو گولیاں میرے باپ کے

سر میں ماریں اور بھاگ گیا۔ روپوش ہو گیا۔ بہت عرصے

بدل ہوا زمانہ

سلسلہ... یہ میں نے شروع نہیں کیا تھا اور نہ میں ختم کر سکتا ہوں۔ لیکن اب ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔
 ”یہاں کوئی تجھ سے ملنے نہیں آیا، نہ بہن بہنوئی؟“
 ”بہنوں کا تو سوال نہیں۔ بہنوئی چھپ کر آئے تھے عید پر... عید کے کچھ دن بعد... کچھ چیزیں لائے تھے جو بہنوں نے بھیجی تھیں۔ میں نے منع کر دیا کہ آئندہ مت آنا... بعد میں بہت رویا میں... تیری ہے کوئی بہن۔“
 ”ہاں، مگر وہ بہت چھوٹی ہے سات سال کی۔“ قاسم نے بتایا۔

جسے میں نے قتل کیا تھا اس کے بیٹے مجھے قتل ضرور کریں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ جیل کے دروازے کے باہر ہی میرا انتظار کریں۔ جیسے میں نے انرپورٹ پر گیارہ گھنٹے کیا تھا۔ اگر ان کو معلوم ہو گیا کہ میری رہائی کب ہوگی تو وہ ضرور آئیں گے لیکن ان کو نہ معلوم ہو... اس کا چانس زیادہ ہے۔ مجھے رعایت ملے گی جو سب کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی میری سزا کی میعاد میں پندرہ دن یا ایک مہینہ کم ہو جائے۔ تاریخ کا پہلے معلوم ہونا مشکل ہے۔“
 ”رہپوش ہو کے تو محفوظ ہو جائے گا؟“

”نہیں، موت ہر وقت میرے سر پر منڈلاتی رہے گی۔ مگر میں خود کو تاتکوں کے حوالے کیسے کر سکتا ہوں؟“
 ”مگر یار! یہ کیا زندگی ہوگی کہ موت ہر وقت ہر جگہ پیچھے رہے... تلواریں رتے سر پر... اور تو بس بھاگتا رہے۔ اس نے بھی اٹھارہ سال گزار لیے تھے تیرے باپ کے قاتل نے مگر مارا گیا بالآخر... اتنی محنت کی۔ پیسا کما یا کس لیے؟ بیوی، بچوں کے ساتھ نہیں رہ سکا۔ خود کوئی خوشی نہ دیکھ سکا جو کسی عمر پانے سے ملتی ہے۔ جب آدمی نا ادا ادا جاتا ہے۔“
 ایاز نے ایک آہ بھری۔ ”تیری بات سو فیصد ٹھیک مگر یار یہ روایت اور خاندانی دشمنی کا نسل در نسل چلنے والا

ایاز خان بولا۔ ”تو نے کس کو قتل کیا تھا؟“
 ”یار کسی کو بھی نہیں۔“ قاسم نے ایک گہری سانس لی۔
 ”کیا مطلب؟“
 ”قتل میرے باپ نے کیا تھا۔ میں تو اس وقت بارہویں جماعت کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا اور بی اے کرنا چاہتا تھا۔ یہ میری ماں کی خواہش تھی اور حکم بھی تھا۔ خود اس نے میٹرک کر لیا تھا جب اس کی شادی زبردستی کر دی گئی تھی۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی، کالج میں داخلہ لینا چاہتی تھی اور اس کی عمر بھی نہیں تھی شادی کی۔ اس کا باپ دیگن چلاتا تھا۔“
 ”پھر کیا مجبوری تھی؟“ ایاز خان بولا۔

جنوری 2015ء... نئے سال کی پہلی صفحات

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سیریس ڈائجسٹ
 ماہنامہ

مزید

خلو طو کی محفل
 محفل شعر و سخن اور

مرزا جی سیک کے حوالے سے سوال و جواب

بے شمار مسافرت

یوں تو زندگی کی راحتیں ہوں یا بے شمار مسافرتیں... دلی سکون بس کسی ایک پل عیاں ہوتا ہے۔ سلیم فاروقی کے قلم سے آخری صفحات کا تحفہ

عشق ناتمام

ایسے تو اس جہان میں کچھ بھی کم نہیں ہاں ایک عشق کی کمی تھی کوئی حد نہیں ہوتی... تاریخ کے دلکش لمحات کا قصہ... ابتدائی صفحات پر الیا سیتا پوری کا انداز

سودانیہ جنوں

امت مسلمہ کے خلاف صیہونی سازشوں کی تباہ کاریاں
 ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے ایک عبرت اثر داستان

ماروی

محبت کی گہرائیوں کا اظہار، رئیس لمحات کی سنگین داستان
 محی الدین نواب کے قلم کا اگلا پڑاؤ

شاہ سید کاسف دیہر مریم کے خان
 تنویر ریاض سلیم انور اور منظر امان کی دلچسپ کہانیاں

رنگ گلزار

”تجھے یہ سب اس نے خود بتایا؟“

”ہاں، جب میں چھوٹا تھا تو اسے مار کھاتا یا روتا دیکھتا رہتا تھا۔ میٹرک میں پہنچے تک مجھے بہت سی باتوں کا پتا چل گیا تھا۔ عملاً یہ کہ میرا باپ بدکردار ہی نہیں، شکی مزاج بھی تھا۔ جس کے اپنے کتوت ایسے ہوں وہ دنیا میں کسی پر اعتبار کیسے کر سکتا ہے۔ بیس سال کی عمر میں میری ماں کے دد پنے تھے۔ میں اور میری بہن۔ اور خدا کی قدرت ہے جس نے اس کو خوب صورتی دی تھی۔ ایسے سخت حالات سے گزر کر بھی اس کا حسن ماند نہیں پڑا تھا۔ اسی لیے میرا باپ اسے گھر میں بند رکھتا۔ کہیں ساتھ نہ لے جاتا۔ کسی کو گھر میں نہ آنے دیتا۔ وقت بے وقت گھر آ کے دیکھتا اور بلا وجہ بار پیٹ کرتا کہ ابھی کون آیا تھا۔ وہ روئے یا خدا رسول کی قسمیں کھائے۔ اس کا حکم برقرار رہتا تھا۔ جب میں نے ماں سے ہمدردی شروع کی اور باپ کے رویے پر برہمی کا اظہار کیا تو اس نے مجھے سب بتا دیا۔ یہ بھی کہا کہ اس کی اپنی زندگی تو برباد ہوئی، پہلے باپ کی وجہ سے پھر شوہر کی وجہ سے۔ اب اس کی امیدیں بیٹے سے وابستہ ہیں۔“

”بہت اچھا کیا تو نے، یہاں بھی ایسے ہی عقل سے اور ٹھنڈے دماغ سے چلے گا تو کچھ نہیں ہوگا اور ایک بات پلو سے باندھ لے... اب تجھے جیل میں رہ کے پڑھنا ہے۔ بی اے کرنا ہے جو تو نہیں کر سکا تھا۔ پھر ایم اے... تجھے بہت فائدہ ہوگا، رعایت بھی ملے گی یہاں ہر سہولت حاصل ہو جائے گی۔“

قاسم غنی سے ہنسنا۔ ”اب کیا کرنا ہے بی اے، ایم اے کر کے... قاتل تو بن گیا۔“

”لیکن ماں سے کیا ہوا وعدہ تو اپنی جگہ ہے۔“

قاسم خاموش لیٹا چھت کو دیکھتا رہا۔ ”مگر وہ ماں کہاں ہے؟“

ایاز اٹھ بیٹھا۔ ”اپنی ماں کے قتل کا الزام ہے... جو تو نے لے لیا اپنے سر؟ تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔“

”اور میں نے ایسا کیا بھی نہیں تھا۔ لیکن دین کے کسی جھگڑے میں میرے باپ نے ایک آدمی کا خون کر دیا تھا۔“

ایک بار پہلے ایسا ہو چکا تھا۔ دوسری بار اسے قرض لینے والے کی بیوی پسند آ گئی۔ وہ دودھ معاشوں کے ساتھ گھر میں گھسا تھا۔ انہوں نے مقروض کو بہت مارا۔ بہت توڑ پھوڑ مچائی۔ یہ سب مجھے بعد میں مقدمے کے دوران پتا چلا۔

مقروض کی بیوی چینی چلاتی رہی اور ہاتھ جوڑتی رہی۔ اگلے دن میرا باپ ایسے وقت گیا جب عورت اکیلی تھی اور کہا کہ

سارا قرض معاف ہو سکتا ہے اگر وہ چاہے... عورت نے

”اس کی مجبوری ایک ہی تھی، وہ عورت تھی۔ اس کا باپ مقروض تھا۔ اس نے ایک سود کا دھندا کرنے والے سے اپنی دیگن خریدنے کے لیے روپیہ لیا تھا۔ یہ دیگن کراچی میں ہونے والے لسانی فسادات کے دوران جلا دی گئی۔ ادائیگی نہ کرنے سے قرض اتنی تیزی سے بڑھا کہ ادائیگی ناممکن ہو گئی۔ سود کا یہ کاروبار غیر قانونی ہوتا ہے تو اس کی وصولی کے طریقے بھی غیر قانونی ہوتے ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ قرض خواہ ایک دن دو غنڈے ساتھ لے کر گھر پہنچ گیا اور مقروض نے گھبرا کے اسے گھر کے اندر بلالیا کہ بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ گلی میں ہنگامہ کرنے سے کیا فائدہ۔“

”ہر آدمی بے عزتی سے ڈرتا ہے۔“

”ہاں، وہ اندر بات کر رہے تھے۔ بات کیا کر رہے تھے۔ ایک دھمکیاں دے رہا تھا، دوسرا منت سماجت کر رہا تھا کہ کچھ مہلت دے دو۔ کچھ نہ کر سکا تو یہ گھر بچ کر قرض ادا کر دوں گا۔ اتنے میں میری ماں چائے لے کر اندر آئی اور

صورت حال ایک دم بدل گئی۔ میرے باپ کا رویہ نرم پڑ گیا۔ بعد میں اس نے کہا کہ مکان بچ کے قرض ادا کر دو گے تو

خود کہاں جاؤ گے۔ تمہارا سارا قرضہ محاف کر دوں گا۔ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو۔ وہ اس کی بات فوراً مان گیا۔“

ایاز خان نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”کتنے افسوس کی بات ہے یارا، ہم کہلاتے مسلمان ہیں اور کڑتے ہیں وہ جو

اسلام سے پہلے ہوتا تھا۔“

قاسم نے ایک آہ بھری۔ ”میری ماں کے ساتھ بھی ہوا۔ میرے باپ کی عمر اس وقت بھی چالیس سال تو تھی۔

میرا باپ جنوبی پنجاب کے علاقے کا تھا۔ معلوم نہیں کراچی کب آیا تھا اور کیوں۔ وہ اُن پڑھ تھا لیکن حساب کتاب کر

لیتا تھا۔ یہاں آ کے اس نے دکان کر لی تھی۔ وہاں ہر قسم کا جانور اور بنا جانر کا ردہار ہوتا ہے جیسے ہر جگہ ہو رہے جبکہ

میری ماں سود کے کاروبار کو حرام اور خطرناک سمجھتی تھی کیونکہ وہ خود اس کا نشانہ بنی تھی۔ میرے باپ کے ذرا اہل اپنے جیسے

لوگوں سے تھے جنہوں نے غنڈے، بد معاش بھی پال رکھے تھے اور وہ تھانے والوں کو بھتا بھی دیتے تھے۔“

”پھر تمہارے گھر میں تو میسے کی ریل چل ہوگی؟“

”برکت کہاں ہوتی ہے ایسی کمائی میں ایاز اگر میں

کم لاتا تھا اور ہاں زیادہ اڑا دیا کرتا تھا۔ وہی شراب، جوا

اور پیشہ دہمورتوں پر... میری ماں نقد پر کورونے کے سوا کیا

کر لیتی۔ باپ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ خود لوٹ کے بھی گھر

چھٹی گئی تھی۔“

بدلا ہوا زمانہ

فق جائے گا۔ اور واقعاتی شہادت جو تیرے خلاف ہے اس کے خلاف نہیں ہوگی۔“

”اور وہ مان گیا؟“

”بالکل مان گیا۔ اسے پچاسی کے پھندے میں جھولتی اپنی لاش جو رکھائی دے رہی تھی۔ دو لاکھ دس ہزار وہ ایک عورت کے حسن و شباب پر لٹا سکتا تھا تو اپنی جان کی قیمت اس سے کہیں زیادہ دے سکتا تھا۔ اس نے وہی کیا جو پولیس نے کرنے کا کہا۔ پولیس نے ایف آئی آر لکھ لی اور چشم دید گواہوں کے بیانات بھی لے لیے مگر یہ تھانے میں ہوتا رہا۔ میرا باپ گھر کے باہر میرا منتظر رہا اور جیسے ہی میں نظر آیا وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا، ایک پارک میں۔ وہاں اس نے بڑی بے شری سے اعتراف کیا کہ اس کے ہاتھوں ایک قتل ہو گیا ہے۔ ایک بدکردار عورت نے مجھے گھر بلایا مگر اس وقت وہاں اچانک اس کا شوہر آ گیا اور اس نے مجھ پر حملہ کیا تو میں نے اپنے دفاع میں گولی چلائی جس سے اس عورت کا شوہر ہلاک ہو گیا۔ اگر اس پر مقدمہ چلا تو پچاسی جینی ہے۔ میری ماں بیوہ ہو جائے گی اور خاندان کو بدنامی کے علاوہ مالی مسائل کا سامنا بھی ہوگا۔ اگر الزام میں اپنے سر لے لوں تو کچھ نہیں ہوگا۔ اپنی ماں کے لیے میں یہ آزمائش قبول کر لوں تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔ اس کے بات کرنے کا طریقہ ایسا تھا یا میری مت ماری گئی تھی، میں اس کی بات مان گیا۔ اس نے کہا کہ وہ میری ضمانت کرا لے گا اور میرے لیے شہر کے بہترین وکیل کرے گا جو ہائی کورٹ کیا، سپریم کورٹ تک اپیل کر سکتے ہیں۔“

”تو نے ماں سے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا؟“

”میرا خیال تھا کہ ماں اس معاملے میں باپ کا ساتھ دے گی۔ کون عورت بیوہ کی قبول کرتی ہے۔ شوہر کو بچا سکتی ہو اور نہ بچائے... یہ مجھے ناممکن لگتا تھا۔ میں نے تھانے جا کے یہی بیان دے دیا کہ قتل مجھ سے ہوا ہے۔ پولیس نے مجھے گرفتار کر کے بڑے آرام سے حوالات میں بند کر دیا۔ آرام کا مطلب ہے کہ مجھے چائے، کھانا سب ملتا رہا اور میں رات کو حوالات سے کھل کے چار پائی پر سوتا رہا۔“

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا پھر ایاز خان نے کہا۔ ”چل یا راز گز رہی گیا دقت... ہم دونوں ایک ساتھ نئی زندگی شروع کریں گے۔ تو نے اچھا کیا کہ بی بی اے کے بعد ایم اے بھی پاس کر لیا۔“

”سب تیرے کہنے سے ہوا۔ تو نے ہمت دلائی اور مجبور کیا۔ میری زندگی یہاں بھی خراب ہونے سے بچائی اور

چالاکی دکھائی اور کچھ رضا مندی ظاہر کی۔ یہ کہا کہ میں موقع دیکھ کر بلاؤں گی۔ تم لکھ کے دو گے کہ قرضہ وصول ہوا۔ میرے باپ نے جھوٹ بولا یا سچ اور کہا کہ بچی رسید پر وصولی لکھ دے گا۔ عورت نے اس سے فون نمبر لے لیا۔ بعد میں کسی دن اسے بلایا اور بچے کاغذ پر وصولی کی رسید سامنے رکھ دی۔ میرے باپ نے دستخط کر دیے۔ اب میں اندازہ کر سکتا ہوں اس سین کا... اس عورت کو میں نے مقدمے کے دوران اور اس سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، اس کا اجلا بھر پور بدن بے حد پرکشش تھا۔ میرا باپ بھی انسان تھا، فرشتہ نہیں۔ میں اس کے کردار پر تبصرہ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے اس کا شوہر ہی ایسے لباس میں پسند کرتا ہو اسے... مگر وہ بیجان خیز ضرور تھی۔ اس کے فون کرنے پر میرا باپ گیا تو اس کے جذبات کا آتش لٹاں بھڑکا ہوا تھا۔ ممکن ہے وہ بی بی کے گیا ہو۔ وہاں عورت نے زیادہ سنسنی خیز لباس میں اس کا استقبال کیا۔ اسے اپنے جسم کی بھرپور طاقت کو استعمال کر کے بہت بڑا فائدہ اٹھاتا تھا۔ میرے باپ کے تو ہوش کم ہو گئے ہوں گے۔ اس وقت عقل تو چلی گئی ہوگی ٹخنوں میں... عورت نے جو کاغذ سامنے رکھا اور جہاں دستخط کرنے کا کہا۔ وہاں اس نے دستخط بھی کر دیے اور اٹھوٹا بھی لگا دیا۔“

”کتنا نقصان اٹھایا تیرے باپ نے؟“ قائم چنے لگا۔

”دو لاکھ سے کچھ اوپر... دو لاکھ دس ہزار... اس کے بعد جیسے ہی میرے باپ نے قیمت وصول کرنے کے لیے ہاتھ آکے بڑھایا۔ ایک ساتھ تین آدمی نمودار ہو گئے جو ادھر ادھر جیسے بیٹھے تھے۔ ایک اس کا شوہر تھا۔ دو پڑوسی... عورت نے قحط پکار مچا دی تھی۔ میرے باپ کا نشہ ہرن ہو گیا۔ عشق کا بھی اور شراب کا بھی۔ وہ ایک دم سمجھ گیا کہ یہ سازش تھی۔ وہ تینوں اس پر ہل پڑے۔ اس کی ایک احتیاط یا عادت ہی میرے باپ کی بدقسمتی بن گئی۔ وہ بھرا ہوا رہا اور ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے رہو اور لور کٹا اور دیکھے بغیر فائر کر دیا۔ گولی اس عورت کے شوہر کو لگی اور وہ وہیں مر گیا۔ میرا باپ بھاگا تو گھر کے باہر کئی لوگ جو شور من کے اور فائر کی آواز پر کھل آئے تھے سب نے اسے فرار ہونے دیکھا۔ وہ ہوائی فائر کرتا کھل آیا۔ اب اس کے بعد کا کھیل دیکھ جو میرے باپ نے پولیس سے مل کے کھیلا۔ پولیس نے اسے پٹی پڑھائی کہ اس کیس میں پچاسی سے بچنا ہے تو اپنے بیٹے سے کہہ کہ وہ الزام اپنے سر لے لے... وہ تاباں ہے،

رعایت تمہیں دی گئی، اب اس کی سہولت واپس لے لی گئی ہے۔ تم کو سزا پوری کرنی ہے۔“

ایاز خان نے ایک گالی دی۔ ”ان کی تو... اب کوئی ردک کے دکھائے مجھے۔ بڑی مشکل سے میں نے یہ آزادی اور یہ زندگی پھر حاصل کی ہے۔ اب میں ان کے ہاتھ نہیں آنے والا۔“

”ابھی تک تجھے کسی نے قتل نہیں کیا۔“ قاسم بولا۔
”ہاں، لگتا ہے وہ میری رہائی کی تاریخ معلوم نہیں کر سکے یا انہوں نے کوشش ہی نہیں کی۔“

”کیا مطلب؟ یعنی بدلہ لینے کا خیال چھوڑ دیا ہے انہوں نے؟“

ایاز ہنسا۔ ”ابے نہیں۔ ان کو زیادہ بھروسہ ہو گا خود پر کہ باہر نکلے گا تو بیچ کر جائے گا کہاں... کسی دن قضا خود نشانے پر لے آئے گی، جلدی کیسی۔“

وہ جمشید روڈ پر آگئے۔ بہت کچھ بدلا ہوا تھا مگر بہت کچھ تھا جو انہی کی طرح پرانا تھا۔ ان کی جیب میں وہ رقم تھی جو انہوں نے جیل میں مشقت کر کے کمائی تھی اور انہیں ساری ادا کر دی گئی تھی کیونکہ جیل کے بادشاہ کی نظر میں وہ خاص تھے۔ دونوں آرام و سکون سے چلتے رہے۔

ایاز بولا۔ ”ابھی خیدر آباد کا کوئی کے چوک پر مجھے وہ ہوٹل نظر آیا جہاں میں نہاری کھانے آتا تھا اور میرے منہ میں پانی آ گیا۔ کیسی مست کرنے والی خوشبو ہوتی ہے نہاری کی... اور گرم گرم تنور سے نکلنے والی ردیوں کی۔“

قاسم اس پر اڑا۔ ”چل تیری رہائی کی خوشی میں بیچ میری طرف سے... آ جا نہاری کھاتے ہیں۔“

”اور تیرے اعزاز میں رات کی دعوت میری طرف سے ہو گی۔ ہم بریانی کھا گئیں گے۔“ کینے اسٹوڈنٹ جاگے۔“

پیٹ کی گنجائش سے زیادہ کھانے کے بعد ایاز نے ہانسی کی مدد سے اپ سے کی۔ قاسم نے برسوں بعد پھر چائے پی جو اپنا دہی پرانا ذائقہ اور مہک رکھتی تھی۔ اب بالآخر انہیں اس یقین کی خوشی مل رہی تھی کہ وہ اپنی گمشدہ دنیا میں لوٹ آئے ہیں جہاں بہت کچھ دی ہے۔ اب سوال آنے والے وقت کا تھا۔ آج کی رات وہ کہاں گزاریں گے۔ کل کیا کریں گے۔ انسانوں کی دنیا میں وہ خلائی مخلوق کی طرح اجنبی تھے۔ نہ ان کا کوئی شناسا تھا، نہ دست نہ رشتے دار۔

”میں اپنے گھر جاؤں گا۔“ قاسم نے اچانک کہا۔
زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔“

”چل چھوڑ قاسم... آگے کی سوچ۔“

”ہم ساری رات باتیں کرتے رہے۔“

”کسے نیند آتی ہے جیل میں آخری رات۔“ قاسم

نے کہا۔ ”خواہ مخواہ بھاگی ہوئی ہو یا رہائی... چل یہاں آخری ناشتا کر لیں۔ لوگوں سے مل لیں۔“

گیارہ بجے انہیں جیلر نے اپنے آفس میں طلب کر لیا۔ اس نے قاسم سے ہاتھ ملا کے اسے مبارکباد بھی دی۔ ”تمہیں یہ نئی زندگی اور آزادی مبارک ہو۔ تم نے دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کی ہے اپنے رویے سے اور اپنی ہمت سے... کتنے قیدیوں کو تم نے پڑھایا، دو نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ چار اس سال امتحان دے رہے ہیں۔ سب تمہارے شاگرد تھے۔“

”مجھے ہمت دلانے والا ایاز ہے سر۔“

”میں جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے کسی اور کے جیسے کی سزا کائی۔ اپنی ماں کو بیوہ ہونے سے بچایا۔ تمہاری قربانی راکھاں نہیں جائے گی۔ دوسروں سے میں کہتا ہوں کہ پھر یہاں لوٹ کے مت آنا۔ تم سے نہیں کہوں گا، مجھے معلوم ہے کہ تم نہیں آؤ گے۔ ہاں مجھ سے ملنے کے لیے آتے رہنا۔ کوئی بھی کام ہو بتانا... خدا حافظ۔“

اور ایک بار پھر اڑدھسے کے منہ جیسے آہنی پھاٹک نے اپنا بھیاٹک منہ کھول کے ان کو اسی دنیا میں اگل دیا جہاں سے نکلا تھا اور وہ برسوں اس کے بے رحم وجود میں اذیت سے بھرے دن رات کی چکی میں پستے رہے تھے۔ بند دقیر لیے دباں کھڑے پہرے داروں کے چہروں پر فریضہ اجل جیسی بے حسی تھی۔ انہیں راستہ دیتے ہوئے وہ اپنی بے بسی پر برہم نظر آتے تھے کہ بہت نچلے درجے کی قابل نفرت مخلوق کی دنیا چھوڑ کے وہ زیادہ معزز اور شریف انسانوں کی دنیا میں واپس جا رہے تھے۔

ایاز خان مین روڈ تک کے لمبے راستے پر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے اوپر آسمان کو دیکھا۔ ”یار قاسم! ذرا غور سے دیکھ اوپر... یہ آسمان وہی ہے اور یہ سورج... پہلے ایسا تو نہیں تھا۔“

قاسم نے اسے سمجھ لیا۔ ”ہاں، سب بدل گیا ہے ہمارے لیے... ہمیں فوراً نکل جانا چاہیے کہیں دور... ایسا نہ ہو کہ ابھی پیچھے سے گارڈ سپاہیاں بجاتے چلائے ہمارے

بدلا ہوا زمانہ

دلائی جو اپنے اور بچوں کے لیے اپورنڈ سوئز اور جریاں خریدنے میں مگن تھیں اور شاید اس لیے اوجڑا دھڑکیں دیکھ رہی تھیں کہ کسی شناسا کی نظر سے نظر نہ ملے۔ "شاپنگ کرتے ہوئے یا ساحل پر انہیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ان خواتین نے لنڈے کے پرانے کپڑے پہن رکھے ہیں؟" ایاز بولا۔ "گوروں کی خیرات کے۔"

قاسم نے سر ہلایا۔ "ہم بھی تو انہی میں شامل ہیں۔" "مجھے لگتا ہے کہ دس سال میں لوگ زیادہ غریب ہو گئے ہیں۔ پہلے لنڈے میں ایسے چہرے کہاں نظر آتے تھے اور یار میں نے دیکھا تھا ایسی ہی خواتین کو کار سے اتر کر گلی میں آتے ہوئے۔"

قاسم نے اس کی تائید کی۔ "میں نے بھی دیکھا تھا۔ سوشل سیکلیس ہے ایاز۔۔۔ ایک پرانی گاڑی لے لی۔ اپورنڈ کپڑے اور بیگ یہاں سے خریدے اور شامل ہو گئے اپریکلاس میں۔ جہاں چاہو کہو۔۔۔ جب میں لندن گئی تھی تو لائی گئی، اعتماد دھونڈا جا رہی۔"

نئے یعنی نئے نظر آنے والے کپڑوں کا بڈل انہوں نے بغل میں رکھا۔ یہاں لباس بدلنے کے لیے جگہ نہ تھی۔ چلتے چلتے ایاز کی نظر نے ایک گلی کی مسجد دیکھی۔ عصر کی نماز کا وقت قریب تھا۔ انہیں خالی غسل خانے مل گئے۔ پرانے کپڑے انہوں نے وہیں چھوڑے اور غسل کر کے نماز پڑھنے والوں کی صف میں کھڑے ہو گئے۔ وہ دوبارہ سڑک پر آئے تو عام معزز شہری تھے۔ ان کا یقین اور اعتماد پوری طرح لوٹ آیا تھا اور احساس جرم و دعامت کی شرمندگی جس کو وہ خود یوں محسوس کرتے تھے جیسے ان کے منہ پر کالک ہے۔ اب باقی نہیں رہی تھی۔

اچانک قاسم نے کہا۔ "یہ ہے وہ گلی۔"

ایاز چونکا۔ "کون سی گلی؟"

"جس میں میرا گھر تھا۔" قاسم بولا اور گلی میں مڑ گیا۔

ایاز کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے چلا گیا۔ سامنے سے آنے والے ان کی طرف دیکھے بغیر گزرتے گئے۔ یہ خاصی چوڑی ہینڈ فرش والی گلی تھی جس میں لوگوں نے اپنی گاڑی کو دیوار سے لگا کے کھڑا کیا تھا تاکہ دوسری گاڑی کے گزرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔

"تو نے کسی کو پہچانا؟" ایاز نے کہا۔

"مجھے کسی نے نہیں پہچانا، سامنے سے آنے والے دو بڑھوں کو میں جانتا ہوں۔ یہاں کے پرانے رہنے والے،

پچھے آجائیں کہ ٹھہر دو۔۔۔ تمہاری سزا ہوتی ہے۔ حساب کتاب میں کچھ غلطی ہوئی اور آرڈر آگئے ہیں کہ اچھے روپے پر جو "حیرا مطلب ہے اس گھر میں جہاں تو اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا گھر وہاں کون ملے گا تجھے؟"

قاسم بولا۔ "کوئی تو ملے گا اور میں کب کسی سے ملے جا رہا ہوں، گھر کو دیکھوں گا۔"

"بٹے پرانے گھر کو دیکھنے سے زیادہ ضروری ہے اپنے ٹھکانے کی فکر کر۔۔۔ بے گھر لوگوں کا سنا تھا، آج ہم بے گھر ہیں۔"

"کوئی نہ کوئی ٹھکانا مل جائے گا۔ لوگ فٹ پاتھوں پر بھی تو سوتے ہیں۔"

ایاز بولا۔ "اس کے لیے بھی کسی سے اجازت لینا ضروری ہے۔ کوئی ٹھیکے دار ہو گا جو بٹا لے گا۔ پولیس الگ پوچھے گی۔"

"شام تک دیکھ لیں گے کوئی جگہ۔۔۔ ایک دن یا ایک رات کی بات تو نہیں ہے نا ایاز۔۔۔ رہنے کی جگہ بھی چاہیے۔ کوئی کام دھندا بھی کرنا ہے۔ یہ تھوڑی سی رقم جو ہمارے پاس ہے کب تک ساتھ دے گی؟"

"چل پہلے اپنا یہ حلیہ ہی شریفانہ بنالیں۔ شریف تو ہم رہے نہیں جب سزا یافتہ ہو گئے۔"

انہوں نے ہال کٹوائے اور شیو کرانے کے بعد خود کو زیادہ پراسر اعتماد محسوس کیا۔ ابھی تک وہ عام لوگوں میں ان جیسے ہی تھے۔ کسی نے ان کے چہرے پر شک کی سوالیہ نظر تک نہیں ڈالی تھی۔ وہ اپنی پرانی دنیا میں لو وارد تھے چنانچہ وہ پندر روڈ تک پیدل ہی گئے اور گرد و پیش کو بڑے غور اور تجسس کے ساتھ دیکھتے رہے۔ کیا بدلا تھا۔ کتنا بدلا تھا۔ کیا ابھی تک وہی تھا اور وہیں تھا۔ ٹریفک کا ازدحام اور شور پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا تھا۔ ہاتی سب وہی دنیا تھی جس کو وہ دس برس بعد دیکھ رہے تھے۔ یقیناً جو آج نوجوان تھے وہ اس وقت بچے اور ناز و ادا کی بھلیاں گراتی شوخ و شریر اور خوب صورت لڑکیاں بھی اس وقت بچی ہوں گی۔ اور وہ جو دس سال پہلے ان کے جیسی طرح دائر اپنے انداز حسن میں یکتا تھیں، وہ اب کہاں ہوں گی؟ چار چھ بچہ کی ماں بن جانے کے بعد پہچانی بھی نہ جائیں گی۔ ان دونوں کے خیال میں ناموں کے بہت سے چراغ روشن تھے۔

لنڈا ہزار کی وسعت اور رونق میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ ایاز نے اس کی توجہ وہاں شائد خواتین کی طرف

اونچائی پر لگی کال بیل کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے کہا۔ ”جی؟“

وہ چونک کر پلٹے۔ ایک لمحے کے لیے قاسم کی نظر اس پیکر حسن و شباب پر جیسے جم کے رہ گئی۔ اس کی نظر نے اپنے مقابل بڑے اعتماد کے ساتھ کھڑی و بلی پتلی نازک سی لڑکی کو دیکھا۔ ”آپ رہتی ہیں، اس گھر میں؟“ اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکن آگئی۔ ”اور کیا آپ رہتے ہیں؟ دروازے پر تو دونوں کھڑے ہیں۔“

”آئی ایم سوری... یہ کبھی میرا گھر تھا۔“ قاسم نے رواں انگریزی میں کہا۔

”اوہو... آپ کے غالباً دادا نے بنوایا ہو گا یہ مکان... لیکن آٹھ سال... پہلے میرے والد نے خرید لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب آپ کو یہاں کھڑے رہنے کا حق بھی حاصل نہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔ بس آج پھر اس شہر میں آیا تھا تو قدم ادھر اٹھ گئے۔ پرانی یادیں ساتھ کہاں چھوڑتی ہیں۔ میرا بچپن اسی گھر میں گزرا تھا۔“

اس کا رویہ قدرے ہمدردانہ ہو گیا۔ ”آپ ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں اندر سے؟ میں ڈیڑی سے کہتی ہوں۔ اس میں کوئی براہم تو نہیں ہونی چاہیے۔“

بیٹ کندھے پر رکھے ایک نوجوان کہیں سے نمودار ہوا۔ ”شانو باجی! باہر کیوں کھڑی ہیں آپ؟ اور یہ کون ہیں؟“ اس نے ایاز اور قاسم پر ایک شکل نظر ڈالی۔

”ظفر ہم سے پہلے یہ ان کا گھر تھا۔“ شانو نے کال بیل پر انگلی رکھی اور دروازہ کھلتے ہی اندر چلی گئی۔ ظفر ان کو گھورتا ہوا گیا اور ناگواری کا اظہار کرنے کے لیے دروازے کو دھڑ سے مار کے بند کیا۔ پھر اندر کی آوازیں باہر سنائی دینے لگیں۔

کسی مرد نے خرا کے کہا۔ ”کون رہتا تھا اس گھر میں؟ تجھے معلوم ہے؟“

لڑکی نے دفاعی انداز اختیار کیا۔ ”جو بھی رہتا ہو، اگر ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے تو... شریف آدمی ہے۔“

”جس بات کا پتا نہ ہو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔“ مرد نے دباڑ کے اس کی بات کاٹ دی۔

اب ظفر بولا۔ ”مجھے تو چھٹا ہوا لوفرنگ رہا تھا۔“

”اتنی صاف رواں انگریزی میں بات کر رہا تھا۔“

”سبب طریقے سے۔“ شانو بولی۔

”چپ کر، میں جانے بات کرتا ہوں اس حرام

ہیں۔“ وہ چلتے چلتے ایک دروازے پر رک گیا۔ ”یہ میرا گھر ہے۔“

”یہ تیرا گھر تھا؟“ ایاز نے نری سے پوچھا۔

قاسم نے دو منزلہ مکان کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ”یہ ایک منزلہ تھا۔ دوسری منزل نہیں تھی۔ نیچے کا نقشہ وہی ہے۔“

ایاز نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”کیا خیال ہے چلیں؟ گھر دیکھ لیا تو نے... کوئی پہچان لے گا تو...“

”گلی میں سب جانتے ہیں کہ میزے ساتھ کیا ہوا تھا۔ سننے آنے والوں کو پرانے لوگوں نے بتا دیا ہو گا۔ ماں کے اچھے تعلقات تھے چند گھروں سے۔“

”ہاں، ہوں گے۔ اب چل۔“ ایاز نے اس کی آستین کھینچی۔

قاسم وہیں کھڑا رہا۔ ”میں... ماں کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ شاید کوئی جانتا ہو کہ وہ اب کہاں ہے؟“

ایاز نے ایک گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے، معلوم کر لے اگر کوئی بتا دے تو اچھا ہے۔“

قاسم نے دونوں طرف کے تین دروازوں پر لگی کال بیل بجا کی۔ دو گھروں کے مکین نئے تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ تیسرے میں ایک دس بارہ سال کا بچہ کئی بار سوال جواب کے بعد نمودار ہوا اور بالآخر اس نے کہا۔ ”اماں کہتی ہے کہ شام کو آتا ہے اور دروازہ بند کر دیا۔“

ایاز نے خفگی سے اسے گالی دی۔ ”یہ شام نہیں ہے کیا؟“

قاسم نے اسے لوکا۔ ”یار، اپنے محلے میں بیار محبت سے بات کرتے ہیں۔ شرافت کی زبان میں اور وہ تو بچہ ہے۔“

”عادت جاتے جاتے ہی جائے گی۔“ ایاز نے شرمندگی سے کہا۔

”کام پر جانے والے مرد رات کو لوٹتے ہیں۔ عورتوں کو دس سال پہلے کی باتوں کا کیا پتا۔ آئی ہوگی کہیں سے بیاہ کے... وہ جو یہاں تھیں وہ دوسرے محلوں، شہروں یا ملکوں میں گئیں۔“

”یار اتنا انہی سے پوچھ لے۔“ ایاز بولا۔ ”جو اب تیرے گھر میں رہتے ہیں۔“ ایاز بولا۔

قاسم لوٹ کے اپنے پرانے گھر کی طرف آیا۔ اس کی نظر میں اندر کا پورا منظر تھا لیکن درمیان میں حائل بند دروازے نے سب اوچھل کر رکھا تھا۔ ابھی اس کا ہاتھ خاصی

موسم سرما کی خشک آلودہ عنایتوں کے ہمراہ دسمبر 2014ء کا دل فریب پاکیزہ آب کی نذر



کراچی



ماہنامہ

نگہت سیمما اور رفاقت جاوید کے سلسلے وارثانوں بہت خوب صورتی سے منزل کی جانب گامزن

مایہ ناز رائٹر و پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی فرحانہ ناز ملک کی
یاد میں ساتھی رائٹرز اور مذاہنوں کے پریم اور پُرسوز تاثرات

زاہدہ پروین کے ماہر قلم کا شاہکار جنگل کا پھول

نایاب جیلانی نے پردہ اٹھایا ترکِ وفا کے اصل راز سے

ماہ دسمبر کے لیے غزالہ عزیز کی دلوں کو گرماتی خوب صورت تحریر

(اس کے علاوہ)

شیریں حیدر، ریحانہ حسن، ندا حسنین،
فرحانہ ناز ملک و دیگر مشاق قلم کاروں کی مہر لطف کاوشیں

گزر تے ماہ و سال کیا

پیٹا آیتے ہیں؟ شائستہ زریں

کا خصوصی سروے

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوق کی نذر

راوے سے... اس کی ہمت کیسے ہوئی ادھر آنے کی۔“
”ڈیڈی! آپ نمبریں، میں کہہ دیتی ہوں کہ یہ نہیں ہو سکتا ابھی۔“

مرد دھاڑا۔ ”ابھی نہ کبھی... ناگہیں توڑ کے ہاتھ میں دے دوں گا پھر اس گلی میں بھی قدم رکھا۔“
اب کسی عورت نے کہا۔ ”شاید! تو بیٹھ آرام سے۔“
تیرے ڈیڈی ہاتھ کر لیں گے۔“

ایاز اور قاسم کو احساسِ ذلت و رسوائی کے ساتھ اپنی غلطی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ شاید کا باپ جو بھی تھا، سب جانتا تھا۔ نام سن کے ہی اس نے سمجھ لیا تھا کہ قاسم وہی ہے جو کل کی سزا کاٹ رہا تھا۔ وہ ایک دم سامنے آ گیا۔ کسی طرح بھی وہ قاسم یا ایاز کے مقابلے میں نازن نہیں تھا کہ انہیں اس غلطی کی سزا میں دھنک کے رکھ دیتا۔ مگر وہ شیر بنا ہوا تھا کیونکہ ایک سزا یافتہ کل کے مجرم کے مقابلے میں اس پر کوئی الزام نہیں تھا اور معاشرے میں اسے شرافت کی سند حاصل تھی۔ باپ کے پیچھے بیٹا تھا اور اس کو جو الی کی جسمانی قوت فراہم کرنے کے لیے موجود تھا۔

اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گیٹ کی لائٹ کسی نے اندر سے جلائی۔ مالک مکان آتش نشاں بنا قاسم سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ ”کیا بات ہے؟ تو قاسم علی ہے نا؟“
وہ اسے گھورتا ہوا بولا۔

”حمید صاحب! میری خواہش۔ اتنی ناجائز بھی نہیں تھی۔“ وہ شرافت سے بولا۔

”ابے بکواس مت کر میرے سامنے... سب جانتا ہوں کہ کون ہے تو... عرقید کی سزا کاٹ کے آیا ہے نا جیل میں... قاسم ہے تیرا نام... تیرے باپ کے کرتوت بھی پتا ہیں مجھے... تیری ماں...“

قاسم گرم ہو گیا۔ ”بس... بہت کہہ کیا آپ نے۔“ غلطی کی میں نے ادھر آ کے۔ کوئی جرم اگر کیا بھی تھا میں نے تو اس کی سزا مل گئی۔ جھوٹ سچ کا آپ کو کیا پتا؟“

وہ اچھلا۔ ”مجھے نہیں پتا۔ ابے... وہ سب مر نہیں گئے ہیں جو سارے کرتوت جانتے تھے تم سب کے۔“

اونچی آوازوں نے ادھر ادھر کے گھروں سے فارغ لوگوں کو کھینچ لیا تھا۔ کچھ در سے کھل گئے تھے اور عورتیں گلی میں ہونے والی ہنگامہ آرائی دیکھی سے سن رہی تھیں۔ گھر کا مالک یوں چلا رہا تھا جیسے قاسم اس کے گھر کو آگ لگانے آ گیا تھا۔ ایاز نے مجمع کے ڈر سے اس کی آستین کھینچی۔
”چل قاسم! کوئی فائدہ نہیں کچھ کہنے کا... کوئی نہیں سنے گا“

تیری۔“
”ابے او چھپے... آدمی گلی اب بھی جانتی ہے اس کے سود خور باپ کو... یہ جو شرافت کا دھوے دار کھڑا ہے نا تیرے ساتھ... اس کی ماں کو بھی وہ خرید کے لایا تھا۔ دوسری عورت کو اغوا کر کے لانا چاہتا تھا۔“

کسی نے قاسم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”قاسم! دیکھ مجھے سب معلوم ہے۔ اپنے باپ کو بچانے کے لیے تم نے قتل کا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔“
”جب آپ جانتے ہیں حقیقت...“ قاسم نے برہمی سے کہا۔

”بہتر ہے کہ تم پھر یہاں نظر نہ آؤ۔ یہ شریفوں کا محلہ ہے اور تم مجرم نہ سہی... دس سال مجرموں کی محبت میں رہے ہو۔ عرقید کاٹی ہے تم سننے... وہاں سے تو فرشتہ بھی شیطان بن کے نکلتا ہے۔“

”لیکن میں نے جیل میں رہ کے بی اسے کیا۔ ایم اسے پاس کیا ہے۔“

”ابے شرافت کی زبان سمجھ میں نہیں آرہی ہے؟“
ایک نوجوان فی شرٹ سے نظر آنے والے طاقتور بازو اور سینہ نکال کے آگے بڑھا۔ ”اب کیوں آیا ہے ادھر... کیا ہے تیرا یہاں... باپ تو منہ کالا کر گیا۔ مکان بیچ گیا حمید اللہ صاحب کو۔“

وہاں اب آٹھ دس افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک دو ہی کا چار عائدہ رویہ تھا مگر باقی بھی انہی کے حامی تھے۔ ایاز چاہتا تھا کہ مزید بد مزگی یا ہنگامہ آرائی سے پہلے وہ یہاں سے نکل جائیں۔ قاسم کی خواہش فطری تھی مگر یہ امید ایاز کو بھی نہ تھی کہ عوامی جذبات ان کے اس حد تک خلاف ہو جائیں گے۔ اوپر کی کسی کھڑکی سے عورت نے مقابل کے گھر کی کسی عورت کو مطلع کیا۔

”ارے وہی ہے... وہ جو رہتا تھا نا پہلے یہاں سود خور... اس کا بیٹا جیل کاٹ کے آیا ہے۔“

”اچھا وہی... جس کے ہارے میں کہتے ہیں کہ بیوی کو بھی سچ گیا تھا مکان کے ساتھ... دوسری عورت بولی۔“

ان مخالف اور دشمن لوگوں میں بیشتر سابق ہمسائے تھے لیکن یہاں ہمسائیگی کا نام لیتا بھی جرم بن چکا تھا۔ ان کے کردار پر سزا یافتہ کی مہر ہی انہیں مجرم قرار دینے کے لیے کافی تھی اور پھر اس کا باپ اچھے کردار کے سبب ایسا محلے دار نہیں تھا کہ کوئی اسے جانے کے بعد اچھے گفتگوں میں یاد کرتا۔ حالات کو بدتر ہونے سے بچانے کے لیے فرشتہ غیب

بدل ہوا زمانہ،

کی۔

”قاسم! سنی سنائی کا کیا اعتبار، یہ بتاؤ تم نے اس گھر میں جانے کی بے وقوفی کیوں کی تھی؟“

قاسم نے فوراً تردید کی۔ ”نہیں مولوی صاحب! میں پاگل نہیں ہوں کہ ایسے منہ اٹھا کے کسی بھی گھر میں گھس جاؤں۔ مجھے تو معلوم تھا کہ اب وہاں میرا کوئی نہیں۔ ماں، باپ کا بھی پتا نہیں۔ موچا تھا شاید کوئی بتا دے۔ گھر کو ایک بار پھر اندر سے دیکھنے کی خواہش کوئی گناہ تو نہیں۔ مالک کی اجازت سے جاتا میں۔“

”چلو چھوڑو... بہت سی باتیں لوگ نہیں سمجھتے۔ یہ ایک جذباتی حرکت تھی جو تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی تھی... اب بتاؤ آگے کے لیے کیا سوچا ہے؟“

اسی وقت عشا کی اذان بلند ہوئی۔ وہ خاموش بیٹھے فلاح کی طرف بلانے والی آواز کو سنتے رہے۔ دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد قاسم بولا۔ ”میں نے بتایا تھا آپ کو... ایم اے کر لیا تھا میں نے جیل میں... خبر بھی آئی تھی اور میرا اثر دیو بھی آیا تھا کسی اخبار میں۔ کچھ نہ کچھ کر لوں گا میں۔“

”اللہ تمہیں نیکی کے راستے پر چلائے اور کامیاب کرے۔“ وہ اٹھے اور اندر چلے گئے۔ یہ محلے کی چھوٹی سی مسجد قاسم کو یاد تھی۔ یہ آج بھی اتنی ہی تھی۔ آس پاس خالی جگہ کہاں تھی کہ اس کی توسیع ممکن ہوتی۔ اب تک ان کا اس طرف خیال نہیں گیا تھا اور مولوی صاحب نے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ چلو نماز کے لیے وضو کرو۔ وہ از خود جماعت میں شامل ہوئے جہاں انہیں بہت سی گھورتی نظروں کا سامنا ہوا۔ یہ پرانے محلے دار تھے جو ان کی آؤ بھگت کا تماشا دیکھ چکے تھے مگر یہاں وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی ناپسندیدگی کے جذبات کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

نماز کے بعد جب وہ اپنے جوتے پہن رہے تھے تو انہوں نے مولوی صاحب کی آواز سنی۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

قاسم نے ہلٹ کے کہا۔ ”جہاں تقدیر لے جائے۔ آج کی رات کہیں گزرا کے کل کوئی لو کرے بھی تلاش کریں گے اور رہنے کی جگہ بھی... آپ کا شکریہ کیسے ادا کریں کہ آپ نے مزید تماشا بننے سے بچالیا۔“

مولوی صاحب بولے۔ ”تم چاہو تو آج رات یہاں

کا کردار ادا کرنے والا پیچھے سے آیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ سفید ریش شخص تھا جس نے جالی دار ٹوپی لگا رکھی تھی اور کندھے پر چار خانے والا روپال ڈال رکھا تھا۔ اس کے سوال کے جواب میں ہیرو بننے والے نے کہا۔ ”ابھی مولوی صاحب! وہ جو یہاں رہتا تھا نا سو دخور... ہاں جس نے اپنی جگہ بیٹے کو جیل بھیج دیا تھا، وہی بیٹا جیل کاٹ کے آگیا ہے گھر دیکھنے۔ اس کے باپ کا گھر تھا نا، میں سائے کو دھن کے رکھ دیتا۔“

مولوی صاحب نے قاسم کا ہاتھ تھاما۔ ”باپ کے حصے کی سزا کاٹ لی اس نے... اور کیا کرے؟“

”سزا یافتہ تو ہو گیا نا جی... چور، ڈاکو اور قاتلوں کے ساتھ رہ کے آیا ہے۔“ کسی نے کہا۔

قاسم نے ایک ہمدردی پلکے پھر کہا۔ ”مولوی صاحب! میں نے جیل میں رہ کے بی اے کیا۔ پھر ایم اے... تعلیم دئی۔“

”اچھا آؤ میرے ساتھ۔“ مولوی صاحب نے گویا معاملہ ختم کیا۔ ”جاؤ بھائی تم بھی اپنے اپنے گھر... کیا تماشا لگا رکھا ہے یہاں۔“

ان دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ لوگوں کے منتشر ہونے سے پہلے ہی وہ مولوی صاحب کے ساتھ ہو لیے جو نماز عشا کی امامت کے لیے جا رہے تھے۔ ”اچھا تو قاسم ہو تم... میں جانتا تھا تمہارے باپ کو... مگر تم اس وقت شاید میٹرک کر رہے تھے؟“

”جی میں ایف اے کا امتحان دینے والا تھا۔ ماں کو بچانے کے لیے الزام اپنے سر لیا تھا۔ وہ بیوہ ہو جاتی۔“

”اس کا اجر اللہ دینے والا ہے۔“ وہ مسجد میں داخل ہو گئے۔ ”آج کل کیا کرتے ہو؟“

”مولوی صاحب! آج ہی صبح رہائی ہوئی تھی۔ یہ میرا جیل کا ساتھی ہے ایاز خان۔ مجھ پر باپ نے ظلم کیا تھا اس کو ماں نے پھانسی چڑھنے بھیجا تھا۔ ہماری کم عمری نے بچالیا۔“

مولوی صاحب مسجد کے صحن میں بیٹھ گئے۔ ”انسان کا اعتبار بڑا دل نہیں کہ وہ معاف کر سکے۔ وہ رب العالمین سزا دینے پر آئے تو ہر روز ہمارے گناہ شمار کرے، کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ماں باپ... وہ چلے گئے ہیں نہ جانے کہاں؟“

”لگتا ہے آپ بھی کچھ بھاری ہیں مجھ سے مولوی صاحب، میں جانتا ہوں کہ وہ کوئی شریف آدمی نہیں تھے۔“

مولوی صاحب نے اٹھکیوں سے داڑھی میں انگلی

وہ اس ایک لڑکی کے بارے میں نہ سوچنے کے ارادے میں ناکام رہا جس نے پیچھے سے آکے کہا تھا۔ ”جی؟“ کتنی سنجیدگی اور شوخی تھی اس کے سوال میں کہ یہاں میں نہیں رہتی تو کیا آپ رہتے ہیں۔ کتنی مختلف تھی وہ ان سب سے جو آج اس کے گھر میں رہتے تھے۔ وہ اپنی ماں کی مظلومیت اور اپنی چھوٹی بہن کی معصومیت کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔ کتنی سفاک حقیقت تھی کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں آج کچھ نہیں جانتے تھے حالانکہ ان کے درمیان خون کا رشتہ ہے۔ یہ بھی نہیں کہ کون کہاں ہے۔ اس دنیا میں یا کسی اور دنیا میں۔

صبح مسجد کے غسل خانے میں نہا کے قاسم نے خود کو بہت پُر اعتماد محسوس کیا۔ نماز فجر کے بعد انہوں نے مولوی صاحب سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ محلے کے بچے بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے اشارے سے قاسم اور ایاز کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ آٹھ بجے بچے رخصت ہوئے تو مولوی صاحب انہیں اپنے گھر لے گئے جو چند قدم دور ایک کوچھی کا سرونٹ کو اڑ تھا۔ وہاں انہوں نے ناشتا کیا جو اندر سے مولوی صاحب کی بیوی نے بنا کے بھیجا تھا۔ خدا نے انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ یہ بات انہوں نے کسی دکھ یا حسرت کے بغیر بتائی۔ پھر وہ ایاز اور قاسم سے جیل میں گزارے ہوئے وقت کی باتیں سنتے رہے۔

”بھی تم نے غور کیا کہ اتنے لوگوں میں تم ہی ایم اے کرنے اور دوسروں کو پڑھانے میں کیوں کامیاب ہوئے؟“

قاسم نے حیرانی سے کہا۔ ”اس لیے کہ میں نے کوشش کی۔“

”نہیں۔ اس لیے کہ خدا نے تمہیں منتخب کیا۔ توفیق دی۔ اس کا خصوصی کرم رہا تم پر... اور وہ تمہارے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتی کی تلافی بھی کرے گا لیکن...“ وہ خاموش ہو گئے۔

قاسم نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”لیکن کیا مولوی صاحب؟“

”ہم انسان اتنے فیض اور معاف کرنے والے نہیں ہوتے۔ یہ تمہیں اپنے ماضی کو بھلانے نہیں دیں گے، بس امت نہ ہارنا۔ میرا تو باہر کی دنیا سے بس یہی تعلق ہے کہ میں بھی دنیا میں رہتا ہوں۔ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ کیونکہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

قاسم نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ کا یہی

رک سکتے ہو۔ موذن کے کمرے میں نیچے سو جاؤ۔ کھانا گھر سے بھجوا دیتا ہوں۔“

موذن اجنبی اور بن بلائے مسلط ہو جانے والے مہمانوں سے خوش نہیں تھا مگر مولوی صاحب کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جن کے وہ مہمان ہو گئے تھے۔ کھانا کھانے تک ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ اس نے پوچھا اور نہ انہوں نے اپنے بارے میں بتانا ضروری سمجھا۔ باہر سردی نہ ہوتی تو درمجن میں بھی سو جاتے۔ مولوی صاحب نے ان کے لیے دو مکمل بھی بھیجے تھے۔ وہ اوڑھ کر خاموش لیٹ گئے۔ جب موذن کے خراٹے سنائی دینے لگے تو ایاز نے کہا۔ ”یارا آج بھی اچھے لوگ ہیں دنیا میں... اور ملا جلی تو فرشتہ ہیں۔“

قاسم اس لڑکی شاہینہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس گھر کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کچھ الگ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ پڑھی لکھی تھی۔ کہیں جاب کرتی تھی، اس میں اعتماد تھا اور ایک وہی ہمدرد بھی محسوس ہوتی تھی۔ جیل کی دنیا کی ساری بد صورتی کے بعد حسن کا یہ پہلا احساس تھا۔

”اوائے خانہ خراب... کیا سو گیا؟“

قاسم چونکا۔ ”نہیں یار، میں کچھ سوچ رہا تھا تو نے کچھ پوچھا تھا۔“

”کیا سوچ رہا تھا؟“

”نہیں... کہ کل کی رات سے آج کی رات کتنی مختلف ہے۔ کہاں وہ جیل کی کوٹھری... کہاں یہ اللہ کے گھر کا ایک گوشہ... کتنے امان کا احساس ہے یہاں اور سکون ہے۔“

قاسم بولا۔

”ہاں، کوٹھری تو اتنی ہی بڑی ہے اور یہاں بھی ہم قین ہیں۔“ ایاز نے سرگوشی میں کہا۔

”آج کی رات بھی وہاں سب کچھ وہی ہوگا۔ دینا ہی ہوگا۔ معلوم نہیں ہماری جگہ کس نے لی۔“

”اب چھوڑ کل کی بات... آنے والے دن کا سوچ۔“

قاسم نے کہا۔ ”سوچنے سے کیا ہوگا؟ یار جس نے آج سہارا دیا، وہ کل بھی دے گا۔ سو جا۔“

مگر وہ خود ایاز کے سو جانے کے بعد بھی جاگتا رہا۔ نہ وہ دیکھی تھا اور نہ آنے والے دن کے لیے پریشان۔ وہ گزر جانے والے وقت کی آزمائش اور عذاب کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ آج دن بھر میں اس نے بازاروں میں گھومتے پھرتے کتنی لڑکیاں دیکھی تھیں؟ شاید سیکڑوں... مگر

بدلا ہوا زمانہ

ہیں ہم سب کی جان میں لیکن آپ کے لیے گنجائش نکالیں گے۔“
قاسم نے کہا۔ ”جی میں لیچر کی جاب کرنا چاہتا ہوں۔“
میرا نام قاسم ہے۔“

پرنسپل صدمے سے کرسی پر گر گیا۔ ”لیچر... تم تو
لیچر نظر آتے ہو جیسے سے... یہ انگلش میڈیم اسکول ہے۔
اپر کلاس کی جنٹری کے بچے پڑھتے ہیں یہاں... ہمارا
چہرہ اسی بھی...“

”پڑھانے کے لیے کوئی فلیکشن ضروری ہے یا اچھا
لباس... میں نے اردو میں ایم اے کیا ہے فرسٹ
کلاس... لیکن انگلش اور اسلامیات بھی پڑھا سکتا ہوں۔“
پرنسپل نے کچھ کم جارحانہ انداز اختیار کیا۔ ”دیکھو
مسٹر، ہاں... قاسم اوقت بدل گیا ہے۔ ایم اے، پی ایچ
ڈی سے کوئی امپریس نہیں ہوتا۔ لیچر کو فرنگلش بولنا آنا
چاہیے امریکن لہجے میں... اور یہی وجہ ہے کہ ہم سینٹ
جوزف کی اے لیول لڑکی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک دم ماڈل
ٹائپ... والدین تم جیسے لیچر سے خوش نہیں ہوتے جو گنوار
نظر آتا ہو۔“

قاسم اٹھ کھڑا ہوا۔ ”پھر تو میں غلط جگہ آ گیا۔“
”آئی ایم سوری... میں تم کو بے عزت نہیں کرنا
چاہتا تھا۔ میں بتا رہا تھا کہ لوگوں کی چوائس بدل گئی ہے۔ ہر
معاملے میں... تم دیکھ سکتے ہو کہ بلاؤتورے کی جگہ برگر
اور پیزانے لے لی ہے۔ تمہیں خود کو بدلنا ہو گا نئے زمانے
کے تقاضوں کے مطابق... پھر تمہاری صلاحیت کی قدر ہو
گی۔“

قاسم بیٹھ گیا۔ ”لباس اگر صرف ٹائی اور سوٹ ہے یا
رنگین ٹی شرٹ اور جینز۔“

”بس، یہ تمہاری عمر کے لوگوں کا کلچر ہے۔ انٹر میڈیٹل
برائڈ اب گلی گلی بنتے ہیں اور پہنے جاتے ہیں۔ ہوائی،
ریننگر، ارمانی، سب پہنے پھر رہے ہیں اور کرفل ٹی شرٹ تو
فٹ پاتھوں پر ملتی ہے بس ذرا وہ نہ ہو... میرا مطلب ہے
فٹس... ہائی جو آگے پیچھے لکھا ہو... سب چلتا ہے... اچھا
اب بولو گار کی بات۔“

”میرا مطلب ہے سٹری... دیکھو ابھی اسکول کو ایک
سال ہوا ہے۔ اللہ نے چاہا تو چار پانچ سال میں ہماری
برائچ ڈیفنس، کنفشن، گلشن بلاک سیون میں ہوگی... اس
سے اچھا پاکستان میں کوئی بزنس نہیں۔ ایجوکیشن یا ہیلتھ...
ہم صرف نرسری... پری اسکول اور پرائمری کلاس رکھیں

احسان کیا کم ہے کہ آپ ہم پر اعتماد کرنے والے پہلے آدمی
تھے۔ آپ نے ہمارے ماضی کو ہمارے لیے شرمندگی کی
وجہ نہیں بنایا۔“

ایک برعاقبت رات کے بعد وہ پھر اس اجنبی دنیا میں
زندگی گزارنے نکل آئے، جو ان پر مہربان بہر حال نہ تھی۔
قاسم بہت پُر امید تھا کہ اس کو اپنی تعلیمی صلاحیت کی بنیاد پر
کہیں نہ کہیں پڑھانے کے لیے رکھ لیا جائے گا۔ ایم اے
میں اس کا مضمون اردو تھا جو اسکول اور کالج میں ہر سطح پر
انگریزی کی طرح لازمی تھی۔ یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی
کہ موجودہ نسل کے لیے انگریزی کوئی مسئلہ نہ تھی۔ بدیسی
آقاؤں کی زبان پر انہیں اسکول کے علاوہ ٹی وی
پروگراموں، گھر کے ماحول اور گیمز وغیرہ سے دسترس
حاصل ہو جاتی تھی۔ ان کی ساری پریشانی اردو کا نصاب تھا
جس میں غالب اور اقبال جیسے شاعروں کی لکھیں غزلیں
شامل تھیں جو اردو میں فارسی لکھتے تھے۔ اردو میں پاس ہونا
لازمی تھا چنانچہ ٹیوٹر اور کوچنگ سینٹر طلباء کو اردو میں پاس
ہونے کے لیے پڑھانے کے علاوہ دیگر طریقے بھی سکھا
دے تھے جن سے یہ مشکل آسان ہو۔

ایاز مایوسی کا شکار تھا۔ وہ کوئی خاص ہنر نہیں جانتا تھا
اور خود کو قاسم پر ہار سمجھتا تھا مگر قاسم کسی قیمت پر اسے الگ
کرنے کے لیے راضی نہ تھا۔ قاسم نے اپنی کوشش کا آغاز
ایک ایسے اسکول سے کیا جہاں گیٹ پر ”لیچر کی ضرورت
ہے“ کا اشتہار ہارڈ بورڈ پر بدخطی کا نمونہ تھا۔ قاسم نے ایسے
بہت سے اسکول دیکھے تھے جو ایک سو بیس گز کے رہائشی
گھروں میں چل رہے تھے اور چوتھی منزل تک ڈرپے جیسے
کمرے بنا کے ان میں بچوں کو ٹھونس دیا گیا تھا۔ ٹھیل کا
میدان کیا وہاں بنیادی سہولتوں کا بھی فقدان تھا۔

اس اسکول کی حالت بہتر لگتی تھی۔ یہ چھ سو گز پر محیط
تھا۔ باہر چوکیدار یونیفارم میں موجود تھا اور بہت سی گاڑیاں
بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ سیدھا پرنسپل کے کمرے میں پہنچ
گیا۔ پرنسپل عقاب جیسی آنکھوں اور طوطے کی چونچ جیسی
ناک والا دبلا پتلا ساٹھ سالہ شخص تھا جو صورت سے ہی مکار
نظر آتا تھا۔ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا اور ٹائی بھی ہانڈھی تھی
لیکن اس سے وہ جو کرسی نظر آنے لگا تھا۔ سوٹ پرانا اور
دھیلا تھا۔ ٹائی گلے کا پھندا بنی ہوئی تھی۔

”آئیے آئیے۔“ اس نے نواداروں کو نظروں سے
پرکتے ہوئے فیملہ کیا کہ وہ اپنے کسی بچے کو داخل کرانے
کے لیے آنے والے ہی ہو سکتے ہیں۔ ”بچے کو داخل کرتے

پرنسپل کو دیکھ رہی تھی جو کو ایفائیڈ تھا اور اس کے انتظامی مسائل کو حل کر سکتا تھا۔ اس کی پرسنالٹی اچھے لباس میں انتہائی متاثر کن ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر ایم اے آکسفورڈ... لی ایچ ڈی کیمرج اس کے نام کی تختی پر لکھ دیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کون تصدیق مانگے گا۔ اگر اسے ایڈمنسٹریٹر بنا دیا جائے تو وزارت تعلیم کے اعلیٰ حکام سے ڈیل کر لے گا۔ ”مسٹر قاسم! سٹ ڈاؤن۔ میں تین ہزار دوں گا تمہیں فائل... اور یہ ہو سکتا ہے کہ کون کا سرورٹ کواریز تمہیں مل جائے۔ تمہارے اکیلے کے لیے کافی ہوتا چاہیے۔“

”میرے ساتھ بھائی بھی ہے۔“ اس نے ایاز کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو رہ سکتا ہے تمہارے ساتھ... کیا یہ نہیں پڑھا سکتا؟“

ایاز نے گھڑے جیسا سر ہلا دیا۔ ”آپ مجھے کلرک رکھ لو فیس وغیرہ لینے کے لیے۔“

”تو اس کے لیے منانت چاہیے کسی کی۔ کیشن کا معاملہ ہے۔ مگر تم اسکول وین چلا سکتے ہو۔ پندرہ سو تم کو بھی مل جائیں گے۔ اب مسٹر قاسم! پڑھانے کے ساتھ تم کو ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داری بھی سنبھانی ہوگی۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔ پی آر کا کام ہے۔ مجھے اپنا سی دی دو۔“ پرنسپل نے قاسم کی خاموشی کو رضامندی سمجھ لیا تھا۔

”سی دی؟ وہ تو نہیں بنائی میں نے۔“

”اب بناؤ۔ میٹرک دی اے اور ایم اے کے کہاں سے کیا۔ کس اسکول میں پڑھاتے رہے۔ شادی کا رڈ... حوالہ اور مستقل پتا... دو ریفرنس۔“

اب وقت آ گیا تھا کہ پرنسپل کوچ بتا دیا جائے۔ ”نہ میرا کوئی ریفرنس ہے، نہ مستقل پتا۔ میں نے جیل میں رہ کے پی اے کیا۔ پھر ایم اے... اور وہیں پڑھاتا رہا۔ محل کے الزام میں دس سال کی جیل کاٹ کے میں کل رہا ہوا ہوں۔ محل میں نے نہیں کیا تھا۔ آپ سینٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے فون پر پوچھ لیں۔ وہ میرے کردار...“

اب تک کی خاموشی اس الیکٹریک شاک کا نتیجہ تھی جو پرنسپل کو قاسم کے انکشافات سے لگا تھا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ”اشعو... پو ہلڈی مرڈر... تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے سامنے بیٹھنے کی اور میرا وقت ضائع کرنے کی۔ تم نے کیا سمجھ رکھا تھا۔ یہاں کسی کرمل کو رکھا جاسکتا ہے۔ کیا میں پاگل ہوں۔ اپنے یوچر پر کھانڈی مار سکتا ہوں۔ تو ہیل دو

کے۔ اس میں محنت زیادہ نہیں۔ بس شوٹا اچھی ہونی چاہیے۔ بچہ ایک دم ڈفر ہو تب بھی اس کو اے گریڈ دو... ہانگنی پرسنٹ سے اوپر... ہاں باب بہت خوش ہوتے ہیں۔ سب کو پروگریس رپورٹ دکھاتے پھرتے ہیں۔“

”یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟“ قاسم نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ تم آئے ہو ٹیچر بننے... نہیں دینا ضروری ہے۔“ پرنسپل بولا۔

”لیکن ابھی آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ نہ میری ڈگری...“

”اب تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو نا... آدی کو ٹرسٹ کرنا چاہیے۔ ہاں بگاڑو لو... تنخواہ۔“

”آپ کیا دے سکتے ہیں؟“

وہ کچھ دیر خاموشی سے قاسم کو دیکھتا رہا۔ ”اپنی

مجبوری بتادی میں نے... ابھی پندرہ سو۔“

”پندرہ سو؟ کیا اس تنخواہ میں کوئی جی سکتا ہے۔ مکان

کا کرایہ، بل، کھانا پینا، جوتے کپڑے؟“

”تو کیا تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟“ پرنسپل حیران

ہوا۔ ”فٹ پاتھ پر سوتے ہو؟ عالمگیر ٹرسٹ سے کھاتے ہو؟“

”آپ مجھے پھر بے عزت کر رہے ہیں۔ اگر فقیر ہوتا تو اس سے دس گنا کما لیتا... یہاں کیوں آتا۔“

”میری کھانے کی بات نہیں۔ تمہارا گھر تو ہوگا۔ کھانا اپنا فیملی کے ساتھ ہوگا۔“

”میری کوئی فیملی نہیں اور کوئی گھر نہیں۔“

ایاز نے کھلی بار دخل دیا۔ ”دراصل ہم اس شہر میں

نو وارد ہیں۔ مظفر گڑھ سے آئے ہیں۔ جنوبی پنجاب سے۔“

”ہاں، اُدھر سے ہر کوئی ادھر آ رہا ہے۔ کراچی کا خانہ

خراب کرنے... خیر اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا میں۔ ہاں تنخواہ دو ہزار ہو جائے گی۔ جو سینئر اسٹاف کو

ملتی ہے۔ وہ بڑے گھروں کی لڑکیاں ہیں۔ اپنی گاڑی میں آتی ہیں۔ اپنا خرچہ پورا کر لیتی ہیں۔“

”آپ ان سے میرا موازنہ کیوں کرتے ہیں۔ دو ہزار ان کی پاکٹ منی ہے۔ وہ محض وقت گزاری کے

لیے... میڈم کھلانے کے لیے ٹیچر بن گئی ہیں۔ ان کے تمام اخراجات تو ان کی ارسنل کرپٹ فیملی پورے کرتی ہے۔“ وہ

پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

پرنسپل خود مالک تھا اور اس کی نظر قاسم میں ایک دلکش

بدلا ہوا زمانہ

دوا میں تک جملی فروخت ہو رہی ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔“

قاسم خاموشی سے سنا رہا۔ ایاز غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ جیل کے اندر ہر قسم کے مجرم تھے۔ شاید باہر سیدھی سادی شریفانہ اور آباؤ اجداد کی طرح زندگی ایک معمول کے دائرے میں گزارنے والوں کو آج کی دنیا کے بارے میں اتنا معلوم نہیں تھا جتنا جیل کے اندر کی دنیا والوں کو معلوم ہوتا رہتا تھا۔

آدھا دن گزر گیا تھا۔ ابھی تک وہ وہیں تھے جہاں چوبیس گھنٹے پہلے جیل سے باہر آئے تھے مگر ایک دن میں گھر، نوکری یا ذریعہ معاش، فیملی اور انسانی رشتے کہاں سے آتے۔ یہ ہزار میں ملنے والی چیز تو تھی نہیں۔ وہ پریقین تھے کہ انہیں ایک موقع مل جائے اور تھوڑا سا دقت تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جیسے گاڑی اسٹارٹ ہو جائے تو بیٹری بھی خارج ہو جاتی ہے۔ مگر دنیا کے نام نہاد عزت داران کا راستہ روک رہے تھے۔ ان کو دھتکارا جاتا رہا۔ جاؤ، ہمارے پاس مت آؤ۔ تم سزا یافتہ ہو، قاتل ہو، جھوٹ سچ کا کسے پتا۔ یہ تمہارے ریکارڈ پر ہے۔ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے کہ تمہیں اپنی محفوظ زندگی، اپنی فیملی، اپنے گھر، اپنے بچوں یا ان کی درس گاہوں میں گھسنے دیں۔

رفتہ رفتہ قاسم کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی تھی کہ اپنے ماضی پر خوشنا جھوٹ کی ایسی چادر ڈالیں جس کے نیچے سب کچھ چھپ جائے۔ شام تک انہوں نے کئی جگہ قسمت آزمائی لیکن گزرے ہوئے دس سالوں کی کالک کے باعث ہر جگہ سے دھتکارے گئے۔

ابھی ان کی جیب میں جیل کی کمائی کے پیسے تھے لیکن وہ کسی ہوٹل میں رات گزارنے کی عیاشی کے مستحق نہیں ہو سکتے تھے۔ ابھی مستقبل غیر یقینی تھا۔ رات گزارنے کے لیے فٹ پاتھ سے ریلوے پلیٹ فارم تک مفت کے ٹھکانے کم نہ تھے۔ وہ کہیں سے بھی سردی سے بچاؤ کے لیے پرانا کبل حاصل کر سکتے تھے لیکن قاسم نے اصرار کیا کہ ہم اپنے محلے کی انی مسجد میں سونے کے لیے جا سکتے ہیں۔

”وہ موذن خوش نہیں تھا ہم سے۔“

”مولوی صاحب اتنے مہربان تھے ہم پر... وہ موذن کو سمجھالیں گے اور ہم کون سا مستقل ٹھکانا مانگ رہے ہیں رہائش کے لیے... بس دو چار دن۔“

مولوی صاحب انہیں نماز عصر کے بعد مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے ملے۔ ان کے پاس محلے کے لوگ تھے جو

پورا دم اسے... تمہارے ماتھے پر سزایافتہ قاتل کی کالک ہے اور تم کہتے ہو جیل تمہارے کردار کا ضامن ہوگا۔ گیٹ آؤٹ۔ دو منٹ میں باہر نکل جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلا دوں گا۔ یہاں باعزت لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔“ وہ اپنی کانپٹی آواز میں چلا پڑا اور خود بھی کانپتا رہا۔

ایاز نے اسے سمجھ لیا۔ ان کا ماضی ہونٹوں پر خاموشی کی مہر بن گیا تھا۔ وہ بے عزت ہونے پر مجبور تھے کیونکہ وہ عزت کی بات کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مختصر گراؤنڈ سے گیٹ تک کا فاصلہ انہوں نے بوجھل قدموں سے طے کیا اور گیٹ سے باہر آتے ہی ایک طرف چل پڑے۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ جو اعتماد انہیں مسجد کے پیش امام نے دیا تھا دھواں بن کے اڑ گیا تھا۔ اب انہیں یوں لگتا تھا جیسے ہر شخص کی نظر میں ان کے لیے نفرت ہے۔ حقارت ہے۔ قریب سے گزرنے والے اپنا دامن بچا کے گزر رہے ہیں کیونکہ وہ سزا یافتہ قاتل ہیں۔ ایک فقیر، بھنگی، موچی، گدھا گاڑی ہانکنے والا... سب عزت دار ہیں۔

ایاز نے اسے سمجھ کر ایک بیچ پر بٹھالیا۔ قاسم کا حلق خشک تھا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک بس چلتا رہا تھا۔ جیسے وہ سب سے دور بھاگ رہا ہو۔ ایاز سڑک پار کے ایک کھوکھ سے پانی کی بوتل لایا۔ قاسم کے حلق میں اذیت کے کانٹے موجود رہے۔

”دیکھ بیٹے ایہ جو ہوا ہے نا ہمارے ساتھ... یہ ہوتا رہے گا۔ جب تک کہ ہم...“

”ہم کیا؟ کہاں سے لائیں حوالے۔ فیملی بیک گراؤنڈ... گزرے ہوئے دس سالوں کو کہاں دھن کریں؟“

”سوچتے ہیں یا... دنیا میں رہنے کے لیے جھوٹ کا سہارا تو لیتا ہی پڑے گا۔“

”ان سے اچھے تو وہ جیل کی دنیا کے لوگ تھے۔ جنہوں نے ہمیں ہمدردی اور سپورٹ دی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جیل میں مجرم بنائے جاتے ہیں۔ جیب تراش وہاں جا کے ڈاکو بن جاتا ہے۔“

”یہ بھی غلط نہیں ہے قاسم، ہمیں قسمت نے محفوظ رکھا لیکن اب تو زندگی اسی دنیا میں گزارنی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ماضی کو لاوارث لاش کی طرح دفن کر دیں۔ ایک نیا ماضی بنالیں۔ فخر کے قابل۔ اس دنیا میں ہر چیز جعلی چل رہی ہے۔ جعلی لیڈر، جعلی پیر، جعلی ڈگری، جعلی نوٹ، ہر مشہور برانڈ کے جعلی نام سے ہر چیز... حد ہے کہ

بھی... لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ مجھے کسی کی نظر میں مروت اور لیاقت محسوس نہیں ہوتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے لور ان کے درمیان جھکڑے کا سبب میرے لیے اس عمر میں پریشانی پیدا کرے۔ تم سمجھ رہے ہو تا میرا مطلب۔“

”جی مولوی صاحب۔“ انہوں نے سر جھکا کے کہا اور سلام کر کے مسجد سے باہر آ گئے۔ مطلب بہت صاف تھا۔ اہل محلہ نے کہہ دیا تھا کہ ان سزا یافتہ قاتلوں کو محلے کی مسجد میں آنے سے نہ روکا گیا تو مسجد رہے گی... پیش امام بدل جائے گا۔ یہ بات دونوں کے دل میں تھی کہ ضرور موزن نے بھی مخالفوں کی حمایت کی ہوگی۔ وہ چاہتا ہوگا کہ پیش امام صاحب کا پتا کٹ جائے تو ان کی جگہ لے سکے۔ تاہم ان میں سے کسی نے بھی زبان سے یہ بات نہیں کہی۔

وہ رات انہوں نے ریلوے کے مسافر خانے میں گزاری۔ اس میں بھی قلیوں کے ٹھیکے دار سے اجازت لینی ضروری تھی۔ وہ سخت چہرے والا سابق ہسٹری شیئر تھا۔ ایک عمر رسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آنے والے قلی نے ترس کھا کے انہیں اشارے سے بتا دیا کہ وہ ہے استاد... اس سے بات کر لوہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

استاد کینٹ اسٹیشن پر حمزہ کلاس مسافر خانے کے ایک گوشے میں دیوار کے سہارے نیم دراز تھا۔ اس کے سر کی ٹائش ہو رہی تھی اور وہ مجرموں کی طرح سر جھکا کے کھڑے دو قلیوں کو گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ کمینہ پن کرتے ہو میرے ساتھ... یہ بلا لے لوں گا اور ریلوے کی پولیس رکھے گی ایک رات تو نانی یاد آ جائے گی۔ چلو دفع ہو جاؤ۔“

مالیہ نے استاد کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا تو استاد کا ہسیانک کرخت چہرہ ان دونوں کی طرف گھوم گیا۔ ”کچھ کام ہے۔ سیٹ چاہیے خیر میل میں؟“

ایاز نے دو ٹوک بات کی۔ ”ہم مسافر خانے میں سونا چاہتے تھے چند دن۔ تمہاری اجازت چاہیے۔“

وہ ان کو جہرائی سے دیکھتا رہا پھر مالیہ کو ڈانٹ کر بھاگ دیا۔ ”کیوں؟ کون ہو تم دونوں؟ گھر بار کوئی نہیں؟“

”نہیں، ایاز خان نے بے خوفی سے کہا۔ ”ہم کل ہی قتل کے الزام میں عمر قید کاٹ کے رہا ہوئے تھے۔ میں نے تو خیر قتل کیا تھا اس نے باپ کو بچایا تھا۔ وہ شہر سے ہی غائب ہے۔ معلوم نہیں کدھر گیا۔“

استاد اٹھ کر بیٹھ گیا اور کچھ دیر باری باری ان کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔

”نہ گھر بار ہے نہ نوکری ملتی ہے۔ حالانکہ میں نے

چاہتے تھے کہ کرایہ دار اور مالک مکان کے قفیے میں وہ کوئی چراسن تصفیہ کرادیں۔ وہ دونوں بھی خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ سوالیہ نظروں سے دیکھنے کے باوجود مولوی صاحب نے انہیں توجہ نہ دی۔ دو افراد کو قاسم نے بھی پہچان لیا۔ گزشتہ شام وہ بھی مخالف جذبات رکھنے والوں میں شامل تھے۔ اس وقت بھی وہ انہیں ناپسندیدہ نظروں سے بار بار دیکھ رہے تھے۔ سوال ان کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ تمہیں خبردار کیا تھا کہ دوبارہ محلے میں نظر نہ آنا، لیکن مسجد میں وہ خاموش رہنے پر مجبور تھے۔

اپنا مسئلہ لے کر آنے والے مولوی صاحب کی کیا مانتے، وہ آپس میں بحث کرتے اور ان دونوں کو گھورتے ہوئے نکل گئے تو مولوی صاحب نے اخلاقیات چھ لیا۔ ”ہاں بھی، کہیں کام بنا؟“

”نہیں مولوی صاحب، اب ہم اس دنیا کے قائل نہیں رہے۔“ ایاز بولا۔

”کیوں بھی؟ ایسی کیا بات ہو گئی آخر؟“

”بات ایک ہی ہے مولوی صاحب! ہم قتل کے جرم میں سزا یافتہ ہیں۔ ہمارا رب ہمیں معاف کر سکتا ہے، دنیا کے نزدیک اب ہم خطرناک مجرم ہیں۔ ایک ٹھپا لگ گیا ہے ہمارے کروار پر... ہمارا نام و نسب گھر بار کچھ نہیں ہے۔ صرف اعلیٰ تعلیم ہماری ضمانت نہیں ہو سکتی۔“ قاسم نے دھکی لہجے میں کہا۔

مولوی صاحب خاموش رہے اور پھر بولے۔ ”اسے بھی اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھو، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر قاسم بولا۔ ”کل آپ کی بروقت مدد نے ہمیں بچا لیا تھا۔ اب... ایک درخواست ہے کہ دو چادرن کے لیے ہمیں یہاں رہنے دیں۔ چند دن میں ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ نوکری نہ ملے تو مزدوری... اور سونے کی جگہ۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مولوی صاحب نے کھٹکھار کے کہا۔ ”دیکھو بر خوردار! مجھے آزمائش میں مت ڈالو۔ آج کچھ لوگ آئے تھے مجھ سے یہی بات کرنے کہ ایک رات کی کوئی بات نہیں لیکن وہ پھر ان سے ملنے آئیں تو منع کر دیا جائے کہ مسجد بھی محلے کی ہے اور عبادت کی جگہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہاں سزا یافتہ قاتل ٹھہریں۔ میں ان سے کیا بحث کرتا۔ ان کے چہرے اچھے نہیں تھے۔ اتنا عرصہ میں نے امامت کی ہے۔ جنازے بھی پڑھائے ہیں اور نکاح

حساب برابر بدل ہوا زمانہ

مریض ڈاکٹر سے: ”اگر آکھ میں مرچیں پڑ جائیں تو کیا کرنا چاہیے؟“
ڈاکٹر: ”جتنی مقدار میں مرچیں پڑی ہوں، اتنی ہی مقدار میں چینی ڈال لیں۔“
(ریاض بٹ، حسن ابدال)

جیل میں بی اے اور پھر ایم اے کیا۔ سب ضائع کیا۔“
قاسم بولا۔
استاد کا چہرہ بے یقینی کی تصویر بن گیا۔ ”ایم اے؟ سچ بولتا ہے تو؟“
”تم سے جموٹ بول کے کیا ملے گا؟“ قاسم تنگی سے بولا۔

”اچھا اچھا، بیٹھو ادھر۔“ گلو استاد نے نری سے کہا اور کسی کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا۔ ”سامان ہے کوئی... میرا مطلب ہے بستر وغیرہ؟“
انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”جیسے ہیں کچھ بچے ہوئے۔ کرائے پر مل جائے کسی کا پرانا کبل تو دلا د اور ہاں استاد! ہم پہلے کھانا کھا لیں گے۔ چائے بعد میں پیئیں گے۔“ ایاز نے جیب سے دو نوٹ نکال کے استاد کی طرف بڑھائے۔

”انہیں رکھ اپنے پاس۔“ اور چائے لانے والے کو نئے احکامات جاری کیے۔ ”باہر سے دو دال فراہمی اور روٹی... اسی ٹکڑے سے... بول دینا گلو کے مہمان ہیں ٹائٹ جا۔“

کھانا دیسے ہی تھا حصاریلوے مسافر خانے کے گرد آباد ہوٹلوں میں ملتا ہے۔ ایاز اور قاسم دونوں کو احساس تھا کہ یہ بستی جیل کیوں کا۔ ٹھیکے دار جو صورت سے ہی سفاک اور بد معاش لگتا ہے ان لوگوں کے مقابلے میں نرم دل اور کچھ ہمدرد لگتا تھا جب وہ کھانا کھاتے ہوئے اپنی گزشتہ زندگی کا حساب پیش کر رہے تھے تو وہ سمجھ رہا تھا۔
”ہوتا ہے، یہی ہوتا ہے۔“ اس نے کئی بار کہا۔ ”پتا ہے مجھے۔“

”کیا تم بھی جیل جاکے ہو استاد؟“ ایاز نے کہا۔
وہ ہنسا۔ ”ابے کوئی ایک بار... ہم تو سسرالی تھے پولیس کے۔ اپنا میکا ہو گیا تھا جیل خانہ۔ مگر بچے نالی کا کیزا بھی زندہ رہتا ہے۔ تمہاری قسمت اچھی تھی جو گٹر میں گرے اور کل آئے۔ فکر نہ کرو، تھوڑے دن بعد یہ سب بھی گئی گزری ہو جائے گی۔ کون یاد رکھتا ہے کسی کو... فرصت کے ہے۔ تم کروٹوں کے جو کرنا چاہو گے۔ ایک دن گھر بار بیوی بچے سب ہوں گے۔ ابے دس سال پوری زندگی تو نہیں ہوتے۔ میں بھی بھول گیا۔ تم بھی یاد کرو گے تو بس اس طرح جیسے بچپن میں ٹائی فائڈ ہوا تھا یا ہاتھ لوٹ گیا تھا۔ میرے سارے بدن پر داغ ہیں زخموں کے... سب میڈل ہیں پولیس کے دیے ہوئے... ایک ٹانگ میں گولی لگی تھی۔

لوہے کی راڈ پڑی ہوئی ہے۔ میں اُن پڑھ تھا، یہ زندگی کا تجربہ ہے جو کام آیا۔“
”بیوی بچے ہیں تمہارے؟“
”ہاں، ایک بیٹی کی شادی کر دی ہے۔ اس کا شوہر پلبر تھا۔ دینی چلا گیا۔ عیش کر رہی ہے۔ دو بیٹے ابھی پڑھ رہے ہیں۔ سب لاہور میں ہیں۔ رام کلی میں گھر ہے۔ شاہ جی کہتے ہیں سب... کسی کو پتا نہیں کہ میں کون تھا اور اب کیا ہوں۔ ایک دو بار میرے پڑوسی سامنے سے گزر گئے پچانے بغیر... وہ دیکھتے بھی تو کوئی مشکل سمجھتے۔ مگر گلو کا شاہ جی سے کیا تعلق۔ تو ماسٹر بننا چاہتا ہے؟“
قاسم نے چونک کے اقرار میں سر ہلایا۔ ”سوچا تو یہی تھا۔“

”چلو ابھی تو جاؤ اور سو جاؤ سب بھول کے... کل کرتے ہیں کچھ انتظام۔“

استاد گلو اس دنیا کے معاملات جانتا تھا جو سامنے ہوتے ہوئے بھی سب کی نظر سے اوجھل رہتی ہے مگر دنیا کے ہر بڑے شہر میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ جیسے انڈر گراؤنڈ ریلوے، محاورے کے مطابق گلی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو نیڑھی کر کے نکالا جاسکتا ہے۔ اور استاد گلو کا کہنا تھا کہ کراچی جیسے شہر میں جینا ایک آرٹ ہے۔ اگلے چند دن میں اس نے قاسم اور ایاز کے راستے کی ساری رکاوٹیں دور کر دیں۔ جب اس نے بی اے کا امتحان دیا تھا تو رجسٹریشن فارم کے ساتھ شناختی کارڈ کی کاپی لگائی تھی۔ اس کا رہائشی پتا وہی پرانا تھا جو اب وہ قانونی طور پر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ استاد گلو نے ہر موقع پر کہا ”ابے قانون کے گھوڑے کیا ہوتا ہے قانون... کہاں ہے قانون... جیسا میں کہوں کرتا جا۔“ اور صرف ایک ہفتے میں استاد گلو نے اس کا سارا ماضی بدل دیا۔ اس کے پاس نامعلوم اسکولوں میں پڑھانے کا تجربہ رکھنے کے سرٹیفکیٹ آگئے۔ ایک لاہور کا تھا۔ دوسرا پنڈی کا۔ دو کراچی کے اسکول تھے۔ سب میں تعلیم دینے کا زمانہ وہی تھا جو عمر قید کا زمانہ تھا۔ ہر سرٹیفکیٹ مستند تھا۔ ایاز نے متاثر ہو کے ایک دن کہا: ”استاد! میں بھی تو

قاسم نے کچھ دن اردو ہی پڑھائی تھی پھر انگلش بھی دے دے مگنی۔ اس کی تنخواہ تین ماہ بعد کسی درخواست کے بغیر ہی دس ہزار کروڑی گئی تھی۔ جب اس نے استاد گلو کی ہدایت پر اپنا حلیہ تبدیل کیا تو جیسے بہت کچھ بدل گیا۔ یہ بدلے ہوئے ماحول کی ضرورت تھی۔ خود اس کے اندر وہ امنگ پیدا ہو گئی تھی جو شہاب کے تقاضوں کو ابھارتی تھی۔ اس نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا کہ اس کا ظاہری حلیہ باقی اسٹاف کے مقابلے میں کتنا دقیقاً لوسی اور مختلف ہے۔ اس سے پہلے اسکول کے سین مالک نے جس نے ماحولی کے حوالے پر انہیں بے عزت کر کے نکالا تھا، ایک بات ضرور صحیح کہی تھی کہ عزت آدمی کی کوئی فلیکشن سے زیادہ اس کے لباس کی ہے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک پہچان ان کا ماحول تھا جسے اپرٹل کلاس اپنائی تھی اور معاشی طور پر نہ سبکی ظاہری طور پر ماڈرن پچر کی پروردہ نظر آنے سے معزز ہو جاتی تھی۔

قاسم نے بھی اپنا روپ بدلا۔ ابتدا میں اس نے لنڈے بازار پر انحصار کیا پھر لالو کھیت اور زینب مارکیٹ تک پہنچ گیا۔ اس نے بیش قیمت نظر آنے والی برانڈڈ جینز اور ٹی شرٹس اور پینٹس کے ساتھ ۔۔۔ ٹائی بھی لگانی شروع کی تو اس کی شخصیت نکھر کے سامنے آئی۔ اسکول انتظامیہ کے متاثر ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے تعلیم سے ہٹا کے ایڈمنسٹریٹر لگا دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ گفتگو شائستہ لہجے میں اور قائل کرنے والے انداز میں بات کرتا تھا۔ اب اس نے ضرورت سمجھتے ہوئے اردو سے زیادہ انگریزی میں بات کرنے کی عادت بنائی تھی۔ بطور ایڈمنسٹریٹر اس کے فرائض میں ایک طرف طلباء کے والدین سے رابطہ رکھنا تھا اور دوسری طرف اسٹاف سے۔ وہ براہ راست پرنسپل کو جواب دہ تھا جو مالک بھی تھا۔

اس کا رویہ اسٹاف کے ساتھ دوستانہ ہونا ضروری تھا۔ اسٹاف روم میں تین چوتھائی سے زیادہ خواتین تھیں جن میں سے نصف غیر شادی شدہ تھیں۔ بے تکلفی کے ماحول نے اس کے تعلقات کو اس قربت میں بھی بدل دیا تھا جس کا ایک نام محبت ہو سکتا تھا تو دوسرا فیئر یانا جائز تعلق۔ بہت جلد قاسم کو احساس ہو گیا کہ کس کی نظر میں اس کے لیے پسندیدگی ہے۔ وہ محتاط نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ کوئی بات چھی نہیں رہ سکتی تھی اور اس کے فرائض کا تقاضا تھا کہ وہ الگ اور غیر جانبدار رہے۔ چند لمحوں اس ماحول کی پروردہ تھیں جہاں تکلف کو

ہوں قاسم کے ساتھ۔“
”کب تک؟“ استاد گلو تپتی سے بولا۔ ”جب تک حیرے نام کی گولی دل میں نہ اترے۔“

”استاد میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مارنا بھی نہیں چاہتا تھا کسی کو۔۔۔ مگر ماں نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ قربانی کا بکرا بنا دیا۔“

استاد گلو سوچتا رہا۔ ”اچھا۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”تیرا بھی کرتے ہیں کچھ، کیا پتا میرے مولا کو یہی ایک نیکی پسند آجائے۔ گناہ تو بہت کیے ہیں گلو نے۔۔۔ یہ بتا کچھ پڑھا ہے؟“

”ہاں، قاسم نے بڑی کوشش سے اتنا کر دیا تھا کہ امتحان دیتا تو ایف اے، بی اے کر لیتا۔“

استاد گلو نے صرف سر ہلایا مگر جب چند دن بعد قاسم کے ہاتھ میں بی اے کی ڈگری آگئی جو کراچی یونیورسٹی کی جاری کردہ تھی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

”اس پر تو میرا نام لکھا ہوا ہے۔“
”اب تو کیا میرا نام ہوگا؟ اب کب اس کی ناکہ یہ جعلی ہے تو ایسا ہاتھ ماروں گا۔“

دس بارہ دن ریلوے کے ویٹنگ روم میں گزار کے قاسم اور ایاز نے زندگی کا وہ سبق حاصل کیا جو کتابی نہیں تھا۔ دو ہفتے بعد قاسم نے بڑے اعتماد کے ساتھ ایک اچھے اسکول میں انٹرویو دیا۔ اس کے اعتماد نے جھوٹ کو بچ بنا دیا۔ اس کی شخصیت نے کامیابی کے نئے راستوں کا سفر شروع کیا۔ سات ہزار روپے ماہانہ پر وہ منچر بن گیا۔ پروموشن بیریڈ تین ماہ کا تھا۔ اس کے بعد تنخواہ دس ہزار ہو جاتی۔ ایاز نے ایک سپراسٹور میں کاؤنٹر منیجر لیا۔ انہوں نے گلشن میں تین بیڈ کا ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کیا اور اسے سہانے سنوارنے میں لگ گئے۔

ان کا داغ دار ماضی کسی لاوارث لاش کی طرح ایک بے نشان قبر میں دفن ہو گیا تھا، ہمیشہ کے لیے۔ پرانا وقت کسی اور کا تھا۔ اب اس کا ذکر وہ خود بھی نہیں کریں گے۔ جیسے وہ کسی اور کا وقت تھا اور انہیں ایک نئی زندگی کے راستے پر گامزن کرنے کا یہ کارنامہ کسی ماہر نفسیات، کسی سماجی کارکن، کیریئر پلاننگ کے ایکسپٹ، سیاست دان، صنعت کار یا بیوروکریٹ نے نہیں کیا تھا۔ یہ ہسٹری فیکٹر کی سند رکھنے والے استاد گلو نے کیا تھا جو کینٹ اسٹیشن پر ٹیلیوں کا ٹھیکے دار تھا۔

☆☆☆

بدلا ہوا زمانہ

پرنسپل نے کہا۔

”وہ، میں نے کچھ کھالیا۔ اب ٹھیک ہوں۔“ اس بات نے رازِ عشق افشا کر دیا۔ اسٹاف روم میں سب نے اتفاق رائے سے کہا کہ سرقاسم لٹچ پر لے گئے تھے مس روشی کو... ان کا فیئر چل رہا ہے۔ پرنسپل کے سامنے قاسم نے سختی سے اس کی تردید کی۔ مس روشی کے لٹچ کا اسکیڈل پرانا نہیں ہوا تھا کہ قاسم ایک اور چکر میں پڑ گیا۔ مس گل نے اسے اپنی برتھ ڈے پر بلایا اور یہ جھوٹ بول کر کہہ اس نے سب کو بلایا ہے۔ یہ سو لیفٹ جھوٹ نہیں تھا۔ دو چار لوگوں کو اس نے اگلے دن آنے کو کہہ دیا تھا۔

قاسم شام کو پورے اہتمام کے ساتھ گفٹ میں پھولوں کا گلدستہ لے کر گیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں کوئی اور حملہ مثلاً جیولری یا پرفیوم دیئے سے غلط فہمی پیدا ہوتی۔ اسے مس گل نے جو ایک پوش علاقے کی بہت بڑی گھٹی میں رہتی تھی، اپنے مگی پاپا سے ملوایا۔ یہ بتایا کہ ان کے پاس یو ایس اے کی سٹیزن شپ بھی ہے۔ اپنے فرینڈز اور کزن کے سامنے قاسم کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی لیکن قاسم کو سب سے زیادہ پریشانی باقی اسٹاف کو غیر موجود پا کے ہوئی۔

”مس گل! دوسرے لوگ کیوں نہیں آئے؟“
”گل مجسم گلزار بنی ہوئی تھی، اس نے ہنس کے کہا۔“
”مجھے کیا معلوم، بد اخلاق لوگ ہیں۔“
”وہ بد اخلاق ہیں یا تم نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔“
”کسی اور کو نہ بلا کر؟“

وہ قاسم کے اور قریب آ کے سرگوشی میں بولی۔ ”جب سمجھتے ہو تو پوچھتے کیوں ہو۔ میں نے ان سب کو گل آنے کا کہہ دیا تھا۔“ وہ ہنسی۔ ”تمہیں تو خوشی اور فخر محسوس کرنا چاہیے۔“

”اور وہ جو گل آ کے شرمندہ ہوں گے؟“
”ان کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ انجوائے... مگی پاپا نے بہت پسند کیا ہے تمہیں۔“

خطرے کی گھنٹی اب قاسم کے سر میں قائم الارم کی طرح بج رہی تھی۔ وہ ٹریپ ہو رہا تھا۔ ان دولت مند غیر ملکی شہریت رکھنے والوں نے اپنی بیٹی کے لیے ایک لاوارث گھر داماد خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے لیے ترغیب کا جال تھا۔ دولت مندی کی کشش، اپر کلاس کی ایک خوب صورت لڑکی کا شوہر کہلانے کا فخر۔ امریکی شہریت کا لالچ، کار، کوئی، کیش... آج کا نوجوان بھلا اور کیا چاہے گا۔

بزدلی یا شرمیلے پن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک دو نے از خود پیش قدمی کی اور اس سے بے تکلف ہونے کے بعد یہ توقع کرنے لگیں کہ وہ ان کو انوائٹ کرے۔ ڈنر پر نہ سہی کافی کے لیے۔ لٹچ کے اوقات میں وہ سب کے ساتھ شیئر کرتا تھا۔ اس جمود کو ایک لڑکی نے اسے انوائٹ کر کے توڑا۔

اس نے بڑی پریشانی کی ادا سے کہا۔ ”قاسم! آج میں لٹچ نہیں لائی۔“

”تو پریشانی کی کیا بات ہے۔ شیئر کر لو یا منگو الو۔“
قاسم نے کہا۔

”اچھا نہیں لگتا۔ ایک گھنٹے میں لٹچ باہر بھی کیا جاسکتا ہے۔“

”لیکن بریک تو چالیس منٹ کا ملتا ہے۔“

”اوہو، اگر بیس منٹ کی دیر ہو جائے کسی دن تو قیامت نہیں آ جاتی ہے۔“ اس نے بیگ میں سے کٹ نکال کے اپنا میک اپ ٹھیک کیا جو پہلے ہی ضرورت سے زیادہ تھا مگر یہ ایک سنگل تھا باہر جانے کی تیاری کا۔

”اوکے، جاؤ میری طرف سے اجازت ہے۔ پرنسپل سے تم خود منٹ لیتا۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”ایڈیٹ، میں اکیلی جاؤں گی؟“
قاسم اس خطاب پر سٹپٹا کے رہ گیا۔ مرونا اس نے کہا۔ ”کس کے ساتھ جاؤ گی؟“

”تمہارے ساتھ اور کس کے ساتھ۔ تم واقعی اتنے ڈفر ہو، سوشل اینٹی کیش ہیں کہ تم خود مجھے آفر کرتے۔ چلو اٹھو، میں انوائٹ کر رہی ہوں تمہیں۔ پرنسپل سے بھی منٹ لوں گی میں۔“

نہ جاننے کے باوجود وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھنے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ ”قاسم صاحب مجھے گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔“

قاسم نے مجبوراً جھوٹ بھایا۔ ”ہاں، میں نے کہا کہ تم ڈرائیو مت کرو۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔“

لیکن ایک گھنٹے بعد وہ لٹچ کر کے لوٹے تو بیماری کی نوعیت سب پر عیاں ہو گئی۔ بیمار اب پہلے سے زیادہ اچھے حال اور اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے بڑی شگفتگی سے پرنسپل کو مطلع کیا۔ ”سر! قاسم مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ اس نے کہا کہ شوکر لیول ڈراپ کر گیا ہوگا۔ دراصل آج صبح ناشتا نہیں کیا تھا میں نے۔“

”پھر بھی واپس آنے کی کیا ضرورت تھی آپ کو؟“

قاسم حیران ہوا۔ ”میں! میں کچھ سمجھا نہیں۔“ وہ بولا مگر اچانک آنے والا ایک خیال قاسم کے دل میں یوں جاگ اٹھا جیسے مردہ سانپ پھر پھن اٹھا کے کھڑا ہو جائے۔ کہیں کسی بدخواہ نے اس کے ماضی کے مردے کو تو قبر سے نہیں نکال لیا ہے۔

”تم نے مس گل کو برطرف کر لیا تھا۔“
”برطرف آپ نے کیا تھا۔ میں نے اپنی ایک ذاتی شکایت کی تھی۔“

”اب اس کی طرف سے جوابی کارروائی ہوئی ہے، تم جانتے ہو اس کا باپ کون ہے؟“
”نام سے واقف نہیں، لیکن ہے کوئی دولت مند امریکی شہری۔“ قاسم نے کہا۔

”اس کا۔۔۔ سر اقتدار جماعت سے پرانا تعلق ہے۔ وہ سینئر ہے اور ایک کمیٹی کا رکن۔ اس کا داماد عدالت عالیہ میں جج ہے اور پیٹا وزارت داخلہ۔۔۔“
”دیکھیے، مجھے اس کے اسٹینس سے کیا۔“

پرنسپل نے میز پر ہنکا مارا۔ ”ایڈیٹ، تم نہیں۔۔۔ میں نے سوچے کچھ بغیر تمہارے کہنے پر ایک قدم اٹھا لیا۔ یہ اسکول میرا بزنس ہے۔ مجھے دھمکی ملی ہے کہ میں نے آج ہی تمہیں برطرف نہ کیا تو میرے اسکول کے بارے میں اس علاقے میں دال چاکنگ کر دی جائے گی۔ راتوں رات یہ لکھ دیا جائے گا کہ میں اسکول نہیں بدکاری کا اڈا چلا رہا ہوں۔ اخبارات میں خبروں اور کالموں میں اس دال چاکنگ کے حوالے سے تبصرے ہوں گے۔ پھر کون بھیجے گا اپنے بچوں کو یہاں۔۔۔ کون کچھ یہاں پڑھائے گی؟“

قاسم نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”ادمانی گاؤ۔“
پرنسپل نے ایک گہری سانس لی۔ ”آئی ایم سوری۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میرے لیے بہت کارآمد رہے لیکن میں مجبور ہوں۔ میں اپنا بزنس گڈول اور زندگی کچھ واؤ پر نہیں لگا سکتا۔ کیشیر تمہارا حساب کروے گا۔ تین ماہ کی تنخواہ میں اپنی طرف سے دے رہا ہوں۔ تمہاری بہترین سروسز پر۔ مجھے امید ہے اس عرصے میں تمہیں کوئی جاب مل جائے گی۔“
قاسم نے سر ہلایا۔ ”تھینک یو سر، میں نے آپ کی مجبوری سمجھ لی۔“

قاسم اسکول سے سیدھا ایاز کے پاس گیا۔ وہ اپنے کیش اینڈ کیری اسٹور کے کاؤنٹر بیٹھا تھا۔ ابھی صبح کا وقت تھا اس لیے دوسرے کاؤنٹرز پر بھی کیشیر فارغ بیٹھے تھے۔
”قاسم، تو اس وقت یہاں۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟“

فائدہ یہ کہ امریکا میں یہ زر خرید شوہر مشرق کا سرتاج اور مجازی خدا نہیں بن سکے گا۔ ان کی آزاد خیالی جیٹی کو اپنی کینز بنا کے نہیں رکھ سکے گا اور کوشش کرے گا تو مارا جائے گا۔ وہاں کا قانون مختلف ہے اور اس پر عمل بھی ہوتا ہے۔

قاسم نے ایاز کے مشورے سے بروقت قدم اٹھایا۔ اس نے صبح پر پہل کو سب بتا دیا۔ گواہی میں اسٹاف کے وہ لوگ پیش ہو گئے جن کو آج خفت اٹھا کے اور جھوٹا بنا کے واپس ہونا تھا۔ مس گل بھی کہتی کہ یہ لوگ خود بھول گئے کہ آج جانا ہے۔ میں کسی کو بلاؤں گی تو اگلے دن کیوں بلاؤں گی۔

پرنسپل نے مس گل کو آفس میں بلا کے برطرفی کا حکم نامہ پکڑا دیا۔ وجہ بتانا ضروری نہیں اور ضروری ہو تو یہ کہ وہ اچھی ٹیچر نہیں ہے۔ یہ خبر اسٹاف روم میں ایک دھماکا بن گئی۔ سر قاسم نے مس گل کی چھٹی کرا دی۔ مس گل کی کردار کشی میں مس روشی پیش رہی جس نے خود ساختہ ”چشم دید“ واقعات سے مس گل کو بدکردار ثابت کیا۔ آئی تھی اس کی حریف بنے۔ ایک طرح سے مس روشی نے یہ سمجھ لیا کہ سر قاسم نے اسے مستز نہیں کیا۔ گویا قبول کیا۔ اللہ وہ دن لائے کہ یہی دو بھول قاضی کے سامنے بولے جائیں۔

قاسم نے سکون کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ مس گل کا فون آگیا۔ قاسم کے لیے یہ غیر متوقع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یون کے قانون کے مطابق ہر ایکشن کاری ایکشن مساوی ہوتا ہے۔ مس گل نے اسے امریکی جاہلوں کی اور غنڈے بد معاشوں کی مستند گالیاں انہی کے لب و لہجے میں دیں اور قاسم نے خاموشی سے سنیں یہاں تک کہ مس گل کو خشک ہوا کہ اس نے فون بند کر دیا ہے۔ ”تم سن رہے ہو نا؟“

”جی مگر مطمئن رہیے، ریکارڈ نہیں کر رہا ہوں۔“
”کر لو ریکارڈ۔“ مس گل نے مزید گل فٹانی کی اور اسے دھمکی دی کہ اب وہ اپنی برطرفی یعنی سمجھے۔ صرف برطرفی ہی نہیں اسے وہ سبق سکھایا جائے گا کہ۔۔۔ قاسم نے خاموشی سے فون بند کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ مس گل کی دھمکی ایک وقتی غصہ ہوگی مگر ایسا نہیں تھا۔ اگلے دن پرنسپل اڈا اسکول کے مالک نے اسے طلب کیا۔

وہ کچھ پریشان تھا۔ ”قاسم صاحب! ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔“

”میں اس میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں تو کیے۔“
”تم؟ تم ہی نے تو مسئلہ کھڑا کیا تھا اور اب خود مسئلہ بن گئے ہو۔“ وہ خاموشی سے بولا۔

بدلا ہوا سامانہ

ہاتھ جوڑ کے دوزانو بیٹھ کر کہوں کہ مجھے معاف کرو۔ اس کے باپ کے قدموں میں گتے کی طرح لوٹنے لگوں تاکہ وہ مجھے داماد بنا کے امریکا ساتھ لے جائے۔ وہاں میں غیرت اور خودداری کو دفن کر کے صرف اس دولت پر قناعت کر لوں جو مجھے گل کے طفیل حاصل ہو... اپنے آپ سے سمجھوتا کر لوں کہ یہ سب لائف اسٹائل ہے۔ میری بیوی جو چاہے کرے مجھے کیا۔ میں بھی سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوں۔ وہ عیش کر رہی ہے تو میں اس سے زیادہ عیش کروں۔ نہیں ایاز، سب ایسا نہیں کر سکتے اور ان میں ایک میں ہوں۔“

ایاز نے ایک آہ بھری۔ ”اچھا بیٹے جو تیری مرضی، اب کیا کرے گا تو؟“

”میں نے سوچا ہے کہ نوکری تو چھوڑنی پڑی ہے۔ ہمیں گھر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔“

ایاز نے حیران ہو کر کہا۔ ”وہ کیوں؟“

”مجھے اندیشہ ہے کہ میرے خلاف کوئی اور کارروائی شروع نہ کرادی جائے۔ مجھے کسی مقدمے میں نہ الجھا دیا جائے اور پولیس کو جانتا ہے تو... وہ حکم کی غلام ہے۔ گتے کی طرح دم ہلاتی جاتی ہے طاقتور کے پیچھے، یہ نہ ہو مستقبل تباہ کرنے والوں کے سامنے ہمارا ماضی بھی آجائے۔“

”ہم استاد گلو سے بات کریں؟“

قاسم کئی سے ہنسا۔ ”وہ گالیاں دے گا کہ اُلو کے پٹھے یہی سیکھا ہے تو نے؟ سو بیاز اور پھر سو جوتے۔ اب کے کیا تو لبا جائے گا اندر... جھلی ڈگری اور جھلی کاغذات کا کیس تو کچھ بھی نہیں۔ انداد دہشت گردی کے کیس میں پھنس جائے گا۔ یہاں تو روز لاشیں ملتی ہیں۔ کسی کے ساتھ بھی لگا دیں گے تیرا نام۔ پہلے بچ گیا تھا اب کے ہوگی پھانسی... وہ تو سب بھول کے جا چکی ہوگی امریکا جس نے سب کرایا۔ وہاں کسی ڈسکو میں ناچتی رہے گی اور کسی نام اینڈ جیری جیسے بوائے فرینڈ کی بانہوں میں اسے قاسم کا نام تک بھول چکا ہوگا۔“

اس رات انہوں نے اپنا اسباب اس فلیٹ سے اٹھالیا جہاں وہ کئی ماہ سے بڑے سکون اور عافیت کے ساتھ رہے اور ان کا خیال تھا کہ اس میں آرام و آسائش کے سب اسباب ہوں گے تو کہیں اور جانے کی فی الحال ضرورت نہ ہو گی۔ ان کو ایک ماہ کے نوٹس کی وجہ سے کرایہ بھی دینا پڑا لیکن مالک مکان کی شرافت کی وجہ سے باقی رقم واپس مل گئی۔ وہ میلوں دور کنٹین میں فلیٹوں کے اس جنگل میں گم ہو

قاسم مسکرایا۔ ”کوئی کاؤنٹر خالی ہے تو مجھے بٹھا دے۔ میری اسکول سے چھٹی ہوگئی ہے۔“

”کیا مطلب؟ تیرے مقدر کا ستارہ تو عروج پر تھا۔ برس روشنی کے ساتھ بچ اور مس گل کی سالگرہ میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت۔“

”وہ ستارہ ڈوب گیا ایاز اور اس کے ساتھ ہی میری چھٹی ہوگئی اسکول سے۔“

اب اُکاؤ کا گاہک آنے لگے تھے مگر وہ دوسرے کاؤنٹرز پر چلے گئے۔ کوئلڈ ڈرنک پیتے ہوئے اس نے بتایا کہ حق گوئی و بے باکی اسے کتنی مہنگی پڑی ہے۔ دنیا بہت بدل گئی ہے ایاز۔

”یہ تو استاد گلو نے بہت اچھی طرح سمجھایا تھا۔“

”مگر اتنی جلدی سمجھ میں کہاں آتی ہے ایاز۔ جب تک عملی تجربہ نہ ہو۔ گلو نے تو رحم کھا کے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ میرے منہ پر گل ہوئی کا لک چھپا دی تھی۔ لیکن وہ جا کیسے سکتی ہے۔ یہی خوف بیٹھا ہوا ہے میرے دل میں کسی دن پھر ہمارا اصلی چہرہ نظر آنے لگے گا۔“

”خواتین کی ٹکڑوں میں کیوں پڑتا ہے۔“

”یہ بات نہیں ایاز، اس لڑکی کی انا کو نہیں پہنچی ہے۔ وہ بھی میرے جیسے معمولی دو ٹکے کے ماسٹر کے ہاتھوں... وہ زخم خوردہ ناگن بنی ہوئی ہے۔ صرف مجھے برطرف کرا کے وہ مطمئن نہیں ہوگی۔“

”اس سے زیادہ کیا کرے گی وہ؟“ ایاز نے اسے گالی دی۔

”ہم بے سہارا، بے تعلق لوگ ہیں اور ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے جرم کو اختیار نہیں کیا۔ پیشہ یا عزت یا دولت کمانے کا راستہ نہیں سمجھا، ہم جیسے بڑے لکھے صرف کتابوں میں لکھے علم کو سمجھتے ہیں۔ اس دنیا کو سمجھنے والے حاکم ہیں اور عزت دار ہیں۔ اس دنیا کو یہ لوگ چلا رہے ہیں ایاز... جس میں زندہ رہتا بھی ان کی شرائط پر ہوتا ہے۔ اگر میں چاہتا تو خوش نصیبی کی جولاٹری میرے نام مس گل کی صورت میں نکل آئی تھی، اسے کیش کرا لیتا۔ حرام ایانا جائز اور غلط یا غیر اخلاقی قرار دے کر اپنے پاؤں پر کھپاڑی نہ مارتا۔ میں ڈرامی معاملہ ہم اور دور اندیش ہوتا تو گل کے ابا کی غلامی قبول کر لیتا۔ سب کچھ مل جاتا مجھے جس کی دنیا میں خواہش کی جاسکتی ہے۔“

”واقعی، مگر یار اب بھی زیادہ غرابی نہیں ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب ہے تیرا۔ میں جا کے گل کے سامنے

دوسرے مرد کی طرف جھٹک رہی تھی اور ابھی تک اسے اپنی منزل نہیں ملی تھی۔ گل اس کے برعکس شوہر خریدنا چاہتی تھی جو اس کے معیار پر پورا اترے۔ ایسا بینڈم جوان جسے وہ فخر سے سب کے سامنے پیش کرے۔ ایسا کھم کا غلام جو کبھی سر نہ اٹھائے۔

اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔ اس نے کھلی آنکھوں سے جہوم کے درمیان مگر سب سے الگ ایک آشنا صورت دیکھی اور درمیان میں حائل وقت کی دیوار کے باوجود اسے یوں نظر آگئی جیسے دیوار شیشے کی تھی۔ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ مسلسل بھاگ دوڑ اور چھپ پکار میں مصروف جہوم سے نکل کر وہ صورت قدم قدم آگے آرہی تھی اور اس کے درمیان فاصلے کو جیسے کوئی زوم کیمرہ کم کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر آ کے ٹھہر گئی۔ وہ بلندی سے اسے بالکل صاف دیکھ سکتا تھا اور اس کی آنکھوں میں شناسائی دیکھ کے وہ حیران تھا اور مسرور بھی... پھر وہ چھلانگ لگا کے ریت پر اترا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”تم شاہینہ ہونا؟“ اس نے تیز ہوا میں اڑتے ہوئے کپڑوں اور بالوں کو سنبھالنے والی لڑکی سے کہا۔

”جہیں نام یاد ہے میرا؟“ وہ حیران ہوئی مگر اس حیرانی میں ایک خوشی تھی۔ ”مجھے تو نہیں یاد۔“

”پھر کیسے پہچان لیا تم نے مجھے؟“ وہ ہنسی۔ ”آدھی صورت سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ تم ہمارے گھر آئے تھے۔ میرا مطلب ہے اس گھر میں جہاں پہلے تم رہتے تھے مگر تم تو بالکل بدل گئے ہو۔“

”وقت کے ساتھ سب بدل جاتے ہیں۔ گھر... گھر کے کین... لوگوں کے رویے۔“

”تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا میرے گھر والوں نے... مجھے افسوس ہے۔“

”میں بھولا نہیں تھا کہ وہاں صرف تم نے میری حمایت کی تھی۔ میرا نام قاسم ہے۔“

”اچانک اتنے عرصے بعد دکھائی دیے تم تو میں نے سوچا کہ معذرت کر لوں۔ میں یہاں اپنے اسٹاف کے ساتھ آئی تھی۔ کہاں ہو آج کل... کیا کر رہے ہو؟“

”قاسم کو اس لڑکی شاہینہ کی سادگی اور بے تکلفی جیسی ادا پر حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی۔“ میں پڑھا رہا ہوں بلکہ پڑھا رہا تھا۔ ایک اسکول میں... آج کل فارغ ہوں۔ ایک فلیٹ میں رہتا ہوں اور بیکار ہوں۔“

گئے جہاں دس بارہ منزلہ عمارات ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ دو اور تین بیڈ کے سیتے کھلانے والے فلیٹوں میں بھانت بھانت کے لوگ آباد تھے جو سارے ملک سے یہاں روزگار کے چکر میں آئے ہوئے تھے۔ ہر قوم کے ہر زبان بولنے والے ایک دوسرے کے تمام معاملات سے لائق تھے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ پڑوس یا سامنے کے فلیٹ میں رہنے والا کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ ان میں کچھ شادی شدہ تھے تو کچھ بیوی بنا کے کسی کو بھی ساتھ رکھ لیتے تھے آتی جاتی عورتوں کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں۔

ان فلیٹوں کی تعمیر ناقص تھی اور ان میں ضروریات زندگی کا بھی فقدان تھا۔ آئے دن بجلی نہ ہونے کے باعث لفٹ کام چھوڑ دیتی تھی یا خراب ہو جاتی تھی۔ بوڑھے، بچے، جوان سب ہانپتے ہوئے زینے طے کرتے تھے اور شمار کرتے جاتے تھے۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں تھرو فلور پر فلیٹ ملا۔ ایاز کو یہ جگہ بہت دور پڑتی تھی مگر دوست کا ساتھ نبھانا زیادہ اہم تھا۔ وہ بوسوں میں دھکے کھاتا ہوا جاتا تھا اور رات کو دیر سے لوٹتا تھا۔ اس نے قسطوں پر کوئی پرانی موٹر سائیکل لینے کا پروگرام بنالیا تھا۔ کیش اینڈ کیری اسٹور والوں نے سالانہ بونس دیا تو سال پورا نہ ہونے کے باوجود ایاز کو بھی نواز دیا کیونکہ اس کی کارکردگی اطمینان بخش تھی۔ اس سے موٹر سائیکل کا مسئلہ حل ہو گیا۔ قاسم فوری طور پر کہیں قسمت آزمانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے تین ماہ کی ایڈوائس تنخواہ کو غنیمت جانا اور بالکل رزپوش ہو گیا۔ سلامتی سب پر مقدم تھی۔ اسے بالواسطہ طور پر معلوم ہوا کہ پولیس اسے تلاش کرتی اسکول گئی تھی اور فلیٹ پر بھی پہنچی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر الزام کیا تھا۔ اس کے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔

ایک ماہ بعد موسم اچانک بدل گیا۔ فلیٹوں کے اندر ساحل کے نزدیک ہونے کے باوجود جس کی کیفیت تھی۔ قاسم پیدل چلتا ساحل پر پہنچ گیا اور کنارے پر بنی میلوں کی حفاظتی دیوار پر بیٹھ کے تفریح کرنے والوں کو دیکھتا رہا۔ سمندر کی لہریں ابھی دور تھیں۔ لوگ سیکل ریت پر ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ کپڑوں سمیت پانی میں اترنے ہوئے تھے۔ ریت پر موٹر سائیکلیں دوڑا رہے تھے اور خوش تھے۔ جوڑوں کا پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ نوبیا ہوتا ہے یا ابھی محبت کے تجربے سے گزر رہے ہیں۔ قاسم نے گل اور پھر روشی کو یاد کیا۔ روشی مجبور تھی۔ وہ سہارے کی تلاش میں ایک مرد سے

بدلا ہوا زمانہ

پونے نو بجے اس سچے پر موجود تھا جو شاہینہ کے دیے ہوئے کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وقت نو بجے ہو تو محلے کے لوگ پانچ دس منٹ بعد ہی آتے ہیں مگر شاہینہ اپنے کیمین میں موجود تھی۔ یہ نیچے سے آدھا لکڑی کا تھا اور اوپر چارنٹ اندھا شیشہ تھا جس پر دوسری طرف کی صرف پر چھائیں سی نظر آتی تھی۔ شاہینہ مین گیٹ کے ساتھ ہی دائیں طرف کے دروازے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مین گیٹ پر پینل کے چمکتے حروف میں ٹینک ڈائریکٹر کا نام لکھا ہوا تھا۔ سائڈ کی دیوار پر کیمینی کا نام تھا۔ باس کے کمرے کا راستہ شاہینہ کے کیمین سے گزرتا تھا۔ کوئی بھی سیدھا اس کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ ہر آنے والے کا نام اور ملاقات کی غرض و غایت سے مالک کو آگاہ کرتی اور اجازت ملنے پر دوسرے گیٹ کو ان لاک کر دیتی تھی جو اس کے کیمین سے براہ راست باس کے کمرے میں پہنچاتا تھا۔ یہ ایک طرفہ لاک تھا یعنی باس اسے اندر سے جب چاہے کھول سکتا تھا۔

شاہینہ ایک خوب صورت میز کے پیچھے گزشتہ شام سے زیادہ خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس منگنا نہیں لیکن جدید فیشن کے مطابق تھا اور اس نے صبح کی تازگی میں ہلکے سے میک اپ کے ساتھ احساس حسن کو دو چند کر دیا تھا۔ اس نے اپنی بے حد دلکش پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہوئے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ”ویری گڈ، تم وقت کے پابند لگتے ہو۔“

”آج تو آپ کو اسپرٹس کرنا ضروری تھا۔“ وہ بولا اور شاہینہ کے نازک ہاتھ کا اشارہ دیکھ کر دائیں طرف کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آکے انتظار کرنے والوں کے لیے ایک صوفہ سیٹ اور سینئر ٹیبل تھے۔ شاہینہ کی فائلیں ریک میں ترتیب سے کھڑی تھیں۔

”میں جاب کرنے والی لڑکیوں کو پسند کرتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”اس لیے نہیں کہ وہ کماتی ہیں، ان کی ہمت کی وجہ سے یہاں تم جیسی کسی لڑکی کا مردوں کے ساتھ رہنا آسان نہیں ہو سکتا۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں اور ہر جگہ ایسا ہی ہے۔ یہاں میرے ساتھ بھی ہوتا اگر باس مجھے اپنی بیٹی نہ سمجھتا۔ بے شک باس وہ ہے مگر رعب میرا بھی کم نہیں۔“ وہ ہنسی۔ ”اچھا بتاؤ کیا ہو گے، چائے یا کافی؟“

”کافی میں نے بھی پی تھیں۔“

”آج میرے کہنے سے پی کے دیکھو، سب کہتے ہیں میں اچھی بناتی ہوں۔“ وہ انہی اور ایک الیکٹرانک کیل کا

”کیوں، اسکول کیوں چھوڑ دیا؟“

”مجھے نکال دیا گیا تھا۔“

”دیکھو ابھی وقت نہیں ہے۔ وقت نکال کے مجھ سے

ملو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے تو کوری کا۔“

”تم بھی تو کوری کرتی ہو کہیں؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”دراصل، تمہارے

بارے میں کچھ تم سے سنا تھا۔ بعد میں لوگوں سے سنا۔ یہ

کہانی مجھے بڑی عجیب لگی۔ کیا تم نے واقعی جیل میں رہ کے

ایم اے کیا تھا؟ اور قتل کے جرم میں عمر قید کاٹی تھی؟“

”بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔“ اس نے

پروین شاکر کی زبان میں کہہ دیا۔

”یہ لومیرا کارڈ، میں باس کی سیکریٹری ہوں۔ وہ

ذرا دیر سے آتا ہے اگر کسی دن وقت نکال کے تم صبح نو

بجے آ جاؤ۔“ اس نے بیگ میں سے کارڈ نکال کے آگے

بڑھا دیا۔

وہ انکار کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی داستان حیات کی تشہیر

نہیں چاہتا۔ اس نے تو بڑی مشکل سے ساری غلاظت کو

سمیٹ کے کارپٹ کے نیچے چھپا دیا تھا، اتنے خوشنما رنگ

اور ڈیزائن والے کارپٹ کو ہٹا کے اس گندگی کو کھٹکانا

عقلندی نہیں خطرناک ہے۔ لیکن اس نے کارڈ لے لیا کیونکہ

وہ اس لڑکی سے ملنا چاہتا تھا۔ خواہ اس کی وساطت سے

تو کوری ملے نہ ملے۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ ماضی کے مزاروں کو

کھود کے اپنے زخم کمریدنا نہیں چاہتا۔

وہ پلٹ کے آہستہ آہستہ ادھر چلی گئی جہاں آٹھ دس

افراد کا ایک گروپ ریت پر دریاں بچھا کے اپنا اسباب پھیلا

رہا تھا۔ وہ سب شاہینہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے

ضرور پوچھا ہو گا کہ یہ کون مل گیا یہاں؟ ہمیں چھوڑ کے اس

سے بات کرنے چلی گئیں اور اس نے کوئی ٹالنے والا جواب

وے کر انہیں مطمئن بھی کر دیا ہو گا کیونکہ اب وہ کھانے پینے

میں مگن ہو گئے تھے۔ اس گروپ میں چار خواتین اور آٹھ

مرد تھے۔ ایک نسبتاً عمر رسیدہ شخص اپنے روپے سے اور

دوسروں کے روپے سے بھی ہاس نظر آتا تھا۔ خواتین مردوں

کو چائے، کافی اور کھانے پینے کی چیزیں دے رہی تھیں۔

وہ سب خوش تھے۔ خوش بخت لوگ جو محفوظ تھے جو خاندان

اور خلوص و محبت کے سارے رشتے رکھتے تھے۔ جن سے وہ

محروم تھا۔

رات کو اس نے کئی بار اپنا کو اپنی اور شاہینہ کی

ملاقات کے بارے میں بتانے کا سوچا اور نہ بتا سکا۔ صبح وہ

کانی ہوگی مگر میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں لکھی گئی عمر کو پہنچ گیا
گیا تو میڈیکل رپورٹ نے مجھے بالغ ثابت کر دیا۔ سزائے
موت سے میں بچ گیا۔ جج سمجھتا تھا کہ اصل کیس کیا ہے گواہ
ثبوت سے کچھ بھی ثابت کیا جائے۔ وہ اب کہاں ہیں؟

شاہینہ چوکی۔ "کون؟" وہ کچھ دیر خاموش رہی جیسے
کچھ بتانے سے گریز ال ہے۔ "مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"کیا سنا ہے تم نے... کیا کسی نے ان کی بات کی؟"
"جھوٹ بچ خدا جانے، شاید تمہاری ماں نے خودکشی
کر لی تھی اور باپ تمہاری بہن کو لے کے چلا گیا تھا، یہ
مکان بچ کے جو اس کے کردار سے واقف ہیں وہ کہتے ہیں
کہ بیٹی کو بھی اس نے پیسے لے کر کسی سے بیاہ دیا ہوگا۔ خیر تم
اپنی بات کہو۔"

"اب کیا ہے بتانے کو؟"

"جیل کی ساری زندگی کیسے گزری۔ تم پیشہ ور مجرم
کیوں نہیں بنے، ایم اے کیسے کر لیا؟"

"دیکھو، میری بات کا برا مت ماننا۔ میں نے اپنے
ماضی کو بھلا دیا ہے۔ دُشمن کر دیا ہے، ہمیشہ کے لیے۔ میں اب
وہ نہیں ہوں کہ جو تھا بس میں خوش قسمت تھا کہ آج تمہارے
سامنے بیٹھا ہوں۔ جب میں نے ایم اے کیا اور اس سے
پہلے بی اے کیا تب بھی... کسی صحافی نے انٹرویو لیا تھا
میرا... چھپا بھی تھا اور میں نے بھی دیکھا تھا۔ شاید وہ اخبار
چل جائے نہیں..."

وہ سیریس بیٹھی خلا میں دیکھتی اور ناخن کاٹتی رہی۔
"میں تمہاری کہانی لکھنا چاہتی تھی۔"

"تم کہانیاں لکھتی ہو؟"

"تم ایک سلسلے دار کہانی کے ہیرو ہو سکتے ہو۔
حالات تمہارے ہوں گے۔ نام بدل جائیں گے۔ اس میں
بڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے اور بھی بہت کچھ ڈالوں گی۔
مجھے یقین ہے کہ وہ قسط دار کہانی ہٹ ہوگی۔ کئی سال چلے گی۔
ہر ماہ ایک قسط لکھنے کے مجھے دس ہزار ملیں گے۔ آدھے تنہیں
دے سکتی ہوں۔"

"اس فراخ دلی کی وجہ؟"

"ایک ضرورت مند ہوں، دوسرے میں... مجھے جیل
کے اندر کے روز و شب کا کچھ پتا نہیں۔ میں تمہیں یہاں بھی
ایڈ جسٹ کر ادیتی اگر تم نے ایم بی اے کیا ہوتا۔ کمپیوٹر کتنا
آتا ہے؟"

"صرف دیکھا ہے۔ مجھے تمہارے سامنے ہے۔"

وہ کچھ مایوس نظر آنے لگی۔ "یہ کوئی مشکل نہیں۔ میرا

سوچ آج کر دیا۔
چھ منٹ بعد اس نے ایک گھاس کے سامنے رکھا
اور دوسرا اپنے سامنے۔ "اپنے ہاتھ میں ہے نا تو بہت پینے
لگی ہوں میں۔"
"تم کیا کرتی ہو یہاں؟"

"جو، ہر سیکریٹری کرتی ہے۔ جو ہاس چاہے۔ میں
صرف گریجویٹ ہوں لیکن یہ سب آپریٹ کر دیتی ہوں۔"
اس نے اپنی میز پر رکھے ڈیجیٹل فون ایکس چینج، لپ
ٹاپ، کمپیوٹر اور انٹرکام سسٹم کی طرف دیکھا۔ "اگر میں
پڑھاتی تو اس سے آدمی تنخواہ بھی نہ لیتی۔"

"تم میرے ماضی کو کیوں کر یادنا چاہتی ہو، ذرا نہیں
لگتا تمہیں مجھ سے؟"

"میں ضرور ڈرتی، اتنی بڑول ہوں کہ کا کروچ دیکھ
کے چم مارتی ہوں۔ کوئی سزایافتہ قاتل میں نے پہلے دیکھا
نہیں۔ بس خیال ہے کہ وہ بہت خوفناک ہوتے ہوں گے۔
تم تو بڑے بے ضرر سے لگتے ہو۔ بلکہ معاف کرنا بے
وقوف۔"

"میں بے وقوف ہوں۔"

"نہیں، تم ایک اچھے اسکول میں پڑھا رہے تھے،
تمہیں کس خطا پر نکالا گیا؟"

"ایک دولت مند اثر سوخ رکھنے والے باپ کی
خوب صورت بیٹی سے عشق نہ کرنے پر۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"ہاں یہی بات ہے مگر شاید اگر میں چاہتا تو اس
سے شادی کر لیتا اور عیش کرتا۔ وہ امریکن نیشنل بھی تھی۔ بس
وقت گزری کے لیے میرے ساتھ پڑھا رہی تھی۔ جتنی تنخواہ
لیتی تھی اس سے زیادہ شاید گاڑی کے بیڑول پر خرچ کر
دیتی ہوگی۔"

وہ کچھ حیرانی سے دیکھتی رہی۔ "قتل بھی تم نے کیا نہیں
تھا مگر سزا پائی۔"

"شاید یہی میری قسمت ہے۔ نا کردہ جرائم کی سزا
کاف اور کچھ نہ سیکھنا۔" قاسم بولا۔

"تمہارے چلے جانے کے بعد۔" اس نے کچھ دیر
بعد کہا۔ "میں نے بہت باتیں سنیں اور کسی حد تک مجھے
اندازہ ہوا کہ قتل تمہارے باپ نے کیا تھا۔ ماں کو بیوہ
ہونے سے بچانے کے لیے تم نے الزام اپنے سر لیا۔"

"وہاں بھی دھوکا ہوا۔ مجھے کہا گیا تھا کہ نا بالغ ہونے
کی وجہ سے مجھے سزائے موت نہیں ہوگی۔ مجھے چند سال قید

بدلا ہوا زمانہ

کشش کے دائرے سے کیسے نکلتا۔ لیکن اس نے تمہیں ایک باس کی سیکرٹری سے زیادہ نہ جانا اور تمہاری پیشکش کے ساتھ تمہیں ٹھکرا کے چلا گیا۔ اب تم کب تک اسے یاد کرتی رہو گی۔

چنانچہ جب اگلے دن صبح آفس پہنچنے کے بعد پہلی ٹیلی فون کال کی تھنی بچی تو اس نے جذبات سے عاری روز کی طرح سپاٹ خوش اخلاقی سے شپ کی ہوئی آواز بنا کے پوچھا۔ ”ایکس والی زیڈ کار پوریشن؟“

دوسری طرف سے قاسم نے کہا۔ ”شاید، میں قاسم ہوں۔“

اس کے ذہن کو جھکا سا لگا مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ ”کیسے ہیں آپ؟ کیسے صبح صبح زحمت کی؟“

”شاید اب مجھے اپنے کل کے رویے پر ندامت ہے۔“

”تم سے ملنا چاہتا ہوں لیکن آفس میں نہیں۔“

”آفس میں نہیں؟ اگر آپ کا خیال بدل گیا ہے تو آپ فون پر بھی بتا سکتے ہیں۔“

”صرف خیال کیا، میں خود بدل گیا ہوں لیکن کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں خود تم سے براہ راست اور اکیلے میں کہیں بیٹھ کے کچھ کہہ سکوں؟“

”شاید کا دل دھڑکا۔ آخر ایسی کیا بات کہے گا وہ اکیلے میں؟ اور میں خود بدل گیا ہوں... اس کا مطلب کیا؟“

”مس شاید! آپ لائن پر ہیں؟“

”جی... جی دراصل میں سوچ رہی تھی کہ... اچھا فرض کریں میں باس سے چھٹی لے لوں دو تین گھنٹے کی۔“

”تھینک یو شاید، اگر تم ایسا کر سکو۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

”لیکن کب... کہاں ملنا چاہتے ہیں آپ؟“

”آج... ابھی... میں گلشن کے ایک فلیٹ میں رہتا ہوں ساحل کے قریب ہے۔“

”سوری، میں اتنی دور... اور ساحل دیران ہوگا۔“

”دعوت میں گری ہے۔“ وہ بے ربطی سے بولی۔

”اوکے، براہ مالو تو... جگہ تم بتا دو میں حاضر ہو جاتا ہوں۔“

”فرض کرو، کوئی پبلک پلس ہو مثلاً کوئی ریسٹورنٹ، مثلاً سالٹ اینڈ پیپر ویج...“ اسے بعد میں اپنی دہری حماقت کا احساس ہوا۔ وہ ریسٹورنٹ بھی تو ساحل سمندر پر ہی تھا اور بڑے بھونڈے پن سے اس نے کہہ دیا تھا کہ مجھے صبح پر انوائٹ کر لو۔ شاید کو اس خیال سے پینا آ گیا کہ

مشورہ ہے کہ سیکھ لو۔ کسی بھی انسٹی ٹیوٹ سے۔ زیادہ سے زیادہ تین ماہ لگیں گے۔ آج کل اس کے بغیر گزارہ نہیں۔ اچھی لو کر رہی نہیں ملتی۔ کسی اسکول میں تو آٹھ دس ہزار سے زیادہ نہیں ملیں گے۔“

”بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”تمہاری کافی کا شکریہ... لیکن میں تمہاری خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے جو میں بتاؤں گا نہیں لیکن میری کہانی شائع ہو گی تو... اس زندگی کے خواب کی تعبیر چمن جائے گی جو میں گزارنا چاہتا ہوں۔“

اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ قاسم کو خاموشی سے باہر جاتا دیکھتی رہی اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ اپنی زندگی پر مبنی کسی مقبول سلسلے دار کہانی سے حاصل ہونے والی شہرت اور مالی فائدے کو وہ بہت خوش ہو کے قبول کرے گا۔ اگر وہ راضی ہوتا تو وہ بتاتی کہ بعض اوقات یہی مطلوبہ کہانیاں کسی ہسٹ ٹی وی سیریل کے لیے بھی منتخب ہو جاتی ہیں بلکہ اب تو ایسا ہی ہو رہا تھا کہ شائع شدہ ناول اور کہانی کو کسی ڈرامے یا سیریل کی بنیاد بنایا جا رہا تھا۔ اس کا خیال یہ بھی تھا کہ جب اسے معلوم ہوگا کہ شاید راسٹر بھی ہے تو اس سے ملنے کی خوشی دگنی ہو جائے گی۔ ایسا کنی بار ہو چکا تھا۔ جب کسی سے تعارف میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہانیوں کی مقبول راسٹر ہے تو لوگ اسے ایسی حیرانی اور خوشی سے دیکھتے تھے جیسے وہ انسانوں سے برتر کوئی مخلوق ہے۔ قاسم نے اسے مایوس کیا تھا۔ باس کے آجانے کے بعد وہ سب بھول گئی۔

لیکن رات کو پھر اسے قاسم کا خیال آیا اور اس نے خود سے سوال کیا کہ آخر وہ کیوں اس کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اگر فائدے کی بات اس نے نہیں سنی تو اس کی مرضی... کیا وہ صرف ایک کہانی تھا اس کے لیے؟ اور اس کے دماغ نے بڑے منطقی انداز میں جواب دیا... سنو شانو عرف مس شاید مہتاب... سچ بات یہ ہے کہ اس نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے۔ تم نے اسے جب پہلی بار دیکھا تھا تو اس کی مردانہ وجاہت نے تمہیں متاثر کیا تھا اس کو تم نے ہمدردی کا نام دے دیا۔ دراصل کچھ غرور تمہیں حسن صورت پر تھا۔

اس مگر کو پہنچنے والی ہر لڑکی جیسا کہ تم جس پر مہربانی کی نظر ڈالو وہ تمہیں ٹھکرا کے کیسے جاسکتا ہے۔ اضافی غرور کا سبب تمہارے ایک مصنف ہونے کی شہرت پر تھا۔ آئے دن ایسی کہانیاں پڑھ کے تعریف کرنے والوں نے تمہیں خود اپنی نظر میں دوسری تمام لڑکیوں سے ممتاز کر دیا تھا۔ تمہاری بدو کی آخر اسے قریب لانے کا بہانہ تھی۔ اس کے بعد وہ تمہاری

جاسوسی ڈائجسٹ

41

2 ستمبر 2014ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ڈرنک پیئرز۔ اس نے وردی پوس سمند اور خوش احساں
دیٹر سے کہا اور سوچتا رہا کہ اگر اس نے کہا کہ وہ بہت اچھی
لگ رہی ہے جو غلط نہ تھا، تو کیا شاہینہ اسے روایتی پیش قدمی
کا پہلا قدم سمجھے گی۔

”اب فرمائیے۔ مفلسی میں آنا گھبرا کر کیا کیوں اتنا
ضروری تھا؟“ وہ بے تکلفی سے بولی۔
”کیا مطلب؟“

”آپ نے بتایا تھا کہ بے روزگار ہیں پھر اتنی مہنگی
جلد لیں۔“

”پلیئر، اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ میں بہت جلد
ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑا رکھ کے بیٹھ جاؤں گا اللہ کے نام
پر کوئی لٹچ کرادے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”خدا نہ کرے۔ بری بات منہ سے
کیوں نکالتے ہیں آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

اگلے ڈھائی گھنٹے میں قاسم نے شاہینہ کو وہ سب بتا دیا
جو سچ تھا لیکن بتانے کے لیے نہیں تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی
اور سنتی رہی۔ کولڈ ڈرنک اور پھر کھانے کے بعد تھوڑا سا وقفہ
دے کر انہوں نے کافی پی۔ پھر وہ چپ ہو گیا اور شاہینہ کو
دیکھتا رہا۔ وہ باہر سمندر کی خاموش پرسکون حرکت، سڑک پر
سے گزرتی بے آواز کاروں اور آتے جاتے لوگوں کے
چہرے دیکھتی رہی۔

”اب کیا خیال ہے۔ بنے گی اس پر ایک دھانسی قسط
دار آپ جیتی۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم نے کل ٹھیک کیا تھا کچھ
نہ بتا کے۔ آج فیصلہ کیوں بدلا؟“
قاسم اسے دیکھتا رہا۔ ”پتا نہیں۔ لیکن کل رات...“
”کیا ہوا کل رات؟“ شاہینہ نے دل کی دھڑکن میں
تبدیلی محسوس کی۔

”میں تمہارے بارے میں سوچتا رہا۔“ اس نے نظر
چرا کے باہر دیکھا۔ ”مجھے خیال آیا کہ تم کو سب بتا دینا
چاہیے۔ تم پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ تم سنو گی اور... حقیقت
جان کے میں تمہاری نظر سے گریں جاؤں گا۔ اس اعتماد کی
وجہ خود مجھے نہیں معلوم۔ آج یہ میری تم سے چوتھی ملاقات
ہے۔“

”چوتھی ملاقات؟“

”ہاں، پہلی بار تم کو میں نے اپنے... میرا مطلب
ہے تمہارے گھر کے دروازے پر دیکھا تھا۔ اور وہ نقش
میرے ذہن میں اسی طرح محفوظ ہے۔ تم نے کیا لباس پہن

وہ کیا سوچے گا۔ میں وہاں ملنے جانی رہتی ہوں۔“

”میرے لیے اعزاز اور میری خوش قسمتی ہوگی اگر
آپ آج بچ میرے ساتھ کریں۔ ٹھیک یوس شاہینہ۔“

اس کے کچھ کہنے سے پہلے فون بند ہو گیا۔ اگر وہ
چاہتی تو کال لاگ سے نمبر دیکھ کے خود بات کر سکتی تھی مگر وہ
ریسیور ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہونا
بھی نہیں چاہیے۔ وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا۔ اور
شاید یہی تو وہ خود بھی چاہتی تھی۔ کسی فون کال نے اس کا
دھیان قاسم کی طرف سے ہٹا دیا۔ اس کے آنے تک وہ
معروف ہو گئی۔ گھڑی دیکھ کے اس نے اپنی بات کی۔
”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے سر، مجھے چھٹی چاہیے۔ میں
گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”کیا ہوا ہے؟ اور بیٹا طبیعت
ٹھیک نہیں ہے تو میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں، تمہیں چھوڑ
آئے۔“

”نہیں سر، میں چلی جاؤں گی۔“
”خدا مت کرو۔ وہ پہلے تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے
جائے گا۔“

شاہینہ مسکرائی۔ ”سر! رات ایک کھلی کی شادی میں دیر
تک جاگی... بس اسی کا اثر ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔
میں گھر جا کے سو جاؤں گی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔
ٹھیک ہو۔“ وہ اگلی بات سننے بغیر ہاس کے کمرے سے نکل
آئی۔

سالٹ اینڈ پیپر دور تھا لیکن اپنی نوکیشن اور کوالٹی کی
وجہ سے مقبول تھا۔ وہ اوپر گئی تو ہال میں ہر میز پر لوگ بیٹھے
تھے۔ ان میں جتنے مرد تھے اتنی عورتیں۔ اس کی نظرس کسی
خالی جگہ کو نہیں قاسم کو تلاش کر رہی تھیں اس تو فیغ کے ساتھ کہ
قبل از وقت اس کو پہنچ جانا چاہیے۔ اپنی کیش... پھر اس
نے ایک ہاتھ بلتا دیکھا اور اس میز کی طرف بڑھی جس پر
قاسم براجمان تھا۔ یہ آخری قطار میں تھی جہاں سے ایک
طرف سمندر کی وسعت کا اور آسمان کی نیلا ہٹ کا نظارہ کسی
خاموش تصویر کی طرح کیا جاسکتا تھا۔ انٹرکٹ ایٹڈ ریسٹورنٹ
کے شیشے باہر کی ساری آوازیں کو روک لیتے تھے۔

وہ سامنے جا کے بیٹھ گئی تو قاسم نے کہا۔ ”ٹھیک ہو،
میں ڈر رہا تھا کہ تم نہیں آؤ گی۔“

وہ مسکرائی۔ ”ڈرنے کی وجہ تو کوئی نہیں تھی۔“
”تجی، کل میں نے خاصی بدتمیزی کا ثبوت دیا تھا۔
خیر، کیا خیال ہے کھانا کچھ دیر بعد منگوا لیں۔ ایک کولڈ

بدل ہوا زمانہ

فائدہ نہیں اٹھایا۔ آخر کیا ہے مجھ میں کہ میں سینکڑوں ہاس کھلاتی ہوں۔ نہیں، غلط سوچ رہے ہو تم۔۔۔ بالکل غلط۔ سارے دفتر کی نظر ہو سکتی ہے مجھ پر۔ کیونکہ میں ایک لڑکی ہوں لیکن ہاس کی نہیں۔ دراصل اس کی ایک بیٹی تھی۔ بیٹا بھی ہے جو ابھی لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہا ہے۔ ایک رات کو ان کے گھر میں ڈاکو آ گئے۔ انہوں نے کن پوائنٹ پر سب کو یرغمال بنالیا۔ پھر سب کو چھوڑ دیا اور بیٹی کو قاتلوں میں رکھا۔ انہوں نے جو مانگا دے دیا گیا۔ وہ بھی جو خفیہ تجویزوں اور الماریوں میں محفوظ تھا۔ سب ملا کے ایک کروڑ کا مال تھا۔ زیور، کیونکہ بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ لفتہ، بانڈ نافذ غیر ملکی کرنسی۔۔۔ جاتے وقت وہ بیٹی کو یرغمال بنانے کے ساتھ لے گئے کہ یہاں سے نکل کے چھوڑ دیں گے۔ کسی پیٹرول پمپ پر۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ لڑکی کو اپنے ٹھکانے پر لے گئے اور اس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی اور پھر اس کی لاش پیٹرول پمپ پر پھینک گئے۔ پولیس کا خیال تھا کہ ڈکیتی کے ساتھ یہ انتقامی کارروائی لگتی ہے۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ماں باپ پر کیا کمزوری ہوگی۔ ماں تو علاج کے باوجود اب بھی نفسیاتی مریض ہے۔ باس سنبھل گیا ہے۔ جب میں یہاں تو کمری کی درخواست لے کر آئی تو اسے بڑا شاک لگا۔ میری صورت میں اسے بیٹی کی مشابہت نظر آئی۔ اس نے کئی بار مجھے نہیں کہا۔ تہینہ نام تھا اس کی بیٹی کا۔ مجھے بعد میں سب معلوم ہو گیا کہ اس کی جذباتی کمزوری کیا ہے۔ کیوں اتنا مہربان ہے وہ مجھ پر۔ ٹھیک ہے میرٹ پر بھی میں پوری اترتی تھی اور یہ بھی نہیں کہ سیکریٹری، باس کا رشتہ عام طور پر بدنام ہوتا ہے اس نے مجھے پہلے دن سے بیٹی کہا۔ میں اس کی جذباتی کمزوری بن گئی تھی۔ وہ مجھے انکار نہیں کرتا۔ حالانکہ میں نے بھی ایسی کوئی فرمائش بھی نہیں کی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ فائدہ اٹھاؤ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بہت دبی آدی ہے۔ اندر سے زخمی ہے۔

”اگر ایسا ہے تو اس نے تمہیں اپنے بیٹے کے لیے کیوں پسند نہیں کیا؟“

”وہ ایسا ضرور کرتا لیکن لندن میں بیٹے نے ایک کلاس فیلو گوری لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اس کے علاوہ آج تک وہ مجھے اپنے گھر نہیں لے گیا۔ اس ڈر سے کہ اس کی بیوی دیکھے گی تو اس کو دورہ پڑ جائے گا۔ اس کا جذباتی توازن پھر بگڑ جائے گا۔“

”تم میری سفارش کرو گی؟“

”میں کیا کروں گی۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، اگر احماد کیا

رکھا تھا۔ کیسے بالوں کی ایک لٹ تمہارے ماتھے پر جمول رہی تھی۔ کیسے تم نے صرف ایک لفظ کا سوال کیا تھا۔ ”جی؟“ پھر اتنا عرصے بعد تم اچانک ساحل پر میرے سامنے آئیں تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ تم ہو۔ میرے لیے یقین کرنا، مشکل تھا کہ تم نے مجھے دیکھا اور پہچان لیا۔ صرف میں ہی نہیں تھا جو تمہارے ہارے میں سوچتا تھا۔ کبھی کبھی۔۔۔ اور تمہاری وہ تصویر آ کے میرے سامنے کھڑی ہو جاتی تھی اور میں تمہیں دیکھتا رہا۔ تمہاری آواز سن رہا۔ وہی، پرسکون، مہربان، ہمدرد، کتنا خوش تھا میں کہ صبح تم سے ملوں گا۔ تمہارا پتا میرے پاس تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا، بونو، میں سن رہی ہوں۔“

”میں بزدل اور خود غرض ثابت ہوا۔ ڈر گیا کہ بچ بولا تو سب ختم ہو جائے گا۔ زندگی کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ جیسے کوئی فانوس سنگ مرمر کے فرش پر گرے اور ختم ہو جائے۔ نہ اس کا حسن رہے نہ روشنی اور نہ وقار۔۔۔ مگر رات تک سب الٹا ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ کیا ختم ہو جائے گا؟ ابھی ہے کیا میرے پاس اگر خواب ہیں تو اس میں تم کو ساتھ ہونا چاہیے ورنہ وہ بے رنگ ہوں گے۔ اگر زندگی ہے تو اس میں تمہیں شریک ہونا چاہیے ورنہ جینے کا مزہ کیا۔ اگر مستقبل کی کامیابی ہے تو وہ عورت تم ہو سکتی ہو جس کا۔۔۔ ہاتھ مرد کے پیچھے ہوتا ہے۔“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ ”تو بس۔۔۔ میں نے تمہیں فون کر دیا۔ میں ڈرائیو کہ تم ناراض ہو تو انکار بھی کر سکتی ہو۔“

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں وہ ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ گئے۔ وہ باتیں جو الفاظ کی محتاج نہ تھیں اور سب سمجھ گئے جو ضروری تھا۔ پھر شاہینہ نے آہستہ سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور ایک ڈیڑ سکر ایسا جو دیکھ رہا تھا کہ بچ کرنے والے سب جا چکے ہیں تو یہ تین گھنٹے سے کیوں بیٹھے ہیں۔ تجربہ کہتا تھا کہ وہ میاں بیوی نہیں ہو سکتے۔ شاید ہو جائیں گے۔ ایسے مناظر وہ صبح شام دیکھتا رہتا تھا۔

شاہینہ نے کہا۔ ”اب تم کو کپڑے پر کام کرنا سیکھنا ہے۔ میں تمہیں سکھا دوں گی۔ کیسے۔۔۔ اس کی لگزم مت کرو۔ صرف تین مہینے بعد تم اسی آفس میں اسسٹنٹ منیجر ہو گے۔ یا بی آر او۔۔۔ یا ایچ آر میں۔۔۔ اور جو تنخواہ سب کو ملتی ہے تمہیں بھی ملے گی۔“

وہ ہلکے جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ ”کیسے؟“

”آج تک میں نے ہاس کی جذباتی کمزوری سے

کہ انڈے دیتی رہے اور وہ عیش کریں۔ خیر، سب ہوتا ہے
اس کاروباری دنیا میں... ان کو ایک بگ ڈیل کی آفر ملی
تھی۔ انہوں نے قبول نہیں کی۔ ان کو دوسرا مل جائے گا۔
آپ کیا کریں گے؟ میرا مطلب ہے پڑھانے کا یہاں کوئی
کام نہیں۔“

شاہینہ نے کہا۔ ”سر! ابھی آپ مجھے اجازت دیں کہ
میں ان کو آفس ٹائم کے بعد کمپیوٹر پر کام کرنا سکھا دوں...
میرا دفتری کام متاثر نہیں ہوگا۔ تین مہینے بعد آپ فیصلہ کریں
کہ یہ کارآمد ہو گئے ہیں یا نہیں۔“

”آئی سی۔“ باس نے کہا اور نظر جما کے شاہینہ کو
دیکھا۔ شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ان کی بیٹی نے اپنا
لائف پارٹنر جن لیا تھا۔ اس کے لیے کچھ نہ کرنا مشکل تھا۔
ایسا نہ ہوا تو یہ نوجوان قاسم کہیں اور کچھ کر لے گا اور اس کے
تیور بتاتے ہیں کہ وہ اپنا راستہ بنا سکتا ہے۔ اس کی شخصیت
مضبوط ہے۔ کامیاب وہ ضرور ہوگا۔ پھر اسے چانس کیوں
نہ دیا جائے درنہ چانس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہینہ اس کے
ساتھ چلی جائے۔ آج نہ سنی کل۔

”کیا میں نے بہت زیادہ مانگ لیا آپ سے سر؟“
شاہینہ نے مایوس لہجہ میں کہا۔ ”یہ کسی کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ کو بھی
جوائن کر سکتے ہیں ویسے تو۔“

”ڈونٹ بی اے فول لڑکی۔“ باس نے چوہے کے بغیر
مسکرا کے کہا۔ ”میں کچھ اور سوچ رہا تھا کہ اس نوجوان کو
کہاں کا ستارہ بنایا جاسکتا ہے۔“

”ابھی تو دیکھنی نہیں ہے سر۔“
”دیکھنی ہونے والی ہے۔ وہ جو جواز کا ہے کسٹمر ریلیشن

کی مس حجاب کے ساتھ... وہ کینیڈا جانے والا ہے بہت
جلد۔ میں اس سے معلوم کرتا ہوں۔ کل کے بجائے آج جگہ
خالی کر جائے۔ ایک ماہ بعد جانا ہے تو ایک ماہ کی تنخواہ لے
جائے۔“

قدرت زندگی میں ہونے والے ہر ظلم اور زیادتی کی
تلافی کرتی نظر آتی تھی۔ اسکول سے نکالا جانا ایک بہانہ بن
گیا تھا۔ اب اس کا فیصلہ ہرگز جذباتی، بے وقوفی نہیں سمجھا جا
سکتا۔ وہ کل کو مسٹر دند کرتا تو شاہینہ تک کیسے پہنچتا۔ ناقابل
یقین تیزی کے ساتھ حالات اس کے حق میں ہوتے جا رہے
تھے۔ اگلے دن وہ آفس ٹائم کے بعد شاہینہ کے پاس پہنچا تو
باس جا چکا تھا۔

”وہ آج جانتے بوجھے جلدی اٹھ گیا۔ شاید روز ایسا
ہی کرے گا اور ایک گاڑی مع ڈرائیور چھوڑ گیا ہے میرے

ہے تو پورا کر دو۔ چلو اٹھو تین گھنٹے سے بیٹھے ہیں میز گھیر کے،
سب نے نوٹ کیا ہوگا۔“
وہ ہنسا۔ ”ان کے لیے نئی بات کچھ نہیں، ہم اکیلے تو
نہیں ہیں یہاں۔“

اور نکلنے وقت شاہینہ نے دیکھا تو اسے یقین آیا کہ یہ
محض اس کے اندر کی خلش تھی ورنہ اس مصروف دنیا میں کسی
کی طرف دیکھنے کی نہ کسی کو فرصت ہے اور نہ ضرورت۔ کسی
میں قاسم کو اس کے فلیٹ کے نزدیک اتارتے ہوئے شاہینہ
کو احساس ہوا کہ آفس کی گاڑی نہ لاکے اس نے کوئی ٹھکانہ
نہیں کی تھی۔ باس یوں بھی ہر روز اسے گلی کے کٹ پر اتارتا
تھا۔ لیکن اسے ڈرتھا کہ ڈرائیور کو سالٹ اینڈ پیپر میں قاسم
سے ہونے والی خفیہ ملاقات کا علم ہو جائے گا۔ آج نہ سنی
کل... جب وہ قاسم کو باس کے سامنے پیش کرے گی تو کیا
اس کی جہاں دیدہ زبانہ شاس نظر سب نہیں سمجھ لے گی۔

اور اگلے دن یہ ہوا۔ قاسم بہترین لباس میں شاہینہ
کے ساتھ باس کے کمرے میں داخل ہوا تو دفتر کی شان و
شوکت سے اس نے کاروبار کی دسعت کا اندازہ کر لیا۔ ”سر
یہ میرے کزن ہیں قاسم... قاسم یہ میرے باس ہیں۔“

باس نے اسے ہاتھ ملا کے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک
مہذب آدمی تھا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“ اس نے رسوا پوچھا اور
پھر شاہینہ سے مخاطب ہو گیا۔ ”پہلے کبھی ذکر نہیں کیا ان کا تم
نے۔“

”یہ ابھی کراچی آئے ہیں سر۔ ان کو تو معلوم بھی نہیں
تھا کہ یہاں میں کام کرتی ہوں۔ یہ جاب کی تلاش میں
تھے۔“

”آئی سی، کس قسم کی جاب چاہتے ہیں آپ مسٹر
قاسم؟“

”سر! انگریزی محاورے کے مطابق... خیرات اپنی
مرضی سے نہیں ملتی... میں صرف اردو میں ایم اے ہوں۔
انگریزی بھی بری نہیں... ایک اسکول میں ایڈمنسٹریٹر تھا۔
پڑھاتا بھی رہا ہوں۔“

”پھر؟ وہ ملازمت کیوں چھوڑ دی؟“
اب شاہینہ نے اس کی وکالت شروع کی۔ ”ان کو
نکال دیا گیا۔ ایک نیچر مس گل کی شکایت پر... اس کا باپ
بہت اثر رسوخ والا تھا اور ان کو گھر داماد منتخب کر چکا تھا۔
انہوں نے انکار کر دیا۔“

باس مسکرایا۔ ”ایمووشنل ہیں آپ کے کزن... آج
کل کے نوجوان سونے کا اندازہ لینے والی مرضی مانگتے ہیں

بدل ابوازمانہ

سمجھوتا کر لیا تھا۔ قاسم عام ملازم نہیں، وہ مس شاہینہ کا ہونے والا شریک حیات ہے۔ چنانچہ اس کے سر پر باس کا ہاتھ ہے لیکن قاسم ہر طرح سے میرٹ پر پورا اترتا ہے۔ چنانچہ سب ٹھیک ہے۔

شاہینہ اب اس کے مستقبل کا حصہ بن چکی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے زندگی نے ماضی کے تمام دکھوں کا بدلہ ادا کر دیا ہے۔ آفس میں وہ ساتھ ہوتے تھے لیکن باہر بھی لچ یا ڈنر کے لیے چلے جاتے تھے۔ اب وہ اظہارِ عشق کی منزل سے بہت آگے جا چکے تھے اور اس وقت کو پلان کر رہے تھے جب وہ میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی کے سفر کا آغاز کریں گے یہ بات سب جانتے تھے کہ وہ کزن ہیں اور یہ بھی کہ وہ شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں چنانچہ باتیں بنانے والوں کے لیے اس چٹارے دار موضوع میں مزے لینے اور ایک کی دولگانے، انہیں بدنام کرنے یا ان کے تعلقات کو ناجائز سمجھتے ہوئے بلیک میل کرنے کے امکانات معدوم ہو چکے تھے۔ دفتر میں وہ کام سے کام رکھتے تھے اور کوئی ان کی کارکردگی پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

”جی! باس نے ایک دن شاہینہ سے کہا تھا۔“ یہ تمہارا کزن تو بہت اچھا نوجوان ہے۔“

”اس نے مجھے آپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔“

”تم اسے پسند بھی کرتی ہو۔ میرا مطلب ہے جیون ساتھی بنانے کے لیے؟“

”جی۔“ شاہینہ نے نظر جھکا کے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔“

”بھئی زندگی تمہاری ہے اور تم خود بہت ذہین اور سمجھدار ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہو گے۔“

”آپ کی دعا میں جانتی ہوں۔“

”کیا تمہارے فیصلے میں وہ بھی شریک ہیں... تمہارے والدین؟“

”ان کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”ہاں، کزن ہے۔ تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار ہے۔“

”بہت اچھا ہے اور کیا چاہیے۔“

بات وہاں ختم ہوئی لیکن اس رات شاہینہ نے سمندر کے سامنے کی دیوار پر قاسم کے ساتھ بیٹھ کر اس موضوع کو چھیڑا جس پر ابھی تک انہوں نے آپس میں بات نہیں کی تھی۔ ”قاسم! ایسے کب تک چلے گا۔ یوں باہر ملتے رہنا۔“

لیے۔ روز خود گھر چھوڑنے جاتا تھا۔“

”وہ واقعی تمہارا بہت خیال کرتا ہے۔“

”کل سے تم عبدالرحمن کی جگہ لو گے۔“ وہ معصوم

صورت بنائے بیٹھی رہی۔

”کون عبدالرحمن؟“

”وہی جس کو کینیڈا جانا تھا ایک مہینے بعد۔ باس نے اسے بلا کے کہا کہ تمہیک یو مسٹر رحمن تم نے اچھا کام کیا مگر تم کینیڈا جا رہے ہو۔ آئی وٹ یوکس... مجھے تمہاری جگہ کام کرنے والا ایک اچھا آدمی مل گیا ہے۔ کیشیئر سے ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوائس لے لو۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی کو اس کے عزائم کا علم نہیں اور وہ عین وقت پر ہم... چھوڑے گا۔“

”شاہینہ! دس از نو بچ۔ ابھی اسٹاف کے باقی لوگ بیٹھے ہیں۔ وہ کیا کہیں گے؟“

”کیا تم کو ان کی زیادہ پروا ہے؟ مجھ سے بھی زیادہ؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔

”نہیں۔ مجھے صرف تمہاری پروا ہے۔“ اس نے شاہینہ کا ہاتھ تھام لیا۔

اس نے مصنوعی خشکی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ”مسٹر! تم یہاں... کمپیوٹر پر کام کرنے آئے ہو۔ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے مسکرا کے سیوٹ کیا۔ ”نہیں باس... پہلا سبق تو ہو گیا۔“

قاسم کی تنخواہ میں ہزار مقرر کی گئی تھی جو شاہینہ کے برابر تھی اور اس سیٹ کو چھوڑ کر جانے والا عبدالرحمن لے رہا تھا۔ اس کی باس مس حجاب واصل ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں جو شوہر سے طلاق لے چکی تھیں۔ ذاتی محنت اور صلاحیت سے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرنے کے بعد جیسے انہوں نے دیا تیاگ دی تھی۔ ان کے بال زیادہ سفید تھے۔ وہ سادہ بلکے رنگ کی ساڑھی استعمال کرتی تھیں اور موٹے سیاہ فریم کی عینک لگاتی تھیں۔ اگر وہ میز ڈاکی استعمال کرتیں، جدید طرز کے رنگین ملبوسات پہن لیتیں اور سنہرے فریم والا نازک سا چشمہ لگاتیں تو بلاشبہ دلکش نظر آتیں۔ جب شاہینہ نے قاسم کا تعارف کرایا کہ ”یہ میرے

کزن ہیں عبدالرحمن کی جگہ کام کریں گے۔ ان کو کچھ دن کام سیکھنے میں لیں گے۔ کمپیوٹر آپریٹ کرنا میں سکھا رہی ہوں۔“

وہ سب سمجھ گئی تھیں اور قاسم نے ان کی توقع سے پہلے ہی کام سیکھ لیا تھا۔ ایک حقیقت سے سب نے پراسن بٹائے باہمی کا

ہماری اگر پتا چلا کہ داماد جیل کاٹ چکا ہے قتل کے الزام میں۔

”مجھے معلوم ہے وہ کیا کہیں گے لیکن میں ان کو انہی کے جال میں ٹریپ کر دوں گی، تم دیکھتے جاؤ۔“

”کیا کر دوں گی تم... مجھے نہیں بتاؤ گی؟“ وہ ہنسا۔

”مسٹر قاسم! تم نے بھی زندگی سے یہی سبق سیکھا ہے۔ سیدھے اور شرافت کے راستے پر یہ دنیا چلنے نہیں دیتی۔ ہمیں بھی چکر چلانا پڑے گا۔ تمہارے ڈیڈی کا رول تو باس ادا کر سکتا ہے، اسے تمہارا پیغام لے کر جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ کون سا غلط کام ہے۔ اس کی بیوی نارمل ہوتی تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ پیغام لے کر جاتے اور میرے گھر والے لڑکا دیکھنے آتے تو کوئی دیکھتے ہی ان کے ہوش کم ہو جاتے۔ لڑکا بعد میں سامنے آتا تو اعتراض کی ہمت بھی نہ پڑتی۔ لیکن باس کی بیوی ابھی تک بیٹی کے مدد سے سنبھل نہیں سکی ہے اسی لیے ڈاکٹر کے کہنے پر اس کا میرا سامنا نہیں ہوا۔“

”ماں کے بغیر کام نہیں چل سکتا؟“

”بالکل چل سکتا ہے۔ باس کی بات کی تصدیق کون کرنا چاہے گا۔ یہ تو غریب اور گمنام لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسے سارا شہر جانتا ہے اگر مسز حجاب جن کو تم آنٹی کہتے ہو اس کا رخیر میں شریک ہو جائیں تو کام نکلا۔“

قاسم ہنس پڑا۔ ”سوچتی دور کی ہو تم لیکن حقیقت بہر حال وہ جانتے ہیں۔ تمہارے ماں باپ۔“

”میں نے اس پر بھی سوچا۔ پہلی بات ہے میرا دباؤ... میں سمجھا سکتی ہوں کہ وہ ماضی پر نہ جائیں حال کو دیکھیں، اپنا اور میرا مستقبل دیکھیں۔ پھر بھی نہ مانیں تو ایک دھمکی کہ میں بالغ ہوں اور چلی جاؤں گی کورٹ... ناک ان کی کئے گی محلے میں اور رشتے داروں میں، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ یہ دنیا بڑی عجیب ہے قاسم۔ دولت کی چکا چوند میں کسی کا عیب کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ لنگڑے، لوہے، بہرے یا کانے کو بھی حسین حور پری چاہیے، مل جاتی ہے۔ سب سے بڑا عیب بن جاتی ہے غربت، یا جہالت، تو میرا خیال ہے کہ میرے ماں باپ کے خیالات بھی پلٹ جائیں گے۔ سب کی طرح وہ بھی کہنے لگیں گے کہ اب گڑے مردے کیا اکھاڑیں... صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے اور قاسم تو سبے چارہ بغیر کسی جرم کے جیل کاٹ آیا۔ ماں بیوہ نہ ہو، یہی خیال تھا اسے اتنی بڑی

”جب تک تم چاہو گی۔“ قاسم نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ تم نہیں چاہتے کہ ہم ایک ہو جائیں؟“ وہ ناراضی سے بولی۔

”اگر یہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں ابھی تمہیں اپنے گھر لے جاتا۔ لیکن آج تک اس محبت کے احترام میں فرق نہیں پڑا جو مجھے تم سے ہے۔ میں نے تمہاری قربت میں بھی ایک فاصلہ رکھا۔“

”کیا میں محسوس نہیں کرتی، سمجھتی نہیں۔ اس سے میرے دل میں تمہارے لیے جو عزت ہے...“

”لیکن صرف تمہارے عزت کے جذبات سے تو فرق نہیں پڑتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے گھر والے مجھے کتنی عزت دیں گے۔ ان کو تم راضی کر سکتی ہو۔ میں دوسری بار بے عزت ہو کے ناکام لوٹنا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے صرف وہ راستہ رہ جائے گا جو آج بھی کھلا ہے۔ کورٹ میرج کا مگر نہ میں ایسا چاہوں گا اور نہ تم قبول کر دو گی۔“

”میرے گھر والے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ میں جانتی ہوں لیکن میں ایسے کب تک بیٹھی رہ سکتی ہوں۔ میرے رشتے آتے ہیں تو میں انکار کر دیتی ہوں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ کیوں۔“

”یہ میری خواہش سمجھ لو یا ضد کہ جس گھر سے نکل کے مجھے جیل جانا پڑا تھا۔ جہاں مجھے دروازے سے بے عزت کر کے بھاگ دیا گیا تھا کہ تم سزا یافتہ قاتل ہو اور یہ شریفوں کا محلہ ہے... اسی دروازے پر میں برات لے کر آؤں... وہیں سے تمہیں دلہن بنا کے لے جاؤں۔ وہ سب مجھے مبارک باد دیں جو میری ذلت اور رسوائی کے کھیل میں شریک تھے۔ وہ دیکھ لیں اپنی آنکھوں سے کہ میں کتنا عزت دار ہوں ان کے مقابلے میں آج۔“

”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ یہ ہو بھی سکتا ہے۔ اگر کوئی تمہارا پیغام لے کر اسی طرح آئے جیسے دوسرے آتے ہیں پھر میں پوچھ سکتی ہوں کہ جب مجھے قبول ہے تو ان کو کیا اعتراض ہے؟ اور اعتراض کی وجہ؟ کیا کمی ہے اس رشتے میں... شاید آج سے پہلے آنے والے تمام رشتوں سے یہ رشتہ بہتر ہے۔ تعلیم، آمدنی، صورت شکل۔“

”مگر دیکھنے والے خاندانی حسب نسب دیکھتے ہیں۔ ماضی کو کریدتے ہیں۔ وہ میرے ماضی کو مسترد کریں گے۔ ہم ایک قاتل کے حوالے کر دیں بیٹی... ناک کٹ جائے گی

حلیہ خراب اور چہرے پر بکرے جیسی داڑھی تھی۔ "آپ؟"
اس نے سامنے آکے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ "آپ کو میں نے
کہاں دیکھا ہے؟"

"آپ مجھے دیکھ رہے ہیں اور میرا راستہ روکے
کھڑے ہیں۔" قاسم نے کہا۔

اس نے چٹکی بجاٹی۔ "یاد آگیا۔ میں نے جیل میں
آپ کا انٹرویو لیا تھا۔ ایک بار نہیں دوبارہ... جب آپ نے
بی اے کیا تھا اور پھر ایم اے کرنے کے بعد... نام کیا ہے
آپ کا؟"

"ضرور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ہمارے آفس
میں اسسٹنٹ منیجر پی آر ہیں۔" شاہینہ نے کہا۔

"ضرور ہوں گے۔ ان کو تو ابھی بہت آگے جانا ہے
لیکن صوفی کو غلط فہمی ہو جائے... ناممکن ہے۔ ایک تو یہ سگے کا
بار بنا ہوا کیرا ہے جو گواہی دے گا۔ دو کیرے یہاں
ہیں۔" اس نے ماتھے پر انگلی رکھی۔ "میری دو آنکھیں اور
ان کا عکس محفوظ ہو جاتا ہے اوپر دماغ کے کمپیوٹر میں۔" وہ
ان کے ساتھ چل پڑا۔ "فائل میں سے وہ اخبار نکالنا دوست
کی بات ہے۔" اس نے پھر چٹکی بجاٹی۔

"او کے صوفی صاحب اب کیا چاہتے ہیں آپ؟"
قاسم نے کہا۔

"بھوکا کیا مانگا ہے، ایک روٹی۔ صوفی انٹرویو مانگا
ہے۔ ایک اور انٹرویو ہوتا کہ اس کو موقع ملے اپنی پیش گوئی
کو سچ ثابت کرنے کا۔ میں نے تو تمہارے لیے ایک
تابناک مستقبل لکھ دیا تھا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی... لیکن میں انٹرویو دینا نہیں
چاہتا۔" قاسم نے رکھائی سے کہا۔

"ارے بھائی انٹرویو میں چاہتا ہوں تم نہیں آئے ہو
میرے پاس... میں آگیا ہوں تقدیر کی مہربانی
سے۔ میرے تو کیریئر کا سوال ہے۔ تمہارے انٹرویو سے
یوں جائے گا اوپر... روم... راکٹ کی طرح۔" اس نے
ہاتھ سے راکٹ چلایا۔

"دیکھیے، ابھی مجھے فرصت نہیں۔" قاسم نے ٹالنے کی
ایک اور کوشش کی۔

"یہ کل ایک کاروباری دورے پر جا رہے ہیں۔"
شاہینہ نے اسے بروقت سپورٹ کیا۔

"جائیں جائیں، جم جم جائیں۔ ہم تو کہیں نہیں
جارہے اور یہ بھی واپس تو آئیں گے۔ ہم انتظار کریں گے
خیر اقامت تک۔ کیا خوب کہا ہے شاعر نے... میں معلوم

قرہانی دی اس نے... قصور وار تھا تو باپ۔"
"ہاں کل ایسا ہی ہوتا ہے۔ سب دلائل الٹ جاتے
ہیں۔ الزام لگانے والے خود سے بڑے وکیل بن کر
مخالفت کے بجائے حق میں دلائل تلاش کر لیتے ہیں۔ تمہیں
ایک ہات ہتاؤں شاہینہ، جب میں جیل سے نکلا تو یہ سمجھتا تھا
کہ مجرم وہی ہیں جو قید میں ہیں اور سزا کاٹ رہے ہیں لیکن
بہت جلد مجھے پتا چل گیا کہ ان سے بڑے مجرم تو باہر اپنے
چہروں پر شرافت کا نقاب ڈالے پھر رہے ہیں۔ شرافت کی
سند رکھتے ہیں اور شریف کہلاتے ہیں۔ اندر والوں پر تو مہر
لگ گئی کہ مجرم ہیں اور وہ تسلیم بھی کرنے پر مجبور ہیں کہ انہوں
نے جرم کیا تھا۔ باہر منافق اور بزدل لوگ شرافت کے نقاب
میں رہتے ہیں۔"

"ایسا ہی ہے قاسم۔ اب پیسے گناہی و شرافت اور
نیک نامی خرید لیتا ہے۔ قانون آپ کی ٹٹھی میں رہتا ہے۔
دولت تمام بند سرحدوں کو کھول دیتی ہے۔ جن کو عام آدمی
ویزا، پاسپورٹ رکھنے کے باوجود عبور نہیں کر پاتا۔"
"تم تو یوتی بھی ایک رائٹر کی طرح ہو۔" قاسم دیوار
پر سے کود کے اترے۔ "چلو اب چلیں۔"

"تم نے ابھی تک وہ منحوس فلیٹ نہیں چھوڑا؟"
"چھوڑ رہا ہوں۔ ایک دو روز لگیں گے شفٹ ہونے
میں۔"

وہ کچھ مطمئن ہوئی۔ "اب کہاں ڈیرا بچایا ہے؟"
"جہاں کا حکم تھا جو آپ کی پسند تھی جہاں آپ کو
میرے ساتھ رہنا ہے۔"

وہ خوش ہوئی۔ "وہیں ہینشل اسٹیم کے پیچھے۔"
"دیس معمار اسکوآر میں فرسٹ فلور پر تین بیڈ کافلیٹ
ہے۔ فرسٹ فلور پر۔ کھڑکی کھلے تو درمیان کے احاطے میں
بنا ہوا سرسبز باغ کا نظارہ ہے۔"

"اس کا کرایہ تو بہت ہوگا؟"

"یہ قرہانی دیے بغیر چارہ نہیں۔ مگر تمہیں فکر کرنے کی
کیا ضرورت ہے۔ ہم دونوں کی آمدنی یہی نہیں رہے گی۔
میں تمہارے ساتھ ایک بہت خوش گوار اور روشن مستقبل دیکھ
رہا ہوں۔ تصدیق کر سکتا ہوں ایمپریس مارکیٹ پر بیٹھے
ہوئے کسی پروفیسر نجومی سے۔"

وہ ایک پلان کے مطابق آگے بڑھ رہے تھے کہ
آگے پیچھے دو واقعات ہوئے۔ وہ اپنے آفس میں شام کے
وقت چھٹی کے بعد شاہینہ کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر لفٹ سے
نکلا ہی تھا کہ ایک شخص سامنے آگیا۔ اس کے بال پریشان،

بدل ہوا زمانہ

کہاں... بیٹھ جاؤ جہاں دل چاہے۔" اس نے پہلے سگریٹ جلائی اور پھر اسی جلیے میں کباڑی کی دکان جیسے کچن میں چائے پنانے چلا گیا۔ اس کا کراہی کباڑ خانہ ہی تھا۔ ہر چیز وہاں تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا یا ہونا ہی نہیں چاہیے تھے صفائی کون کرتا... کمرے میں ہر قسم کی بدبو تھی۔ ٹھیکے کے قریب شراب کی آدمی بوتلی پڑی تھی۔ دیواروں پر ہر سائز کی عریاں تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ راتوں رات نیک نائی اور بدنامی کمالینے والی پاکستانی اداکارہ کی قید آدم تصویر تھی۔

قاسم کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ صوفی نے اس کی ایک نہیں سنی۔ قاسم نے بڑی منت سماجت کی اور اسے سمجھانا چاہا کہ اس کے مستقبل کا سوال ہے۔ مگر اس نے صاف کہا کہ بھائی! میں تمہارے مستقبل کا سوچوں... یا اپنے مستقبل کا۔ یہ تو نفسا نفسی کی دنیا ہے میری جان، انٹرویو نہیں دو کے تو میں پرانے میں نیا ملا کے چھاپ دوں گا۔ معلوم تو ہو ہی جائے گا کہ تم کہاں رہتے ہو کیا کرتے ہو، خطرہ اب قاسم کو سر پر منڈلاتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کا فوری تدارک ضروری تھا۔ ورنہ کچھ بھی نہیں رہے گا۔ نہ نوکری، نہ شاہینہ کے ساتھ خوابوں کی جنت آباد کرنے کا خواب۔

اچانک اسے استاد گلو کا خیال آیا۔ اسے بڑی شرم آئی کہ اتنے عرصے میں وہ اس شخص سے صرف ایک بار ملا تھا جس نے اس کے لیے کامیابی کا راستہ ہموار کیا تھا۔ جو خود اس کے لیے ناممکن کام تھا اور کوئی بھی نہ کرتا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ آ گیا۔ اس بندرڈ ایک پاؤں میں لگ اددو نوں ہاتھوں میں نصف انگشت شہادت رکھنے والے (یہ سب پولیس کے دیے ہوئے میڈل تھے۔ وہ کہتا تھا) شخص کے پاس سونے کا دل تھا جو دیکھنے والے کی آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی۔

"ارے قاسم!" اس نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔ "کہاں تھا تو... اپن کو تو یار نا تم ملتا نہیں سالاتو جو میں گھنٹے کیا کرتا ہے۔ ابھی ادھر ہی ہے؟ اور بچے کتنے ہیں ایک کہ دو... اور شاہینہ کیسی ہے؟"

قاسم ہنسنے لگا۔ "استاد ایک ساتھ اتنے سوال۔ شادی سے پہلے تو بچے ہوتے نہیں۔"

"ہوتے ہیں پاگل خانے... بہت ہوتے ہیں۔" قاسم پھر ہنسنے لگا۔ "استاد پہلے وہی چائے چلاؤ پھر دکھرا سنو۔ خود غرض کہو یا کچھ اور... لیکن کون ہے میرا جس کے پاس جاؤں میں۔"

کرتار ہوں گا خدا حافظ۔" وہ ہا ہر آ کے ایک دم پلٹ گیا۔ وہ دونوں کچھ دیر دم بخود کھڑے رہے۔ پھر شاہینہ نے کہا۔ "یہ بلا کہاں سے نازل ہو گئی؟"

قاسم خاموشی سے کار پارکنگ کی طرف چلتا رہا۔ "اور بھی بہت پلیس کے، میرے ماضی کے گواہ۔"

"اس کو رد کو کسی طرح۔"

"کوشش ضرور کروں گا لیکن وہ آدمی ضدی اور جھپٹی لگتا ہے مشکل ہے کہ مانے۔"

اس کا خیال اگلے روز ہی درست ثابت ہوا۔ رات کو پریشانی کے باعث اسے ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی تھی اور اس کی تشویش بجا تھی۔ اس کا سارا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا۔ اس کے خوابوں کی دنیا میں زلزلہ آ رہا تھا۔ اس نے اگلے دن آفس جانے کے بجائے پریس کلب کا رخ کیا۔ وہ غلط وقت پر آ گیا تھا۔ ٹائٹ برڈ کھلانے والی یہ مخلوق جو اخبارات میں ڈیک پر کام کرتے تھے دوپہر کے بعد جاگتے تھے اور لچ کی جگہ ناشتا کرتے تھے۔ وہاں جو تھوڑے بہت لوگ بیٹھے تھے انہوں نے قاسم سے کہا کہ وہ شام کے بعد آئے۔ قاسم کو احساس ہوا کہ اس نے بلاوجہ چھٹی کی۔ لیکن اب وہ واپس جا کے بھی کیا کرتا۔ شاہینہ کے پوچھنے پر اس نے بتا دیا کہ وہ صوفی کی تلاش میں ہے۔

ایک نوجوان نے اس کی مایوسی کو دیکھ کے کہا۔ "کوئی ضروری کام ہے تو اس کے گھر چلے جاؤ۔ آفس میں تو وہ اسے ملے گا شام کے بعد... مگر قریب ہے۔"

قاسم نے ایک لمحہ سوچا۔ "گھر، ٹھیک ہے۔ میں گھر جا کے مل لیتا ہوں۔ وہ برا تو نہیں ماننے گا۔"

"وہ بڑی ڈھیٹ ہڈی ہے نہ کسی کی بات ماننا ہے نہ برا ماننا ہے۔"

پہلی بات نے قاسم کے کان کھڑے کیے لیکن پھر بھی وہ نوجوان صحافی کے دیے ہوئے ایڈریس تک پہنچ گیا۔ کافی دیر تک وہ گھنٹی اور پھر دروازہ بجاتا رہا۔ وہ مایوس ہو کے پلٹنے ہی والا تھا کہ صوفی کا خوابیدہ چہرہ نمودار ہوا۔ اس وقت وہ قابل اعتراض جلیے میں تھا۔

"بہرے ہو کیا؟ کب سے کہہ رہا ہوں کہ آ جاؤ، دروازہ تو کھلا رہتا ہے۔"

"آپ کو ڈر نہیں چوروں، ڈاکوؤں کا؟" قاسم نے دوستانہ لہجہ بلکہ خوشامد انداز میں کہا۔

"سالانہ وقت ضائع کرنے آئے گا یہاں۔ یہ چور، ڈاکو پہلے چھان بین کر لیتے ہیں کہ گھر میں ہے کیا اور

استاد نے اس کی ساری بات ظاہری بے نیازی سے سنی اور دیوار کے سہارے نیم دراز سگریٹ کے کش لگاتا، قاسم کی بات ختم ہوتے ہی وہ بولا۔ ”ابے شادی میں بلائے گا نا؟“

”استاد میں کیا کہہ رہا ہوں۔“

”سن لیا بیٹے“ میں سمجھا دوں گا اسے... کچھ نہیں بگڑے گا تیرا۔“

”وہ سننے والا اور ماننے والا آدمی نہیں ہے استاد۔“

”قاسم جانی، سمجھانے کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ جیسے سبق پڑھانے والے ماسٹر الگ الگ ہوتے ہیں۔ کسی کی بات سمجھ میں نہیں آتی، کوئی ڈنڈے سے سمجھاتا، کوئی پیار سے، اطمینان رکھ۔“

مطمئن نہ ہونے کے باوجود قاسم لوٹ آیا۔ اس کے اندر غصہ بھرا ہوا تھا۔ آخر یہ دنیا اسے شرافت سے جینے کیوں نہیں دیتی؟ کیا کرے وہ؟ گلے میں سختی ڈال کے پھرے کہ میں قتل کے جرم میں عمر قید جگت چکا ہوں۔ میرے شریفانہ چلیے اور لکھے پرست جاؤ، میں نفرت اور ملامت کا شوقی ہوں خواہ نیکی بھی کروں۔ قتل میں نے نہیں کیا تھا لیکن اب کروں گا اگر اس صوفی نے میرے ماضی کو دکھا کے میرا مستقبل تباہ کیا تو میں اسے قتل کروں گا۔ ایک کیسٹ سے وہ اپنے لیے صرف ایک خواب اور سکون آور گولی حاصل کرنے میں کامیاب رہا اور رات کو سو کے اٹھا تو صبح نسبتاً پرسکون تھا۔ وہ اپنے لیے ناشا بنارہا تھا کہ دروازے کی کھنٹی بجی اور قاسم نے شاہینہ کو اپنے مقابلے پایا۔

”تم؟ یہاں کیوں آئی ہو۔ میں نے کہا تھا کہ رخصت کر کے لاؤں گا۔“ وہ برہمی سے بولا۔

”کل سے تم نے بات نہیں کی۔“ وہ اس کی برہمی کو نظر انداز کر کے بولی۔ ”کیا کرتی میں؟“

”دعا... دعائے مغفرت۔“

شاہینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم بیمار لگ رہے ہو۔ اب میں نہیں جاؤں گی۔ لیٹ جاؤ آرام سے، ناشا کیا؟“

قاسم نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پرسکون کیا اور نرمی سے بولا۔ ”میں ناشا بنارہا تھا۔ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ پھر وہ شاہینہ کو ناشا بناتے اور رُے میں سجا کر لاتے دیکھتا رہا۔ یہ اس کے آنے والے کسی دن جیسا دن ہو گیا تھا۔ وہ خود ناشا کر کے آئی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اخبار دیکھتی رہی جو دروازے

کے پاس پڑا تھا۔

اچانک اس نے ایک ہسٹریائی چیخ ماری۔ ”قاسم! یہ... وہ صوفی۔“

قاسم گھبرا گیا۔ ”کیا ہے۔ کیا ہوا ہے صوفی کو؟“ اس نے شاہینہ کے ہاتھ سے اخبار لے لیا۔

اس کی نظر ایک سرخی پر جم گئی۔ ”ایک اور نامور صحافی ٹارگٹ کلنگ کا شکار۔“ اس چوکھٹے میں ایک طرف صوفی کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی خبر پڑھی۔ شام کے وقت پریس کلب سے نکل کر موٹر سائیکل پر آفس جاتے ہوئے اس پر دو موٹر سائیکل سواروں نے دو طرف سے گولیاں برسائی تھیں۔ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔ ”یہ کیا کر دیا تو نے استاد گلو۔“ قاسم نے اپنا سر تھام لیا۔

”تم نے استاد گلو سے کہا تھا کہ صوفی کو مار ڈالو۔ اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دو۔ کیونکہ وہ تمہارے لیے اور تمہارے مستقبل کے لیے خطرہ بن گیا ہے۔“ شاہینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ہسٹریا کا شکار تھی۔ ”تم ایسا سمجھتی ہو مجھے؟“ قاسم نے دھمی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”دنیا کی طرح مگر ہاں اس کے قتل کا میں ذمے دار ہوں۔ میں نے ہی کہا تھا استاد گلو سے کہ اس کا چپ رہنا ضروری ہے۔ اس نے بھی سمجھانے کا وعدہ کیا تھا۔“

غصے میں کھولتا وہ استاد گلو کے پاس پہنچا اور اخبار اس کے سامنے پٹ دیا۔ ”تم نے صوفی کو مار دیا۔“

”مار دیا۔ ابے بھوت کے بچے، میں تو سارا دن یہاں تھا۔ اور کل تو گیارہ آدمی مارے گئے ہیں ٹارگٹ کلنگ میں کیا ان سب کو بھی میں نے مارا ہے۔ ابے یہ کراچی ہے۔“ ”مجھے معلوم ہے تم نے مروایا اسے... مانتے کیوں نہیں۔ میں نے سمجھانے کا کہا تھا۔“

”آہستہ بول الو کے پٹھے۔ میں نے بھی سمجھانے کا کہا تھا۔ سلطان بھائی عرف کو برا ہے۔“

”کون ہے یہ سلطان بھائی عرف کو برا؟“

”مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔ سارا شہر واقف ہے اس سے۔ مل سکتا ہے تو اس سے جا کے پوچھ۔“ استاد گلو دو قلیوں کا پھنڈا اٹھانے نکل گیا۔

اندازہ تو قاسم نے کر لیا تھا کہ یہ سلطان بھائی عرف کو برا کون ہو گا۔ شاید وہ اس تک پہنچ بھی نہ پائے۔ سارا دن کوشش کے بعد بھی اسے سلطان بھائی کا پتا معلوم نہ ہو سکا حالانکہ اس کے نام کی دہشت تھی اور سارا شہر اسے جانتا تھا۔

بدلا ہوا زمانہ

تھے۔ قتل، ڈاکے، بھتے، اغوا، زنا، دھماکے، اسٹریٹ کرائم ہر قسم کی مافیا، پانی کی مافیا، ٹرانسپورٹ مافیا اور ہر مافیا کا دوسری مافیا سے لنک تھا۔ استاد قلیوں کی بھرتی کا ٹھیکہ دار تھا۔ بھتا وصول کرتا تھا اور آگے پہنچاتا تھا۔ ایسے بہت سے ٹھیکے دار تھے۔

وہ صوفی کی نماز جنازہ اور تدفین میں بھی شریک ہوا جہاں کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ سب جانتا ہے جو دوسرا کوئی نہیں جانتا، لوگ وہی ہزار روٹھ کی مسمیٰ پٹی غم و غصے کی باتیں کر رہے تھے۔ صحافی بازوؤں پر سیاہ مٹی باندھے نعرے لگا رہے تھے اور ان کا ساتھ دینے میں وہ پیش پیش تھے جو اب حکومت میں نہیں تھے۔ ان کی باری گزر چکی تھی۔ خطرناک نتائج کی دھمکیاں، تین دن کے اندر اندر قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ، تحقیقاتی ٹریبونل کا بائی کاٹ، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینے کے دعوے، سب پرانے ہو چکے تھے۔ وہ دھکی دل کے ساتھ سوچتا رہا کہ وہ جو سب جانتا ہے کہ صوفی کو کس نے مارا اور کیوں مارا، خاموش رہنے پر مجبور ہے۔ وہ کسی ٹریبونل میں پیش نہیں ہوگا۔ کسی سے بات تک نہیں کرے گا کہ صوفی کو کس جرم کی سزا ملی۔ کیونکہ وہ بزدل ہی نہیں انتہائی خود غرض اور بے ضمیر انسانوں میں شامل تھا جو جینا چاہتے تھے۔ اور یہ سب غم و غصہ اکیلے صوفی کے لیے نہیں تھا۔ مزید دس تھے جو بظاہر کسی وجہ کے بغیر مارے گئے تھے۔ حالانکہ وجہ جاننے والا شاید ہر جنازے کی نماز میں موجود تھا۔ گزرے ہوئے کل کے مرنے والوں کا غم کل کے ساتھ گیا۔ آنے والا دن ہو گا تو نئے شہید ہوں گے۔ جن کا قاتل کوئی نہیں مگر وہ مقتول ہوں گے۔

ڈپریشن اور اپنی خود غرضی سے نفرت اور اس زندگی پر شرمندگی کا یہ دورہ ایک ہفتہ چلا جس میں سب سے زیادہ شامینہ اسے دلائل دیتی رہی کہ اس کا قصور کوئی نہیں۔ موت برحق ہے آج تم کل ہماری باری ہے۔ دنیا میں جب آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا اور آہستہ آہستہ خود قاسم کا ذہن دلیل دینے والوں میں شامل ہو گیا۔

حالات کو معمول پر آنے میں پندرہ دن سے زیادہ لگ گئے۔ ایک ماہ بعد سب پہلے جیسا ہو گیا۔

قاسم پہلے بھی اپنی لباس سبز حجاب کا احترام کرتا تھا اور وہ بھی اس کے خصوصی التفات سے متاثر تھیں۔ اس نے ایک دن کہا۔ ”آئی! آپ نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے۔ زندگی کی جنگ ٹھیک لڑنے کے بعد آپ کا میاب ہو گئی ہیں تو آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ خوش نظر آنا چاہیے۔“

”تم نہیں سمجھ سکتے قاسم اکیلی عورت کا دکھ، یہ زندگی

شام کو جب وہ مایوس ہو چکا تھا اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے بڑی شرافت سے اس کا نام پوچھا۔

قاسم نے نمبر دیکھا اور کہا۔ ”جی میں قاسم ہوں، آپ کون؟“

”میں سلطان بھائی ہوں۔ آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ مجھے تلاش کر رہے تھے۔“ وہ ملاکت سے بولا۔

”جی، آپ کا بچا کوئی نہ بتا سکا۔“

”فرمائیے میرے لائق کیا خدمت ہے؟ میں حاضر ہو جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

لہجے کی انکساری اور شائستگی نے قاسم کے وجود میں بھرا ہوا غصہ یوں خارج کر دیا جیسے غبارے کے منہ پر سختی سے بندھا ہوا دھماکا کھل جائے۔ ”جی، میں پوچھنا چاہتا تھا کہ صوفی کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کون صوفی؟ اچھا وہ اخبار والا۔ قاسم صاحب! اسے سمجھانے کے لیے اسی کے ہم پیشہ بہت سینئر صحافی کو بھیجا گیا تھا مگر کچھ لوگ شرافت کی زبان سمجھتے ہی نہیں۔“

”آپ سے کس نے کہا تھا کہ وہ نہ سمجھے تو اسے جان سے مار دینا؟“

”ہمارے ایک کرم فرما ہیں۔ براہ راست نہیں۔ غلام محمد صاحب۔ ان کا پیغام ملا تھا اب انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ ہمارا نمبر آگیا تا آپ کے پاس۔۔۔ آئندہ ضرورت ہو تو بس فون کر دیں، غلام محمد کے حوالے سے۔ خدا حافظ۔“

قاسم نے ریسور رکھ دیا۔ یا میرے خدا! اس دنیا کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ کیا اب زندگی کے لیے موت ضروری ہے۔ اپنی زندگی کے لیے مجھے سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ دوسرے کی زندگی اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں اسی دنیا میں رہتا جہاں یہ سب نہیں تھا۔ وہ مجرم کہلانے والوں کی دنیا میرے لیے محفوظ تھی۔ وہاں مجھے سہولت ہی نہیں عزت بھی ملی۔ وہیں سے میں نے تعلیم کی دولت حاصل کی۔ اس نے اردو پڑھی اور پڑھائی تھی۔ اسے میری نازی کا ایک شعر یاد آیا۔ اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو... میں ایک دریائے پاراتر اتو میں نے دیکھا۔ اس شعر میں ترمیم کی ضرورت تھی یا شاید نہیں تھی کیونکہ شاعر تو استعاروں میں بات کرتے ہیں۔ مطلب اس کا یہی ہو گا کہ ایک اور زندان کا سامنا تھا منیر مجھ کو۔ میں ایک زندان میں رہ کے لکھتا تو میں نے دیکھا۔

اس کے ارد گرد کی دنیا میں مجرم دندناتے پھر رہے

تھا۔ ”تم میرے بڑے بیٹے کی طرح ہو۔“ ایک دن انہوں نے کہا اور قاسم نے محسوس کیا کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ تاہم اسے یہ شرمندگی نہیں تھی کہ وہ مسز حجاب کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ مس حجاب خوش رہنا سیکھ لیں اور اچھی نظر آئیں۔ ان میں یہ تہدیلی آہستہ آہستہ آرہی تھی۔ اس وقت جب وہ شاہینہ کے ساتھ مل کر طے کر چکا تھا کہ اب اسے باس سے بات کر لینی چاہیے اور وہ مسز حجاب سے کہے گا کہ وہ اس کے سر پرست بن کر شاہینہ کے والدین سے دیکھی طور پر رشتہ مانگنے جائیں۔ ورنہ اس کا دنیا میں اور ہے کون جو یہ کام کر سکے۔ باس کی وائف نارمل ہوتی تو لڑکی والوں کو ان کے گھر بلا لیا جاتا۔ رہی شادی تو رخصتی ہال سے ہوگی اور دلہن اس کے فلیٹ میں جائے گی۔ ولیمہ بھی ہال میں ہوگا۔ باس اور مسز حجاب کی مدد کے بغیر یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ کورٹ میرج کا راستہ وہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ مگر آخری لمحے میں ایک اور حادثہ پیش آگیا۔

ترقی ایاز نے بھی کی تھی اور اسی کیش اینڈ کیری اسٹور میں جہاں وہ دیگر چھ لوجوؤں کے ساتھ کاؤنٹر پر کیش وصول کرتا تھا اور مشینوں پر خریداری کی تفصیل کا اندراج کرتا تھا۔ اس کو منیجر بنا دیا گیا۔ موقع شناس یا مرموشاس تو وہ پہلے ہی تھا۔ ایماندار اور محنتی بھی تھا جب نیچر ایک بہتر حجاب کے لیے دینی گیا تو خالی جگہ کے لیے ایاز کو منتخب کر لیا گیا جو شاید سب سے جونیئر تھا مگر یہ ایسی نوکری نہ تھی جہاں شرائط ملازمت لاگو ہوتی ہوں۔

ایک رات وہ آیا تو بہت اب سیٹ تھا۔ ڈیپارٹمنٹ اسٹور بند ہونے کے بعد بھی اس کو حساب کتاب میں کچھ وقت لگتا تھا اور وہ عموماً آدھی رات سے پہلے نہیں آتا تھا۔ اس وقت تک قاسم سوچنا ہوتا تھا۔ پھر اسٹور ہفتے کے سات دن کھلتا تھا چنانچہ پچھٹی کے دن کا ایاز کے لیے کوئی تصویز نہ تھا۔ دونوں دوستوں میں بعض اوقات ایک ایک ہفتے بات کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی تاہم قاسم جانتا تھا کہ اس کا اسٹور میں کام کرنے والی کسی لڑکی سے انیئر چلا تھا۔ صرف تین ماہ بعد اس نے ایاز کو باپ بننے کی خوش خبری سنائی اور مطالبہ کیا کہ اب انہیں بلاتا خیر شادی کر لینی چاہیے۔ ایاز کو شک ہوا تو اس نے لڑکی کے ساتھ ایک میڈیکل سینٹر کا رخ کیا اور رپورٹ میں اس کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ لڑکی کسی اور کی کہانی پر ایاز کا عنوان لکھنا چاہتی تھی۔ ایاز کے انکار پر اس نے ہنگامہ کیا اور دھمکی دی۔ ایاز نے بھی نئی زندگی میں کامیابی کے لیے جائز اور ناجائز سارے راستے اختیار کرنا سیکھ لیا تھا۔

آج بھی ایک سزا ہے میرے لیے۔“
”سزا آپ نے خود بنائی ہے۔ آپ اچھا کماتی ہیں اچھا اور خوش رہنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟“
”بیٹا! عورت بدنامی کے خوف کے ساتھ تو اپنے شوہر کے ساتھ بھی جیتی ہے جب شوہر نہ رہے تو اس کے ساتھ یہ ہوس پرست دنیا کیا کرتی ہے۔“
”مجھے سب معلوم ہے لیکن اب کوئی آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اچھے کپڑے پہنیے، بیوی پارلر جائے اپنی خوب صورتی پر سوگ کی خاک مت ڈالے۔“
وہ مسکرائیں۔ ”کیسی باتیں کرتے ہو، یہ عمر ہے میری؟“

”عمر کی بات بالکل نہ کریں۔ چالیس ہوگی زیادہ سے زیادہ، لگتی کم ہے۔“

”جھوٹ مت بولو۔ عمر تو چالیس ہی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ پچاس کی نظر آتی ہوں میں کم سے کم۔“

”غلط، بالکل غلط۔“ اس نے ایک درجن فلسٹارز، ماڈلز اور دیگر پاکستانی اور غیر ملکی خواتین کی مثال دے دی جو ساتھ سے اوپر کی اور نانی داوی کے مرتبے پر فائز تھیں لیکن جوان نظر آتی تھیں۔ خوب صورت نظر آتا تو عورت کا حق ہے بلکہ فرض ہے۔

مسز حجاب جن کو سب مس حجاب کہتے تھے، کبھی خفا ہو جاتی تھیں تو اسے بے عزت کر کے کمرے سے نکال دیتی تھیں کہ اپنا کام کرو، میری ذاتی زندگی تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن قاسم نہ برا مانا تھا نہ ان کی جان چھوڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے مس حجاب کو متاثر کر لیا۔ وہ اس سے اپنی گزشتہ زندگی کے غم والہ کوشیئر کرنے لگیں۔ اسے بتانے لگیں کہ بیوہ ہونے کے بعد خود ان کے انہوں نے کیا نہیں کیا۔ کون سا الزام تھا جو نہیں لگایا۔ کس کس نے ایک تنہا عورت کی بھجوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ اپنی تعلیمی استعداد کو بہتر بنانے کے بعد انہوں نے بالآخر یہ ملازمت حاصل کر لی، اس سے پہلے ملازمت کے تلخ تجربات اپنی جگہ تھے۔ اب ان کا بیٹا سولہ سال کا اور بیٹی چودہ سال کی تھی۔ ان کا گھر سوسائٹی میں تھا جو شوہر چھوڑ گیا تھا۔ گاڑی اس وقت بھی تھی۔ آج بھی ہے۔ انہوں نے قاسم کو اپنے بیٹے کی اور پھر بیٹی کی سالگرہ میں مدعو کیا جو چند روز کے وقفے سے آگے پیچھے آتی تھیں۔ قاسم کے علاوہ صرف دو مہمان اور تھے باس اور شاہینہ۔

قاسم کو اب انہوں نے اپنا حقیقی ہمدرد اور مشیر سمجھ لیا

بدلا بوازا سانہ

بھی کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ماں نے کرا دیا۔ کسی بری نیت سے نہیں۔ اس کے اندر خالص پٹھان خون تھا جس میں غیرت کا تناسب کولسٹرول کی طرح زیادہ تھا اور یہ زیادہ ہوتا آدی خود نہیں مرتا۔ مار دیتا ہے۔ میرے قاتل مرتے دم تک مجھے تلاش کریں گے اور مرتے وقت وصیت کر جائیں گے بیٹوں کو کہ قتل کا قرض ابھی وصول نہیں ہوا۔ وہ دن گزرنے کے ساتھ یہ بات ہر دن کا موضوع نہیں رہی مگر ابھی بکھارا یا ز کے لاشور کا خوف اس کی زبان پر آ جاتا تھا۔

آج بہت عرصے بعد اس کی بات کو سن کے نہ جانے کیوں قاسم کو جیل کا زمانہ یاد آیا جہاں سزائے موت پانے والے ہر اپیل منظور ہونے کی خوش فہمی کے سہارے جیتے تھے۔ یہ ان کے وکیل پیدا کرتے تھے۔ پھر وہ خود پیدا کر لیتے تھے۔ آخری سہارا رحم کی اپیل ہوتی تھی جو بعض اوقات مہینوں مسترد نہیں ہوتی تھی اور اب تو ایسے ہزاروں قیدی تھے جن کی سزائے موت کئی کئی سال سے موخر ہوتی چلی آرہی تھی کیونکہ پاکستان سیاسی مصلحت کے تحت عالمی براہوری کے دباؤ میں تھا جو سزائے موت کو غیر انسانی قرار دے کر ختم کرانا چاہتی تھی۔

قاسم کو یوں لگا جیسے ایاز کی صدر کو جانے والی رحم کی اپیل مسترد ہو گئی ہے اور اب اسے پھانسی کے تختے پر لے جانے کی تاریخ کا بلک وارنٹ کسی بھی دن موصول ہو جائے گا۔ "ایاز! اگر یہ تیری غلط فہمی نہیں ہے تو پھر اب تک زندہ کیوں ہے تو؟"

"پتا نہیں، شاید وہ موقع کے منتظر ہیں یا کنفرم کر رہے ہیں کہ صورت اور حلیہ بدل لینے والا وہی ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔ وہ پہچان گئے ہیں مجھے۔"

"اگر اتنا یقین ہے تجھے تو پھر اب تک کچھ کیا کیوں نہیں تو نے؟"

"کیا کروں؟ پہلے انہیں مار دوں؟ اسٹور کے اندر اور پھر جیل جا کے لنگ جاؤں؟ اس سے تو بہتر ہے دوسرے قتل کے الزام کی اذیت اٹھائے بغیر فوراً مر جاؤں۔" وہ اداسی سے بولا۔

"اگر بھاگنا نہیں چاہتا تو انہیں پکڑوا دے۔"

"کیسے؟ جا کے پولیس نے کہوں کہ کوئی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ اسے پکڑ لو، اور وہ پکڑ لیں گے تو میں محفوظ ہو جاؤں گا؟ کیسی بچوں جیسی بات کرتا ہے۔"

"اچھا یہ بتا، تو نے کیسے جانا کہ وہ تجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟"

اب وہ علاقہ غیر کا سادہ لوح پٹھان نہیں تھا، وہ عروس البلاو کراچی کا شہری تھا اور نئے زمانے کا آدی جو مشکلات کی بھول بھلیوں میں سے اپنا راستہ بنانا جانتا تھا۔ اس نے دھمکی کا پتلیج قبول کر لیا۔ اس کو کسی ڈاکٹر نے کہا کہ انکار پر ڈلے رہو۔ اس لڑکی سے کہہ دو کہ تم لگرمٹ کرو، اگر ڈی این اے ٹیسٹ سے میں باپ ثابت ہوا تو اسی وقت شادی کر لوں گا تم سے۔ ورنہ اصل بابا سے رجوع کرنا۔

اس کے بعد لڑکی تو غائب ہو گئی تھی اور ایاز اس اسٹور کی ایک مالک کو پسند آ گیا تھا۔ اس کا زوہار میں دو بھائی اور دو بہنوں کی پانچ شہر تھی۔ وہ شادی شدہ عورت عمر میں ایاز سے دس سال بڑی تھی لیکن کلشن کے جدید ترین بیوٹی سیلون اس کی عمر کو دس سال کم دکھانے میں کامیاب تھے۔ خود ایاز کہتا تھا کہ یار سونا تو سونا ہی رہتا ہے خواہ وہ ہاتھوں سے گزرے۔ کرنسی گر دس میں رہے تو بولوسیدہ ہو جاتی ہے، اور پوٹ بھی جاتی ہے۔ اس نے اشارہ کرتے ہی اپنی نیاز مندی کو عاشقی میں تبدیل کر دیا تھا اور اب گر دڑ پتی ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ خاتون مالک کے تیسرے شوہر کے منصب پر فائز ہونے کے حق میں ایک سے زیادہ وکلاء بھی رکھتا تھا۔

اسے پریشان دیکھ کے قاسم نے کہا۔ "بھوں کے گھوڑے، گھڑی کی طرح ہارہ کیوں بچ رہے ہیں تیری صورت پر؟"

ہر روز وہ سیدھا اپنے بیڈروم میں چلا جاتا تھا مگر آج لائٹ دیکھ کے قاسم کے پاس آ بیٹھا تھا۔ "یار! بات ہی ایسی ہے۔"

قاسم اٹھ بیٹھا۔ "کیا اس بڑھیا نے تجھے گود لینے سے انکار کر دیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے فرشتہ اجل کو دیکھ لیا ہے اور اس نے مجھے۔"

قاسم نے اسے غور سے دیکھا۔ "کھل کے صاف بات کر۔"

"بس، میری زندگی کا آخری اسٹیشن آ گیا۔ قاتل پہنچ گئے ہیں مجھ تک۔"

قاسم سارا مذاق بھول گیا۔ شروع شروع میں ایاز کہتا تھا۔ یار آج بھی میں زندہ ہوں۔ ابھی تک میرے قاتل میرا سراغ نہیں لگا سکے۔ قاسم اسے حوصلہ دیتا تھا کہ یار ممکن ہے اللہ نے ان کے دل میں نیکی ڈالی ہو۔ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو۔ لیکن ایاز کی وکیل وہی رہتی تھی۔ یار ارادے سے کون قتل کرتا ہے یا قتل ہو جاتا ہے یا کرایا جاتا ہے۔ میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تمہی مگر اس خوش فہمی کو پال رہی تھی کہ وہ لگتی ہے اور اتنی بری بھی نہیں تھی۔ کروڑوں کے ساتھ تو حسینہ عالم سے بہتر تھی۔ ایاز کے بچوں کی ماں بھی بن سکتی تھی۔ ”ایاز خود کہاں ہے؟“ ”زیر زمین، میرا مطلب ہے روپوش، وہ سچ سچ زیر زمین نہیں ہونا چاہتا۔“

”مجھے پوری بات بتاؤ۔“

”اسے پرچی ملی ہے۔ ایک کروڑ کی۔“

پرچی کے نام پر اس کا رنگ بدلا۔ وہ جانتی تھی کہ پرچی کا مطلب ہے اغوا برائے تاوان کی وارننگ۔ ایک کروڑ فلاں دن فلاں جگہ پہنچا دو ورنہ ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں گے جہاں تمہارے فرشتے نہیں پہنچ سکتے۔ ”کون ہیں وہ لوگ؟“

”وہ لوگ سامنے آ کے مطالبہ نہیں کرتے۔ انہوں نے ایاز کو فون کیا تھا۔“

”کس نمبر سے؟“

”آپ ماشاء اللہ جوان ہیں۔ بچوں جیسی بات کیوں کرتی ہیں۔ کیا آج تک کوئی نمبر سے پکڑا گیا ہے۔ ایک سم کو وہ دوسری بار استعمال نہیں کرتے بلکہ موبائل فون کو بھی۔ ایاز نے ان کو اسٹور میں دیکھا ہے دو دن سے دیکھ رہا ہے۔ پہلے ایک تھا۔ پھر دوسرا اس کے ساتھ آیا۔ وہ ایاز کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ایاز نے خود دیکھا اور جو ایاز نے دیکھا وہ کیمرے کی آنکھ نے بھی دیکھا ہوگا۔“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ہاں، مگر اس سے تو کچھ ثابت نہیں ہوگا۔“

”آپ مجھے وڈیو ریکارڈنگ دلوادیں۔ تصدیق ہو جائے گی اور ثبوت پولیس خود حاصل کر لے گی۔“

”تم اتنے یقین سے کہہ رہے ہو۔ اگر انہیں پتا چلا تو وہ ایاز سے کچھ نہیں کہیں گے۔ میزے مگر ہم پھینک جائیں گے۔ ہینڈ گرنیڈ... یا یہاں؟“

”آپ جو مناسب قدم اٹھا سکتی ہیں اٹھائیں۔“

پولیس بے آپ کے اچھے مراسم ہوں گے۔“

”اس معاملے میں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے میں سودا کروں۔ ایک کروڑ مانگنے والے پچاس لاکھ پر مان جاتے ہیں۔“

قاسم بھونچکا رہ گیا۔ یہ عورت ایاز کو اس لیے نہیں چاہتی تھی کہ وہ جوان اور ہینڈ سم تھا۔ وہ ایاز سے محبت کرتی تھی۔ اس کے لیے پچاس لاکھ کا تاوان ادا کرنے پر فوراً مان گئی تھی۔ قاسم نے کہا۔ ”آپ کے جذبات کی قدر کرتا

”دونوں سے میں دیکھ رہا ہوں ان کو پہلے ایک تھا پھر دوسرا بھی آیا اور ایک نے میری طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ کھڑے تھے۔ خریدار نہیں تھے جو ثرائی لیے پھرتے نظر آتے ہیں۔“

قاسم نے چٹکی بھائی۔ ”نظر آتے ہیں؟ خفیہ کیمروں کو اور وہ دکھاتے ہیں لی وی اسکرین پر... جگہ جگہ وارننگ اسی لیے لکھی نظر آتی ہے کہ کیمرے کی آنکھ آپ کو دیکھ رہی ہے۔“

”مگر میں نے اسکرین پر نہیں دیکھا۔“

”ابے دماغ سے کام لے۔ جو اسکرین پر کیمرے دکھاتے ہیں، اس کی وڈیو ریکارڈنگ بھی تو ہوتی ہے۔ خدا انخواستہ کوئی واردات ہو جائے تو دیکھی جاسکے۔ ابھی وہ محفوظ ہوگی۔“

ایاز کا بچھا ہوا چہرہ آہستہ آہستہ روشن ہوا۔ ”یار یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی؟“

”اس لیے کہ تو پٹھان ہے۔ اب کل صبح بلکہ ابھی فون کر اپنی اس مالکن محبوبہ کو، جس نے تجھے ٹوڈلے لیا ہے۔“ وہ بے وقوفوں کی طرح بولا۔ ”کیا کہوں اس سے؟ وہ پاگل سمجھے گی مجھے... وقت دیکھ۔“

”رات کے ایک بجے کسی شوہر ہونے والے شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہونے والی بیوی کو خطرے سے آگاہ کر سکے۔ کہہ سکے کہ جاننا من، یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ قاضی سے پہلے فرشتہ اجل آ گیا ہے بتا دو۔“

”تو مان گیا اس لیے کہ تجھے سارا کیس معلوم ہے۔ کیا اسے پہلے بتاؤں کہ میں کیوں مقتول ہونے والا ہوں۔ کوئی کروڑ پتی بیوہ پھانسی کے تختے پر کھڑے ہوئے شخص کے لیے کہے گی کہ قبول ہے۔ خواہ جلاؤ کے ساتھ قاضی بھی موجود ہو۔“

”یہ تو ہے ایک طرف بڑا خطرہ، دوسری طرف چھوٹا خطرہ۔ اچھا کل پہلے تو نکلواتے ہیں وڈیو ریکارڈنگ، پھر سوچتے ہیں۔“

”تو اکیلا سوچتا رہتا۔ اتنا وقت کہاں دیں گے وہ۔“

”او کے، تو تم ہو جا دو چار دن کے لیے۔ میں کرتا ہوں کچھ۔“

قاسم نے اسٹور کی اس مالکن سے ملاقات کی اور اپنا تعارف کرایا۔ ”میں اس کا بھائی تو نہیں مگر بھائی سے زیادہ ہوں۔ آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ ایاز کی جان خطرے میں ہے۔“

وہ عورت فل میک اپ کے باوجود جوان لڑکی نہیں لگتی۔

بدل ہوا زمانہ

موتھیں رکھ لی ہیں اس نے۔

”تیرے چہرے پر بھی واڑھی ہے۔ جھاڑ جھکاڑ نہ سہی، فیشن کے مطابق تراشی ہوئی۔“
”اب ہم کیا کریں گے؟“

”یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ چاہے تو اپنی محبوبہ و لنواڑ کی زلفوں کے سائے میں جا کے سو جا۔ وہ کہتی ہے کہ ایک کروڑ تجھ پر قربان۔ وہ خود تجھ پر قربان۔“

قاسم نے جیل کے باہر ایک سال میں جو سیکھا تھا، وہ دس سال جیل میں رہ کے نہیں سیکھا تھا۔ وہاں اس نے کتابی علم سیکھا تھا۔ زندہ رہنے کا آرٹ اس سے قطعی مختلف تھا۔ کراچی کا شہر، اس کی سمندر جیسی آبادی میں موجود کروڑوں مچھلیوں کے درمیان پھرنے والے خون کے پیاسے مگرچھ۔ شریف انسانوں کو احمق اور کمزور سمجھنے والے مانیہ کے رکن۔ اسٹریٹ کرائم سے دھماکوں اور پریچوں سے وشت پھیلا کے اپنا کاروبار چلانے والے کم ستھے، بہت کم۔ آئے میں نمک کے برابر بھی نہیں مگر انہوں نے بہت بڑی اکثریت کو جو انہیں اپنی طاقت سے چٹکیوں میں مسل دیتی، بزدل اور خود غرض بنا دیا تھا۔ نظر نہ آنے والی اقلیت متحد تھی۔ شریف آدمی کہلانے والوں کی اکثریت متحد نہیں تھی۔ پھر اپنی مدد آپ کا اصول ہی بٹا کا ضامن تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ جب نہ قانون آپ کے ساتھ ہو اور نہ حکومت تو پھر شیدا پستول جیسے کردار ابھرتے ہیں۔ وحشی گجر اور جیرا بلڈ سائے آتے ہیں۔

قاسم نے زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ اس کے نزدیک دوسرے سب لوگوں کے جینے کا حق بعد میں آتا تھا۔ پہلے اس کی اپنی زندگی اہم تھی۔ اب وہ ایک نیا آدمی تھا جو نئے زمانے سے نمٹ سکتا تھا۔ خواہ وہ کیسا بھی ہو۔ قاسم وہ جذباتی احمق نہیں رہا تھا جو اپنے مستقبل کے لیے خطرہ بننے والے کی موت پر آنسو بہا رہا تھا اور خود کو اس کی موت کا ڈٹے دار سمجھ کے احساس جرم کی سزا پارہا تھا۔ یہ تو قانونِ تقدیر ہے۔ بٹا اسی کے لیے ہے جو مخالف حالات سے نمٹ سکے۔

پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ غلام محمد عرف استاد گٹھو کے پاس جائے لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ بدل کے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک نمبر ملا یا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر کسی نے کہا۔ ”کیا ہے؟“

”مجھے سلطان بھائی سے بات کرنی ہے۔“

”کون ہے تو؟“ کوئی فرمایا۔

قاسم نے پہاڑ جیسی دو گالیاں لڑھکا کیں۔ ”بھونکنے کی ضرورت نہیں۔ جو کہا ہے، وہ کر۔“

ہوں میں لیکن وہ حرام زاوے پرانے پانی کھتے ہیں۔ مجھ سے میرا مطلب ہے ایاز سے کہا کہ ہم سے بارگیننگ کرنے میں وقت ضائع مت کرنا۔ ہم ایک بات کرتے ہیں اور بس۔“

”اچھا؟ یہ کہا انہوں نے۔“ وہ متفکر ہو گئی۔ ”تم ایاز سے کہو کہ وہ ایک کروڑ دے گا۔ میں دوں گی مگر ایاز سے کہو مجھ سے ملے۔ میں اسے روپوش رکھ سکتی ہوں اور اس کی حفاظت بھی کر سکتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا لیکن وڈیو ریکارڈنگ پھر بھی چاہیے مجھے۔“

ڈیڑھ گھنٹے بعد قاسم کو وڈیو ریکارڈنگ مل گئی۔ وہ دہری کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اب امکان پیدا ہو گیا تھا کہ مجرم پکڑ لیے جائیں اور پولیس ان سے اعترافِ جرم بھی کرا لے۔ دوسری ایاز کے لیے واقعی خوش خبری تھی۔ اس کی محبت سچی ہے۔ ایک کروڑ کی رقم وہ اس کی جان کا صدقہ دے سکتی ہے۔ اس پر وار کے سپینک سکتی ہے اور آج کے زمانے میں۔ واقعی عشق کی کوئی سرحد نہیں۔ نہ عمر، نہ رنگ، نہ مذہب اور نہ غربت۔

ان دونوں نے فلیٹ میں قلعہ بند ہو کے اپنے وڈیو سسٹم پر ساری ریکارڈنگ دیکھی۔ ایاز کو تاریخ اور وقت کا اندازہ تھا چنانچہ انہوں نے وہی حصہ دیکھا۔ ایک ایک فریم کو زوم کر کے خریداروں کے چہرے دیکھے جو سامان سے بھری گلیوں میں ٹرائی لیے گھوم رہے تھے۔ مرد عورت بچے اور اچانک وہ سامنے آ گئے۔ اس لیے بھی کہ جو خریدار تھے وہ ایاز کو دیکھ رہے تھے اور نہ کیمرے کو۔ وہ خریداری میں مصروف تھے۔

”یہ... ایاز چلتا یا۔“ یہی ہیں وہ۔ یہ پہلے دن اکیلا تھا۔ دوسرے دن اس کو ساتھ لے آیا۔ دیکھ کس طرح ان کی نظر مجھ پر فوکس ہے۔“

قاسم نے اس فریم کو زوم کیا اور اسٹین کر کے پرنٹ نکال لیا۔ ”اب دو رہیں لگا کے دیکھ، اپنے ماضی میں کہ ان کی صورت کس سے ملتی ہے۔ گیارہ سال پہلے کس کے چہرے کا تصور ابھرتا ہے۔“

”میں نے دیکھ لیا۔ شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ اس کا بیٹا ہے جسے میں نے قتل کیا تھا دوسرا اس کا بھائی ہوگا یا دوست۔“

”نام یاد ہے؟“

”مکاب خان یوسف زئی۔“ ایاز بولا۔ ”بڑی بڑی

ہارمٹ کلنگ کا شکار ہونے والوں کا صرف اسکوڑھا۔ سترہ افراد مختلف علاقوں میں مارے گئے تھے۔ نہ مدی نہ شہادت۔ ہارمٹ کلنگ کی مہر لگاؤ اور کیس کو داخل دفتر کرو۔ اس نے مزید تفصیل دیکھی تو اسے کچھ نام نظر آئے۔ مطمئن ہو کے اس نے اخبار رکھ دیا۔

رات کو اس نے سرسری انداز میں ایاز سے کہا۔ ”کل سے تو جا اپنا کام کر۔“

”کام پر جاؤں؟“

”ہاں، یہ اخبار دیکھ لے۔ ان میں مرنے والوں کے نام ہیں۔ سب کے تو نہیں مگر ایک نام خاص ہے چاہے تو صبح جانے سے پہلے سرکاری مردہ خانے میں دیکھ لیتا جہاں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے پڑی ہیں یا ایڈمی کے سرد خانے میں جہاں لاوارث رہ جاتے ہیں۔“

☆☆☆

صرف ایک مہینے بعد سہرا باندھے قاسم کی کار اپنی کلی میں داخل ہوئی تو پرانے محلے دار دونوں طرف کھڑے تھے۔ کلی کے آغاز میں ”خوش آمدید“ والا گیٹ تھا اور آگے اس پر پھول برسائے والوں کی قطار، کونٹوں پر سے جمائکتی اور کھڑکیوں سے نکلتی ہر عمر کی عورتوں نے چیخ ماری۔ ”دو لہا آگیا۔ دو لہا آگیا۔ ہائے اللہ کتنا خوب صورت ہے اور گاڑی اس کی اپنی ہے۔ سنا ہے ایک لاکھ لیتا ہے اب۔ ارے ایک نہیں دو۔ بڑے گھر کا بیٹا ہے۔“ نکاح انہی مولوی صاحب نے پڑھایا جنہوں نے دوسرے دن محلے والوں کے ڈر سے قاسم کو مسجد میں سونے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ نکاح اسی کمرے میں ہوا جو اس کی ماں کا کمرہ تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ آج کون تھا جو اس سے ذات اور نسب پوچھنے کی جرات کرتا۔ اس کے ماضی کے بارے میں سوال کرتا۔ یہ قاسم کی خواہش تھی کہ نکاح اسی گھر میں ہوگا۔ اگلے دن شہر کے سب سے بارونق اور مہنگے شادی ہال سے وہ دلہن کو اپنے گھر لے جائے گا۔ پھر دوسرے شاندار ہال میں دلیمہ ہوگا۔ جس میں شہر کے معززین اور سلطان بھائی بھی شریک ہوں گے۔ نکاح کے گواہوں میں ایک غلام محمد تھا اور دوسرا ایاز خان۔ وہ دن بہت پیچھے ماضی میں گم ہو گیا... جب اسے اپنے گھر کے دروازے سے دھکارا گیا تھا۔ دھکار نے والوں نے بھی جان لیا تھا کہ وقت بدل گیا ہے۔ انہیں بھی بدل جانا چاہیے۔



دوسری طرف خاموشی چھا گئی پھر سلطان کی آواز آئی۔ ”جی فرمائیے۔“ آواز میں وہی ملاعنت اور انکساری تھی جو قاسم نے پہلی بار محسوس کی تھی۔

”سلطان بھائی! آپ کا ایک نیاز مند ہوں میں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ کبھی ضرورت ہو تو اس نمبر پر بتا دینا۔“

”اچھا۔“

”اگر یاد ہو آپ کو... وہ صوفی تھا ایک الٹی کھوپڑی کا صحافی۔ مجھے پریشان کر رہا تھا۔ غلام محمد نے کہا تھا۔“

”وہ تو مجھے نہیں یاد۔ آپ بتائیے کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟“

”سلطان بھائی، دو بندے ہیں۔ وڈیو بھی ہے اور تصویر بھی۔ میری بہن کے شوہر کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ بھائی اسے بیوہ ہونے سے بچالیں۔“

کچھ دیر بعد آواز آئی۔ ”تصویر اور وڈیو بھیج دیں۔“ اور فون بند ہو گیا۔

قاسم نے پھر نمبر ملایا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تصویر یا وڈیو کہاں اور کس کو بھیجے مگر دوسری طرف سے ٹیپ چل پڑا۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔“ اسے سخت مایوسی ہوئی۔ شاید سلطان بھائی نے اسے ٹال دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے کچھ یاد نہیں اور کیسے یاد رہے گا جب ہر روز نئے احکامات جاری کرنے پڑتے ہوں۔ لیکن شام کو وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو چند سنٹ بعد کال بیل بجی اور اس نے دروازہ کھولا تو ایک لڑکی مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

”جی، کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ قاسم نے گھبرا کے کہا۔

”وہ تصویر اور وڈیو دے دیں مجھے۔“ اس نے مصحوبیت اور سادگی سے کہا۔

”آپ کو سلطان بھائی نے بھیجا ہے؟“

”جی نہیں۔ مجھے صدر صاحب نے بھیجا ہے۔“ وہ اتنی ہی سادگی سے بولی۔

قاسم نے تصویر اور وڈیو اس کے حوالے کی۔ وہ جتنی بے خونی سے آئی تھی اتنی ہی بے نیازی سے چلی گئی۔۔۔

یامیر نے خدا۔ کیا ہو گئی ہے یہ دنیا جس میں مجھے جینا پڑ رہا ہے۔ ادائے حسن کی مصحوبیت کو کم کر دے۔ گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے۔ ایسی سیدھی سادی شریف اور صرف محبت کے لائق لڑکی بھی؟ مگر عورت ہو یا مرد، جینے کی ضرورت تو سب کی مجبوری ہے۔

اگلے دن قاسم نے کئی اخبارات دیکھے لیکن ان میں



قانسٹا بابر نسیم

دولت کی چکا چوند وہ کام کروا دیتی ہے... جن کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے... دو ایسے ہی پارٹنرز کے مشترکہ کام کی نوعیت... دونوں ہم پلہ تھے... مگر ایک کا ارادہ تھا کہ دونوں ہلڑوں میں صرف وہی ہو...

قاتل و مقتول دونوں سامنے تھے... مگر قاتل کی تلاش جاری تھی

”آلہ قتل“، پولیس افسر نے کہا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے سانپ کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔ اس سانپ کی لمبائی تین فٹ کے لگ بھگ تھی اور اس کے جسم پر سرخ اور پیلے رنگ کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سانپ کا سر کچلا ہوا تھا اور تقریباً اہموار ہو چکا تھا۔

”یہ شوخ رنگ کا زہریلا سانپ کورل اسٹیک کھلاتا ہے۔“ سرائی رساں نے لاش پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے بتایا۔ ”یہ مردہ سانپ دفتر کے گوشے میں وہاں بیڑ کے ان

جاسوسی ڈائجسٹ — 57 — دسمبر 2014ء

دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اس قدر پریقین کیوں ہو کہ تمہارے پارٹنر کو سانپ ہی نے ہلاک کیا ہے؟" سراغ رساں نے کہا۔

"مجھے سانپ کے کاٹنے کے نشان دکھائی دے رہے ہیں۔ اس سانپ کو غور سے دیکھیں۔ مجھے وہ کہاوت ابھی

تک یاد ہے جو میں اپنے بچپن میں سنا کرتا تھا۔ زہریلے

کورل سانپ کو دیگر اقسام میں کس طرح شناخت کیا جاسکتا

ہے۔ پہلے پر سرخ رنگ قاتل سانپ... سیاہ پر سرخ رنگ

حیلے سے محفوظ نسل... یہ قاتل سانپ ہے کیونکہ اس کے جسم

پر ہلکی اور سرخ دھاریاں ہیں۔"

"تمہیں سانپوں کے بارے میں خاصی معلومات

ہیں؟"

ویٹرس نے قدرے جھرجھری سی لی اور واپس جانے

کے لیے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ سراغ رساں نے اسے

آواز دی۔ جب وہ ہلٹی تو سراغ رساں نے اس کے نام کے

ٹیک کو پڑھتے ہوئے کہا۔ "لیزا... کیا آج صبح تمہاری مسٹر

کارلائل سے ملاقات ہوئی تھی؟"

"جب میں کام پر آئی تھی تو میں نے ان کی لاش

وہاں پڑی ہوئی پائی تھی۔ تب میں نے آپ لوگوں کو فون کیا

تھا لیکن آج وہ شراب خانہ کھولنے کے لیے معمول سے جلدی

آگئے تھے۔ وہ اس بات کا یقین کر لیتا چاہتے تھے کہ ہم نے

ہیٹر کی دافر مقدار اسٹاک کر رکھی ہے یا نہیں۔ سینٹ پیٹرک

ڈے آئرش ہیپ میں سال کا مصروف ترین دن ہوتا ہے۔"

"اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنا کام فوری طور

پر ٹیٹا دیں تاکہ ہم منگائی وغیرہ کر لیں۔ ورنہ سہ پہر تک

مکانوں کا رش بڑھنا شروع ہو جائے گا۔" ایڈی نے کہا۔

"یہ جو لاش یہاں موجود ہے یہ تمہارے پارٹنر کی

ہے؟" سراغ رساں نے کارلائل کی لاش کی جانب اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔

"ویل، یقیناً۔" یہ درست ہے کہ ہم پارٹنر تھے لیکن

وہ ایک کاروباری آدمی بھی تھا۔ وہ حالات کے تقاضوں کو سمجھ

سکتا ہے۔" ایڈی نے کہا۔ "جب بھی ہمیں کاروبار کا موقع

ملے ضرور کرنا چاہیے۔"

"کاروبار کے لیے تمہیں اس وقت تک انتظار کرنا

ہوگا جب تک ہماری تحقیقات مکمل نہیں ہو جاتیں۔" سراغ

رساں نے جواب دیا۔

"اس طرح تو ہمارا دن ضائع ہو سکتا ہے۔"

ایڈی نے احتجاجی لہجہ میں کہا۔ "ہم یہ دن ضائع کرنے کے

کریٹس کے پیچھے پڑا ہوا ملتا ہے۔"

پولیس اسٹرکی لگا ہیں ہیٹر کے ان بکسوں کی جانب اٹھ

گئیں جو آئرش روزیپ کے عقبی داخلی دروازے کے ساتھ

ہے ہوئے چھوٹے سے دفتر کے ایک گوشے میں رکھے

ہوئے تھے۔

اسنے میں شراب خانے کا شریک مالک ایڈی جیزی

سے دفتر میں داخل ہوا۔ "اسے مرنا نہیں چاہیے۔" اس نے

اپنے پارٹنر کی لاش پر نظر کرنا جاتے ہوئے کہا جو فرش پر

پڑی ہوئی تھی۔ سراغ رساں لاش پر جھکا ہوا تھا۔ "کم از کم

سینٹ پیٹرک ڈے پر نہیں۔"

سراغ رساں نے لاش کی گردن پر موجود سوراخ کے

نشانات کا جائزہ لیا اور پھر اٹھ کر قریب سے مردہ سانپ کا

جائزہ لینے لگا۔

"کیا یہ سانپ پہلے کبھی یہاں دکھائی دیا تھا؟" سراغ

رساں نے ایڈی سے پوچھا۔

"ایسا زہریلا سانپ ساناٹا مونیکا شہر کے وسط میں

واقع اس شراب خانے میں کس طرح داخل ہوا ہو

گا؟" ایڈی نے قدرے حیرت سے کہا۔

"کوئی تو اسے یہاں لے کر آیا ہوگا۔" سراغ رساں

نے جواب دیا۔

"کون...؟"

"یہ ہم بتا لگائیں گے مسٹر ایڈی... ہم جان لیں گے

کہ تمہارے پارٹنر کو کس نے قتل کیا ہے۔"

"ہم جانتے ہیں کہ اسے کس نے ہلاک کیا ہے۔"

ایڈی نے کہا۔ "اسے سانپ نے ہلاک کیا ہے۔ اسے قتل

نہیں کیا گیا۔ سانپ کسی طرح اندر گھس آیا تھا اور اسے ڈس

لیا۔"

شارٹ اسکرٹ میں ملبوس ایک پستہ قد ویٹرس اوپر

تک بھرا ہوا دھسکی کا ایک چھوٹا گلاس لے کر آئی اور ایڈی کو

تھمایا۔

ایڈی نے دو گھونٹ میں وہ گلاس خالی کر دیا پھر خالی

گلاس ویٹرس کو واپس کرتے ہوئے بولا۔ "شکریہ... اب

ایک ایک گلاس سراغ رساں اور پولیس افسر کے لیے بھی

لے آؤ۔"

"ہم ڈیوٹی پر ہیں۔" سراغ رساں نے نفی میں سر

ہلاتے ہوئے کہا۔

"آپ اس قاتل سانپ کو نیچے کیوں نہیں رکھ

دیتے۔" ایڈی نے خوف زدہ نظروں سے مردہ سانپ کو

”ڈاکٹر صاحب! میرے بہرے پن کے علاج کی آپ کتنی فیس لیں گے؟“
 ”دو ہزار خرچ آئے گا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔
 ”تو ہزار؟“ مریض نے تصدیق چاہی۔
 ڈاکٹر نے مریض کے چہرہ بھاٹتے ہوئے قلاباری کھائی اور رکھائی سے بولا۔ ”نہیں، پندرہ ہزار۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ مریض نے سر جھکا کر کہا۔

سکون

ریل میں سفر کا آغاز ہوتے ہی دو محروموں نے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا۔
 ایک کہہ رہی تھی کہ کھڑکی کھولی گئی تو وہ سردی سے ٹھنڈ کر مر جائے گی۔ دوسری بغندھی کہ کھڑکی بند کی گئی تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔
 مسافر اس عجیب جھگڑے سے سخت پریشان تھے۔ کسی نے تنقید آکر گارڈ کو خبر دی۔ اس نے بہت سفیدگی سے دونوں کا موقف سنا پھر مسافروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”پہلے کھڑکی کھولو، ایک مر جائے گی۔ اس کے بعد کھڑکی بند کر دو، دوسری کا قصہ بھی تمام ہو جائے گا اور بقیہ لوگوں کا سفر سکون سے طے ہو جائے گا۔“

اوکاڑہ سٹی سے تصویرالحین کا فیصلہ

اثر دکھایا ہوگا اور وہ جان گنوا بیٹھا ہوگا۔ صاف ظاہر ہے ایسا ہی ہوا ہوگا۔۔۔ ہے ناں۔۔۔؟“
 ”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔“ سراغ رساں نے کہا۔ ”کیا مسٹر کارلائل عام طور پر صبح سویرے شراب کا جام لیا کرتے تھے؟“ ساتھ ہی سراغ رساں نے میز پر موجود ایک گندے جام کی جانب اشارہ کیا۔
 ایڈی نے شانے اچکا دیے۔۔۔ لیزا نے بھی شانے اچکا دیے۔

سراغ رساں نے ہاتھوں میں ایک حفاظتی دستانہ چڑھایا اور اس شیشے کے گندے جام کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ کون سا مشروب پیا کرتے تھے؟“
 ایڈی نے شانے اچکا دیے۔ لیزا نے بھی شانے اچکا دیے۔

سراغ رساں نے جام کو سونگھا اور پھر تیزی سے اسے دور ہٹا دیا۔

تمحل نہیں ہو سکتے۔ کم از کم سینٹ پیٹرک ڈے پر نہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ پلیز، آفیسر۔۔۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔“
 ”یہ ایک قسم کا طعنے ہے۔“ باوردی پولیس افسر نے درمیان میں فقرہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”سینٹ پیٹرک ڈے پر سانپ بہ طور قاتل جبکہ سینٹ پیٹرک نے آئر لینڈ سے تمام سانپوں کو نکال باہر کر دیا تھا۔“

”سراغ رساں نے باوردی پولیس افسر کی جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور پوچھا۔ ”کیا کورڈر روانہ ہو چکا ہے؟“

”راستے میں ہے۔“ پولیس افسر نے جواب دیا۔
 ”اس نے مجھے آپ کو یہ بتانے کا کہا ہے کہ کورل سانپ کا زہر سانس لینے والے عضلات کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اس سے عمل تحفہ رک جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔“

سراغ رساں ایڈی کی جانب گھوم گیا۔ ”کیا مسٹر کارلائل کا کوئی دشمن بھی تھا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں۔۔۔ ایک دشمن تھا۔“ ایڈی نے غرا تے ہوئے کہا۔ ”یہ کم بخت سانپ۔۔۔“

ایڈی کے درشت لہجے پر کمرے میں موجود ہر فرد نے رد عمل ظاہر کیا۔ سراغ رساں نے شانے تانتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اپنی پشت پر رکھ لیے اور تھکا ہوں سے ایڈی کو گھورنے لگا۔ ویٹس لیزا نے اپنے سر کو پیچھے کی جانب جھکا سا دیا اور ایڈی کی جانب اپنے ہاتھ سے ایک اشارہ کیا۔ یہ بات سراغ رساں نے نوٹ کر لی۔ اپنی یہ حرکت سراغ رساں کی نگاہ میں آنے پر ویٹس لیزا کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کے تاثرات منڈلانے لگے۔

”سوری۔۔۔“ ایڈی نے کہا۔ ”میں فکر مندی سے بولا سا گیا ہوں۔ میرا پارٹنر مر گیا ہے۔ یہ سال میں سب سے زیادہ کمائی کا دن ہے۔ کاروبار کی حالت تشویشناک ہے، ہم آج کے دن زیادہ سے زیادہ آمدنی کی توقع کر رہے ہیں۔“

پھر ایڈی نے پولیس افسر کے ہاتھ میں دے ہوئے سانپ کی جانب اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”جیسا کہ میں نے کہا تھا صاف ظاہر ہے کہ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔۔۔ سانپ نے کارلائل کو چو لکا دیا ہوگا۔ اس نے کارلائل کو ڈس لیا ہوگا اور پھر بھاگنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن کارلائل نے اسے جالیا ہوگا اور اس کے سر کو اپنے جوتے یا کسی اور شے سے ٹکرا دیا ہوگا۔ لیکن پھر زہر نے اس پر اپنا

”اس میں سے تو عجیب سی بو آرہی ہے، یہ مکمل طور پر شراب کی بو ہرگز نہیں ہے۔“

سراغ رساں نے جام ایڈی کی جانب بڑھایا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ تب سراغ رساں ویٹرس لیزا کی جانب گھوم گیا۔ وہ بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سراغ رساں نے خالی جام نیچے رکھ دیا۔ ساتھ ہی پولیس افسر کو اشارہ کیا کہ وہ مردہ سانپ کو نیچے ڈال دے۔ پولیس افسر نے سراغ رساں کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ہاتھ خالی کر لیے۔

”کیا اب ہم شراب خانہ کھولنے کی تیاری شروع کر دیں؟“ ایڈی نے پوچھا۔ ”ہم صرف بار میں کام کریں گے۔ یہاں عقیقی دفتر سے دور رہیں گے۔“

”تم سانپوں کے بارے میں بہ خوبی جانتے ہو۔“ سراغ رساں نے ایڈی سے کہا۔

ایڈی ساکت ہو گیا۔ اس نے ویٹرس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوف نمایاں ہو گیا۔

”میرے آفیسر نے سینٹ پیٹرک کے بارے میں جو داستان سنائی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے آئرلینڈ سے سانپوں کو نکال باہر کیا تھا اور وہاں سے ان کا صفایا کر دیا تھا۔ درحقیقت سینٹ پیٹرک کی آئرلینڈ میں آمد سے قبل وہاں کوئی سانپ نہیں تھے۔ آئرلینڈ کی سرزمین پر ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ کیا تم یہ بات جانتے ہو؟“ یہ سوال سراغ رساں نے براہ راست ایڈی سے کیا تھا۔ ”سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ کلیشیرز سے متعلق تھا۔“

”اچھا ایسا تھا؟ یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔“ ایڈی نے جواب دیا۔

سراغ رساں نے خالی جام کی طرف اشارہ کیا۔ ”سینٹ پیٹرک نے سانپوں سے نجات کا کریڈٹ حاصل کیا جبکہ وہاں سانپوں کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس بے چارے سانپ، اس کورل سانپ کو بھی قتل کا کریڈٹ دیا جا رہا ہے لیکن یہ اس کو کس طرح مار سکتا تھا جو پہلے ہی مرا ہوا تھا۔“ کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

”کوئی سوال نہیں...؟“ سراغ رساں نے جھوٹ موٹ حیرت سے اپنی بھوئیں اچکاتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً تمہارے پاس سوال کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں کیونکہ تم اس بات سے پہلے ہی واقف تھے۔ مسٹر کارلائل کے صبح کے مشروب میں جو کچھ بھی شامل کیا گیا تھا اس نے انہیں مار ڈالا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کورونر اس زہر کو تلاش کر لے گا جو عضلات تنفس کو اسی طرح مفلوج کر دیتا ہے جیسا کہ سانپ

کے زہر سے سانس لینے کا عمل رک جاتا ہے۔“

”کیا پاگل پن کی باتیں کر رہے ہو۔“ ایڈی نے کہا۔ اس نے مزید کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ بالآخر وہ بول پڑا۔

”یہ سانپ ہی تھا۔ کیا تمہیں گردن پر سانپ کے کانٹے کا نشان دکھائی نہیں دے رہا؟“

”مجھے دکھائی دے رہا ہے، میں حیران ہوں کہ سانپ مسٹر کارلائل کی گردن تک کس طرح پہنچا ہوگا۔ اونچائی پر کوئی ایسا شیلف بھی نہیں ہے کہ جس سے وہ نیچے ٹپک پڑا ہو۔ اور نہ ہی اس کے پر ہیں کہ یہ اڑتا ہوا ان کی گردن پر آ گیا ہو۔“

”اوکے...“ ایڈی یہ کہہ کر رک گیا۔ پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ”کارلائل اونگھ رہا ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ اونگھتے ہوئے نیچے گر پڑا ہو اور سانپ نے اسے جالیا ہو۔“

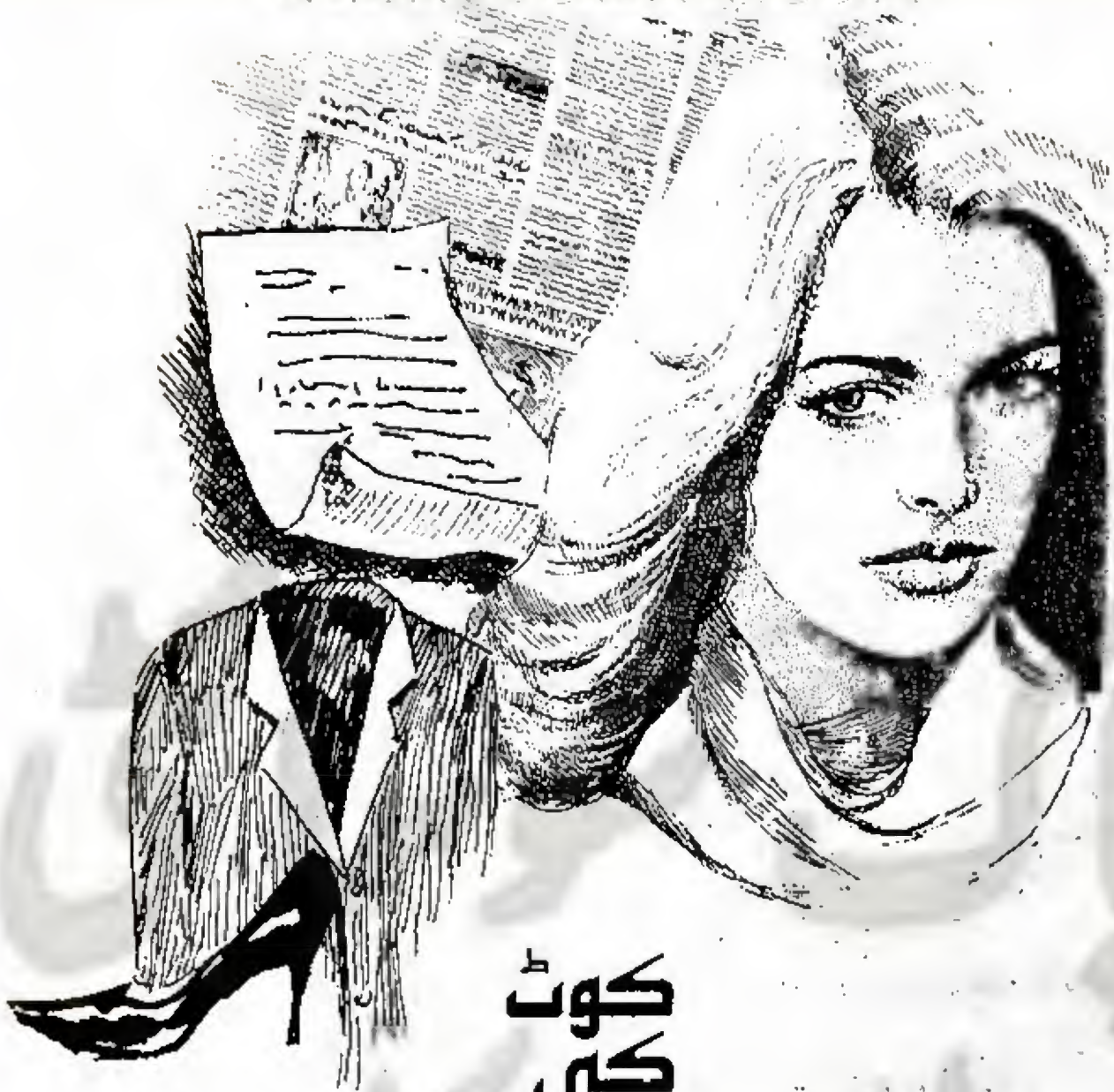
”یا ہو سکتا ہے کہ جب وہ پہلے ہی مر چکا ہو تو سانپ کے نوکیلے دانت اس کی گردن میں گاڑ دے گئے ہوں۔ دانتوں کے نشانات کے اطراف گردن پر کوئی خون دکھائی نہیں دے رہا۔ حتیٰ کہ خون کی ایک بوند تک نہیں ہے۔ جو کوئی بھی سانپوں کے متعلق معلومات رکھتا ہے اسے اس بات کا دھیان ہونا چاہیے تھا۔“

ایڈی نے بے بسی سے اپنے ہاتھوں کو اس طرح ملنا شروع کر دیا جیسے کہ مٹی کو بندھ رہا ہو۔ ”نہیں، نہیں... تم دیکھ سکتے ہو...“ وہ یہ کہہ کر رک گیا اور ویٹرس کو گھورنے لگا پھر ایک اونچی زوردار آواز میں چیخ کر بولا۔ ”مشروب میں ملاوٹ اس نے کی تھی۔“

”الحق... کہیں کے ا“ ویٹرس لیزا بھی پھٹ پڑی۔ ”وہ تمہیں کارڈ ہار سے علیحدہ کرنا چاہتا تھا۔ تم اپنے لیے اس کارڈ ہار کو بچانا چاہتے تھے... ہمارے لیے... ہم دونوں کے لیے۔“

تب سراغ رساں نے پولیس افسر کو اشارہ کیا تو اس نے اپنے پوئلیدیلٹ سے بندھی ہتھکڑی اتار لی۔ ”سینٹ پیٹرک کو اب بھی سانپوں سے نجات دلانے والے کی حیثیت سے یاد کیا جاتا رہے گا لیکن ہم اس بے چارے سانپ پر قتل کا جھوٹا الزام عائد نہیں کریں گے۔“ سراغ رساں نے کہا۔

ایڈی اور ویٹرس لیزا کے منہ لٹک گئے اور انہوں نے خاموشی سے ہتھکڑیاں پہننے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔



کوئی دھڑکتی دل

تویر ریاض

بعض اوقات بظاہر صاف اور عیاں نظر آنے والے منظر نامے کے پیچھے وہ کچھ چھپا ہوتا ہے جو نظر آنے کے بعد کسی قیامت سے کم نہ ہو... ایک سیدھی سادی لڑکی کی زندگی کے شب و روز... اچانک ہی اسے ایک کوٹ ملا... اور پھر داستان کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ ایک سرے کے بعد دوسرے سرے کی کھوج نے اسے سنگین راز سے آشنا کر دیا۔

ایسا سچ جس کی حقیقت نے وقت گزرنے کے بعد اپنی اہمیت کو غیر اہم ثابت کر دیا

”ڈاکٹر اسٹیوارٹ! یہ تمہاری غیر موجودگی میں کوئی دے گیا ہے۔“
لڑی اسٹیوارٹ نے اسی میل سے نظریں ہٹاتے ہوئے اپنی اسٹنٹ کلاڈیا کی جانب دیکھا۔ اس نے اپنے
بازوؤں میں ایک بڑا سا باکس پکڑا ہوا تھا اور خاصی پرجوش نظر آرہی تھی۔
”میں ایسی کسی چیز کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ یہ کہاں سے آیا ہے؟“

جاسوسی ڈائجسٹ 61 دسمبر 2014ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

والے کسی پر اتنا بھروسہ نہیں کرتے کہ ٹرک کے پاس پارسل رکھ کر چلے جائیں۔

کلاڈیا نے پُرشوق نگاہوں سے کوٹ کی جانب دیکھا اور بولی۔ ”کیا تم اسے پہن کر نہیں دیکھو گی۔ اگر یہ مسٹر چرڈ نے نہیں بھیجا تو یہ کسی اور کی جانب سے بھی تمہارے لیے تحفہ ہو سکتا ہے۔“

لڑی نے باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولی۔ ”شاید کسی نے ہمارے ادارے کو بطور عطیہ دیا ہو اور اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنا چاہتا ہو۔“

”لیکن کوئی اس قدیم زمانے کے کوٹ کو ایسے ادارے کے لیے عطیہ کیوں کرے گا جو سدرن کرائم اور پھر پر تحقیق کر رہا ہو۔“

”تم جانتی ہو کہ لباس بھی سدرن کلچر کا حصہ ہے۔“

”لیکن یہ تو بہت شاندار کوٹ ہے۔ لگتا ہے کہ کسی نے نیو یارک کے بڑے اسٹور یا ایسی ہی کسی دوسری جگہ سے خریدا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی نے اسے پہنا ہی نہ ہو۔“

لڑی نے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا جو باکس کی تہ میں رکھا ہوا تھا اور بولی۔ ”اس میں شاید ہمارے سوالوں کا جواب موجود ہو۔“

”یہ کاغذ کسی کا پی سے پھاڑا گیا تھا اور اس کے وسط میں صرف ایک ہی جملہ لکھا ہوا تھا۔ لڑی نے وہ کاغذ کلاڈیا کی طرف بڑھا دیا۔

”اپنے خالق کے پاس جانے سے پہلے یہ میں تمہیں بھیج رہی ہوں۔“ کلاڈیا نے بہ آواز بلند پڑھا اور مستفسرانہ بولی۔ ”اس کا خالق کیا یہ اشارہ خدا کی جانب ہے؟“

”میرا بھی یہی اندازہ ہے۔“

”لیکن اس تحریر اور کوٹ کے درمیان کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔“ کلاڈیا نے کہا۔

”تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ لڑی نے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کہ یہ کوٹ کسی ایسی عورت کا نظر نہیں آتا جو لکھنے کے لیے اس طرح کا کاغذ استعمال کرے۔“

”پھر تمہارے خیال میں یہ کوٹ کس عورت کا ہو سکتا ہے؟“

”وہ عورت جو اپنے چہرے ہوئے لیٹر پیڈ پر خط لکھے اور نوٹین چین کا استعمال کرے۔“ کلاڈیا نے کہا۔ ”وہ کسی بھی خدا کے پاس جانے کی بات نہیں کرے گی۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ جس عورت کا یہ کوٹ ہو وہ اب بوڑھی ہو چکی ہو اور خط لکھنے کے لیے اس نے اپنے پوتے یا

کلاڈیا نے نفی میں سر ہلا اور بولی۔ ”یہ معلوم نہیں۔ جو لڑکا یہ پارسل لے کر آیا ہے، وہ بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے یہ باکس کھپنی کے ٹرک کے پاس رکھا ہوا ملا تھا۔ جب اس نے اسے اٹھایا تو اس کے ساتھ ایک لفافہ بھی منسلک تھا۔“

”اس لفافے میں کیا تھا؟“

”ڈاک خرچ کے برابر رقم۔ چنانچہ وہ اس باکس کو دفتر میں لے گیا۔ وہاں اسے کھول کر دیکھا گیا اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ اس میں کوئی خطرناک چیز نہیں ہے تو سپردانہ زور نے کہا کہ اس باکس کو متعلقہ پتے پر پہنچا دیا جائے کیونکہ ڈاک خرچ کی ادائیگی ہو چکی ہے تاہم اس باکس پر بھیجنے والے کا نام اور پتہ درج نہیں ہے۔“

”حیرت ہے۔“ لڑی نے کہا۔

”تمہارے خیال میں اس میں کیا چیز ہو سکتی ہے؟“

کلاڈیا نے پُراشتیاق انداز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ لڑی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو اسے کھولنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔“

”ممکن ہے کہ کسی نے کانفرنس کے لیے کچھ بھیجا ہو۔“

”ہم جن تنظیموں کے لیے کام کر رہے ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو اپنا نام پتا ظاہر کیے بغیر اس طرح کوئی پارسل ہمیں بھیجے۔“

”مجھے تو یہ معاملہ بہت پُر اسرار لگ رہا ہے۔“ کلاڈیا کے لہجے میں ہلکا سا خوف جھلک رہا تھا۔

”ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“ لڑی نے کہا اور ورائز سے قنبلی نکال کر باکس پر لگا ہوا شیپ کاٹنے لگی اور جب اس نے باکس کا اوپری حصہ کھول کر وہ چیز باہر نکالی تو کلاڈیا کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ وہ ایک سیاہ ویلٹ کا کوٹ تھا جس کے کالر اور کلف پر سرخ کپڑا لگا ہوا تھا۔

”یہ تو بہت شاندار ہے ڈاکٹر اسٹیوارٹ۔“ کلاڈیا بولی۔ ”قدیم زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے کوٹ انہیں سو تیس یا چالیس میں استعمال کیے جاتے تھے۔“

لڑی نے کرسی کی پشت پر وہ کوٹ پھیلا دیا اور بولی۔

”تمہارا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے۔“

”ممکن ہے کہ کسی نے تمہیں یہ تحفے کے طور پر بھیجا ہو۔“ کلاڈیا نے کہا۔ ”اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسٹر چرڈ کی نظر اس پر پڑی ہو اور انہوں نے تمہیں حیران کرنے کے لیے یہ تحفہ بھیجا ہو۔“

”تم جانتی ہو کہ وہ پولیس میں رہ چکا ہے اور پولیس

صوت کس کو اب

صرف ایک منٹ لگے گا۔ ممکن ہے کہ وہاں سے کچھ پتا چل سکے۔“

”تمہارے پاس اس کی رسید تو ہوگی۔ وہ مجھے دے دو تاکہ میں اسے حفاظت سے رکھ دوں۔“

کلاڈیا نے رسید کی کاربن کاپی اسے حمادی جو وہ باکس کے ساتھ ہی لائی تھی اور بولی۔ ”ٹھیک ہے ڈاکٹر، اب سب ملاقات ہوگی۔“

اس کے جانے کے بعد لڑی نے دروازہ بند کیا اور کوٹ کو دربارہ غور سے دیکھنے لگی۔ کلاڈیا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ کوٹ انیس سو تیس یا انیس سو چالیس کے زمانے کا لگ رہا تھا اور اس لحاظ سے اس کا شمار قدیم نوادارت میں کیا جاسکتا تھا۔

”نہیں۔“ لڑی نے بہ آواز بلند خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”فی الحال اس بارے میں مت سوچو۔ اس کوٹ کو باکس میں رکھ کر الماری میں بند کر دو اور کانفرنس کے ختم ہونے تک اسے وہیں رہنے دو۔“

اس نے ایسا ہی کیا اور کوٹ کو باکس میں رکھ کر الماری میں بند کر دیا پھر اس نے جلدی جلدی ایک نظر کل کے پروگرام پر ڈالی تاکہ اطمینان کر سکے کہ کہیں کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ اس کے بعد گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس نے اپنے شوہر پر چڑ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ رات کے کھانے سے قبل گھر پہنچ جائے گی۔

☆☆☆

قدیم زمانے کے پتروں کی دکان پھر کے روز بند ہوتی تھی چنانچہ وہ منگل کو نئی الصباح وہاں پہنچ گئی لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہاں ابھی تک ’بند ہے‘ کا بورڈ آویزاں تھا۔ اس نے اپنے پروگرام کے بارے میں کلاڈیا، یار چرڈ کو نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ کلاڈیا کو اپنے ساتھ نہیں لانا چاہتی تھی اور چرڈ کو کچھ بتانے کا مطلب اپنا مذاق بنوانا ہوتا۔ وہ واپس ہو کر واپس جانے والی ہی تھی کہ دکان کا دروازہ کھلا اور کسی نے باہر آ کر وہ بورڈ ہٹا دیا۔ یہ دیکھ کر لڑی نے اطمینان کا سانس لیا اور باکس سمیت کار سے باہر آ گئی۔

دکان کی مالکہ کا نام کیرول بیکر تھا جب لڑی نے بتایا کہ وہ اسی کوٹ کے بارے میں بات کرنے آئی ہے جس کے بارے میں اس نے بیٹے کی سہ پہر کو فون کر کے بتایا تھا تو کیرول نے اپنی معاون کو کاؤنٹر پر رہنے کی ہدایت کی اور لڑی کو لے کر دکان کے قہقی حصے میں واقع اپنے دفتر میں آ گئی۔ اس نے باکس سے کوٹ نکالا اور اسے غور سے دیکھتے

پوتی کی کاپی سے کاغذ پھاڑا ہوا اور وہ مرنے سے پہلے اپنی چیزیں لوگوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہو۔“ لڑی نے کہا۔

”لیکن اس نے گناہم رہ کر یہ کوٹ کیوں بھیجا؟“ کلاڈیا نے پوچھا۔ ”اگر وہ بوڑھی عورت ہے تو اس کے لیے اس باکس کو بازوؤں میں اٹھا کر ٹرک تک لے جانا ممکن نہیں۔“

لڑی نے کوٹ اور اس کی پراسرار آمد کے بارے میں مزید بحث سے گریز کرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”پانچ بج چکے ہیں۔ اب تم اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے جاسکتی ہو۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری شام بہت اچھی گزرے گی۔ ویسے بھی کل کافی کام ہے۔ کانفرنس ٹھیک آٹھ بجے شروع ہو جائے گی۔“

”لیکن کیا تم اس بارے میں جانتا نہیں چاہتیں؟“ ”فی الحال میں صرف اس کانفرنس کے بارے میں سوچ رہی ہوں جس کی منصوبہ بندی ہم کئی مہینوں سے کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے ادارے کی پہلی کانفرنس ہے۔ کیا تم نے ان طالب علموں کی فہرست بنالی ہے جو کل مندوین کی رجسٹریشن کریں گے۔“

”ہاں۔“ کلاڈیا بولی۔ ”میں اور ڈاکٹر فیلڈنگ تمہاری غیر موجودگی میں یہی کام کر رہے تھے۔“

”ویسے ڈاکٹر فیلڈنگ اس وقت ہے کہاں؟“ ”ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی۔ ڈاکٹر فیلڈنگ نے تمہارے لیے پیغام دیا تھا کہ وہ کہیں جا رہی ہے تاکہ ڈین پیلر سے مل کر اسے یاد دلا سکے کہ کل صبح اسے مہمانوں کا استقبال کرنے کے ساتھ ساتھ انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ کا تعارف بھی کر دانا ہے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ گھر چلی جائے گی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہیں آدھی رات تک یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کتاب سارے کام ہو چکے ہیں۔“

”شکر ہے کہ تمہیں اس کا پیغام دینا یاد رہا۔“ ”مجھے یاد تھا لیکن جب تم آئیں تو اس وقت میں ٹیلی فون پر مصروف تھی۔ اس کے بعد ہم اس باکس میں الجھ گئے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر کوٹ پر نظر ڈالی اور بولی۔ ”کیا تم واقعی اس کے پیچھے والے کے بارے میں جانتا نہیں چاہتیں؟“

”نہیں۔“ لڑی بولی۔ ”اب تم گھر جاؤ۔ میں کل صبح تمہیں دروازہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے لیکن ڈیوری سمیٹی کو فون کرنے میں

ہوئے بولی۔ ”یہ اچھی حالت میں ہے۔ بس ایک آستین کہنی کے پاس سے تھوڑی سی کھسکی ہوئی معلوم ہو رہی ہے اور ویلوٹ پر گہری تہ نظر آرہی ہے۔ غالباً اسے کافی عرصے سے موڑ کر رکھا گیا تھا۔“

”مجھے کپڑوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔“ لڑی نے کہا۔ ”کیا یہ سلک ہے؟“

”کریم سائن۔“ بیلر نے کہا اور یہ کسی گارمنٹ کمپنی کا تیار کردہ ہے۔ گوکہ اس پر کوئی لیبل نہیں ہے لیکن بہت سے گاہک ایسے ہی لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر تم اسے نمائش میں رکھنا چاہتی ہو تو اس کے کوائف اس طرح بیان کیے جاسکتے ہیں۔ ”آرٹ ڈیکو۔ انیس سو تیس کا سیاہ ویلوٹ کوٹ۔“

”کیا تم یہ مجھے لکھ کر دے سکتی ہو؟“ لڑی نے کہا۔ ”مجھے خوشی ہوگی۔“ بیکر بولی اور دراز سے ایک پیڈ نکال کر اس پر کچھ لکھنے لگی۔

”تمہاری مدد کا بہت بہت شکریہ۔“ لڑی بولی۔ ”کوئی بات نہیں۔“ بیکر اسے کاغذ پکڑاتے ہوئے بولی۔ ”کیا ڈیوری کمپنی نے کچھ بتایا کہ یہ کوٹ کس نے بھیجا ہے؟“

”نہیں، ان کے دفتر میں گاہکوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس لیے کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی کہ کون اس باکس کو ڈیوری ٹرک کے پاس رکھ کر چلا گیا۔“

☆☆☆

توہ بوزومی عورت مین کے باہر اپنی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لڑی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارے آنے کا وقت ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم نے دوپہر کا کھانا چھوڑ دیا۔“

لڑی نے آگے بڑھ کر اکیلا نوے سالہ اور لینز کینے کی مالکن کے جھریوں بھرے گال کا بوسہ لیا اور بولی۔ ”میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ کانفرنس میں مصروف تھی۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ مس ایلس ایک خالی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا شو ہر کہاں ہے؟“

مکن سے آنے والی کھانے کی خوشبو نے لڑی کی بھونک اور بڑھا دی۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”وہ کسی بھی وقت یہاں آسکتا ہے۔ اگر اسے دیر ہوگئی تو میں اس کے بغیر ہی کھانا شروع کر دوں گی کیونکہ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

”لگتا ہے کہ تمہاری طرح وہ بھی بہت مصروف ہے۔“

”مس ایلس! اس سے پہلے کہ رچ ڈائے، میں تم سے کسی چیز کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”تم دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کر کے اپنے آپ کو مشکل میں ڈال لیتا ہو۔ بہتر ہوگا کہ یہی وقت اپنے شو ہر کو دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسری عورت اسے لے آئے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ لڑی صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تو ایک نمائش کی تیاری کر رہی ہوں اور تم سے ایک ایسے کوٹ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں جو کسی نے مجھے بھیجا ہے۔“

”میں یہاں کوٹ نہیں بیچتی پھر میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتا سکتی ہوں؟“

لڑی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”جانتی ہوں کہ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید تمہیں کچھ یاد ہو اگر کبھی تم نے اس طرح کا کوٹ دیکھا ہو۔“

یہ کہہ کر لڑی نے اپنے بیگ سے کوٹ کی ایک تصویر نکالی اور مس ایلس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ مس ایلس نے تصویر پر نظر ڈالی اور بولی۔ ”اس طرح کے کوٹ پرانی فلموں میں عورتیں پہنا کرتی تھیں۔ آج کل ایسے کوٹ نظر نہیں آتے۔ پر اسے زمانے میں بھی صرف امیر عورتیں ہی ایسے کوٹ پہن سکتی تھیں۔“

”کیا تم نے یہاں کسی عورت کو اس طرح کا کوٹ پہنے دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“

لڑی سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے امید تھی کہ شاید اس کوٹ کو دیکھ کر تمہیں کچھ یاد آجائے۔“

”تمہارا کہنا ہے کہ کسی نے یہ کوٹ تمہیں بھیجا ہے۔“

”مس ایلس کے لہجے میں تھوڑا سا جھجھک تھا۔

”ہاں مادام یہ مجھے گزشتہ بدھ کی سہ پہر کو ملا، اس پر کسی سیچنے والے کا ہتا نہیں تھا۔ میں یہی سمجھ رہی ہوں کہ کسی نے ہمارے ادارے کو یہ عطیہ کے طور پر بھیجا ہے لیکن میں اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی ہوں۔ شاید اس کے پیچھے کوئی کہانی ہو۔“

”اگر ایسی کوئی کہانی ہوتی اور سیچنے والا یہ چاہتا کہ تم اس کے بارے میں جان جاؤ تو وہ اس کوٹ کے ساتھ ہی کہانی بھی بھیج سکتا تھا۔“

”ہاں مادام لیکن بعض اوقات لوگ چاہتے ہیں کہ وہ چیزیں ہاتھوں میں لے جائے تو وہ ایسے گناہ عطیات بھیجتے

سکتی ہے۔ تب لڑی نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ کس کی تلاش میں یہاں آئی ہے اور اسے کیا معلومات درکار ہیں۔
”اس کے لیے تمہیں پرانے اخبارات کی مائیکرو فلمیں دیکھنا ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی مدد سے تم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی کہ اس زمانے کی عورتیں کیسا لباس پہنتی تھیں اور یہ تمہاری نمائش کے لیے ایک اچھا آئیڈیا ہوگا۔“

لڑی نے اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا بلکہ اس نے لائبریرین کو اپنے ارادوں کے بارے میں کم و بیش سب کچھ بتا دیا تھا۔ البتہ اس نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کسی خاص نوجوان عورت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہی ہے جو ایک خوب صورت سیاہ ویلٹ کا کوٹ پہنا کرتی تھی۔
وہ دو گھنٹے تک پرانے اخبارات کی مائیکرو فلمیں دیکھتی رہی لیکن اسے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ وہ کافی تھک چکی تھی اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور سوچنے لگی کہ بقیہ کام اگلے روز تک ملتوی کر دیا جائے لیکن پھر اسے اپنی مصروفیات کا خیال آ گیا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ لائبریری آنے کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ ابھی چار بجے تھے اور وہ مزید دو تین گھنٹے یہاں گزار سکتی تھی۔ اسے اسٹور کی مالکن کو رول بیکر کی بات یاد آئی جس کے مطابق یہ کوٹ 1930ء، 1940ء کے درمیان بنایا گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تلاش کو 1935ء کے اخبارات تک محدود کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے معاشرتی صفحات دیکھنے لگی تاکہ جان سکے کہ اس زمانے میں مقامی خواتین تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے کس طرح کا لباس استعمال کیا کرتی تھیں۔

سازمے آٹھ بجے اعلان ہوا کہ لائبریری آدھے گھنٹے بعد بند ہو جائے گی۔ لڑی نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ وہ ابھی تک کچھ معلوم نہیں کر پائی۔ اس نے مایوس ہو کر مائیکرو فلم مشین بند کر دی اور اٹھنے ہی والی تھی کہ اچانک اس کے ذہن نے ایک اور رخ سے سوچنا شروع کر دیا، اس نے کوٹ کے ساتھ آنے والی تحریر کے الفاظ پر غور کیا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوٹ بیچنے والی عورت واقعی مرگئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے انتقال کے بعد کسی رشتے دار نے یہ کوٹ لڑی کو بیچ دیا ہو۔ لڑی نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اخبارات میں گزشتہ چند ہفتوں کے دوران ہونے والی اموات کے بارے میں جان سکے۔
اس نے تمام اخبارات چھان ڈالے لیکن ان میں

ہیں لیکن اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے۔“
”اگر تم یہ بات جانتی ہو تو پھر اتنی چھان بین کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ مس ایلس بولی۔
”شاید یہ ممکن نہیں کیونکہ میرا جستجو بڑھ گیا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تم یہ تحریر دیکھ رہی ہو؟“ یہ مجھے کوٹ کے ساتھ ہی ملی ہے اور اس پر ایک ہی جملہ لکھا ہے۔
”تم بھی پڑھ لو۔“

مس ایلس نے زیر لب وہ تحریر پڑھی جس میں لکھا تھا۔ ”اپنے خالق کے پاس جانے سے پہلے میں یہ کوٹ تمہیں بھیج رہی ہوں۔“ پھر بولی۔ ”گتا ہے کہ وہ اپنے گھر کی صفائی کرنا چاہ رہی تھی۔“

”میرے دماغ میں بھی یہی بات آئی تھی لیکن اس کے لیے اس نے ہمارے ادارے کا انتخاب ہی کیوں کیا؟ وہ اپنے کسی رشتے دار کو بھی یہ کوٹ دے سکتی تھی۔“
”شاید اس نے سوچا ہو کہ یہ کوٹ تمہارے ادارے کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے کسی رشتے دار کو دیتی تو شاید وہ اسے بیچ دیتے۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی مال دار عورت تھی۔ کم از کم اس کوٹ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“
”ٹھیک ہے پھر تم کسی ایسی بوڑھی مالدار عورت کو تلاش کرو جو بستر مرگ پر ہو شاید اس طرح یہ معلوم ہو جائے کہ کس نے یہ نفیس کوٹ تمہیں بھیجا ہے۔“
لڑی جیتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ مس

ایلس۔“
اس کا جملہ ختم ہوتے ہی رچرڈ بھی آ گیا۔ وہ مس ایلس کی میز کے پاس پہنچ کر تعظیماً جھکا اور بولا۔ ”کیسی ہو مس ایلس؟ کیا تجھے یہ کہنے کی اجازت ہے کہ تمہیں دیکھنے کے بعد میرا دل بہت اچھا لگتا ہے۔“

”پھر تو تمہیں صبح کا ناشتا بھی کیوں کرنا چاہیے؟“ مس ایلس مسکراتے ہوئے بولی۔ ”آؤ، میرے پاس بیٹھو۔“
لڑی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوٹ کی تصویر اپنے ہیک میں ڈال لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ رچرڈ یہ تصویر دیکھے اور اس کا سوڈ خراب ہو جائے۔

☆☆☆

لڑی کی اگلی منزل پبلک لائبریری تھی لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریلز روم کی لائبریری میں بیماری کی وجہ سے چھٹی پر ہے تاہم اس کی جگہ ڈیوٹی پر موجود عورت نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ اس کی کیا مدد کر

سلسلے میں آئی ہوں جو غالباً انیس سو تیس کا بنا ہوا ہے اور مجھے کسی نامعلوم شخص نے ڈاک کے ذریعے بھیجا ہے۔ میں اس کوٹ کی مالکن کو تلاش کر رہی ہوں کیونکہ اسے نمائش میں رکھنا ہے اور چاہتی ہوں کہ بھیجے والا شخص مجھے اس کوٹ کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرے۔“

پیٹ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اس کوٹ کا آنٹی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”مجھے اس کوٹ کے ساتھ ایک تحریر ملی تھی جس میں کوٹ کی مالکن نے اپنی متوقع موت کا ذکر کیا تھا۔ چنانچہ میں نے گزشتہ دو ہفتوں کے اخبارات دیکھے جن سے مجھے تمہاری آنٹی کے انتقال کا پتا چلا اور یہ بھی کہ وہ ایک ہاؤس کیپر تھیں میرا خیال ہے کہ یہ کوٹ ان کی مالکن نے انہیں دیا ہوگا۔“

پیٹ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”تم غلط جگہ پر آگئی ہو، میں نے آنٹی کے مرنے کے بعد خود ان کا سامان بیگ کیا تھا اور ان میں جو قابل استعمال اشیاء تھیں، وہ خیراتی اداروں اور چرچ کو بھیج دی گئی تھیں۔“

لڑی نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے کوٹ کی تصویر نکالتے ہوئے بولی۔ ”اس تصویر کو دیکھو۔ شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔“

پیٹ نے تصویر دیکھی اور دوبارہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”بہت شاندار کوٹ ہے لیکن میں نے اسے پہلے بھی نہیں دیکھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ لڑی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے قیمتی وقت کا شکریہ۔“

”کوئی بات نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری کوئی مدد نہ کر سکی۔“

وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور ایک نو عمر لڑکی اندر داخل ہوئی۔ پیٹ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری بیٹی جین ہے۔“

لڑی نے غور سے جین کو دیکھا اور پیٹ سے بولی۔ ”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اس کوٹ کی تصویر تمہاری بیٹی کو بھی دکھا دوں۔“

”دکھا دو لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ پیٹ بولی۔ ”جب مجھے اس کوٹ کے بارے میں کچھ علم نہیں تو اسے کیا معلوم ہوگا؟“

”کیسا کوٹ؟“ جین بولی۔

... کسی سفید فام عورت کے انتقال کی خبر نہیں ملی پھر ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا، یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوٹ بھیجنے والی عورت کوئی سیاہ فام ملازمہ ہو جسے اس کی مالکن نے یہ کوٹ بخش دیا ہو یا پھر اس نے خود ہی مالکن کے مرنے کے بعد اس کی الماری سے یہ کوٹ نکال لیا ہو اور اب وہ مرنے سے پہلے اپنے اس جرم کی تلافی کرنا چاہ رہی ہو چنانچہ اس نے ایک بار پھر اخبارات کھنگالنے شروع کر دیے۔ اس مرتبہ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی وفات کا کالم دیکھ رہی تھی۔

نوبتے میں پانچ منٹ اور باقی تھی جب اسے مطلوبہ خبر مل گئی۔ وہ تیزی سے فوٹو اسٹیٹ مشین کی جانب لپکی تاکہ اس صفحے کی نقل حاصل کر سکے۔ آپریٹر نے اسے دیکھ کر برا سا منہ بنایا تاہم لائبریری بند ہونے میں چند منٹ باقی تھے لہذا اسے لڑی کی فرمائش پوری کرنا پڑی۔

☆☆☆

دروازہ کھولنے والی عورت نے اسے غور سے دیکھا اور بے یقینی سے بولی۔ ”کیا تم ہی پروفیسر اسٹیوارٹ ہو؟“

”ہاں، بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے ملنے کا وقت دیا۔“

”اندر آ جاؤ۔“ وہ عورت ایک طرف پٹتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام پیٹ ہے، پیٹریشیا فریزر، جیسا کہ فون پر بتا چکی ہوں کہ تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گی کیونکہ مجھے ایک گھنٹے بعد اسپتال جانا ہے۔“

”کیا تم نرس ہو؟“

”نہیں، میں استقبالیہ پر بیٹھتی ہوں۔“

لڑی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مسز کنگ تمہاری آنٹی تھیں؟“

”ہاں، تمام رشتے داروں میں وہی ایسی تھیں جن کی موجودگی سے میں لطف اندوز ہوا کرتی تھی۔“

”کیا وہ تمہارے ساتھ ہی رہتی تھیں؟“

”ہاں، وہ ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ میری ایک بیٹی بھی ہے۔ شوہر سے طلاق ہو چکی ہے۔ درنہ وہ تو میرے کسی رشتے دار کو گوارا نہ کرتا۔“

”میں تمہاری آنٹی کی بات کر رہی ہوں۔“

”کیا تم ہاؤس کیپر کے بارے میں کوئی تحقیق کر رہی ہو؟“

”جی نہیں، میں نے تمہیں فون پر بتایا تھا کہ ایک ادارے کی ڈائریکٹر ہوں اور تمہارے پاس ایک کوٹ کے

کوٹ کس کو اس

جائے۔

”تم نے پروفیسر کا پتا کیسے معلوم کیا؟“

جین بولی۔ ”مجھے یہ جاننے میں تھوڑا سا وقت لگا کہ آنٹی لی وی پر کون سا پروگرام دکھ رہی تھیں پھر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ انہوں نے یقیناً دو پہر کی خبروں میں اس پروفیسر کو سنا ہوگا چنانچہ میں نے تینوں لی وی اسٹیشنز فون کر کے معلوم کیا کہ اس روز وہ کس کا انٹرویو کر رہے تھے اور اس طرح مجھے پروفیسر کا پتا معلوم ہو گیا۔“

”بہت خوب۔“ لڑی بولی۔ ”باقی دادے، میں ہی لڑی اسٹیوارٹ ہوں۔“

”اوہ میرے خدا! جین۔۔۔ حیرت سے بولی۔“ تو یہ تم ہو۔ کیا تمہیں وہ کوٹ مل گیا؟ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ لڑی بولی۔ ”وہ کوٹ مجھے مل گیا ہے اور میں صرف یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس کا بیچنے والا کون ہے تاکہ اس سے مل کر اس کوٹ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر سکوں کیونکہ میں اسے نمائش میں رکھنا چاہتی ہوں، مجھے حیرت ہے کہ بیچنے والے نے اسے ڈیوری ٹرک کے پاس کیوں رکھ دیا۔“

”کیا؟“ پیڑیشیا اپنی بیٹی کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری آنٹی نے یہ کوٹ پروفیسر کو بیچنے کے لیے کہا تھا اور۔۔۔“

”میں ڈر گئی تھی۔“ جین بولی۔ ”آنٹی نے جس انداز میں یہ کوٹ بیچنے کی بات کی تھی، اس سے مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ تمہیں یہ کوٹ چوری کا تو نہیں یا پھر اس کے ساتھ کوئی اور مسئلہ ہے۔ اسی لیے میں نے باکس پر بیچنے والے کا نام اور پتا نہیں لکھا اگر میں ڈیوری کمپنی کے کاؤنٹر پر جاتی تو وہ اس کے بغیر باکس قبول نہ کرتے لہذا میں نے اسے ٹرک کے برابر میں رکھ دیا اور ساتھ ہی اس کی فیس بھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ یہ باکس مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیں گے۔“

”انہوں نے ایسا ہی کیا۔“ لڑی بولی۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ۔ کیا تم مجھے اس عورت کے بارے میں بتا سکتی ہو جس نے تمہاری آنٹی کو یہ کوٹ دیا تھا؟“

”ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے پھر اتنی چھان بین کیوں کر رہی ہو؟“ جین بولی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ لڑی نے کہا۔ ”میں صرف یہ چاہ رہی تھی کہ جب ہم اس کوٹ کو نمائش میں رکھیں تو ہمارے پاس اس کی مالکین کے بارے میں مکمل معلومات ہوں۔“

لڑی نے تصویر جین کو دی اور بولی۔ ”ہم اس کوٹ کی بات کر رہے ہیں۔ کیا تم اسے پہچانتی ہو یا تم نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے؟“

جین بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ آنٹی نیز کے پاس ایسا کوٹ تھا۔“

پیٹ نے اپنی بیٹی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ آنٹی کے پاس ایک سیاہ ویلوٹ کا کوٹ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں نے اسے نہ دیکھا ہو۔“

”کیونکہ آنٹی نے یہ کوٹ میرے پاس رکھوایا تھا۔ جب وہ ہمارے گھر رہنے کے لیے آئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اسے اپنے کمرے میں رکھ لوں۔ وہ چاہتی تھیں کہ جب تک وہ یہ فیصلہ نہ کر لیں کہ اس کا کیا کرنا ہے میں اس کوٹ کو چھپا کر رکھوں۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر کسی دوسرے رشتے دار کی نظر اس پر پڑ گئی تو وہ یہ کوٹ مانگ سکتا ہے۔“

”اور تم نے مجھے بھی اس بارے میں نہیں بتایا؟“ پیٹ غصے سے بولی۔

”آنٹی نے کہا تھا کہ میں کسی سے بھی اس کوٹ کا تذکرہ نہ کروں۔“

لڑی بولی۔ ”کیا تمہاری آنٹی نے بتایا تھا کہ ان کے پاس یہ کوٹ کہاں سے آیا؟“

”انہوں نے کہا تھا کہ وہ جس گھر میں کافی عرصہ پہلے ہاؤس کیپر کے طور پر کام کرتی تھیں، ان کی لڑکی نے جانے سے پہلے یہ کوٹ انہیں دیا تھا۔“

”وہ لڑکی کہاں چلی گئی تھی؟“ لڑی نے پوچھا۔

”انہوں نے یہ نہیں بتایا۔ دراصل وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے بس اتنا کہا کہ میں یہ کوٹ اپنے پاس رکھ لوں۔ چنانچہ میں نے اسے ایک باکس میں بند کر کے الماری میں رکھ دیا جب تک انہوں نے نہیں بتایا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔“

”پھر انہوں نے اس بارے میں کیا فیصلہ کیا؟“

”جب ان پر نمونیہ کا حملہ ہوا تو میں انہیں دیکھنے اسپتال گئی۔ انہوں نے لی وی پر کسی پروفیسر کو سنا تھا جس نے یونیورسٹی میں کوئی ادارہ قائم کیا ہے۔ آنٹی نے کہا کہ ان کے مرنے کے بعد یہ کوٹ اس پروفیسر کو عطیہ کے طور پر بھیج دیا جائے۔ انہوں نے مجھ سے ایک کاغذ مانگا اور اس پر ایک تحریر لکھ کر میرے حوالے کی اس تاکید کے ساتھ کہ یہ تحریر بھی کوٹ کے ہمراہ پروفیسر کے ہتے پر بھیج دی

کو تھک گواہی

ڈالرز بھی جمع کروائے تھے۔“

”اس زمانے کے لحاظ سے تو یہ ایک بڑی رقم تھی۔“
رچرڈ نے کہا۔

”ہاں، لیکن نیز نے کبھی اس پیسے کو ہاتھ نہیں لگایا اور اس میں ہر سال اضافہ ہوتا رہا۔ تین سال پہلے اس نے ایک وکیل سے رابطہ کر کے کہا کہ اس رقم سے ایک ٹرسٹ فنڈ قائم کیا جائے جو چین کی تعلیم میں استعمال ہو۔“ لزی نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”ہیئریشیا نے مجھے فون کیا کیونکہ وہ اس بات پر حیران تھی کہ ریٹائی بروک نے اس کی آنٹی کو دس ہزار ڈالرز کیوں دیے تھے۔“
”پھر تم نے کیا کہا؟“

”یہی کہ میری سمجھ میں ایسی کوئی وجہ نہیں آتی کہ انہیں یہ ٹرسٹ فنڈ کیوں نہیں قبول کرنا چاہیے۔“
”اب تم اس سے کیا کہو گی؟“

”کچھ نہیں۔“ لزی نے جواب دیا۔ ”میں اب بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ انہیں یہ رقم کیوں نہیں قبول کرنا چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ ریٹائی بروک نے اپنی اونچی ایڑی کے جوتے کو کس مقصد کے لیے استعمال کیا، اس کا سوتلا باپ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس نے اپنی فیکٹری میں کام کرنے والے لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس نے ایک امیر بیوہ سے شادی کی جس کی بیٹی کو شہ قہر کا اس نے فیکٹری ملازمین کی طرح اس کی ماں کی زندگی بھی عذاب بنا دی ہوگی اور ماں کے مرنے کے بعد وہ اس پر بھی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”تمہارے خیال میں اس کے سیزھیوں سے مرنے کی وجہ کیا ہوتی ہے؟“ رچرڈ نے پوچھا۔
”میں نہیں جانتی کہ جب وہ سیزھیوں سے نیچے گر تو اس وقت کیا کر رہا تھا۔ لی الحال اتنا ہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ ریٹائی بروک نے پر خون کا دھبہ شاید اس وجہ سے لگ گیا ہو جب وہ اپنے سوتیلے باپ کی مدد کے لیے آئی ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ریٹائی بروک کا دھبہ ہے۔ بظاہر یہ ایک حادثہ ہی لگتا ہے۔“

رچرڈ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”شاید اس نے بہت زیادہ پی پی لی تھی اس لیے تو ارن برقرار نہ رکھ سکا۔“
”ہاں اسے اچھی برائڈی اور اچھے سگار کا شوق تھا۔“
”اب تم کیا سوچ رہی ہو؟“ رچرڈ نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارے مشورے پر عمل کرنا ہی ٹھیک رہے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ریٹائی بروک نے اپنی ہاؤس کیسپر کو اتنی بڑی رقم کیوں دی تاہم اب اسے ایک ذہین طالبہ کی

”پیاری نیز، میں پیرس پہنچ گئی ہوں اور خیریت سے ہوں۔۔۔“

تین دن بعد لزی اپنے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ رچرڈ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور بولا۔

”لیبارٹری کی رپورٹ آگئی ہے۔ تمہارا اندازہ درست تھا۔“

”یعنی اس کے جوتے پر جو دھبہ ہے وہ خون...“
”انسانی خون۔“ رچرڈ نے صحیح کرتے ہوئے کہا۔
”گو یا یہ ممکن ہے کہ ریٹائی بروک کے سوتیلے باپ کا سیزھیوں سے گرنا محض ایک حادثہ نہیں تھا۔“

”میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف اس خون کے دھبے کی بنیاد پر اس کی لاش قبر سے نہیں نکالی جاسکتی۔“
”لیکن وہ خط۔“ لزی نے دل میں سوچا۔ ابھی تک اس نے رچرڈ کو اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

”اگر لاش قبر سے نکالی جائے۔“ وہ بولی۔ ”تو شاید میڈیکل ایگزامنز کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ وہ جان سکتا ہے کہ لاش کو کتنے والی چوٹیں کس فاول پلے کا نتیجہ ہیں۔“
”شاید۔ اگر یہ چوٹیں جوتے کی ایڑی کے سبب ہوئی ہوں۔“

لزی نے اپنی میز کی دراز پر نظر ڈالی جس میں۔۔۔
اخبار کا تراشہ رکھا ہوا تھا جو چین نے اسے دیا تھا۔ لزی اس مضمون کو اتنی بار پڑھ چکی تھی کہ وہ تقریباً اسے زبان یاد ہو گیا تھا۔ مارچ 1939ء میں ریٹائی بروک کے دوستوں نے اسے فرانس جانے سے پہلے ایک الوداعی پارٹی دی تھی۔ ریٹائی بروک میں ہی تعلیم حاصل کی تھی اور اب وہ اپنے باپ کی المناک موت کے بعد وہاں غیر محینہ عمرے کے لیے رہنے جا رہی تھی۔

ریٹائی بروک دوسری جنگ عظیم کے دوران فرانس میں انتقال کر گئی۔ لزی نے رچرڈ کی طرف دیکھا اور بولی۔
”ہیئریشیا فریڈر نے آج مجھے فون پر بتایا کہ اسے کسی وکیل کا فون موصول ہوا ہے جس کا کہنا ہے کہ اس کی آنٹی نے چین کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا۔“
”ٹرسٹ فنڈ؟“ رچرڈ نے تعجب سے کہا۔ ”اس کے پاس یہ ٹرسٹ قائم کرنے کے لیے پیسہ کہاں سے آیا؟“

”1939ء میں ریٹائی بروک نے یورپ جانے سے پہلے اپنے وکیل کو سابق ملازمہ نیز کنگ کے نام سے ایک اکاؤنٹ کھولنے کی ہدایت کی تھی اور اس میں دس ہزار

”ہاں، میں نے یہی سوچا ہے۔“

☆☆☆

حقیقت بھی یہی تھی کہ اب لڑی کے پاس آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ رینا سی بروک کا سوتیلایا بپ کسی حادثے کا شکار ہوا یا اسے دھکا دے کر سیزمیںوں سے گرایا گیا، یہ جاننا لڑی کا کام نہیں تھا۔ نیز کنگ نے جب اپنی سنجی سے کہا کہ وہ یہ کوٹ اور جوتے اس پروفیسر کو بھیج دے جس کا انٹرویو اس نے ٹی وی پر دیکھا تھا۔ شاید اعتراف کرنا چاہ رہی تھی۔ شاید وہ موت کے منہ میں جانے سے پہلے اپنا یہ راز کسی کو بتانا چاہ رہی ہو لیکن اگر وہ اعتراف کرنا چاہ رہی تھی تب بھی اس نے کسی پر اعتماد کرنے سے گریز کیا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ کوٹ اس کے کسی شے دار کے ہاتھ لگ جائے اور وہ رینا سی بروک کا خط پڑھ لے۔

لڑی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نیز نے کوٹ بھیجنے کے لیے اس کا انتخاب کیوں کیا۔ اگر اسے اپنے جرم کا اعتراف کرنا ہی تھا تو وہ یہ کوٹ کسی پادری کو بھیج سکتی تھی۔ اسے لڑی سے کیا توقع تھی کہ وہ اس راز سے واقف ہو جانے کے بعد خاموش رہے گی اور کوٹ کو بیچ کر اس سے ملنے والی رقم کسی فلاحی کام میں خرچ کر دے گی لیکن خون آلود جوتا بھیجنے کا کیا مقصد تھا۔ کیا جوتے کی ایڑی پر خون کا دھبہ اسے نظر نہیں آیا تھا اور اس نے یہ فیصلہ جوتے بھی لڑی کے انسٹی ٹیوٹ کو عطیہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ایسے سوالات تھے جن کا جواب دینے والی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔

لڑی کی سوچ بار بار ایک ہی تکتے پر مرکوز ہو جاتی۔ آیا وہ اس معاملے کو آگے بڑھائے یا یہیں ختم کر دے، اگر وہ اس حادثے کی تحقیقات کروانا چاہتی تو اس کے لیے اسے کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں، اس کا شوہر رچرڈ خود بھی ایک سراغ رساں فرم میں پارٹنر تھا لیکن اس کا پارٹنر یہ پسند نہ کرتا کہ وہ بلا معاوضہ کوئی کام کرے اور لڑی مالی طور پر اتنی مضبوط نہیں تھی کہ وہ رچرڈ کی فرم کو بھاری معاوضہ ادا کر کے اس کی خدمات حاصل کر سکے۔ اس نے دراز کی چابی اپنے شوڈر بگ میں ڈالی اور اس کی ڈپ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”میری طرف سے کیس ختم ہو گیا۔ چلو گھر چلتے ہیں۔“

تعلیم کے لیے استعمال ہوتا چاہیے۔ میں پیٹریشیا اور جین دونوں کو یہی مشورہ دوں گی کہ وہ اس فنڈ کو قبول کر لیں۔“

”اور اس کوٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میں نہیں سمجھتی کہ فوری طور پر اس کی نمائش کرنا ممکن ہے۔“ وہ اکٹھا ہٹ کے عالم میں بولی۔ ”اس کانفرنس کے بعد میں بہت تھک گئی ہوں۔“

”تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ رچرڈ بولا۔ ”چلو گھر چلتے ہیں۔“

لڑی نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ”اچھا خیال ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے وہ اخباری تراشہ میز کی دراز میں رکھ دیا۔ وہ اس خط کو اتنی بار پڑھ چکی تھی کہ اسے تقریباً زبانی یاد ہو گیا تھا۔ ”پیاری نیز! میں پیرس میں بہت سکون سے ہوں گو کہ تم نے زبان سے نہیں کہا لیکن میں جانتی ہوں کہ تم خوف زدہ ہو کہ شاید ہم دونوں نے جو کچھ کیا، اس کے بعد میں سکون سے نہ رہ سکوں لیکن مجھے کوئی پہچھتاوا نہیں ہے۔ اس نے میری ماں کو مار ڈالا اور اگر میں اس کے بیچ کی ماں بن جاتی تو میری زندگی برباد ہو جاتی۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔ یہاں بہت خوش ہوں۔ اپنا خیال رکھو اور میرے بارے میں پریشان مت ہونا۔“

لڑی نے سوچا کہ اسے یہ خط رچرڈ کو دکھادینا چاہیے لیکن ابھی نہیں۔ وہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا اور اگر وہ یہ معاملہ پولیس کے علم میں لے آتا تو شاید وہ اس ٹرسٹ فنڈ کو ختم کر دیتے اور اس طرح جین ایک بڑی رقم سے محروم ہو جاتی۔ اب کڑے مردے اکھاڑنے سے کیا حاصل۔ رینا سی بروک اور نیز کنگ، دونوں ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ دنیا کی کوئی عدالت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اب ان کا فیصلہ بڑی عدالت میں ہوگا۔

رچرڈ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ لڑی نے اس کی حقباتی نظروں سے بچنے کے لیے مسکراہٹ کا سہارا لیا اور بولی۔

”کیا تم نے سوچا تھا کہ اس کوٹ کے ذریعے میں کہاں تک پہنچ سکتی ہوں۔“

رچرڈ نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہنے لگا۔ ”کیا کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں؟“

”نہیں، بعض اوقات زیادہ کریدنے سے فائدے کے بجائے نقصان پہنچ سکتا ہے لہذا میں بھی اس کیس کو یہیں ختم کر کے دستبردار ہو رہی ہوں۔“

”کیا واقعی؟“ رچرڈ نے حیرت سے پوچھا۔

نہاں اور میاں حقائق کے شانہ بشانہ سفر کرتی رشتوں کی تلاش و جستجو

نیت کا پھل

سیرین اراض

حقیقت تک رسائی دراصل خود شناسی کے راستے سے ہوتی ہے... یہ راستے پیچیدہ ہی نہیں مشکل ترین بھی ہوتے ہیں... اسے اپنی صلاحیتوں اور نیک نیتی پر بھروسہ اور کامل اعتماد تھا... قدم قدم پر اسے ناکامی کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا... مگر وہ مایوس کن صورت حال کے باوجود ایک جگہ تھما نہیں... بلکہ اس کا مقرر کردہ ہدف ہنوز مرکز نگاہ بنا رہا۔



وہ موسم بہار کا ایک خوشگوار دن تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور موسم سرما کی شدت کا احساس زائل ہو رہا تھا۔ میں گنگناٹا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس روز میں نے اپنی بیٹی کو رات کے کھانے پر بلایا تھا جسے اس نے

بخوشی قبول کر لیا تھا۔ میں نے اس دعوت کے لیے خاص اہتمام کیا تھا اور اس کی پسند کے کھانے تیار کر دائے تھے۔ مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ ڈنکر کے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ اچانک اس نے ایک سوال کر کے مجھے چونکنے پر مجبور

جاسوسی ڈائجسٹ - 71 - دسمبر 2014ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

چلے جانا چاہیے، اس سے پہلے کہ وہ میرا اشارہ سمجھتی۔
دروازے کی کھٹکی بجی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ہولنر سے
پستول نکال کر میرے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ یہ تو
میں بتانا بھول ہی گیا کہ میری بیٹی ایک پولیس آفیسر ہے اور
ہمیشہ اپنے یونیفارم میں گھر سے باہر نکلتی ہے۔

دروازے پر کرسٹن نکلن کھڑا تھا۔ میری اس سے پہلی
ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ایک کلاسٹ کے طور پر
میرے پاس آیا تھا۔ دوسری مرتبہ وہ ایک متاثرہ شخص کی
صورت میں میرے پاس آیا۔ اس کے بعد بھی وہ دوسرے
لوگوں کو میرے پاس لاتا رہا جنہیں میری مدد کی ضرورت تھی
لیکن اس وقت اس کی آمد میرے لیے تعجب خیز تھی کیونکہ عام
طور پر میں ملاقاتیوں سے دن کے اوقات میں ملتا تھا۔

”ہیلو البرٹ، کیسے ہوا؟“ اس نے خوش مزاجی سے
پوچھا۔

میں نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی گھڑی کی
طرف دیکھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ”جانتا ہوں کہ
مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی لیکن یہ معاملہ بہت اہم ہے۔“

میں نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا اور وہ میرے
پچھے چلا ہوا دفتر میں داخل ہو گیا جہاں سام ریو الور لیے چوکنہ
گھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو
آفیسر سام۔“

”میں بس جانے ہی والی تھی مسٹر۔۔۔؟“

سام کی یادداشت اتنی بری نہیں اور وہ اس کا اصل نام
بھی جانتی تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ وقفے وقفے سے
اپنا نام بدلتا رہتا ہے۔ اس بار اس نے اپنا نام فشر بتایا۔ میں
نے مذاقاً پوچھا۔ ”بولی یا کیری؟“

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بولی فشر۔۔۔ مجھے
تمہاری ضرورت پیش آگئی ہے۔ اس کام کا تمہیں معقول
معاوضہ ملے گا۔“

”تم جانتے ہو کہ میں ایک پرائیویٹ سرائف رساں
ہوں اور اسی کی آمدنی سے میرے گھر کا کچن چلتا ہے اس لیے
معاوضے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ البتہ تمہاری بات سننے
کے کوئی پیسے نہیں لوں گا۔ تمہارے پاس پندرہ منٹ ہیں اس
کے بعد مجھے برتن دھو کر انہیں اپنی جگہ پر رکھنا ہے۔“

سام بولی۔ ”اب میں چلتی ہوں۔“

”اگر تم بھی میری بات سن لو۔“ بولی بولا۔ ”تو میں
تمہارا شکر گزار رہوں گا۔“

”اگر اس کا تعلق پولیس سے ہے تو تم پولیس اسٹیشن جاؤ۔“

کر دیا۔
”ڈیڈی، آپ نے کبھی اپنے والد کے بارے میں
کوئی بات نہیں کی۔“

”اچھا، کیا واقعی؟“ میں نے حیران ہونے کی
اداکاری کرتے ہوئے کہا لیکن دل میں سوچ رہا تھا کہ اس
وقت سام کو میرے باپ کا خیال کیسے آگیا۔

”دادی کبھی بھی ان کا تذکرہ کیا کرتی ہیں اور ہوٹل
میں آنے والے لوگ بھی ان کے بارے میں باتیں کرتے
رہتے ہیں لیکن آپ نے کبھی کچھ نہیں کہا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ موضوع کبھی زیر بحث نہیں
آیا۔“

”آپ کو ان کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ بہر حال
وہ آپ کے باپ تھے اور ایسا بھی نہیں کہ انہوں نے ٹھیکہ
اختیار کر لی ہو اور دادی کو چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔“

”ہاں، اس وقت میں نو عمر تھا۔ وہ مجھے بیس بال کا میچ
دکھانے لے جاتے تھے پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ اس بات کو
بھی کافی عرصہ ہو گیا اور میں ان کے بارے میں نہیں سوچتا۔“

”ان کے انتقال کے وقت آپ کی کیا عمر تھی؟“

”اتیس سال۔“

”اور ان کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہوا تھا؟“

”ہاں یہ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا لیکن
میں یہاں نہیں تھا اور نہ ہی میں نے ڈیجیٹل سرٹیفکیٹ دیکھا۔“

”آپ اس وقت گریجویٹ کورس کے دوسرے سال
میں تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑ کر
ہوٹل چلانے میں دادی کی مدد کرنے یہاں آ گئے۔“

”ہاں وہ ہوٹل انہی دنوں شروع ہوا تھا اور مہیا کے مالی
مستقبل کا انحصار اسی پر تھا اگر وہ کاروبار ناکام ہو جاتا تو وہ
اسے برداشت نہ کر پائیں دیکھیں ہی شوہر کی موت ان کے
لیے بہت بڑا سانحہ تھی۔“

”مجھے آج تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ زندگی گزارنے
کے لیے کیا کرتے تھے؟“

”انہوں نے بڑھتی کے طور پر کام شروع کیا پھر مختلف
مٹھے اختیار کیے۔ بعد میں انہوں نے دوسرے تعمیراتی کام بھی
کرنا شروع کر دیے۔“

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسا سوال کرے جس کے
جواب میں مجھے اپنے باپ کی حقیقت بیان کرنی پڑ جائے
چنانچہ میں نے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھنا شروع کر دی۔
یہ گویا اشارہ تھا کہ اب میرے آرام کا وقت ہو رہا ہے۔ اسے

نیت کا پھل

سے پہلے اس نے کتنی بار مما سے رابطہ کیا ہوگا لیکن سرائے والوں نے بتایا ہے کہ اس نے چند مرتبہ ماما کو فون بھی کیا تھا۔
”تمہاری ماں سامتا کلاز میں رہتی تھی اور اب تمہارا سوتیلہ بھائی کم ہو گیا ہے۔ تم اسی وجہ سے مجھے اس معاملے میں شامل کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں، مجھے وصیت کے سلسلے میں اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس نے سرائے والوں کو نمبر دیا تھا، اس پر بات نہیں ہو پارہی۔ جب انہوں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ ماما کا انتقال ہو گیا ہے تو کسی عورت نے فون اٹھایا اور کہا کہ وہ نہیں جانتی کہ فزلا پتا ہے اور یہ کہ اسے مزید پریشان نہیں کیا جائے۔ وہ اس کی نگہبان نہیں تھی۔“
”کیا سرائے والوں کے پاس اس جگہ کا پتا ہے جہاں کا یہ فون نمبر ہے؟“

”ہاں وہ جگہ ڈیپٹی میں ہے۔“
انڈیا ٹاپولس کے شمال مغرب میں یہ چھوٹا سا قصبہ ہے پھر میں نے بوبلی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے عورت سے پوچھا تھا کہ فز کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟“
اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔“
”تم نے اسے کب فون کیا تھا؟“
”گزشتہ روز۔“

”گو یا تم ابھی تک ڈیپٹی نہیں گئے؟“
”میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ پناہ گزینوں کی دیکھ بھال کے علاوہ مجھے ماما کی جائداد کے معاملات بھی دیکھنا پڑ رہے ہیں۔“

”تمہارے پاس فز کو ڈھونڈنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس لیے تم یہ کام مجھ سے لینا چاہ رہے ہو؟“
”اس سے رابطہ بہت ضروری ہے کیونکہ وصیت میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔“
”گو یا تمہیں نہیں بلکہ جاگیر کو میری خدمات درکار ہیں۔ کیا وہ مجھے منہ مانگا معاوضہ دے سکیں گے؟“
”اس کی تم فکر نہ کرو۔ میری ماں نے لاکھوں کی جائداد چھوڑی ہے۔“

”اگر میں نے تمہارے سوتیلے بھائی کو تلاش کر لیا تو اس سے کیا کہوں؟“
”اسے بتا دینا کہ ہماری ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور اس سے پتہ لے لیتا تا کہ میں اسے جائداد کے حق کی حیثیت سے خط لکھ سکوں۔“

یا انہیں فون کرو۔ ویسے بھی میں اپنے باپ کے کام میں مداخلت نہیں کرتی۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنی میز کی دراز سے ایک نوٹ بک نکالی اور بولا۔ ”شروع ہو جاؤ۔“
”میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔“ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ شاید تم نے بتایا تھا کہ وہ کافی عرصے سے بیمار تھی۔“

”وہ کئی سالوں سے بیمار تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے اس اذیت سے نجات مل گئی۔“ وہ تقریر یاروہانسا ہو گیا۔
”اس کا انتقال کب ہوا؟“

”دس روز قبل لیکن البرٹ، میرے یہاں آنے کی یہ وجہ نہیں ہے بلکہ اپنے بڑے بھائی کے لیے پریشان ہوں، وہ وہیں غائب ہو گیا ہے۔“

”میرا خیال تھا کہ تم اکلوتے ہو۔“
”مجھے بھی اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔“ بوبلی نے کہا۔ ”اور نہ ہی جانتا تھا کہ اس کا کوئی وجود ہے۔ وہ میرا سوتیلہ بھائی ہے۔“

”تمہاری ماں کا ایک بیٹا اور بھی تھا اور اس نے یہ بات تمہیں کبھی نہیں بتائی؟“
”مجھے اس کا پتا ماما کی وصیت اور دیگر کاغذات سے چلا۔ اب میں ہی اس کی جائداد کا مختار ہوں۔“

”یقیناً یہ اطلاع تمہارے لیے حیرت کا باعث ہوگی؟“
”ایسا لگتا ہے کہ ممانے چودہ برس کی عمر میں فز کو جنم دیا اور اس کے باپ کے والدین نے اس کی پرورش کی۔“

میں نے نوٹ بک میں لکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا سوتیلہ بھائی، دادا، دادی کے گھر میں پرورش پاتا رہا اور تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے؟“
”وہ یعنی چھوٹیلی کے لوگ ماما کو الزام دیتے رہے اور ماما کے خاندان والے ان کے بیٹے عمون کو مورد الزام ٹھہراتے رہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کبھی ان کے درمیان بات چیت ہوئی ہو۔“

”فز۔“ میں نے زیر لب دہراتے ہوئے کہا۔ ”کیا پیدائش کے وقت اس کا یہی نام رکھا گیا تھا؟“
”ہاں، اس کا پورا نام فزگیر الدجکل ہے اور میں اس سمجھتا ہوں کہ بعد میں اس نے ماما سے رابطہ استوار کر لیا تھا اور وہ ایک مرتبہ سرائے میں بھی آیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس

جاسوسی ڈائجسٹ 73 - دسمبر 2014ء

”تم اسے اپنی ماں کی تدفین کے بارے میں نہیں بتانا چاہتے؟“

”تدفین تو تین روز پہلے ہو چکی۔“

”اور تم نے گزشتہ روز تک اسے فون نہیں کیا؟“

”سراے والوں نے اس عورت کو تدفین کے بارے میں پیغام دے دیا تھا۔“

”یہ بتاؤ کہ تمہاری ماں کی وصیت میں اس کا کتنا حصہ ہے؟“

”وہ اس کی جائیداد اور اثاثوں میں آدھے کا مالک ہے۔“

”ادہ میرے خدا۔۔۔ وہ تو پلک جھپکتے ہی لاکھوں کا آدمی بن جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ وصیت کس تاریخ کو لکھی گئی تھی؟“

”ماں نے تقریباً ایک ماہ پہلے ہی وصیت لکھی تھی۔“

”اس وقت اس کی ذہنی کیفیت کیا تھی؟“

”میں اس وصیت کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس نے وہی لکھا جو وہ چاہتی تھی۔“

”اگر فز مر جائے تو اس کے حصے کی رقم کا کیا ہوگا؟“

”میں نے ایک چھبھتا ہوا سوال کیا۔

”وہ کیوں مرے گا؟“

”عام طور پر لاپتہ افراد مردہ حالت میں ملتے ہیں۔“

”اگر وہ ماں کے انتقال سے پہلے مر گیا ہو تو اس کا حصہ بھی مجھے مل جائے گا۔“

”کیا تم نے اپنے سوتیلے بھائی کو قتل کیا ہے؟“ میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

اس کے بعد وہ ایک لمحے کے لیے نہیں رکا حالانکہ اس نے پندرہ منٹ سے زیادہ وقت لے لیا تھا لیکن میں صبر اور سکون سے اسے برداشت کرتا رہا کیونکہ اس نے ایک بڑی رقم کا چیک میرے حوالے کر دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے برتن دھوئے اور سوچنے لگا کہ اس نئے کیس کی شروعات کیسے کی جائے۔ پہلے میں نے اس عورت کو فون کرنے کا سوچا لیکن وہ پہلے ہی فز کے بارے میں کسی سوال کا جواب دینے سے بیزاری ظاہر کر چکی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ سے بات کرنا پسند نہ کرے اس لیے میں نے اس سے ملنے اور زبرد بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ساتھ ہی میں نے انٹرنیٹ پر فز گیرالڈ جیل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہاں اس نام کا کوئی شخص موجود نہیں تھا اور نہ ہی ڈیلی کے علاقے میں

فون نمبر کی فہرست میں اس کا نام نظر نہیں آیا۔ وہ کسی کلب کا ممبر نہیں تھا اور نہ ہی اس کے نام کا ٹیس بک یا لنکڈ ان کاؤنٹ تھا۔ میں نے احتیاطاً ڈیلی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ایسے سات افسروں کے نام اور پتے نوٹ کر لیے جو ریاستی قانون پر عمل درآمد کے ذمے دار تھے اور عام لوگوں کو اسلحہ کے لائسنس جاری کیا کرتے تھے۔

انٹرنیٹ سے ڈیلی کے بارے میں کچھ معلومات ضرور حاصل ہو گئیں۔ مثلاً یہ کہ اس قصبے کی آبادی کل تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور یہ تقریباً دو سو سال پرانا تھا۔ یہاں ایک بہت بڑی مل تھی جس میں مکی کے دانے رکھنے کے لیے کریٹ تیار کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں انیسویں صدی کا تعمیر شدہ ایک ادھوا ہاؤس بھی تھا جس نے اپنے عروج کے زمانے میں نامور فنکاروں کی میزبانی کی تھی۔

دوسری صبح میں ڈیلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ موسم خوش گووار تھا اور راستے میں جا بجا حسین نظارے بکھرے ہوئے تھے۔ میں ان سے لطف اندوز ہوتا ہوا سبک خرای کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور اس طرح نوے منٹ کا راستہ دو گھنٹے میں طے کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عورت کسی خستہ حال مکان میں رہتی ہوگی لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ وہاں پچاس کی دہائی میں بنے ہوئے مکانات کی قطار تھی۔ اس عورت نے دروازہ کھولا اور مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

”تم کون ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟“

”معاف کرنا۔“ میں نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن میں انڈیا ٹاؤن پولیس سے آیا ہوں اور فز جیل کی ماں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے لیے کام کر رہا ہوں۔ مسٹر جیل نے..... سراے کے لوگوں کو رابطہ کے لیے یہی پتا دیا تھا۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کئی ہفتوں سے فز کو نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور نہ ہی میں اس کی نگراں ہوں۔“

وہ دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ میں جلدی سے بولا۔ ”دور دراز قتل تمہاری جس شخص سے بات ہوئی، وہ اس جائیداد کا حقدار ہے اور اس نے فز کو تلاش کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ برائے کرم مجھے دو منٹ دے دو میں جیل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن اس سے رابطہ کرنا ضروری ہے۔“

”لیکن میں تمہیں نہیں جانتی۔ پہلے اپنا تعارف

”کیوں؟“

”میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ اب تم جاسکتے ہو مسٹر البرٹ۔“

”کیا تم ایسے لوگوں کے بارے میں جانتی ہو جو اس کے دوست ہوں۔ انہیں شاید معلوم ہو کہ وہ کہاں ہے یا کس کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ ان جگہوں کے بارے میں بتاؤ جہاں وہ کھانے پینے جایا کرتا تھا؟“

”لوگن اسپورٹ میں ڈینزل کے نام سے ایک بار ہے وہ وہاں اپنے چند دوستوں سے ملنے جایا کرتا تھا جو فوج میں تھے۔“

”کیا وہ خود بھی فوجی خدمت انجام دے چکا ہے؟“

”ہاں وہ دو مرتبہ افغانستان گیا تھا۔“

”کیا تمہارے پاس اس کے لیے کوئی میل یا پیغام آیا ہے؟“

”تین ہفتے پہلے ایک شخص نے اسے پیغام بھیجا تھا۔“

”کیا تم مجھے اس کا نمبر دے سکتی ہو؟“

”اس نے کہا تھا کہ فٹز کے پاس اس کا نمبر ہے۔ اس نے کہا تھا کہ فٹز اسے فون کرے۔ اس نے اپنا نام پھر روز بتایا تھا۔ وہ ڈیڑہ کر یک کے قریب رہتا ہے۔ مجھے اس کا پتہ یاد نہیں رہا لیکن تم وہاں جا کر لوگوں سے بات کرو کہ تو وہ بتا دیں گے۔“

”تم روز کو جانتی ہو؟“

”وہ ایک مرتبہ فٹز کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی فوج میں رہ چکا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اس کی تقلید میں اٹھ کھڑا ہوا پھر چانک ہی میری زبان سے ایک سوال پھسل پڑا۔

”فٹز کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟“

میرا خیال تھا کہ وہ اس کا کوئی سابق دوست ہوگا جو کچھ عرصے اس کے ساتھ رہا اور پھر اس نے اسے جانے کے لیے کہہ دیا لیکن وہ بولی۔

”فٹز مجل میرا سوتیلا بھائی ہے۔“

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور میں نے بے ساختہ کہا۔

”اس کا ایک سوتیلا بھائی بولی فٹز ہے جس نے مجھے اسے تلاش کرنے کے لیے بھیجا ہے اور اب تم بھی اس سے رشتے داری جتا رہی ہو؟“

جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ بولی فٹز سے اس کا کوئی براہ راست رشتہ نہیں۔ فٹز اور کلار کا باپ ایک تھا جبکہ بائیں الگ الگ تھیں۔ ان کا باپ فٹن مجل ایک شرابی جواری اور غیر ذتے وار شخص تھا۔ اس نے فٹز کو دادا، داوی کے پاس چھوڑا

کر دیا۔“

میں نے اپنا لائنس نکال کر اسے پکڑ لیا۔ وہ کچھ دیر اسے غور سے دیکھتی رہی پھر لائنس واپس کر کے مجھے لوٹک

روم میں لے گئی جسے بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود فرش پر پڑے ہوئے

کشن پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ ”کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟“

”کلار اچونس۔“

”کیا میں تمہیں صرف کلار کہہ کر پکاروں یا تم مسز جیونس کہلوانا پسند کرتی ہو؟“

”تمہیں جو مناسب لگے اسی نام سے پکار دو۔“

”تم نے کہا کہ فٹز کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں لیکن میرے لیے اس کو تلاش کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس کی ماں نے مرنے سے پہلے وصیت میں اس کا نام بھی شامل کیا ہے۔“

”یعنی وہ بھی اس جائداد میں حصے دار ہے؟“

”میں نے وصیت نہیں دیکھی اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو جائداد کے حقدار نے اسے تلاش کرنے پر مامور کیا ہے۔ کیا وہ یہیں رہتا ہے؟“

”پہلے رہتا تھا لیکن مجھے کمرے کی ضرورت تھی اس لیے وہ یہاں سے چلا گیا۔ یہ تقریباً تین مہینے پہلے کی بات ہے۔“

”اب وہ کہاں رہتا ہے؟“

”اس نے مجھے اپنا پتہ نہیں دیا۔“

”کیا اس کی کوئی ملازمت ہے؟“

”وہ ایک ہنرمند شخص ہے اور سارے کام کر لیتا ہے۔“

”کیا تمہارے پاس اس کا کوئی میل نمبر ہے؟“

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”یہاں سے جانے کے بعد وہ ہفتے میں دو تین مرتبہ اپنی ڈاک لینے آتا ہے۔“

”لیکن تم نے دو دن پہلے فون کرنے والے شخص کو بتایا تھا کہ مجل لاپتا ہے۔“

”کیونکہ تین ہفتے سے وہ یہاں نہیں آیا جبکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

”کیا تم نے اس کی اطلاع پولیس کو دی تاکہ وہ اس کا نام لاپتا افراد کی فہرست میں شامل کر لیتی۔“

”فٹز کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ میں اس کی گم شدگی کی اطلاع پولیس کو دوں۔“

نیت کا پہل

وہاں پر موجود ایک پولیس آفیسر نے میرا خوش دلی سے استقبال کیا۔ اس کا نام ڈین مارٹن تھا۔ اس نے میرا کارڈ دیکھنے کے بعد پوچھا۔ ”تمہیں کس قسم کی مدد درکار ہے مسٹر البرٹ؟“

”میں فٹز گیرالڈ محل نامی ایک شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

”میں نے وجہ بتائی تو وہ بولا۔“ اب وہ تمہیں ڈیلی میں نہیں ملے گا۔“

”کیا وہ کوئی جرم کر کے بھاگا ہے؟“

”ایسی بات نہیں، دراصل اس نے تقریباً ایک ہفتہ اس پولیس اسٹیشن میں ملازمت کی تھی۔ ابھی وہ آزمانگی مدت پوری کر رہا تھا کہ ایک شام پولیس چیف ال مین دورے پر آ گیا۔ اس نے فٹز کو کمپیوٹر پر بیٹھے دیکھا۔ وہ بغیر اجازت پولیس ریکارڈ دیکھ رہا تھا۔ چیف نے غصے میں آ کر اسے فوراً ڈیلی چھوڑنے کا حکم دے دیا۔“

”یہ کتنی پرانی بات ہے؟“

”مارٹن نے ایک نوٹ بک اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹے ہوئے بولا۔“ سات ہفتے ہو گئے۔“

”اس کی بہن نے تین ہفتے سے اسے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر ملی ہے۔ شاید تم یا تمہارا کوئی ساتھی آفیسر جانتا ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟“

”میں نے اسے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔“ مارٹن بولا۔

”اس نے جب ملازمت کے لیے درخواست دی تھی تو اپنا کوئی پتا بھی دیا ہوگا۔“

”اس نے دراز کھول کر ایک فائل نکالی۔ اس میں فٹز کا جو پتا اور فون نمبر درج تھا، وہ کھارا کا تھا۔“

”ذاتی طور پر تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مارٹن نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔“ وہ صرف یہاں ایک ہفتے رہا۔ اتنے کم وقت میں کسی کے بارے میں کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے؟“

”ایک ہات اور یہ بتاؤ کہ وہ کمپیوٹر پر کیا تلاش کر رہا تھا؟“

”اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ہاپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

”اس کے ہاپ کا نام مین محل ہے۔ کیا تم اسے جانتے

اور خود اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ کھارا اس سے کئی برس چھوٹی تھی۔ اس کی پرورش ماں نے کی۔ فٹز پہلی بار اس علاقے میں اس وقت آیا جب وہ چھٹیوں پر تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا باپ یہیں کہیں قریب میں موجود ہے تاہم وہ مین کو ڈھونڈنے میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکی۔

”کیا مین بھی لاپتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں یہی سمجھتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”صرف فٹز ہی اسے ڈھونڈنا چاہ رہا تھا۔“

”کیا تمہارے دادا، دادی کو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟“

”اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ نفی میں سر ہلایا اور بولی۔

”میں، فٹز اور میری ماں سب ان سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے فٹز کی پرورش صرف اس لیے کی کہ دنیا سے مین کی ناجائز اولاد کے نام سے جانے اور وہ اسے اذیت پہنچاتے رہیں۔ جب مین فوج میں گیا تو فٹز کو محسوس ہوا کہ اس کا باپ صرف اسی وجہ سے سب کو چھوڑ کر چلا گیا۔“

”کیا تمہارے پاس فٹز کی کوئی تصویر ہے؟“

”اس نے اپنے سر پر انگلی رکھی اور بولی۔“ یہاں۔“

”میں اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولا۔“ اگر فٹز تمہیں مل جائے تو کیا تم اسے مجھ سے رابطہ کرنے کے لیے کہہ سکتی ہو؟“

”معاف کرنا، اس سے زیادہ تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔“

”میرا خیال ہے کہ شاید فٹز کی ماں نے اسے بھی کچھ نہیں بتایا کہ اس کا... ایک سوتیلا بھائی بھی ہے اور نہ ہی یہ بات۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو بتائی۔ اسے بھی جاکداو کا مختار بننے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا سوتیلا بھائی بھی ہے۔“

”اگر فٹز کو یہ بات معلوم تھی تو اس نے مجھے بھی نہیں بتائی۔“ اس عورت نے بے رخی سے کہا۔

میں وہاں سے روانہ ہوا تو میرے ذہن میں ایسی کئی جگہیں تھیں جہاں سے فٹز کے بارے میں معلومات مل سکتی تھیں جیسا لوگن اسپورٹ کا بار، بیس پر روز اور فٹز کے دادا، دادی لیکن کھارا نے مجھے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ میں مقامی پولیس اسٹیشن نہ جاؤں کیونکہ فٹز اسے پسند نہیں کرے گا۔ میں نے کسی ٹی وی ڈرامے میں ایک عورت کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ مرد کو جس کام سے منع کر دے پہلے وہ وہی کرے گا۔

میں نے بھی اپنی گاڑی کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ لیا۔

ہو؟

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کمپیوٹر کی طرف دیکھا اور چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولا۔ ”چار سال پہلے ہم نے اسی نام کے ایک شخص کو ایسٹ فرنٹ اسٹریٹ سے آوارہ گردی اور ہنگامہ آرائی کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ وہ نشے میں گالیاں بک رہا اور اپنی رائفل سے ہوائی فائر کر رہا تھا۔“

”کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟“

”وہ لمبے بالوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جس پولیس آفیسر نے اسے گرفتار کیا، وہ یہاں سے جا چکا ہے۔ میں نے ٹمن کو سرسری طور پر کوٹھری میں دیکھا تھا۔“

”تمہارے پاس اس کا پتا تو ہوگا؟“

مارٹن نے ایک فائل کھولی اور ٹمن پھل کا ایڈریس اور فون نمبر بتا دیا۔

میں نے کار میں بیٹھتے ہی اس فون نمبر پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن فون کام نہیں کر رہا تھا چنانچہ میں نے مارٹن کے دیے ہوئے سچے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ لوگن اسپورٹ کا قصبہ ڈیلتھی سے پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ مجھے وہ مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مکان کافی پرانا تھا اور باہر کی دیواروں پر رنگ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ پکلی دستک کے جواب میں خاموشی رہی لیکن دوسری دستک سے پہلے دروازہ کھل گیا اور ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔ اس کی عمر سو سال کے قریب معلوم ہوئی لیکن آواز میں کراہی تھی۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا جانتے ہو؟“

”میں ایک شخص کو تلاش کر رہا ہوں جو شاید گزشتہ دو ماہ کے دوران اپنے باپ کو پوچھتا ہوا یہاں آیا ہو۔“

”اندر آ جاؤ۔“

میں اس کے پیچھے چل دیا۔ اس نے مجھے کچن ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میرے سامنے کافی کا مگ اور بسکٹ کی پلیٹ رکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا بیٹا لیوس اب ایک جیولری اسٹور پر کام کرتا ہے لیکن وہ نوٹرے ڈیم کے لیے فٹ بال بھی کھیلتا رہا ہے۔“

میں نے جواب میں سر ہلادیا تو وہ بولی۔ ”ٹمن اسی مکان کے ایک کمرے میں رہتا تھا لیکن لیوس نے اسے نکال دیا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ یہ واقعہ کب پیش آیا لیکن شاید لیوس کچھ بتا سکے اور ہاں زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک شخص ٹمن کو پوچھتا ہوا آیا تھا لیکن اس نے کافی پی اور نہ ہی بسکٹ

کھائے۔ مجھے ایسے لوگ پسند نہیں۔“

”کیا تم لیوس سے میری بات کر داسکتی ہو؟“

اس نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا سیل فون اٹھایا اور لیوس کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولی۔ ”میرے پاس ایک شخص بیٹھا ہے جو تم سے ٹمن کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے سیل فون میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ میں کوئی ایسا شخص ہوں جو گھر گھر جا کر چیزیں فروخت کرتا ہے لیکن میں نے جلدی اس کی غلط فہمی دور کر دی تو اس نے مجھے پتا سمجھاتے ہوئے کہا کہ اس وقت وہ اپنی دکان پر ہی مل سکتا ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ کسی گاہک کے ساتھ مصروف تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے تعارف کرواتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ بولا۔

”وہ شخص انتہائی خطرناک تھا۔ وہ اپنے آپ کو کارنگر کہتا تھا چنانچہ میں نے اس سے ثانی کے گھر پر کچھ کام کروایا تا کہ انہیں اچھا کر لیں لیکن اس کا بنایا ہوا کینسٹ چند روز بعد ہی زمین پر گر پڑا اور اس میں رکھا ہوا سارا سامان فرش پر بکھر گیا۔ ذرا سوچو کہ اگر ثانی کینسٹ کے پاس کھڑی ہوئیں تو کیا ہوتا۔ انہوں نے مجھے فون کر کے بلایا اور جب میں نے اس کا سارا کام دیکھا تو بہت غصہ آیا۔ اس نے انتہائی گھٹیا سامان استعمال کیا تھا اور اوپر سے رنگ کر دیا تا کہ دیکھنے میں وہ کینسٹ اچھا لگے۔ میں نے اسے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا اور اس کا سامان اٹھا کر باہر لان میں پھینک دیا۔“

”یہ کتنی پرانی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تقریباً دو سال ہو گئے۔ وہ غالباً بہار کا موسم تھا۔“

”تمہاری ثانی نے بتایا کہ حال ہی میں ایک اور شخص بھی اسے پوچھتا ہوا یہاں آیا تھا؟“

”ہاں۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ وہ ٹمن کا بیٹا ہے۔“

”اس نے ثانی کو یہی بتایا تھا۔“ لیوس نے کہا۔ ”لیکن ثانی کو وہ شخص پسند نہیں آیا چنانچہ انہوں نے فون کر کے مجھے بلایا لیکن جب میں گھر پہنچا تو وہ جا چکا تھا۔“

”کیا تم نے بعد میں کبھی ٹمن کو دیکھا؟“

”ہاں، ایک دفعہ وہ میرے سامنے آیا تھا لیکن میرے قریب پہنچنے سے پہلے وہ سڑک پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔“

”یہ واقعہ کب پیش آیا؟“

”تقریباً پانچ چھ ماہ پہلے۔“

”کچھ اندازہ ہے کہ اب وہ کہاں رہ رہا ہے؟“

نیت کا بھل

رہے مجبور امیں نے بار کا وقت ختم ہونے پر انہیں اٹھایا۔
"پھر تو تم نے ان کے لیے ٹیکسی منگوائی ہوگی اور ان کا
پتا بھی نوٹ کیا ہوگا؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس کی نوبت نہیں آئی۔ ان
کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسی کے
پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"تم اس آدمی کا نام جانتے ہو؟"

"جیسپر۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "جیسپر روز۔"
یہ نام سن کر میں چونک پڑا اور بولا۔ "کیا وہ ڈیئر
کریک کے پاس رہتا ہے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔ وہ فٹز کے ساتھ فوج میں تھا اور
ایک حادثے میں زخمی ہو جانے کی وجہ سے اس کی ٹانگ میں
ہلکی سی ٹنگڑا ہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اب وہ شاید ہنشن پر گزارہ
کر رہا ہے۔ اس نے قسمت آزمانے کے لیے کئی منصوبے
بنائے اور لوگوں کو ان میں پیسے لگانے کے لیے کہا لیکن کسی
میں کامیابی نہیں ہوئی۔"

میں نے ڈیئر کریک جانے کے لیے روٹ نمبر اتنیس پر
سفر کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے مجھے ایک پرانے طرز کا
میس اسٹیشن نظر آیا۔ میں نے وہیں سے ابتدا کرنے کا فیصلہ
کیا۔ مجھے باہر احاطے میں کوئی فرد نظر نہیں آیا۔ دفتر کے
دروازے پر دستک دی تو ایک عورت آنکھیں ملتی ہوئی باہر
آئی۔ شاید وہ اسی وقت سو کر اٹھی تھی۔ میں نے اس سے جیسپر
روز کا پتا پوچھا تو اس نے لائیکس کا اظہار کیا تب میں نے کہا۔
"قرب و جوار میں کوئی ایسا فرد ہے جو یہاں رہنے والے ہر
شخص کے نام اور کاروبار سے واقف ہو؟"

اس نے مسکراتے ہوئے سڑک کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہا۔ "غلہ گودام کے بعد جو سفید مکان ہے وہاں ملی
سے معلوم کرو۔"

وہ لیوس کی نانی سے عمر میں کم تھی۔ میں نے اسے اپنا
کارڈ دکھا کر جیسپر کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی بتا دیا کہ
میں اس سے کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ وہ بے یقینی سے مجھے
دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا اس نے تم سے بھی ادھار لیا تھا؟"

"نہیں کیا وہ لوگوں سے ادھار لیتا ہے؟"

"وہ ہر ایک کا مقروض ہے۔" وہ پورج کی طرف
آتے ہوئے بولی۔ "اس دوست کا کیا نام ہے جس کے لیے تم
اس سے ملنا چاہتے ہو؟"

"فٹز غیر الذمیل۔"

اس نے منظم انداز میں سر ہلایا اور مجھے روز کے گھر کا

لیوس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "تم اسے کیوں
تلاش کرنا چاہ رہے ہو؟"
"اگر میں نے باپ کو تلاش کر لیا تو شاید بیٹا بھی وہیں
مل جائے۔"

دوپہر کا وقت تھا جب میں اس بار میں پہنچا جس کا پتا
کلارا نے بتایا تھا۔ میں نے ہارٹینڈر کو سیب کے جوس کا آرڈر
دیا اور اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا۔ "میں
یہاں ایک سابق فوجی کی تلاش میں آیا ہوں۔ اس کی بہن
نے بتایا ہے کہ وہ بھی یہی ڈرنک کرنے یہاں آیا کرتا تھا۔
مجھے اس کی تلاش پر مامور کیا گیا ہے کیونکہ اس کی ماں کا
انتقال ہو گیا ہے اور وصیت کے مطابق وہ بھی داروں میں
شامل ہے۔"

"کہیں تم فٹز محل کی بات تو نہیں کر رہے؟" ہارٹینڈر نے
کہا۔ اس کا نام کوری تھا۔

"تم اسے جانتے ہو؟"

"ہاں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے محل کے
بارے میں اس کے خیالات اچھے نہیں ہیں پھر وہ بولا۔ "کیا
اس کی ماں مر گئی؟"

"ہاں اس کے انتقال کو گیارہ دن ہو گئے۔"

"اس نے بتایا تھا کہ ماں مرنے والی ہے اور اس کے
بعد وہ بہت امیر ہو جائے گا۔ تمہارے خیال میں اس کے حصے
میں کتنی دولت آئے گی؟"

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "یہ میں نہیں
جانتا۔ مجھے جائداد کے معیار نے اسے تلاش کرنے کے لیے کہا
ہے۔ تم نے آخری بار اسے کب دیکھا تھا؟"

"دو ہفتے پہلے۔ وہ یہاں اپنے باپ کے ساتھ آیا
تھا۔"

"باپ کے ساتھ؟" میری بھوئیں حیرت سے پھیل
گئیں۔

"جسہیں حیرت ہو رہی ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے باپ کو برسوں سے تلاش
کر رہا تھا۔"

"کیسی عجیب کہانی ہے۔" کوری نے کہا۔ "مجھے تو وہ
یوڑھا شخص کوئی جعل ساز لگ رہا تھا جس نے کہیں سے سن لیا
ہوگا کہ فٹز کے پاس دولت آنے والی ہے۔"

"تمہیں یہ خیال کس طرح آیا؟"

"مجھے اس کی کچھ باتیں غلط لگ رہی تھیں۔ اس کی
آنکھوں سے دیوانگی جھلک رہی تھی لیکن وہ یہاں کئی گھنٹے بیٹھے

پہلے ہی بورڈ حایول پڑا۔ "بیٹا، تمہاری ماں مر گئی ہے۔"
اس کے بعد گفتگو کا انداز بدل گیا۔ میں نے پوچھا۔
"کیا تم ہی فنز گیر اللہ محل ہو؟"
"یقیناً۔" جوان آدمی بولا۔
"مجھے افسوس ہے کہ یہ بری خبر تمہیں دے رہا ہوں۔"
"ہمیں معلوم تھا کہ وہ بہت بیمار ہے۔" وہ بورڈ سے
فحش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں اسے دیکھنے کے لیے
ساتھ کلاز جانا چاہ رہا تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی حالت
اتنی تشویش ناک ہوگی۔"

بورڈ سے آدمی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے
ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے بیٹا۔"
"کیا تم مومن محل ہو؟"

"ہاں، میں ہی وہ بد نصیب ہوں۔ لورنی مجھے چھوڑ کر
چلی گئی جبکہ وہ اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے بے تاب تھی۔"
"میں دوبارہ اس سے ملنے جاتا۔" جوان آدمی نے
کہا۔ "لیکن میں اپنے باپ کو عرصہ دراز سے تلاش کر رہا تھا
اور جب وہ مجھے ملا تو یقین نہیں آیا۔"

"فمن نے کہا۔" اگر معلوم ہوتا کہ تم مجھے ڈھونڈ رہے ہو
تو میں تمہیں پوسٹ کارڈ یا اس قسم کی کوئی چیز ضرور بھیجتا۔"
"بہر حال جو ہوا سو ہوا۔" میں نے گلا صاف کرتے
ہوئے کہا۔ "میں یہاں اس لیے آیا ہوں کیونکہ جاکداو کے
حقار کو فنز سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا میں تمہارا فون
نمبر جان سکتا ہوں یا میں تمہیں اس کا نمبر دے دوں؟"
"تم مجھے اس کا نمبر دے دو، اس کا نام کیا ہے؟"
"یو پی فشر۔" میں نے اس کا فون نمبر دیتے ہوئے
کہا۔ "تم مجھے اپنا پتہ دے دو۔"
"میرا پتہ کیا ہے۔" اس نے میل باکس کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ جیسپر روز کا مکان نہیں ہے؟"
اس نے اشارات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں
کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں مل سکتا ہوں؟"
"مجھے تمہاری بہن نے یہاں کا پتہ دیا تھا۔"
"اوہ کلاز!... وہ کیسی ہے؟"

"وہ پریشان تھی کیونکہ تم اس سے رابطے میں نہیں
ہو۔" میں نے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں
تمہارے بھائی کو بتاؤں گا کہ تمہارے فون کا انحصار
کرے۔"

ان لوگوں سے رخصت ہونے کے بعد میں نے

جنا سجدہ کیا۔ مجھے گھر تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی
لیکن وہاں کوئی نہیں تھا اور دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ مکان
کے برابر میں ایک سبز رنگ کی پک اپ کھڑی تھی۔ میں نے
عمارت کی کھڑکیوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ ایک
کمرے میں کاؤچ، ٹیلی ویژن، میز اور چند کرسیاں رکھی
ہوئی تھیں جبکہ بقیہ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔
ممکن ہے کہ روز اپنے کمرے میں سو رہا ہو یا غسل کر رہا ہو۔
میں نے عقبی دروازے پر دستک دی لیکن وہ بھی مقفل تھا۔

وہاں سے واپس آتے ہوئے میری نظر مکان کے
مشرق میں ایک مٹی کے ڈھیر پر گئی۔ اس کی لمبائی پانچ فٹ
اور چوڑائی تین فٹ ہوگی۔ شاید روز کو سبزیاں اگانے کا شوق
تھا لیکن اس کے لیے اسے مکان کے جنوبی حصے کا انتخاب کرنا
چاہیے تھا جہاں سورج کی روشنی براہ راست پڑتی تھی۔
میں گھوم کر واپس آیا اور پک اپ کا جائزہ لینے لگا۔ اس کا عقبی
حصہ خالی تھا اور وہاں چند رسیاں پڑی ہوئی تھیں جبکہ پینجر
سیٹ کے ساتھ فرش پر ایک بڑا سا سرخ رنگ کا ٹول بکس رکھا
ہوا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں چند اوزار
موجود تھے۔

میں نے اپنا فون نکالا۔ وہاں کمزور سگنلز آرہے تھے۔
اس سے پہلے کہ میں کوئی نمبر ملانے کی کوشش کرتا، ایک گرے
رنگ کی پک اپ آئی اور میری کار کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ میں
نے سبز رنگ کی پک اپ کا دروازہ بند کیا اور اس سے دور ہٹ
گیا۔ گرے رنگ کی پک اپ سے دو آدمی باہر آئے۔ ان
میں ایک ادھیڑ عمر لمبے بالوں والا شخص تھا جبکہ ڈرائیونگ سیٹ
سے اترنے والا اس کے مقابلے میں بہت کم عمر تھا اور اس کے
ہاتھ میں ایک شاٹ گن تھی۔ وہ دونوں میرے پاس آئے اور
ڈرائیور بولا۔ "تم پک اپ میں کیا دیکھ رہے تھے؟"

میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا تم جیسپر روز ہو؟"
"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" وہ تند لہجے میں
بولا۔

"میں کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھا جس کی مدد سے فنز
گیر اللہ محل کو ڈھونڈ سکوں۔"
"تمہیں فنز سے کیا کام پڑ گیا؟" بورڈ سے فحش نے
پوچھا۔

"اس کی ماں مر چکی ہے اور اس نے وصیت میں فنز کا
حصہ رکھا ہے۔ میں اسی لیے اسے تلاش کر رہا ہوں۔"
شاٹ گن والا شخص کچھ کہنے ہی والا تھا لیکن اس سے

نیت کا پہل

”میں نے تمہارے باپ کو تلاش کر لیا ہے؟“
”تم خوش قسمت ہو، کیا فٹز بھی ملا وہ کیسا ہے؟“
”میں نے ایک آدمی کو تلاش کیا ہے جو اپنے آپ کو فٹز کہتا ہے۔“

”لیکن تمہیں یقین نہیں آ رہا آخر کیوں؟“
”اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ شاید تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکو۔ جب تم نے آخری بار اسے دیکھا تو اس کے پاس کون سی گاڑی تھی؟“

”بزرگ کی بیک اپ۔“
”اور اس کے ٹول بکس کا رنگ؟“
”سرخ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟“
”ایک بات اور بتا دو کیا وہ لنگڑا کر چلتا ہے؟“
”نہیں لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا؟“
”اس لیے کہ جس فٹز کو میں نے تلاش کیا ہے، وہ لنگڑا کر چلتا ہے۔“

مجھے شہر تھا کہ وہ فٹز نہیں بلکہ میسر روز ہے۔ اس کا لنگڑا پن، سانس کا زکام اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فٹز اور مسن ایک گرے رنگ کی بیک اپ چلا رہے تھے جبکہ کلارا نے اس کا رنگ بزرگ بتایا تھا۔ یہ ساری باتیں شبہات کو جنم دے رہی تھیں۔ اس کے علاوہ مکان کے مشرق میں تازہ مٹی کا ڈھیر بھی میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

یقیناً روز نے فٹز کو مل کر دیا ہوگا تاکہ اس کی جگہ لے کر وارثت کا دعویٰ کر سکے اور وہ مسن کون تھا جس سے میں ملا۔ کیا وہ بھی فرضی تھا یا اصلی مسن کو اپنے بیٹے کے مقابلے میں روز کے ساتھ معاملہ کرنے میں زیادہ فائدہ نظر آیا ہوگا۔

ابھی کچھ واضح نہیں تھا۔ میں نے کلارا سے کہا: ”کیا کوئی ایسا شخص ہے جس کے ساتھ تم کچھ دن گزار سکو مثلاً تمہارا بوائے فرینڈ یا پھر میں تمہارے لیے یہاں سے دور کسی مونیٹل میں رہائش کا انتظام کر دوں۔“

وہ مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی: ”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”یہ ایک عارضی انتظام ہے جب تک یہ تصدیق نہیں ہو جاتی کہ یہ دونوں وہی ہیں جو اپنے آپ کو ظاہر کر رہے ہیں۔“

”لیکن میرا اس معاملے سے کیا تعلق؟“

”اگر وہ جھوٹے ہیں تو تم ان کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہو کیونکہ تم روز سے بھی مل چکی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے مشکل ہوگا لیکن حفاظتی نقطہ نظر سے ایسا کرنا

راستے میں ایک جگہ گاڑی روک کر یونی فشر کا نمبر ملا یا اور کہا۔“
”میں نے ابھی ابھی تمہارا نمبر ایک ایسے شخص کو دیا ہے جو اپنے آپ کو فٹز گیرالڈ کہتا ہے۔ میں تمہیں اس کا پتا دے سکتا ہوں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ فٹز گیرالڈ ہے؟“
”اس نے مجھے اپنا ہی نام بتایا اور کچھ دوسری تفصیلات بھی بتائیں۔ وہ تمہارا اصلی نام بھی جانتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی تھا جو اپنے آپ کو فٹز کا باپ بتا رہا تھا۔“

”یعنی تم نے مسن بچل کو بھی تلاش کر لیا؟“
”ہاں، ایک کلکٹ میں دو مڑے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ تمہاری ماں مر چکی ہے۔ وہ شخص اسے لورنی کے نام سے یاد کر رہا تھا۔ کیا تمہاری ماں کا یہی نام تھا؟“
”ہاں۔“ اس نے غزدہ لہجہ میں کہا۔

میں نے کہا: ”وہ اپنے باپ کو عرصہ دراز سے تلاش کر رہا تھا اور خال ہی میں اس سے ملا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ دوبارہ سانس کا زکام جانے والا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری ماں اتنی زیادہ بیمار ہے۔“

بولی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا: ”تمہیں معلوم ہے کہ فٹز کی ایک سوتیلی بہن بھی ہے۔ وہی عورت جس سے تم نے بات کی تھی۔ وہ ڈیفی میں رہتی ہے اور مسن اس کا باپ بھی ہے۔“

بولی بولا: ”اس آدمی نے سانس کا زکام لیا تھا؟“
”ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ ممی کے سرائے ایونزولی میں تھی۔“
”کیا یہ جگہ سانس کا زکام سے قریب ہے؟“ میں نے

پوچھا۔
”دونوں کے درمیان پچیس میل کا فاصلہ ہے۔“

”اوہ تب تو ہمیں مزید چھان بین کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی تصدیق کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کروایا جاسکتا ہے۔ میں بھی اپنے طور پر مزید چھان بین کروں گا۔ اس لیے مجھے واپس آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔“

میں ایک بار پھر ڈیفی گیا تاکہ کلارا سے مل کر کچھ مزید معلومات حاصل کر سکوں۔ وہ گھر پر نہیں تھی لہذا میں کار میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سورج غروب ہونے کے بعد آئی۔ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور بولی: ”کہو کیسے آتا ہوا؟“

ضروری ہے۔“

ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی اور اس نے ٹمن پر الزام لگایا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس پر ٹمن کو غصہ آ گیا اور اس نے کچن میں پڑے ہوئے چاقو سے اس پر حملہ کر دیا۔“
اس دوران بوبی بھی ہماری گفتگو میں شریک ہو چکا تھا۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔“اس نے اپنے بیٹے کو مار ڈالا۔ اس طرح تو انہیں اپنا ہی نقصان کر ڈالا۔ شروع شروع میں جیسپر روز کے ساتھ رہنا کتنا مشکل لگا ہوگا۔“
”بالکل نہیں کیونکہ وہ اس کا بھی باپ تھا۔“
”اس کا بھی باپ تھا۔“ سام کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”مجھے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں اور نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ اس کے کتنی عورتوں سے تعلقات تھے۔ اس واقعے کے بعد ٹمن نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے روز کو قائل کر لیا کہ وہ فنز بن جائے۔ وہ اس کے ٹکنز سے پن کے بارے میں کوئی بھی کہانی گھڑ سکتا تھا لیکن فنز کا وزن روز کے مقابلے میں بیس پاؤنڈ زیادہ تھا لہذا ٹمن اس کے کھانے پینے پر زیادہ توجہ دے رہا تھا تاکہ اس کا وزن بڑھ جائے اور سرائے میں کسی کو شک نہ ہو۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“ سام نے پوچھا۔
”یہ بات روز نے پولیس کو بتائی، وہ بخ گیا تھا۔ اس بات کو لے کر کلارا کے بوائے فرینڈ نے اسے خوب مذاق نشانہ بنایا اور کہا کہ اسے مزید نشانہ بازی کی مشق کی ضرورت ہے۔“
”روز کا اس پورے معاملے کے بارے میں کیا کہنا ہے؟“ سام آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

”وہ یہی کہتا ہے کہ ویڈیو نے اسے اس کے لیے اکسایا تھا۔“
”یہ بھی ممکن ہے کہ روز نے فنز پر چاقو سے وار کیا ہو تاکہ اس کے حصے کی دولت اسے مل جائے لیکن میرا شبہ ٹمن پر ہے۔“ میں نے بوبی سے کہا۔
”وہ کیوں؟“

”پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ فنز پر چاقو کے پے در پے وار کیے گئے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ ٹمن پر یو ایگٹا طاری ہوئی تھی اور وہ فنز کی اشتعال انگیزی برداشت نہ کر سکا۔ دوسری بات یہ کہ وہی شخص کلارا کے دروازے پر پہلے داخل ہوا تھا۔“
”بے چاری کلارا۔“ بوبی نے تاسف بھری لہجے

اسی وقت دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے کھلا اور وہ دونوں شاٹ گن لیے اندر داخل ہوئے۔ ٹمن آگے تھا، مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”یہ وہی سراغ رساں ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے مار ڈالو۔ اس وقت ہمارے پاس اچھا موقع تھا۔“
”ہم ہر ایک کو کسی وجہ کے بغیر نہیں مار سکتے پاپا۔“ فنز بولا۔

”ٹھیک ہے، اب تو ہمارے پاس اسے مارنے کی معقول وجہ موجود ہے۔“

”ہاں، اب ہم اسے مار سکتے ہیں۔“ فنز نے کہا۔
اس کی بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ کلارا نے پستول نکالا اور دونوں پر گولی چلا دی۔

اس واقعے کے کئی دنوں بعد میری زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا۔ میں اپنی ماں کے چھوٹے سے لوتنگ روم میں بیٹھا اور سام کو ان واقعات سے آگاہ کر رہا تھا جو بوبی فنز کے میرے دفتر آنے کے بعد پیش آئے تھے۔
”کیا آپ کو واقعی معلوم نہیں تھا کہ کلارا کے پاس پستول ہے؟“ سام نے پوچھا۔
”واقعی مجھے معلوم نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اسے پستول نکالتے اور ٹریگر دباتے دیکھا۔“

سام نے پوچھا۔ ”کیا انہوں نے مکان کے صحن میں کسی کو دفن کیا تھا؟“
”ہاں، وہ بد نصیب فنز گیر الذہل تھا۔ انہوں نے اس کی لاش کو بوری میں لپیٹ کر گڑھے میں رکھ دیا اور اوپر سے مٹی ڈال کر زمین برابر کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ بعد میں اسے کہیں اور منتقل کر دیں گے۔“

”پھر وہ ٹکنز کون تھا؟“ سام نے پوچھا۔
”جیسپر روز لیکن وہ بوڑھا واقعی ٹمن بچل تھا۔“
مما کی پیشانی پر مٹی پڑ گئی اور وہ غصے سے بولیں۔
”یہ کیسے ممکن ہوا کہ روز نے بچل کو اس کے بیٹے کے قتل پر آمادہ کر لیا؟“

”یہ معاملہ کچھ مختلف ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ٹمن بچل، روز کے پاس رہ رہا تھا۔ جب جیسپر روز نے سنا کہ فنز بار میں بیٹھا تھی بچل رونا تھا کہ اسے ورٹے میں بہت ساری دولت ملنے والی ہے تو اس نے یہ بات ٹمن کو بتائی۔ ٹمن کے دل میں لالچ آ گیا اور اس نے بیٹے سے دوبارہ تعلق استوار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے لیکن جب وہ سب روز کے گھر گئے تو فنز کے دل میں بوبی

میں کہا۔ "اے اپنے باپ کو مارنا بڑ گیا۔"
"اس نے اپنے دفاع میں گولی چلائی ورنہ وہ اسے مار ڈالتا۔"

"لیکن وہ اس کا باپ تھا۔ اسے اپنے بچے بھائی پر گولی چلا کر بڑ گئی اور میرا بچہ بھائی سے بھی محروم ہو گئی۔"
"ممکن ہے کہ کسی روز تصویر کا اصل رخ اس کے سامنے آجائے لیکن فی الحال اسے اپنے باپ سے محروم ہو جانے کا کوئی افسوس نہیں ہے جس سے وہ شدید نفرت کرتی تھی۔"

بونی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"لیکن بونی، اب ایک اور بات سامنے آئی ہے۔"
میں نے کہا۔
"وہ کیا؟"

"ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق فز کی موت کلارا کے گہرے پیش آنے والے واقعے سے دو سے چار ہفتے پہلے واقع ہوئی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہاری ماں کی وفات سے پہلے مارا جا چکا تھا۔ اس طرح اب ساری جائیداد تمہیں مل جائے گی لیکن اسٹیٹ کو خود بھی اپنے طور پر حقائق کا تجزیہ کرنا ہوگا تاکہ فز کے رشتے داروں کی اہلیت کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکے۔"

"کیا اس کا کوئی رشتہ دار بھی ہے؟"
"تم کلارا اور روز کو کیوں بھول رہے ہو۔ وہ سوتیلے ہی سہی لیکن اس کے بہن بھائی تو ہیں اور ممکن ہے کہ مزید دعوے دار بھی سامنے آجائیں۔"
"یہ فیصلہ تو قانونی ماہرین ہی کر سکتے ہیں کہ اس کی کیا پوزیشن ہے۔" اس نے مایوسی کے انداز میں کہا۔
"میرا خیال ہے کہ سب کچھ تمہارے ہی حصے میں آئے گا۔"

"واقعی؟"
"ہاں کیونکہ تم دل کے اچھے بچہ ہو اور اس دولت کو بھی اچھے کاموں میں استعمال کرو گے۔ تمہاری نیت صاف تھی اسی لیے تم نے مجھے فز کی تلاش پر مامور کیا تھا۔"
"کاش فز مجھے مل جاتا۔ میں خاندان کے بغیر کتنا ادھورا ہوں۔" اس نے یاس بھرے لہجے میں کہا۔

"کلارا کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس سے تمہارا خونی رشتہ نہیں لیکن فز کے حوالے سے ایک تعلق تو ہوتا ہے۔"
"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اسے بہت کچھ دے سکتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "خاندان کے بغیر آدمی

اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرتا ہے۔"
بونی کے جانے بعد ممانے کہا۔ "تمہیں اس کام کا معقول معاوضہ ملنا چاہیے۔ تم نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا۔ اس کے علاوہ عدالتی کارروائی میں بھی تمہارا بہت سا وقت ضائع ہوگا۔"

"بونی کا کہنا ہے کہ مجھے اس کام کا معقول معاوضہ ملے گا۔ اگر یہ بہت زیادہ نہ ہوا تب بھی میں اسے قبول کر لوں گا۔"

ممانے برا سا منہ بنایا اور سام کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔ "تمہارے ڈیڈی کا کہنا ہے کہ تم نے ان سے اپنے دادا کے بارے میں بات کی تھی؟"

"میں جانتا چاہتی ہوں کہ ڈیڈی ان کے بارے میں بات کیوں نہیں کرتے۔"
"اس کی بھی کچھ وجوہات ہوں گی۔" ممانے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔
"میں جانتی ہوں۔" سام بولی۔

میں اور ممانہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیا آپ لوگوں نے بھی انٹرنیٹ کا نام نہیں سنا۔ میں جان گئی ہوں کہ وہ طبعی موت نہیں مرے بلکہ انہوں نے خودکشی کی تھی۔ وہ اچھے کاروبار نہیں تھے۔ ان کے بنائے ہوئے مکانات اتنے ناقص تھے کہ اس کے بلے میں چند لوگ مر گئے۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ ڈیڈی اس لیے ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے۔ ان کی موت کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن آپ ان کی پوری زندگی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ داوی، آپ نے ان سے محبت کی اور شادی کر لی۔ ڈیڈی وہ آپ کے باپ تھے۔ میں آپ کی زبان سے ان کے بارے میں سنا چاہتی ہوں۔"

یہ سن کر ممانہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ہم دونوں نے ایک طویل عرصے تک اس بوجھ کو سینے میں دفن رکھا اور کبھی اس بارے میں بات نہیں کی۔ ممکن ہے کہ ہم کبھی انہیں معاف نہ کر سکیں لیکن اس لیے میرا دل چاہا کہ سام کو اپنے باپ کے بارے میں سب کچھ بتا دوں۔ میں اسے اس احساس محرومی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا جس کا شکار بونی فشر ہو چکا تھا۔ ہر شخص اپنے خاندان کے بارے میں جانتا چاہتا ہے پھر میں کیوں سام کو اس کے حق سے محروم رکھوں۔ رشتوں کی ڈور کو کاٹنا اتنا آسان تو نہیں۔





وصیت

عکس نامہ

انتظار... تھکا دینے والے لمحات کا نام ہے... کوفت... بیزاری اور افسردگی کی کیفیات ہر طرف سے انسان کو محصور کر لیتی ہیں۔ صبر... استقامت... مفاہمت اور تحمل... رفتہ رفتہ کہیں دور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی بے صبرے کا احوال... وہ برداشت کی آخری حد پر کھڑا تھا۔ جو ہوتا تھا... فوری رونما ہو جاتے... مگر گھڑی کی ٹک ٹک ختم نہیں ہو رہی تھی...

ایک شخص کا قصہ..... غلٹ پسندی نے اسے کامیابی سے دور پاتال میں دھکیل دیا

پہاڑی پر واقع اس تاریک مکان میں جیس دو سال سے اپنی دادی کے مرنے کا انتظار کرتے کرتے اکٹا گیا تھا۔ ڈاکٹر یہ بات کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ دادی کے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اب معاملہ صرف چند دنوں کا ہے لیکن وہ چند دن ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے دکھور یا ایس ڈاکٹر کی تمام آرا کو رد کرنے پر ڈٹی ہوئی ہے۔ وہ موت کو دور رکھنے کے لیے اسی عزم اور پائنداری سے جنگ کر رہی تھی جیسے کہ وہ زندگی سے

جاسوسی ڈائجسٹ 85 دسمبر 2014ء

جگ کرتی چلی آئی تھی۔

ہونے کے ماتے میں تمہیں اس قسم کی کوئی بات بتا نہیں سکتا۔ یہ رازداری کے اصولوں کے خلاف ہے۔

”تم مجھے کوئی ہلکا سا اشارہ تو دے سکتے ہو۔“ جیمس نے التجا کی۔ ”صرف یہ جاننے کے لیے کہ میں دادی کی نظروں میں کس مقام پر ہوں۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ تم یا کوئی اور کس مقام پر کھڑے ہو۔“ میکا لے نے قدر سے بد مزاجی سے کہا۔ ”یہی تو قانونی سقم ہے۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ تم یا ولیم فوسٹر تمام تر جائیداد کے حق وار بن سکتے ہو اور ممکن ہے کہ تم دونوں ہی حق دار ٹھہرو۔“

”تمہارا مطلب ہے۔“ جیمس کے لہجے سے خوف عیاں تھا۔ ”کہ ولیم تمام جائیداد کا واحد حق دار قرار دیا جاسکتا ہے؟“

”ہاں، یہ ہو سکتا ہے، تم بھی تب ہی حق دار قرار دیے جاسکتے ہو یا کوئی بھی! لیکن تم دونوں کے امکانات زیادہ ہیں۔ میں تمہیں خفیف سا اشارہ دے رہا ہوں جیمس! دادی کے زیادہ سے زیادہ قریب رہو۔“

”لیکن میں تو گزشتہ دو برسوں سے ان کے قریب ہی رہ رہا ہوں۔“ جیمس نے جواب دیا۔

میکا لے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس سلسلے کو جاری رکھو۔ یہ تمہارے لیے بہترین چال ہے۔“

جیمس سر د آہ بھرتے ہوئے وکیل کے دفتر سے نکل آیا۔ اسے داوی وکٹوریا کے پاس ایک اور طویل شب بیداری کرنا ہوگی۔

جب گھر واپس پہنچ کر اس کی نگاہ ولیم کے تاثرات سے عاری اور ہنستے ہوئے چہرے پر پڑی تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ولیم اور اتنی ڈھیر ساری جائیداد کا وارث؟ اس خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ دولت پانے کے بعد اس احمق کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ اسے اس دولت کا کیا کرنا ہے اور جیمس نے تو دولت اور جائیداد کے حصول کے بعد بہت سے منصوبے بنائے ہوئے تھے۔

اس وصیت پر سبقت لے جانے اور اس پیچیدہ معاملے کو حل کرنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اگر دادی وکٹوریا کی موت واقع ہو جاتی ہے تو وصیت نامے کی قانونی توثیق ہوگی اور اگر ولیم تمام تر دولت و جائیداد کا وارث قرار پایا اور اس کی بھی موت واقع ہوگئی تو یہ گویا طے ہوگا کہ اس کے بعد یہ تمام دولت اور جائیداد جیمس کے حصے میں آجائے گی۔

اور یقیناً اس بات کا امکان بھی تھا کہ دولت اور جائیداد اس کے نام نکل آئے۔ لیکن فی الوقت جیمس کوئی خطرہ

جیمس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ داوی وکٹوریا کے ساتھ ہمدردی اور رحم دلی کا برتاؤ کرنے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن دوسری طرف اسے ولیم فوسٹر کی فکر بھی لاحق تھی جو اسی مکان میں رہتا تھا۔

ولیم فوسٹر دادی وکٹوریا کی بہن کا بیٹا تھا جس کے انتقال کو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔

جیمس کو اس بات کی پریشانی نہیں تھی کہ دادی وکٹوریا کے مرنے کے بعد ولیم کو اس ڈھیروں جائیداد میں سے حصہ دینا پڑے گا جو دادی وکٹوریا کی ملکیت تھی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ولیم نرا احق اور بالکل بے عقل تھا۔ ولیم کو بات کرنے میں مشکل پیش آتی تھی، وہ ڈھیلے پن سے حرکت کیا کرتا تھا اور بات سمجھ نہیں پاتا تھا۔

جیمس اسیس مزید ایک سال انتظار کر لیتا اگر دادی وکٹوریا اچانک اپنا وصیت نامہ تبدیل نہ کرتی۔ جیمس نے وصیت نامے میں تبدیلی کی بات خود دادی وکٹوریا کے منہ سے سنی تھی، جب ایک رات وہ اسے کچھ پڑھ کر سن رہا تھا، البتہ دادی نے یہ راز افشا کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ تبدیلی کیا تھی۔

وصیت نامے میں تبدیلی کا ذکر سن کر جیمس خوف زدہ ہو گیا۔ وہ اگلے روز ہی دادی وکٹوریا کے وکیل لیون میکا لے کے پاس جا پہنچا۔

”نہیں جیس! میکا لے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔“ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ دادی نے تمہیں بتایا ہے، انہوں نے وصیت نامہ تبدیل کر دیا ہے اور اس تبدیلی کے وقت وہ مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں تھیں۔“

”لیکن جائیداد کسے ملے گی؟“ جیمس نے وکیل کی خوشامد کرتے ہوئے پوچھا۔ ”خدا جانتا ہے میکا لے کہ میں نے ان کی زندگی کے آخری ایام کو آرام و تسکین سے گزرنے اور انہیں راحت پہنچانے میں اپنی زندگی کے دو سال قربان کر دیے ہیں۔ اس خدمت گزاری کے صلے میں میرا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جس حالت میں ہیں، اس میں انہوں نے کیا کیا ہوگا۔“

وکیل میکا لے نے بے بسی کے اظہار کے طور پر شانے اچکا دیے۔ ”کاش میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا، جیمس! تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک وکیل

وصیت

دیکھا۔ جب وہ پہاڑی پر واقع اندھیرے میں پہنچا تو وہاں تار کی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ وہ گھر میں عقی دروازے کے راستے اندر داخل ہو گیا۔ عقی دروازے کی چابی اس کے پاس تھی۔ اس نے ہاتھوں میں دستانے پہن لیے جو اس کی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ کچن میں پہنچ کر اس نے دراز کھولی جس میں چمچے، چھری، کاٹنے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے دراز میں سے برف توڑنے والا وہ سوا نکال لیا جس کی نوک ولیم نے تیز کر دی تھی۔

پھر وہ دبے پاؤں سیزھیاں چڑھنے لگا۔ اسے ٹھنڈے پینے آ رہے تھے۔ ولیم اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ جیس نے اس بات کی پروا نہیں کی۔ ولیم کبھی باہر نہیں جاتا تھا۔ وہ گھر کے اندر ہی کسی جگہ ہوگا، جیس نے سوچا اور اس وقت اس کی کمرے میں غیر موجودگی ضروری بھی تھی۔

دادی وکٹوریہ کے کمرے میں پہنچ کر جیس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے خود کو سنبھالا اور ان کے بیڈ کے پہلو کی طرف چلا گیا۔ وہ سو رہی تھیں۔ ان پر نیند کا وہی عجیب سے غلبہ طاری تھا جیسے... کو ما کی کیفیت میں ہوں۔ لیکن وہ ہمیشہ اس نیند سے بیدار ہو جاتی تھیں جیس اس بات کا تصور ذہن میں آتے ہی اپنے دانت پیسنے لگا۔

اس نے برف توڑنے والے سونے کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور قدم جماتے ہوئے سونے کی نوک دادی کے سینے میں بائیں جانب پوری قوت کے ساتھ گھونپ دی۔ وار ہونے پر دادی کا جسم اکڑ گیا لیکن ان کے منہ سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ صرف ان کے ہونٹ خاموشی سے حرکت کر رہے تھے، البتہ آنکھیں کھل بند تھیں۔

ان کے سینے سے خون تیزی سے اگلنے لگا جو بیڈ کی سفید چادر کو داغ دار کر رہا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں ان کا جسم پُر سکون ہو گیا۔

جیس سمجھ گیا کہ وہ مر چکی ہیں۔

جیس کے دستانے خون میں لت پت ہو چکے تھے۔ اس نے وہ خون آلود دستانے اتار لیے۔ پھر دادی کا... ہایاں ہاتھ پکڑا جس کی کلائی میں ایک چھوٹی سی رسٹ وایج بندھی ہوئی تھی۔ جیس نے گھڑی کے شیشے کو ایک جھٹکے سے بیڈ کے سر ہانے پر دے مارا تو شیشہ کڑی کڑی ہو گیا اور گھڑی کی سوئیاں رک گئیں۔

اس وقت گھڑی میں آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔

مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس نے ولیم کو نیچے چھوڑا اور خود دادی وکٹوریہ کو دیکھنے کے لیے اوپر چلا گیا۔

دادی وکٹوریہ سو رہی تھیں۔ وہ دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ دادی کے رخساروں کی جھریاں نمایاں تھیں اور بائیں کنٹینی کی رگ پھڑپھڑا رہی تھی۔

اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد جیس نے ایک کاغذ پر اپنے منصوبے کو لکھنا شروع کر دیا۔ یہ ایک پرنکیٹ پلان ہوگا۔ تمام تر منصوبے کا اٹھار اس کی بے عیبی پر ہوگا۔ وہ سہ پہر تک اس منصوبے پر مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنی پینل ایک طرف رکھ دی اور اپنے منصوبے کو دوبارہ پڑھنے لگا۔ وہ ہر طریقے سے اپنا اطمینان کر لیتا ضروری سمجھتا تھا۔

اس شام سات بجے جیس ایس نے اپنے پلان پر عمل شروع کر دیا۔ رات کا ہلکا سا کھانا کھانے کے بعد اس نے کچن کی دراز میں سے برف توڑنے کا سوا نکالا اور اسے ولیم کو دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ کند ہو رہا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم آج رات اس کی نوک تیز کر دو۔“

ولیم نے ہنستے اور سر ہلاتے ہوئے وہ سوا لے لیا۔

ولیم کے چہرے پر ہمیشہ چھائے رہنے والے وہ مبہم سے تاثرات جیس کو ہمیشہ ڈسٹرب کر دیتے تھے۔ اس وقت بھی وہ کھپکھی لے کر رہ گیا۔ گو کہ وہ ایک گرم رات تھی لیکن جیس نے اپنا کوٹ پہنا اور اندرون شہر روانہ ہو گیا۔

ایک مقامی سینیما گھر پہنچ کر اس نے شو کا ٹکٹ لیا اور ٹکٹ آفس پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے جو اسے پہچانی تھی، خیرد عالیت دریافت کی۔ پھر وہ گیٹ کی جانب بڑھا اور نوجوان ٹکٹ فیکر کو ٹکٹ چھما دیا۔ اس نوجوان نے جیس سے خوش دلی سے بات کی اور دادی وکٹوریہ کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ پھر جیس تعمیر میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچ کر جیس نے اپنا کوٹ اتار دیا اور اسے ایک کونے کی شکل میں لپیٹ کر مراوندہ انموٹنگ روم کے ایک نچلے صوفے کے نیچے چھپا دیا۔ یہ کام کرنے کے بعد جیس جیمز کے بغلی دروازوں میں سے ایک کے راستے جیمز سے باہر نکل گیا۔ البتہ اس نے جاتے ہوئے اس بغلی دروازے کے نیچے ایک لمبی سی پینل پھنسا دی تھی تاکہ خود کار دروازے کا تالا بند نہ ہو جائے۔

پھر وہ تیزی سے گھر کی جانب چل دیا۔

اسے گھر جاتے ہوئے راستے میں کسی نے نہیں

پڑے گی۔ تم کسی کی عداوت میں اپنا ہی نقصان کر بیٹھے ہو۔“
”مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ جیمس نے جواب دیا۔

اور یہ معاملہ یوں ہی رہا۔
وکیل میکالے نے پوری کوشش کی کہ ولیم پر مقدمے کی کارروائی میں تیزی رہے اور جب تک مقدمہ ختم نہیں ہو جاتا، اس نے دادی و کنوڑیا کی وصیت نامے کی شرائط جیمس ایس کو پڑھ کر سنانے سے صاف انکار کر دیا۔

مقدمے کی سماعت کے دوران میں جب استغاثہ کا وکیل ولیم فوسٹر کے خلاف کیس کو مضبوط کر رہا تھا تو جیمس کے چہرے پر فتح مندی کے تاثرات نمایاں تھے۔ شہادتوں کی کڑیاں اتنی زیادہ مضبوط تھیں کہ انہیں توڑنا ناممکن تھا۔ پچاسی ولیم کا مقدمہ دکھائی دے رہی تھی۔

اور اس تمام کارروائی کے دوران وہ ایڈیٹ ولیم فوسٹر سے سمجھے بغیر کہ اسے کس سزا کا سامنا کرنا پڑے گا، مسلسل مسکراتا رہا۔

مقدمے کے آخر میں جیمس بے چین سا ہو گیا۔
وکیل میکالے، ولیم کا دفاع کر رہا تھا اور ثبوت کے جال کے باوجود قطعی طور پر پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ جوہری کے لیے استغاثہ کے دلائل کا خلاصہ کرنے سے عین قبل میکالے نے ڈاکٹر کونراڈ کی شکل میں ایک حیرت انگیز گواہ پیش کر دیا۔

ڈاکٹر کونراڈ شہر کا وہ میڈیکل افسر تھا جو کنوڑیا ایس کی بیماری کے تمام عرصے اس کا علاج کرتا رہا تھا۔
ڈاکٹر کونراڈ نے اس بات کی قاطبی شہادت دی کہ اس رات جب وکنوڑیا ایس کا قتل ہوا تھا تو وہ رات پونے آٹھ بجے سے آٹھ بجے تک ایس ہاؤس میں ولیم سے ٹیلا فون پر باتیں کرتا رہا تھا۔
یہ گواہی سننے کے بعد جیمس کو اپنی دنیاؤ گماتی محسوس ہونے لگی۔

اسے یاد آیا کہ جب وہ سینما سے چھپ کر نکلنے کے بعد گھر واپس پہنچا تھا تو ولیم اسے کیوں دکھائی نہیں دیا تھا۔ ٹیلی فون بیرونی ہال میں رکھا ہوا تھا۔ دادی و کنوڑیا کو قتل کرنے کے لیے وہ مکان کے عقبی زینے سے ہوتا ہوا اوپر پہنچا تھا اور جس وقت وہ جرم کا ارتکاب کر رہا تھا تو اس تمام عرصے کے دوران ولیم، ڈاکٹر کونراڈ سے فون پر بات کر رہا تھا۔

دادی و کنوڑیا کی کلانی کی ٹوٹی ہوئی گھڑی میں قتل کا جو وقت سیٹ تھا اور جس پر گھڑی کی سوئیاں رک گئی تھیں، اس وقت

اس نے خون آلود دستانے اٹھائے اور داوی کے کمرے سے نکل کر ولیم کے کمرے کے باہر پہنچ گیا۔ اس نے ایک خون آلود دستانہ ولیم کے کمرے کے دروازے کی تاب سے پونچھ لیا اور پھر نیچے اتر آیا۔ اس نے باہر نکلنے کے لیے ایک بار پھر عقبی راستہ اختیار کیا اور وہ دوبارہ اندرونی شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے خون آلود دستانے راستے میں ایک کوزے دان میں چھینک دیے۔

وہ بہ حفاظت سینما گھر تک پہنچ گیا۔ اس نے وہی راستہ استعمال کیا اور دروازے کے نیچے اٹکی ہوئی پھل ہٹا کر اندر داخل ہو گیا پھر سموکنگ روم کے صوفے کے نیچے چھپا ہوا ٹاپ کوٹ نکال کر پہنا اور ٹھیکڑ میں داخل ہونے کے بعد ایک سیٹ سنبھال لی۔ پھر وہ آخر تک بیٹھا رہا اور پورا شو دیکھنے کے بعد وہاں سے اٹھا۔

سینما کا شو مکمل دیکھنے اور ٹکٹ ٹیکر سے الوداعی ہیلو ہائے کرنے کے بعد جیمس ایک بار پھر گھر واپس پہنچ گیا۔ وہاں وکیل میکالے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ باقی تمام گھروں پر ان پڑا تھا۔ میکالے نے تیزی کے ساتھ اسے بتایا کہ کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔

”ولیم کو حراست میں لینے کے بعد وہ وکنوڑیا کی لاش یہاں سے لے گئے ہیں۔“ میکالے نے کہا۔ ”برف توڑنے والے سڑے پر ہر جگہ ولیم کی انگلیوں کے نشانات تھے اور اس کے کمرے کے دروازے پر خون بھی لگا ہوا تھا۔“
جیمس یہ سن کر دہشت زدہ سا ہو گیا۔ ”کون یہ گمان کر سکتا تھا کہ ولیم.....“ اس کی آواز میں کھوکھلا پن نمایاں تھا۔
”اب تم سنو، جیمس۔“ وکیل میکالے نے انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں میرے ساتھ ڈھونڈ رہا جانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ولیم نے داوی و کنوڑیا کو قتل نہیں کیا۔ اس کے برعکس میں جانتا ہوں کہ انہیں تم نے قتل کیا ہے۔ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت ہے جسے غیر مؤثر قرار نہیں دیا جاسکتا اور تم نے یہ سب کامیابی کے ساتھ کس طرح کیا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔“
”تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔“ جیمس نے وکیل کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”بکو اس مت کرو۔“ میکالے نے سختی سے کہا۔ ”سنو جیمس! میں تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تمہارا منسوبہ جو کچھ بھی تھا، تم نے اس پر ایک گھڑی کی طرح کام کیا ہے۔ تم شے سے پاک ہو۔ لیکن باقی گاڑ، تمہیں ندامت اٹھانی

وصیت

ہوئے کہا۔ ”اب میں تم سے سرکاری طور پر ایک سوال پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم دولت و جائیداد کا دعویٰ کر رہے ہو؟ کیا تم موت کے وقت ان کے پاس تھے؟“

”نہیں۔“ جیمس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن کوئی اور بھی اس کا دعوے دار نہیں ہو سکتا۔ میکالے! کم از کم مجھے اطمینان تو رہے گا کہ یہ بات میرے علم میں ہے۔“

میکالے نے جیمس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس پر ترس آگیا ہو۔

ولیم نیچے ہال میں فون پر ڈاکٹر سے گفتگو میں مصروف تھا۔ یہ ایک مختصر سی حقیقت تھی لیکن جیوری کے ارکان ڈاکٹر کو نراڈ سے بہ خوبی واقف تھے اور اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جیوری نے آپس میں مشورہ کرنے اور فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

بیس منٹ بعد میں وہ کمرائے عدالت میں واپس آئے تو انہوں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ولیم کو بے تصور قرار دے دیا۔

☆☆☆

بعد میں وکیل میکالے اپنے دفتر میں سامنے بیٹھے ہوئے جیمس کو دیکھ کر میرا سر ار انداز میں مسکرانے لگا۔

”تم ناکام ہو گئے ہو۔“ وکیل نے کہا۔ ”تم مکمل طور پر ناکام ہو گئے ہو، جیمس! گوکہ وہ کبھی تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار نہیں کر سکیں گے، دادی و کنور یا نے خود تمہیں سزا دے دی ہے۔ بیٹھ جاؤ۔“

جیمس سہم کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تم یہ بھی غلط کہہ رہے ہو۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”کوئی ہے جو اس کا دعوے دار ہو سکتا ہے۔ میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ یہ دولت اور جائیداد اسے مل جائے۔ دادی و کنور یا کی دولت و جائیداد کا وارث ولیم فوسٹر ہے۔“

”وہ وارث ہرگز نہیں ہو سکتا۔“ جیمس چیخ پڑا۔

”دراشت کا دعویٰ اس پر قائل ہونے کا شپا لگا دے گا۔“

اس بات پر وکیل میکالے نے شانے اچکا دیے۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ دادی انظر میں ایسا ہی ہے۔ لیکن وہ دعویٰ کر سکتا ہے جیسے، وہ کہہ سکتا ہے کہ دادی و کنور یا کی موت کے وقت وہ ان کے پاس تھا۔“

اس بات پر جیمس کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”اسے دعویٰ کرنے دو۔ اگر اس نے ایسا کیا تو عدالت اسے پھانسی پر لٹکا دے گی۔ اس سے ایسی ہی حاجت کی توقع کی جاسکتی ہے۔“

”نہیں، وہ اسے پھانسی پر نہیں لٹا سکیں گے۔“ وکیل میکالے نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

وہاں ولیم فوسٹر بھی موجود تھا۔ حسب معمول اس کے چہرے پر احمقانہ ہنسی تھی اور اسے قطعی علم نہیں تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہ دانت نکالے وکیل میکالے کو سیکے جارہا تھا۔

وکیل میکالے اٹھ کر اپنی الماری تک گیا اور وہ قائل اٹھا کر لے آیا جس میں دادی و کنور یا کی وصیت موجود تھی۔ اس نے وصیت کے لفافے پر ثبت سیل توڑ دی اور لفافہ کھول کر اس میں سے وصیت نامہ باہر نکال لیا۔ پھر ان دونوں کو متوجہ کرتے ہوئے بلند آواز سے وصیت نامہ پڑھنا شروع کر دیا۔

”میں، و کنور یا، درست اور صحت مند ذہن اور جسم کے ساتھ یہ وصیت کرتی ہوں کہ میری موت کے وقت جیمس ایس اور ولیم فوسٹر میں سے جو بھی میرے سر ہائے موجود ہو، وہ میری تمام دولت اور جائیداد کا وارث ہوگا۔“

”وہ کیوں؟“

”تمہیں معلوم ہوگا جیمس کہ اس ملک میں کسی شخص پر کسی ایک جرم کے الزام میں دو مرتبہ مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ قانون میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے۔۔۔۔۔ ولیم فوسٹر پر دادی و کنور یا کی ہلاکت کے جرم میں پہلے ہی مقدمہ چل چکا ہے اور اسے اس الزام سے بری قرار دیا جا چکا ہے، اب بتاؤ کیا کوئی طاقت اسے دادی و کنور یا کی دولت و جائیداد کا دعویٰ کرنے سے روک سکتی ہے؟ ویسے بھی وہ دادی کی موت کے وقت ان سے قریب تر تھا۔ تم بے چارے تو بہت دور تھے۔“

وکیل میکالے کے لہجے کا ہر جیمس کے دل و دماغ میں ارتعاش چلا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ بے بسی سے اپنا سر پیٹنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔

یوں لگا جیسے جیمس ایس کے چہرے سے تمام کا تمام خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ وکیل میکالے نے پڑھنے کے بعد وصیت نامہ میز پر رکھ دیا۔

”اب کیا ہو گئے، جیمس؟ کیا تم اب دولت و جائیداد کا دعویٰ کر رہے؟ کیا دادی و کنور یا کی موت کے وقت تم ان کے پاس موجود تھے؟“ وکیل میکالے نے کہا۔

”اس۔۔۔۔۔ اس طرح تو میں قائل قرار دیا جاؤں گا؟“ جیمس نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ تم نے اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیا ہے۔“ وکیل نے میز کی سطح پر اپنی انگلیاں بجاتے

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندن کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور
انانہ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے
مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن
جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے
ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... آشرم
پھر ایک کلیسا کی نام نہاد بن جاتا ہے جسے
گھنٹوں کے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی
شرمناک ہے مگر یہ پورے ہے... استحصال کی
صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے
بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی
ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر
کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے
تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا
شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ
اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل
اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے
اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی
راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا
تھا... اس کے گھسٹ میں راج کا خواب دیکھتے
والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے
آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا
دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی
سفسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں
سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سننی اور ایشن میں

ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...



ہر کہ آپ کو تو ساری حقیقت کا علم ہے کہ پولیس مجھے قانون کی خاطر نہیں بلکہ اپنے راتب نوازوں کی خوشنودی کی وجہ سے گرفتار کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ روشن خان کے عزائم سے آپ بھی واقف ہیں۔ ممتاز خان پولیس اور قانون کا سہارا لیتے ہوئے مجھے دوبارہ جلی پولیس مقابلے میں بلاک کرنے کی مذموم کوشش کر چکا ہے۔

میرے لب و لہجے میں جوش خود کر آیا تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اب خانم شاہ کی خود غرضانہ ہٹ مجھ پر اچھی طرح واضح ہونے لگی تھی۔

میری دونوں اور مدلل گفتگو نے شاید خانم شاہ کو باور کرا دیا تھا کہ وہ مجھے آسانی سے بے وقوف نہیں بنا سکتی۔ نیز یہ بھی کہ مجھے بھی اس کی خود غرضانہ سوچ کا بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے اندر کا دبا ابال بالاً خراٹا آیا۔

”شہزی! میری معصوم اور بے گناہ بہن آسیہ صرف تمہاری وجہ سے ایک دردناک موت سے ہمکنار ہوئی۔ وہ اپنا آرام و سکون سچ کر محض تمہاری مدد کی خاطر آخری دم تک مجھ پر عزم رہی تھی اور جب اس نے تم پر اپنی عزت اور جان... بڑی جان کنی کے عالم میں قربان کر ڈالی ہے تو تم اتنے خود غرض ہو گئے ہو کہ اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ایک ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتے، مجھے تم سے اتنے گھٹیا رویے کی توقع نہ تھی۔“

کوئی چارہ کار نہ پاتے ہی خانم شاہ اب اس فوج پر اتر آئی تو مجھے مجبوراً اسے آئینہ دکھانا ہی پڑا۔ اس کے چہرے پہ نظریں جھپکاتے ہوئے مسامت سے بولا۔ ”میں تو اب تک دانت کسر نفسی سے کام لے رہا تھا۔ کیونکہ اس حقیقت سے آپ کو بھی آپ کی بہن آسیہ میرے سامنے اپنی بھینک غلطی کا اظہار کرتے ہوئے آگاہ کر چکی تھی کہ وہ میری مدد نہیں کر رہی تھی بلکہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی خاطر وہ میرے ساتھ اس مہم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی ایک غلط وید یو کلب نے ہی درحقیقت میرے لیے اُن گنت مسائل کھڑے کر دیے تھے، جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے پھر بھی آسیہ کی اس غلطی کو معاف کرتے ہوئے اسے خود سے الگ کرنے کی کوشش چاہی تھی، مگر وہ ایک باضمیر اور باغیرت لڑکی تھی۔ وہ ضمیر کا تیدی بن کر زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی، اب رہی بات آپ کا میری سوچ کو گھٹیا کہنے کی تو... خانم صاحبہ! مجھے خود آپ کی اس گھٹیا سوچ پر افسوس ہو رہا ہے کہ آپ ان تمام پیش آنے

ایڈووکیٹ خانم شاہ کی بات سے مجھے ہی نہیں دیر خان کو بھی حتمی اختلاف تھا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی ملی میں اپنا سر اور ہاتھ ہیک وقت ملاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں... ہرگز نہیں، شہزاد کی از خود گرفتاری ایک بے وقوفانہ عمل ہوگا۔ مجھے حیرت ہے، آپ یہ... غیر دانشندانہ مشورہ دے رہی ہیں؟“ دیر خان کی حیرت میں ملی کا مضر بھی تھا۔ اسی اثنا میں اس نے پاس بیٹھی ملی کو مخصوص اشارہ کر کے وہاں سے چلا کر دیا۔

”بعض حالات و معاملات میں ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں خان صاحب۔“ خانم شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بھی مسامت سے بولا۔

”اور بعض حالات و معاملات میں اس طرح کی گرفتاری خود اپنے ہی گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔“ خانم شاہ کے جواب میں دیر خان خود ہی میرا دفاع کر رہا تھا۔ اس لیے سر دسٹ میں خاموشی سے دلوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ تاہم میں بظاہر خاموش چہرے اور بھانپتی نظروں سے خانم شاہ کی گفتگو سے کچھ اندازہ بھی اخذ کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے لگتا تھا کہ اپنی بہن آسیہ کے اس بے پناہ قتل پر وہ بہت رنجیدہ اور مضطرب الحال ہو رہی تھی، میرا تجربہ تھا کہ ایسی کیفیات میں انسان کو صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے حالانکہ دیر خان سے زیادہ خانم شاہ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ میرا پولیس کے ہتھے چڑھنا بالخصوص سپر سنڈنٹ روشن خان کے، کس قدر بھینک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ دیر خان اس خطرناکی کو مد گاہ رکھتے ہوئے خانم شاہ کے مشورے کی سختی سے نفی کر رہا تھا۔

”دیکھیے خان صاحب! قانونی معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور ہاریکیوں سے آپ سے زیادہ میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اس میں کہیں نہ کہیں اور بھی نہ بھی پوٹرن لینا پڑتا ہے۔“

خانم شاہ کی اس بات نے بالآخر مجھے بولنے پر مجبور کر ہی دیا۔ اس کے بہ خند رہنے اور اپنے کز در... مگر خود غرضانہ موقف پر ڈٹے رہنے اور اپنی وکالت کا ہم پر دانتہ رعب جھاڑ کر... قائل کرنے کی روش نے مجھے بھی سچ بنا دیا۔ لہذا میں نے خانم شاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”خانم صاحبہ! کم از کم میرے معاملے میں کوئی قانونی پیچیدگی یا بار باری سرے سے ہی نہیں نظر آتی ہے۔ میرا معاملہ تو سیدھا اور صاف ہے۔ مجھے حیرت ہے آپ کی بات

زہر خندانہ انداز میں مسکرایا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

”مجھے ایسا مجبوراً کرنا پڑا۔ ورنہ اس کے یوں جانے کے بعد یہ کوٹھی تمہارے لیے محفوظ نہیں رہتی۔“ مجھے اس کی بات درست لگی مگر مجھے یہ بھی اچھا محسوس نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔

”میں خانم شاہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“

”چند گھنٹے گزر جانے دو۔ کبھی کبھی انسان کا اہمال دماغ سے نیچے اترنے لگتا ہے تو تب ہی اسے بات سمجھ میں آتی ہے۔“ وہ بولا۔ اسی دوران گارڈ اندر داخل ہوا اور مؤدبانہ بولا۔

”خان جی! خاتون کو اندر پہنچا دیا گیا ہے۔“

”اس کی گاڑی بھی اندر کر لی ہے؟“

”جی خان جی...“

”ٹھیک ہے۔ ہاں... وہ ذرا نیر کو بھیج دو سامان کے ساتھ۔“

”جی بہتر۔“ گارڈ نے مؤدبانہ کہا اور چلا گیا۔ زبیر خان نے کسی نیر نامی آدمی کو نجانے کون سا سامان لانے کو کہا تھا۔ مگر جب ذرا ہی دیر بعد ایک چھریر سے جسم کا آدمی ہاتھ میں درمیانی سائز کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا تو بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔

نیر نامی اس آدمی نے جوڑے درمیان میں بھی شیشے کی ٹاپ والی میز پر سجائی تھی، اس میں ”نواز مات آوارہ“ کا سامان سجا ہوا تھا۔

اعلیٰ برانڈ کی انگلش و مسکی، دو بلوریں پیکنگ، ایک چھوڑے اور بھنی ہوئی مونگ بھلی کے دانوں کی پلیٹوں کے علاوہ، آئس کیوب کا باؤل بھی تھا۔ جس کے اندر چند آدھ کئے لیموں رکھے ہوئے تھے۔

”کیوں تو جوان! شغل تو کرتے ہو گے...؟“ زبیر خان نے معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تو میں نے فوراً نلی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جی بالکل نہیں... آپ سمجھیے۔“

میں نے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ ذرا تنہائی چاہتا تھا اور زبیر خان نے خود ہی یہ مسئلہ حل کر دیا۔ گارڈ کو آواز دے کر بلایا پھر مجھ سے بولا۔

”تم ذرا اندر جا کر کچھ دیر آرام کر لو، پھر باقیں کرتے ہیں۔“ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ گارڈ ہولے سے میرے سامنے خم ہوا، میں... اس کے عقب میں چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے کمرے تک چھوڑ کے گارڈ پلٹ

والے حالات سے عموماً واقف نہیں ہیں۔

میری جی تکی جواہی کار رودائی نے ایک ایسی پروفیشنل صورت کو ٹنگ سا کر کے رکھ دیا تھا جسے اپنے آپ پر بڑا ازم تھا کہ وہ عدالتی دنیا میں اپنی دھواں دھار بحث سے سینئر وکیلوں کو لاجواب کر دیتی ہوگی۔ وہ میری صورت میں یہ ظاہر ایک عام جذباتی نوجوان کو بے نام سی غیرت کا جوش دلا کر قائل کر لے گی۔ اس کا سارا ازم ناک کے راستے بہہ نکلا تھا۔ زبیر خان مجھے اپنے موقف کے حق میں مدلل اور جامع گفتگو کرتا پایا کہ... دانستہ طعنیت بھرے انداز میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔

خانم شاہ فوراً اپنی اصلیت پر اتر آئی اور مارے طیش کے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہے شہزی! اگر تم میرے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرنے کو تیار نہیں ہو تو پھر مجھ سے بھی کسی قسم کی امید نہ رکھنا... اور یہ بھی تم سن لو... اپنی بہن کے قاتلوں کو تختہ دار پر چڑھانے تک میں پُر عزم رہوں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کسی کو بھی تختہ مشق بنانا پڑے... بائے...“

وہ بھنائے ہوئے انداز میں یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ میں ابھن آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا۔ مجھے اس کی بالکل پروا نہ تھی کہ جو اس نے مجھ سے تعاون کے سلسلے میں کہا تھا۔ پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد میرے لیے مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔ وہ بے وقوف تھی، انتقامی روش میں وہ آسپہ کے سفاک قاتلوں کو کیفر کردار تک کیا پہنچائے گی... بلکہ الٹا میرے خلاف ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ درحقیقت مجھے اس کی نہیں اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ مگر جوش انتقام میں جلد بازی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور یہ عین وہی حرکت کر رہی تھی جو اس کی چھوٹی بہن آسیہ نے کی تھی۔

میں نے فکر مندی سے سامنے صوفے پر بہ ظاہر آرام سے بیٹھے ہوئے زبیر خان کی طرف دیکھا۔ یقیناً اسے بھی اذراک ہونا چاہیے تھا کہ پھری ہوئی خانم شاہ کا نیلی کوٹھی سے اس طرح نکلنے کا مطلب... اس جگہ کو بھی پولیس اور دشمنوں کی نظروں میں مشکوک بنانے کے مترادف ہے۔

تب میں نے دیکھا۔ زبیر خان نے اپنے سیل پر کسی سے سمجھنے میں جھکمانہ کہا۔

”ایک باؤلی کتیا یہاں سے نکل رہی ہے۔ گیٹ پار نہ کرنے سے پہلے اسے دیوچ کر اندر کمرے میں پہنچا دو۔ اور اس کے منہ پر پٹی بھی باندھ لو۔“ یہ حکم دینے کے بعد وہ

سجیدہ ہے؟ اور کس قدر کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ جبکہ ادھر ایڈوکیٹ خانم شاہ نے بھی ایک نیا مسئلہ... بالفاظ دیگر شوشہ چھوڑ دیا ہے۔

مجھے اپنے کمرے میں آئے نصف گھنٹا ہوا تھا کہ دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ میں خیالات کے بہمنور سے چونک کر ابھرا اور دروازے کی طرف دیکھ کر بولا... "کون...؟ آجاؤ، دروازہ کھلا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ زبیر خان نے "شغل" فرمانے کے بعد مجھے بلانے کے لیے کسی کو میرے کمرے میں بھیجا تھا مگر جب دروازہ کھلا تو میں بڑی طرح ٹھنک گیا۔ سامنے نیلی خاتون کھڑی تھی۔

☆☆☆

پُرکشش اور حسین کتابی چہرہ، دراز قامت، لمبے ریشمی بال، منقسم ہونٹ اور گہری بولتی ہوئی سی دلکش آنکھیں... نیلی کو دیکھ کر میں فوراً ہیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"آ... آپ... یہاں... کیسے؟"

"کیوں؟ کیا میں یہاں نہیں آ سکتی؟" وہ اٹھلائے ہوئے لیجے، رمزیہ مسکراہٹ اور معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ساتھ میں چند قدم چلتے ہوئے اندر بھی آ گئی... اور اک اذوائے دل آرا کے ساتھ صوفے پر براجمان... ہو گئی، مجھے گھبراہٹ نے آن لیا۔ کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ نیلی نے ہلکے پنک ٹھک کی چمکیلی گولڈن لیس والا بیش قیمت شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ باریک ریشمی مہین لباس میں اس کا وجود ہر قدم پر تھرتھاتا ہوا بھی لگتا تھا۔ مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ وہ حسین ہی نہیں بلکہ بہت دلربا اور پُرشباب جسم کی مالک بھی تھی۔

اس کے حسن و شباب کی رحنائی دیکھ کر دل میرا بھی بے طرح دھڑکا تھا مگر میں خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "زبیر صاحب میرے منتظر ہوں گے مجھے ان کے پاس جانا چاہیے۔" مقصد اس حسین قافلہ سے جان چھڑانا تھا میرا۔ اس کا یوں میرے کمرے میں آنا اور پھر بیٹھ بھی جانا مجھے معیوب سا لگ رہا تھا اور بارِ خاطر بھی۔ وہ زبیر خان کی بیوی تھی۔ دوسری یا تیسری ہی تھی، مجھے اس سے کوئی غایت نہیں تھی، کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا... اس کے کسی آدمی کی نظر پڑ سکتی تھی، وہ کیا سمجھتا۔

"وہ دو تین گھنٹے سے پہلے اپنی جگہ سے نہیں اٹھیں گے۔" اس نے مترنم سی آواز میں کہا۔ اس کی بولتی آنکھوں

گیا۔ میں آرام دہ بیڈ پر نیم دراز سا ہو کر سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

حالات عجیب رخ اختیار کر رہے تھے، دوست دشمن ہو رہے تھے، جانے میری تقدیر میں آکے کیا لکھا تھا۔ میں جتنا حالات سدھارنے کی کوشش کرتا وہ اسی قدر... دیگرگوں ہوتے چلے جاتے۔ میرے بازو کا زخم اب قدرے بہتری کی جانب مائل تھا۔ یہاں بھی میری پٹی کی گئی تھی۔

میرے کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ پھر شاید ہوا سے یا اپنے جھول میں وہ تھوڑا سا مزید کھل گیا۔ درمی بچھا روشن کوریڈور مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ میں یونگی وہاں غیر مرئی تھیلے پر اپنی نظریں جمائے سوچ میں غرق تھا کہ معا وہاں میں نے کسی کی جھلک دیکھی۔ پھر ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ اور ہلکی مخصوص محوشبو سے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نیلی خاتون تھی۔ اسے میں نے کچھ ٹائپ کے لیے اپنے کمرے کے سامنے رکھتے دیکھا تھا اور اندر جھانکتے ہوئے بھی۔ میرے دل کو پھر بے چینی سی کھانے لگی۔ وہ آگے بڑھی، میں نے قدرے سکون کی سانس لی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے ہلکی سوسپتی کی آواز سنائی دی۔ شاید اس کا کمرہ میرے کمرے کے برابر میں تھا یا پھر وہ دانستہ اس کمرے میں داخل ہوئی تھی، کوٹھی بڑی تھی اور وہ اس کی مالک تھی۔ اچانک ایک گانے کے بول کچھ واضح اور اونچی آواز میں سنائی دیے۔ یہ ایک انڈین مودی کا مشہور گانا تھا۔ گلی گلی میں پھرتا ہے... تو کیوں بن کے بجا رہے...

آ... میرے دل میں بس جا... میرے عاشق

آواز

مجھے یہ بات اور نیلی خاتون کا یہ فلمی گیت سننا عجیب اور عارضیہ سا محسوس ہوا اور اس سے بڑھ کر اس کی یہ حرکت بھی نہ... کہ وہ دانستہ دو تین بار دروازہ کھڑکے گانے کے نیکی بول مجھے سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہر حال... مجھے ان خرافات سے کب دلچسپی تھی۔ میں نے سر جھٹکا اور اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ موسیقی کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر گزری۔ شاید موسیقی بھی بند کر دی گئی۔ اب خاموشی طاری تھی۔

میں... سوچنے کے لیے کمرے میں کچھ دیر کے لیے آیا تھا۔ نیلی خاتون کی ٹین اٹیج لڑکیوں جیسی حرکت مجھے ناگوار گزری تھی۔

میں ایک بار پھر سوچ میں محو ہو گیا۔ میں زبیر خان کے متعلق سوچنے لگا کہ وہ میری مدد کے سلسلے میں آخر کس حد تک

موت پر براہمان ہونے کے بعد وہ مجھ سے بولا۔
 "میں نے ابھی ابھی اپنے ایک پرانے جاننے والے
 سینئر وکیل سے بات کی ہے۔ وہ کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والا
 ہے۔"

میں نے ہولے سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے
 کہا۔ "میرا معاملہ طوالت اختیار کر سکتا ہے مگر میری کوشش
 ہوگی کہ پہلے... میرے ساتھیوں کو پولیس کی حراست سے
 چھڑانا از بس ضروری ہوگا۔ کیونکہ ان کے ذریعے مجھے بلک
 میل کیا جاسکتا ہے یا کسی دباؤ کا شکار کیا جاسکتا ہے۔" میری
 بات سن کر زبیر خان نے اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی۔

"خان صاحب! اگر ممکن ہو سکے تو پہلے آپ پولیس کی
 حراست میں موجود میرے تین ساتھیوں ارشد، شوکت حسین
 اور شکیلہ کی ضمانت وغیرہ پر رہائی کا بندوبست کر دیتے تو مجھے
 زیادہ تسلی اور خوشی ہوتی۔" میری بات پر اس نے ایک پُر
 خیال ہنکارا بھرا اس دوران نہ جانے کیوں نیلی کے الفاظ
 میرے کانوں میں سرکوشی کے انداز میں سنائی دینے لگے۔
 "جنہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے... خان
 صاحب کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا آلہ کار بنانے کا
 ہنر بخوبی جانتے ہیں۔"

میں نے سر جھٹک دیا۔ یہ اپنی جگہ ایک یقینی امر
 تھا۔ اگر زبیر خان میرے کسی کام آرہا تھا تو پھر مجھے بھی
 اس کے کسی کام آنے میں عار نہیں محسوس کرنا چاہیے تھا۔ اس
 میں آلہ کار بننے والی کوئی بات ہی نہ تھی۔ اب تک زبیر خان
 کا میرے ساتھ دوستانہ رویہ ہی تھا۔ اس میں کسی حکم کا دخل
 کب تھا۔ لہذا میں نے دل ہی دل میں نیلی خاتون کی بات
 رد کر ڈالی۔

"جنہیں خود سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی بڑی فکر
 رہتی ہے نوجوان!" کچھ سیکنڈ کے وقفے کے بعد زبیر خان
 نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی
 مسکراہٹ تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔
 "بات ہی ایسی ہے خان صاحب! کیونکہ وہ میرے
 دوست ہیں۔ مصیبت کی گھڑی میں میرے کام آتے رہے
 ہیں اور اب میری ہی وجہ سے وہ خود مصیبت کا شکار ہیں۔
 مجھے تو فی الحال فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے مگر وہ خطرے
 میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"ابھی حیات مرزا آنے والا ہے۔ وہ سپریم کورٹ کا
 ایک سینئر وکیل ہے۔ میرے پرانے شناساؤں میں سے
 ہے۔ تمہارے سلسلے میں مشورے کے بعد میں اس سے یہ

کی سرگمیں چمک میں مجھے عجیب سی کشش محسوس ہونے لگی۔
 "میں انہیں ہلانے جھلانے نہیں ان سے باتیں کرنا
 چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

یہ کہتے ہوئے میں نے ایک قدم دروازے کی طرف
 بڑھایا ہی تھا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں میکا کی انداز
 میں رک گیا۔ ایک بار پھر اس کا دلکش حسین چہرہ گھنڈی ہوئی
 سنجیدگی کی زد میں تھا پھر وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"نصہرو، ایک بات کا جواب دو۔ کیا تم خان صاحب
 کے آدمیوں میں شامل ہو گئے ہو؟" اس کا سوال مجھے عجیب لگا۔
 بہر حال میں نے فوراً جواب دیا۔ "نہیں۔"

"وہ دوست تو کسی کو کم ہی بناتے ہیں۔ اپنا غلام
 بنانے میں وہ کسی کو دیر نہیں لگاتے۔"

"میں کسی کا آلہ کار یا غلام بننا پسند نہیں کرتا۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر کہیں بہت جلد یہاں سے
 چلے جانا چاہیے۔ وہ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنا
 آلہ کار بنانے کا ہنر بہ خوبی جانتے ہیں۔" اس کی بات پر
 مجھے چونکنا پڑا۔ پھر وہ مجھے اسی طرح سوچتا چھوڑ کر پلٹ
 گئی۔ عجیب شخصیت تھی اس عورت کی بھی، بھی مجھے اس کی
 حرکتیں عامیانہ قسم کی لگتی تھیں اور کبھی ایک دم بردبار اور رکھ
 رکھاؤ والی مدبر عورت کے روپ میں نظر آنے لگتی۔ اس کے
 جانے کے بعد میں نے سر دست کرے سے نکلنے کا ارادہ
 بدل دیا اور دوبارہ بیڈ پر جا بیٹھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر خانم شاہ اپنا رویہ درست رکھتی
 تو اس کے ذریعے میں شوکی وغیرہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ
 مدد لینے کی کوشش کرتا مگر معاملہ اب ایسی آستیں گلے پڑنا جیسا
 ہو گیا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ مجھے خانم
 شاہ سے ملنا چاہیے تھا۔ اسے سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ جوش اور
 انتقامی رویے سے ہٹ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ
 میری بات سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرے، کہ اسی میں
 سب کی بھلائی تھی۔ اس کے علاوہ میں اپنے بھائی، اپنے
 دوست، اپنے عمسار، جاں نثار ساتھی اول خیر کے بارے
 میں بھی فکر مند تھا اور اب میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ زبیر خان
 ان سارے معاملات میں میری کیا مدد کر سکتا تھا؟ لہذا جب
 میں اس کے پاس پہنچا تو وہ اپنے "مشغل" سے تقریباً فارغ
 ہو چکا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں پنسل نما سگریٹ تھا اور
 دوسرے ہاتھ میں سیل فون، جسے وہ اپنے کان سے لگائے
 کسی سے اختتامی گفتگو کر رہا تھا۔ میرے سامنے والے

طرح بنا دیا کہ ہونٹوں سے ہٹ گیا مگر باجھوں میں اٹکارا۔
..... یہ وقت ضرورت میں اسے بہ آسانی دوبارہ اپنی جگہ
چسپاں کر سکتا تھا۔

”...ت...تم...ذلیل...! کیسے... احسان
فراموش... میرا یہ حشر کرانے، مجھے تم سے یہ امید نہ
تھی...“ وہ جیسے پھٹ پڑی۔

میں برداشت سے کام لیتے ہوئے نہایت تحمل سے
بولی۔ ”ایسے گالم گلوچ والے الفاظ آپ کو زیب نہیں دیتے
محترمہ! اسوس ہے مجھے کہ آپ جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ سلیجی ہوئی
خاتون ایسے الفاظ بھی استعمال کرتی ہوں گی۔“

”زیادہ مہذب بننے کی ضرورت نہیں۔“ وہ پھر
پھری۔ ”مجھے اس طرح یرغمال کیوں بنایا ہے تم نے...؟
وحشی انسان۔“

”اس میں میرا کوئی دخل نہیں، یہ عمل کسی اور کا ہے۔“
”زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں، مجھے نکالو
یہاں سے، جانتے ہو اس طرح ایک خاتون وکیل کو جس بے
جائیں رکھنا کتنا بڑا سنگین جرم ہوتا ہے؟“

”محترمہ! اگر قانون کی تشریح اتنی سادہ ہوتی تو آج
میں بے گناہ ہونے کے باوجود ایک ایسے قانون سے کیوں
منہ چھپاتا پھر رہا ہوتا جسے محض دولت اور اثر و رسوخ کے بل
پوتے پر سنگین اور نرم بنانا ممکن ہوتا ہے۔ لہذا آپ مجھے
قانون پڑھانے کی کوشش تو بالکل نہ کریں۔ میں آپ سے
مخاصت کے سلسلے میں بات چیت کرنے آیا تھا۔ زبیر
صاحب سے خصوصی اجازت لے کر... اگر یہ موقع آپ
نے گنوا دیا تو پھر وہ جانیں اور آپ... میں درمیان سے نکل
جاؤں گا۔“

میری اس بات نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا
تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے چہرے کا تناؤ کم ہونے لگا۔ بے
چارگی جیسے تاثرات میں بدل گیا۔ اس نے بے اختیار حلق
سے ایک گہری سانس خارج کی جیسے خود کو پُر سکون کر کے
اعصاب زدگی سے چھٹکارا پانا چاہتی ہو اور اسی لمحے میں
بولی۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“

”فقط اتنا کہ... خدا را...! اسٹریاتی جوش اور غصے
کی بینک اتار کر ٹھنڈے دل و دماغ سے بات سوچنے اور
سمجھنے کی کوشش کریں۔“ میں نے قدرے رسوائیت سے کہا۔
”آپ کیا سمجھتی ہیں کہ مجھے آسیہ کی موت کا دکھ نہیں... یا
اس کے قاتل اور دوسمن کوئی اور ہیں۔ ہرگز نہیں، میں تو خود بھی
انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کا عزم کیے بیٹھا ہوں اور ان

بات بھی کروں گا۔“
”بہت فکر یہ... خان صاحب آپ کا۔“ میں نے
منون لہجے میں کہا۔ وہ پھر پُرسوج نظروں سے میرے
چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ ماحول میں یک طرفہ دم بہ خود سناٹا
طاری رہا۔ میں اب بے گنی سے منتظر تھا کہ زبیر خان کب
اپنے مطلب کی بات مجھ سے کرتا ہے جس کا اظہار اشارتاً وہ
فون پر مجھ سے کرتا رہا تھا۔ مزید کچھ ٹاپنے اور بیت گئے تو
میں نے ہی زبیر خان سے کہا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو... میں خانم شاہ کو
سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔“
”ایسی عورتیں نیز می کھیر ہوتی ہیں۔ وہ نہیں سمجھے گی
تمہاری بات، اسے سمجھانا ہمیں آگے جین بھانے کے
مترادف ہے۔“ زبیر خان نے کہا۔

”شاید آپ صحیح کہہ رہے ہوں، ممکن ہے اب ان کا
جوش کچھ کم ہو گیا ہو اور وہ میری بات سمجھ لیں۔“

”گارڈ!“ زبیر خان نے بلند آواز میں پکارا۔ گارڈ
بول کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ زبیر خان نے اسے مجھے
خانم شاہ سے ملانے کا کہا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا اور گارڈ کے
ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ ایک چوڑی راہداری سے
گزرتے ہوئے ایک بار پھر میری نگاہ بھٹریلی سے ہو گئی، اس
نے اپنے ریشمی کھننے بالوں میں ہیئر برش پھنسا رکھا تھا۔
میری طرف اس نے عجیب سی مسکراہٹ سے دیکھا تھا اور
مسکراہٹ میں مجھے طرکی کاٹ بھی محسوس ہوئی تھی۔

خانم شاہ کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں یرغمال
بنا کے رکھا ہوا تھا۔ گارڈ دروازے پہ رک گیا جبکہ میں اندر
داخل ہو گیا۔

اندر روشنی تھی۔ کمرہ بہتر تھا۔ ایک بیڈ اور دو کرسیاں
دھری تھیں۔ واش روم بھی تھا، ایک کھڑکی تھی، جو باہر بجر
دیرانے میں کھلتی تھی۔ اس کے اوپر گول روشندان تھا۔ خانم
کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بیڈ پر بٹھا رکھا تھا۔ منہ پر اسکاچ
ٹیپ تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ ذہنی خفالت کے
باعث سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں بھی متورم نظر آتی تھیں۔ اسے
اس ہیئت گذائی میں دیکھ کر مجھے دکھ بھی ہوا تھا اگر وہ بلا وجہ کا
زمنہ ڈالتی تو اس کا آج یہ حال نہ ہوتا۔ مجھے دیکھ کر اس کی
آنکھوں میں نفرت آمیز درجی کے تاثرات ابھرنے لگے۔
وہ کسمپاسی بھی تھی، میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس
کے بیڈ کے قریب آیا۔ پھر اس کے سامنے بیٹھ کر میں نے اپنا
ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹوں پہ چسپاں اسکاچ ٹیپ اس

اوارہ کدو

نے سراٹھایا تھا۔ یعنی... "مکاری۔"

کہیں یہ عورت میرے ساتھ کوئی چالاکی تو نہیں کر رہی تھی؟ پھر میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ میں کون سا اسے ابھی یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔ یہ فیصلہ یقیناً میرے اور زبیر خان کی باہمی مشاورت سے ہی طے پاسکتا ہے۔ تاہم میں نے اس سے ازراہ شفقی کہا۔

"اس بات کی آپ فکر نہ کریں۔ میں اس سلسلے میں ابھی زبیر خان سے بات کرتا ہوں۔" میں نے دیکھا... میری بات پر اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے الجھن سی تیر گئی تھی۔

"شاید تم بھی مجبور ہو، میں سمجھتی ہوں تمہاری مجبوری، تمہیں زبیر خان نے یہاں پناہ دے رکھی ہے۔ ظاہر ہے اس سے مشورہ کرنا ضروری ہوگا۔" مجھے اس کی بات اچھی لگی۔ شاید وہ اب صورت حالات کو سمجھ رہی تھی۔ لہذا اس کے بارے میں ذہن میں ابھرنے والی میری تشکیک کچھ کم ہونے لگی تو میں نے مسکرا کر اسے پھر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، میں زبیر خان سے بات کرتا ہوں، یہاں آپ کے ساتھ کوئی بھی نازیبا حرکت کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ کم از کم میرے یہاں ہوتے ہوئے یہ سب ناممکن ہے۔" کہتے ہوئے میں جانے کے لیے بیڈ سے اٹھا۔ میں نے اسکاج ٹیپ اتار کر پھینک دیا۔ اس پر خانم شاہ نے میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر بولی۔

"ذرا ایک منٹ... میں رک کر اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "داش روم تو یہاں ہے مگر اس کا فائدہ؟" میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔

میرا خیال تھا کہ اسے اب اس رن بستہ حالت میں رکھنا مناسب نہ تھا۔ لہذا میں نے اس کی ساری بندشیں کھول دیں۔ اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور داش روم کی جانب بڑھی اور بند دروازے پر زور آزمائی کرنے لگی۔ میں اس کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ دم ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے داش روم کے دروازے کو دھکا لگا دیا تو وہ بہ آسانی کھل گیا۔ مجھے کھٹک آمیز حیرت ہوئی، اسی وقت مجھے عقب سے خانم شاہ نے زوردار دھکا دیا اور پلٹ کر دوڑی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کمرے کے باہر گارڈ تاج دین عرف تاجا موجود ہے۔ ادھر میں بھی فوراً منتہیل کر پلٹا۔ تب تک خانم شاہ پھرئی کے ساتھ کھلے دروازے سے باہر دوڑ لگا چکی تھی اور اس کے تعاقب میں گارڈ کی عیسیٰ چٹنی آواز سنائی دی گئی۔ میں بھی دوڑا۔

چاروں بھیڑیا صفت افراد کو بھی موقع پر واصل جہنم کر چکا ہوں جنہوں نے چوہدری ممتاز خان کے ایما پر آسیہ کے ساتھ یہ بھیانک اور شیطانی کھیل کھیلا تھا۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو کر ایک بار پھر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا جس میں مثبت اشارہ پایا جاتا تھا۔

"بہن کی اچانک اور اس طرح کی سنگین موت کا سن کر آپ کا رد عمل فطری تھا... لیکن پلیز اب تو آپ سمجھنے کی کوشش کریں... تو خود آپ کو اس بات کا جواب مل جائے گا کہ میری از خود گرفتاری میرے لیے نقصان دہ اور دشمنوں کے لیے کس قدر سودمند ثابت ہوگی۔ آپ بھی اچھی طرح یہ تلخ حقیقت جانتی ہیں کہ میرے ساتھ اگر کچھ معنوں میں معاملہ قانون کا ہوتا تو اس کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا لیکن یہاں معاملہ ہی الٹا ہے۔ دشمن مجھے قانون کی آڑ لے کر ہی اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔"

"شاید میں غلطی پر تھی۔" معافی خانم شاہ کے لرزے ہونٹوں سے برآمد ہوا۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ بالآخر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں اسے مزید آگے بولنے کا موقع دینے کی غرض سے خاموش رہا تو وہ اسی لہجے میں دوبارہ بولی۔ "تم نے صحیح کہا شہزی اشاید آسیہ کی موت کی خبر نے مجھے اعصاب زدہ کر دیا تھا اور میں تمہیں دیدہ و دانستہ معیبت میں دھکیلنا چاہ رہی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ ہمارے دشمنوں کا مقصد ہی یہی ہے کہ قانون کی آڑ لے کر تمہیں راستے سے ہٹایا جاسکے۔" خدا کا شکر ہے۔ آپ کو میری بات سمجھ آ گئی۔ میں نے کہا۔

وہ محالہ آئینزی سے بولی۔ "شہزی اسوری، میں نے تمہیں غلط سمجھا اور برا بھلا بھی کہا۔ میں اپنے نازیبا الفاظ واپس لیتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کو پردہ پوش حقائق کا بالآخر ادراک ہو ہی گیا... میں نے مسکرا کر کہا تو وہ بولی۔

"مگر شہزی انا... کیا اس طرح مجھے یرغمال بنا کر یہاں رکھنا ایک درست عمل ہوگا؟ آخر کب تک تم... میرا مطلب ہے، یہ زبیر خان مجھے اس طرح جس بے جا میں رکھ سکتا ہے؟"

"میں ان سے بات کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔" میں نے جواب میں کہا اور پھر یہی وہ لمحات تھے جب اچانک میرے ذہن میں خانم شاہ کی طرف سے ایک کھٹک

بھرنے پر خان کے سامنے اپنی بات دہرائی تو وہ جھلا کر بولا۔
 ”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے شہزی؟ مجھے کچھ سوچنے
 دو... تم ذرا خاموش رہو۔“ اس کے بعد اس نے گارڈ سے
 دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا اور
 اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ نکل گیا۔

زیر خان نے معتدل لہجہ اختیار کرتے ہوئے مجھ سے
 کہا۔ ”دھیرج رکھو، ابھی ڈاکٹر پہنچ جاتا ہے...“

مگر میری تسلی نہ ہوئی، میں اس کمرے میں موجود رہا
 تھا۔ خانم شاہ نزع کے عالم میں ایک بستر پر بے سدھ...
 پڑی ہوئی تھی۔ خانم شاہ کی حالت زار دیکھ کر میری تشویش
 لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ معاملہ اتنا نازک تھا کہ خانم شاہ کو
 کسی کلینک یا اسپتال نہیں لے جایا جاسکتا تھا مگر اس کا
 مطلب یہ بھی نہ تھا کہ ایک انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے
 ایڑیاں رگڑتے مرنا ہوا دیکھا جائے... یہ بے رحمی اور بے
 حسی کی انتہا تھی۔ نہ جانے کس طرح اور کتنی دیر میں اپنی
 ابلیج جلتی کیفیات پر قابو پائے رہا۔ کچھ وقت بیت گیا تو گارڈ
 اور اس کے ساتھی ایک ڈاکٹر کو لے آئے۔ اس بے چارے
 کو شاید زبردستی اس کے کلینک یا گھر سے اٹھا کر لایا گیا تھا
 کیونکہ اس کی آنکھوں پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ زیر خان نے
 مجھے کمرے میں جانے سے روک دیا... خود بھی نہیں گیا۔

”ڈاکٹر کو زبردستی لایا گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا مجھے یا
 تمہیں وہ دیکھ پائے۔ میرے ساتھی صورت حال قابو کر لیں
 گے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ایک لمحہ بھاری سل
 کی طرح گزر رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر گارڈ کی اس سفاکانہ
 حرکت پر غضب ناک طیش چڑھ رہا تھا۔ میرا تودل چاہا رہا
 تھا کہ اسی پستول کی ایک عدد گولی اس درندے کے پیچھے میں
 بھی اتار دوں۔

”اس میں خانم شاہ کی اپنی غلطی تھی۔ گارڈ نے سب
 بتا دیا ہے کہ وہ تمہیں کس طرح جل دے کر بھاگنے کی کوشش
 کر رہی تھی۔“ شاید میرے چہرے سے ذہنی تناؤ کا اندازہ
 کرتے ہوئے زیر خان نے کہا۔

”گارڈ نے یہ اچھا نہیں کیا خان صاحب...! خانم
 شاہ بہر حال ایک کمزور اور سستی عورت تھی۔ اس پر گولی چلانا
 گارڈ کا ایک بے رحمانہ فعل تھا۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا... تم ذرا خود پر قابو پانے
 کی کوشش کرو۔ میں گارڈ سے ہاڑ پر سر کروں گا۔“ زیر خان
 نے کبھیر لہجے میں کہا۔

خانم شاہ کا رخ زینے کی طرف تھا۔ وہ جوش میں دو
 دو، تین تین قدم بچھلاکتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔ اسی وقت
 میں نے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے گارڈ کے ہاتھ میں
 پستول کی جھلک دیکھی۔ میں تشویش میں جھلا ہو گیا مگر میں
 سمجھتا تھا کہ وہ گولی چلانے کی جرأت نہیں کرے گا اور اگر
 چلائے گا بھی تو شخص خانم شاہ کو دھمکانے کے لیے ہوائی فائر۔
 مگر جیسے ہی خانم شاہ بیرونی دروازے کی طرف
 دوڑی، گارڈ نے رک کر اس کا نشانہ لیا۔ میں حلق کے بل
 پیچھے سے چلا یا۔

”نہیں گارڈ۔“

”ڈر...“ ایک دھماکا ہوا اور میری نظروں نے خانم
 شاہ کی پشت سے خون کا فوارہ اٹھتے دیکھا۔ وہ ایک ہنسی بھنی
 چیخ سی خارج کر کے ڈھیر ہو گئی۔ میں نے گارڈ کی اس
 سفاکانہ حرکت پر جنونیوں کی طرح اسے جالیا۔

”ذلیل...! کتے ایہ تو نے کیا کر دیا۔ میں تجھے زندہ
 نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے ایک زوردار گھونسا گارڈ کی
 ٹھوڑی پہ رسید کر دیا۔ وہ حیرا کر گر پڑا۔ پستول اس کے ہاتھ
 سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اسی اثنا میں دو افراد نے مجھے دبوچ
 لیا۔ ٹھوڑی دیر میں زیر خان بھی تشویش زدہ چہرے کے
 ساتھ وہاں آ گیا۔

”خان صاحب... اس نے... اس درندے
 نے... اس پر گولی چلائی تھی... وہ مر رہی ہے۔ اسے بچا
 لو۔“ میں نے دونوں تنومند آدمیوں کی گرفت سے خود کو
 آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کی پیشانی پہ
 آن گنت سلولوں کا جال سا بن گیا۔ گارڈ منہ سنبھالے میری
 جانب خوفناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں
 میرے لیے معاندانہ چمک تھی۔ زیر خان نے اپنے
 آدمیوں سے حکمانہ کہا۔

”عورت کو اٹھا کر اندر لے جاؤ، اور اسے سنبھالو۔“
 مجھے چھوڑ کر دو آدمی بے سدھ پڑی خانم شاہ کی جانب لپکے۔

”اسے فوراً اسپتال لے جانا ہوگا، خان صاحب...
 میں نے زیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ مگر اس نے میری
 بات نظر انداز کرتے ہوئے غصے سے گارڈ کی طرف گھورتے
 ہوئے کہا۔

”اسے گولی مارنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ میں جل دے کر بھاگ رہی تھی، خان جی۔“
 گارڈ نے کہا۔

خانم شاہ کی حالت تشویش ناک تھی۔ میں نے ایک بار

آوارہ گرد

نقابہ طاری تھی۔ رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا... سانس بھی وہ اکھڑی اکھڑی لے رہی تھی ہر سانس پر اس کے اد پری وجود کو ہلکا سا جھٹکا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ایسی جھجھکے یوں لگا جیسے خانم شاہ بہ زبان خاموشی مجھ سے التجا و فریاد کر رہی ہو۔

”شہزی... کیا میں بھی اپنی چھوٹی بہن آسیہ کی طرح بے موت ماری جاؤں گی؟ اس کی طرح میرا بھی پرسان حال کوئی نہ ہوگا؟ کیا تم اب بھی اپنی کھلی آنکھوں سے محض تماشا دیکھتے رہ جاؤ گے؟“ ان سوچوں کی یلغار سے میرا دماغ اٹھنے لگا۔ ایک بار پھر میرے اندر فطری جی داریاں اگڑاٹیاں نے کر بیدار ہونے لگیں جو دیوانہ وار مجھے آتش نمرود میں کودنے پر اکسا رہی ہوں۔ غم و جوش سے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ میں نے کن آنکھوں سے قریب کھڑے زبیر خان کی طرف دیکھا۔ تو وہ بولا: ”اپنے کیسے کی سزا اب اسے خود ہی بھگتی چاہیے۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ کمرے میں اب میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میرا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ ایک انسان کی زندگی بچانے کی خاطر میں ہر خطرے کی دیوار کو پاٹنے کا عزم مصمم کر چکا تھا۔ برق جیسی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خانم شاہ کی اپنی گاڑی نیچے کارپورج میں کھڑی ہوگی مگر چابیاں...؟ وہ یقیناً اس پرس میں ہوں گی جس کے اندر اس کا سیل فون بھی ہوگا مگر پرس کہاں ہے اور کیسے وہ حاصل کیا جاسکتا ہے؟ سر دست مجھے اس کا حصول ناممکن ہی نظر آ رہا تھا اور نہ ہی اس کی تلاش کا وقت تھا۔ یوں بھی اول خیر جیسے سانچی نے مجھے ہر کام میں طاق و مشاق کر دیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر کی سن گن لی اور پھر خانم شاہ کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر کمرے سے لٹکا۔ زینے کی طرف بڑھا تو ایک آدمی سے میرا ٹکراؤ ہوا۔ وہ پہلے تو بھونچکا رہ گیا۔ پھر مجھے روکنے کی کوشش کی، اسی دقت میری ایک لات حرکت میں آئی جو اس کے سینے پر پڑی۔ وہ زینے سے نیچے لڑکھڑاتا چلا گیا۔ میں بے ہوش خانم شاہ کو اٹھائے دیوانہ وار زینے اتارتا مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ یہاں دو آدمیوں سے میری ٹڈیٹھڑ ہو گئی۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹھکے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں ان کے خان جی کا مہمان ہوں۔ قیدی نہیں، اس لیے انہیں تھوڑی دیر کے لیے بے وقوف بنانا آسان تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ انہوں نے ہی مجھے اسے لے جانے کا کہا ہے۔ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگے۔ پھر آگے کھسک گئے۔ شاید وہ اپنے خان جی کے پاس جا کر اس کی تصدیق کرنا چاہتے ہوں گے۔ میرے

لگ بھگ کوئی نصف گھنٹا گزرا ہوگا کہ گاڑی اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میرے چہرے پر سخت ناگواری کے تاثرات ابھرے تھے۔ اس نے کہا۔

”خان جی! ڈاکٹر کہہ رہا ہے اسے بڑے آپریشن کی ضرورت ہے۔ گولی بہت اندر تک گھس گئی ہے اس نے ایک گردے کو نقصان پہنچایا ہے۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔“ اس کی بات سن کر زبیر خان کی پیشانی پہ شکنوں کا جال سا بن گیا، خود مجھے خانم شاہ کی طرف سے گہری تشویش لاحق ہونے لگی اور میں بے چینی سے منتظر تھا کہ اب زبیر خان کون سا قدم اٹھاتا ہے۔

”تم کسی بڑے ڈاکٹر کو اٹھلاتے۔ جو ادھر ہی اس کا آپریشن کر کے گولی نکال دیتا۔ یہ کس کو پکڑ لائے تم لوگ؟“ زبیر خان نے غصیلے لہجے میں گاڑی سے کہا۔

”خان جی! ہم نے اپنی طرف سے بڑے ڈاکٹر کو ہی اٹھایا تھا مگر... مجھے لگتا ہے وہ کوئی چالاکی چل رہا ہے۔“ گاڑی اپنی صفائی میں بولا... ”ابھی اس کو کٹکا شکا لگاتے ہیں... وہ ادھر ہی بڑا آپریشن کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔“

”نہیں...“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہر ڈاکٹر ہر علاج نہیں کر سکتا۔ جہاں تک اس کی اہلیت ہوتی ہے وہ اسی حد تک مریض کی جان سے کھیلتا ہے۔ اس سے زیادہ رسک نہیں لیتا۔ میرا خیال ہے وہ ڈاکٹر سچ کہہ رہا ہے... خانم شاہ کی حالت بہت نازک ہے خان صاحب! اسے کسی طرح بھی فوراً سے جیٹر ہاسپتال لے کرنا ضروری ہوگا۔“

”اسے اسپتال لے جانا اتنا آسان اور معمولی بات نہیں ہے۔ شہزاد احمد خان...“ زبیر خان نے گویا میری طرف گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم تھوڑی دیر خاموش رہو، اور ہمیں کچھ کرنے دو۔“

مجھے زبیر خان کے یوں ڈپٹنے کا انداز انتہائی ناگوار گزرا تھا مگر مجبور تھا مصیبت خاموش رہا۔ زبیر خان نے گاڑی کو حکم دیا کہ ڈاکٹر کو اسی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر جہاں سے لایا گیا تھا وہیں چھوڑ دیا جائے۔ حکم پاتے ہی گاڑی پلٹ گیا۔ زبیر خان کچھ سوچتا رہا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں اور زبیر خان اس کمرے میں پہنچے جہاں زخمی خانم شاہ کو رکھا گیا تھا۔ اس کی ہیئت کدائی دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔ ڈاکٹر نے فرسٹ ایڈ کے طور پر اد پری زخم کی ڈریسنگ وغیرہ کر دی تھی اور شاید کوئی ٹیکا بھی لگا دیا تھا۔ اس کے چہرے پہ سخت

متوجہ ہو جاتا، اور میرا یہ کام ہو چکا تھا، لہذا اب میں خود یہاں سے نکلنے کے لیے پرتو لے لگا۔

جہاں ایمر جنسی کا استقبال کاؤنٹر تھا، اس کی لابی خاصی کشادہ تھی۔ یہ کسی این جی او کی سرپرستی میں چلنے والا بڑا اسپتال تھا اور اسے سرکاری معاونت بھی حاصل تھی۔ یہ غالباً پانچ چھ منزلہ تھا۔ لفٹ لگی ہوئی تھی۔ برابر میں زینے بھی تھے۔ اوپر یقیناً مختلف وارڈز بنے ہوں گے۔ لابی کے دائیں جانب بھی کشادہ ایمر جنسی وارڈز بنے نظر آ رہے تھے۔ چونکہ یہ ایمر جنسی کا حصہ تھا جسے عام فہم میں "لال جی" کہا جاتا ہے۔ اس لیے یہاں متعلقہ عملے کے علاوہ مریضوں اور ان کے واسطے داروں کی خاصی چھل پھل نظر آتی تھی۔ مجھے کاؤنٹر کے بائیں جانب ایک اسٹول پر بٹھایا ہوا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک مولیٰ کی گوری استقبال لڑکی خصوصی یونیفارم میں رجسٹر کھولے کچھ اندراج کرنے میں منہمک تھی۔ ایک پختہ عمر کا ساتھی بھی وہاں موجود تھا جو کاؤنٹر کے ڈراز میں کچھ تلاشنے میں مصروف تھا۔ دوسری طرح بنگ لڑکے یونیفارم میں مہر سرج اور انجکشن کے امپول تھامے کھڑے آپس میں بیزار کن انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ یہاں کام کا دباؤ زیادہ نظر آتا تھا۔ مرکزی دروازہ شیشے کا تھا۔ وہاں بھی اسٹاف کا ایک آدمی کھڑا تھا۔ ان ساری چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد مجھے یہاں سے اپنے ٹکسے کی کوشش کچھ زیادہ سہولت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لہذا ابھی میں اسٹول سے اٹھا تھا کہ اچانک میری نظروں نے جو پہلے ہی سامنے گیٹ نما مرکزی دروازے پہنچی ہوئی تھیں ایک تھرا دینے والا منظر دیکھا۔ شیشے کے پار احاطے میں ایک کار دندناتی ہوئی نہ صرف اندر داخل ہوئی بلکہ وہ سیدھی ایمر جنسی کے بند شیشے کے دروازے کے بالکل قریب ایک جھکے سے آن رکی، باہر تعینات عملے کے لوگ اسے روکتے ہی رو گئے۔ کار کے دروازے کھلے اور پھر جیسے یکدم میرا دل اچھل کر حلق میں آن لگا۔ میں نے چار پانچ مسلح افراد کو بڑی تیزی سے کار سے اترتے دیکھا۔ ان کے چہروں پر سیاہ نقاب چڑھے ہوئے تھے۔ ان سب کا رخ داخلی سمت تھا۔ دروازے پر تعینات شخص ان مسلح افراد کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی اور دل گویا ساگیں سائیں کرتا کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پہلا شبہ میرے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ یہ زبیر خان کے آدمی ہو سکتے تھے جو میرے اس طرح خانہ شاہ کو نیکی لکھی سے لے جانے پر اس نے میرے تعاقب میں

لیے اتنا موقع کافی تھا۔ پورچ میں خانہ شاہ کی سوزو کی کار کھڑی تھی۔ ٹھکر تھا کہ دروازے لاک نہ تھے اور ہوتے بھی کیوں، بھلا خانہ شاہ کو کیا پتا تھا کہ مہمان کی حیثیت سے یہاں آنے کے بعد اس بے چاری کا یہ حشر ہوتا تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ عقبی دروازہ کھول کر خانہ شاہ کے بے سدھ وجود کو بہ آہستگی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور خود بہ سرعت ڈرائیونگ سنبھال لی۔ جیسے ہی کار اسٹارٹ ہوئی، مجھے کچھ چلتی ہوئی آدازیں سنائی دیں۔ گیٹ پر تعینات دو گن بردار گارڈز ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے کہ میری کار گولی کی رفتار سے ان کے قریب سے زنائے دار آواز سے گزرتی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ عقب میں مجھے گولیاں چلنے کی آواز بھی سنائی دی تھیں مگر میں اب کہاں رکنے والا تھا۔ شکر ہے کہ بھولی بھٹکی گولی نے کار کو نہیں چھوا تھا۔

سیدھی سڑک پہ آ کر میں نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ یہ علاقہ قدرے نواح میں ہونے کے باعث روڈ سنسان تھی۔ میرا رخ شہری آبادی کی طرف ہی تھا۔ میں نے ایسے ہر خطرے کو ہالائے طاق رکھ چھوڑا تھا جس میں میری اپنی جان پر بھی بن آسکتی تھی۔ میرے دل و دماغ میں اس دقت صرف یہی سودا سما یا... ہوا تھا کہ اللہ کے حکم سے ایک بے گناہ انسان کی زندگی ہر حالت میں بچا تا تھی۔ جلد ہی میں منجانب آبادی میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے تعاقب کا کچھ زیادہ خدشہ نہ تھا۔ ایک بڑے اسپتال کے احاطے میں آ کر میں نے کار روک دی... پھر خانہ شاہ کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ایمر جنسی کی طرف دوڑ لگا دی۔ آج کل بڑی بڑی شخصیات کی ٹارگٹ کلنگ کے واقعات عام تھے۔ اس لیے اس طرح کی ایمر جنسی کو فوراً توجہ ملتی تھی۔

کاؤنٹر پر میں نے یہی بتایا کہ یہ ایک مشہور خاتون وکیل ہیں اور دو موٹر سائیکل سوار مسلح افراد نے ان کی کار پر فائرنگ کی تھی۔ میں ایک عام راہ گیر ہوں۔ محض اللہ کے واسطے اور انسانیت کے ناتے اسے یہاں لے آیا ہوں... وغیرہ۔

اسپتال کا عملہ فوراً حرکت میں آ گیا اور خانہ شاہ کو فوراً اسٹریچر پر ڈال کر ایمر جنسی آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ جبکہ مجھے ملکہ اور ضروری قانونی کارروائی کے لیے وہیں استقبال کاؤنٹر پہ موجود رہنے کا حکم دیا گیا۔ میں ایسی کسی قانونی کارروائی کا سرے سے متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ میں خود قانون کا ایک مفرد مجرم تھا۔ محض اس وقت تک میں وہاں رک گیا تھا کہ ڈاکٹری عملہ خانہ شاہ کی طرف

قدم اٹھانا تھا۔ میں نے اپنے دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پایا اور جھکے جھکے کاؤنٹر کی اوٹ سے دیکھا، جتنی اپنے ساتھ ساتھیوں کے ساتھ زینے طے کرتا اوپر غائب ہو چکا تھا۔ نیچے اس کے دو نقاب پوش ساتھی موجود تھے۔ میں نے اپنے عقب میں دیکھا جس اب ایک سلوپ نما راستہ اوپر سے نیچے آتا دکھائی دیا۔ یہ سلوپ نماسپاٹ راہداری سی تھی جو خاصی چوڑی تھی اور یقیناً بہ وقت ضرورت اس کے ذریعے کسی مریض یا معذور شخص کو اسٹریچر یا ویل چیئر سے نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے لایا جاتا تھا۔ ایسے سلوپ نماسپاٹ راستے جو درحقیقت زینے کا ہی کام کرتے تھے اپناٹالوں میں عام طور پر نظر آتے تھے۔

میں کسی دیکھے ہوئے چیتے کی سی پھرتی سے پلٹا۔ میرے ساتھ جڑی نیٹھی موٹی لڑکی نے میرے کان میں خوف زدہ سی سرگوشی بھی کی تھی۔ شاید وہ مجھے کسی خطرناک حرکت سے روکنے کا مشورہ دینا چاہتی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں کون تھا اور ان خطرناکیوں کو حالات نے میری سکین گاہ بنا دیا تھا۔

اس سلوپ نما زینے پر آتے ہی جیسے میرے پورے وجود میں بجلی دوڑ گئی۔ میں جتنی تیز رفتاری سے دوڑ سکتا تھا دوڑتا ہوا دوسری منزل پر جا پہنچا۔ یہاں بھی شور و غبار اٹھا ہوا تھا۔ اور میں نے ان تینوں سبز آدمیوں کو ایک وارڈ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس وقت راہداری میں مجھے ایک ایسا اسٹریچر نظر آیا جس پر سفید رنگ کی چادر اس طرح بچھائی گئی تھی کہ وہ نچلے خلا تک کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ میں نے ایک خطرناک فیصلہ کر لیا۔ اسٹریچر کو تیزی سے دھکیلا اور پھرتی سے اس کے نچلے خلا میں دبک گیا۔ اسٹریچر اب چکنے کوریڈر پر رینگتا ہوا ان تینوں سبز افراد کے قریب سے گزرتا چلا گیا اور سیدھا مطلوبہ وارڈ کے دروازے سے نکلا۔ میں اچھل کر باہر آ گیا۔ وہاں بھی ہڑ بونگ سی ہنجی ہوئی تھی اور میں نے کھوجتی نظروں سے بستروں کو دیکھا تو،

9 نمبر والے بیڈ کے مریض پر نظر پڑتے ہی سناٹے میں آ گیا۔ وہاں کمبل دادا کو پایا۔ اس کے جسم کے کچھ حصوں پر پٹیاں باندھی نظر آرہی تھیں اور اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی حالت کچھ زیادہ نازک نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور اس کے قریب والے بیڈ پر اس کا وہ ساتھی بھی موجود تھا جسے میں بیگم ولایا میں دیکھ چکا تھا۔ مگر مجھے اس کا نام نہیں یاد آرہا تھا۔

”کمبل دادا...! ہوشیار... دشمن آرہے ہیں۔“

روانہ کیے تھے۔ مگر فوراً ہی مجھے اپنے اس خدشے کو رد کرنا پڑا۔ اس کے امکانات کم تھے بلکہ نہ ہونے کے برابر... کیونکہ مجھے نہیں محسوس ہوتا تھا کہ یہ معاملہ اس کے لیے اتنا سنگین ہوگا۔

وہ پانچوں بھاری اسلحے کے زور پر شیشے توڑ کے اندر داخل ہو گئے تو ہر طرف خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی اور جو لوگ جہاں تھے وہیں فرار ہو گئے۔ جسے جہاں چھینے کی جگہ ملی وہ کونوں کھدروں میں دبک گئے۔ ایک نقاب پوش نے ہوائی برست بھی چلا دیا۔ میرے وجود کا رواں مریض تھا۔ میں نیچے جھک گیا اور موٹی لڑکی میرے ساتھ چپک گئی۔ خوف سے اس کی ہڈی بندھ گئی۔ اس کا پختہ عمر کا ساتھی بھی وہیں کہیں دبک گیا تھا۔ ”جو جہاں ہے... وہیں دبکا رہے... درندہ گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔“ نقاب پوش کی دھمکی آمیز اور غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔ مگر اس آواز نے سر سے پاؤں تک میرے ٹھکے ہوئے وجود میں سنسنی کی ایک لہر دوڑادی۔ سفاکی اور درندگی کا شائبہ دیتی یہ آواز میرے لیے غیر شناسا نہ تھی۔ اس مکروہ اور شیطانی آواز کو تو میں لاکھوں افراد کے ہم جج (شور) میں بھی پہچان سکتا تھا۔ یہ صفت ایس... چوہدری ممتاز خان کے مقرب خاص کار پر واز جنگی خان کی آواز تھی... مگر میرے لیے اس وقت اہم اور تشویش ناک بات یہ تھی کہ یہ مردود و ملعون یہاں کسی کو خون میں نہلانے کی غرض سے آیا تھا؟ بہت سی باتیں ذہن میں آتی تھیں۔ مگر اس وقت ان پر غور کرنے اور تو جیہات تلاشنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ تاہم میرے اعصاب تن گئے تھے۔ میں نے کاؤنٹر کے عقب سے فوراً سرک کر تھوڑا سا رہا اور اسے اپنے ساتھیوں سے کہتے سنا۔

”تم دونوں میرے ساتھ آؤ، وہ دونوں اوپر دوسری منزل کے جنرل وارڈ میں ہیں۔ آؤ۔“

میں نے اسے قد کاٹھ سے پہچان لیا تھا۔ پھر میں نے اسے اپنے دو مسلح ساتھیوں کے ساتھ لفٹ کے ساتھ بنے زینے کی طرف بڑھتے دیکھا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ دونوں کون تھے؟ جنہیں یہ درندہ اپنی خوف ناک بربریت کا نشانہ بنانے آیا تھا؟ میں شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ یہ لوگ میرے بھی دشمن تھے۔ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ ان کے دشمن میرے دوست بھی ہو سکتے تھے۔ اس خیال نے میرے اندر بے چینی اور تشویش کی لہر دوڑادی۔ پہلے تو میرا ارادہ ادھر ہی دے کر رہنے کا تھا۔ لیکن اب نہیں... مجھے فوراً سے بیشتر کوئی

ہوئی آگ میں دھکیل دیا تھا۔

جب تک باقی دو سنبھلتے، میں نے فرش پر سے تیسرے حملہ آور کی گری ہوئی گن اٹھالی۔ اسی وقت جنگی کے دوسرے ساتھی نے اپنی گن سے مجھے وارڈ کے پکٹے فرش پر ہی نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر میں پھرتی کے ساتھ اپنی گن سمیت لڑھکنی کھاتے ہوئے اگلے ہاتھ کے بیڈ کی آڑ میں چلا گیا اور لڑھکنی کھانے کے دوران مجھ سے غیر ارادی حرکت بھی ہوئی، کیونکہ اس حرکت کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر سنبھلتے ہوئے پہلے ساتھی کی ٹانگوں سے اپنی دونوں ٹانگیں زور سے ٹکرا بھی دی تھیں۔ جس کے نتیجے میں وہ دوبارہ تھوڑا کر گرنے لگا۔ برسٹ چلنے کی گھن گرج کے ساتھ ہی پکٹے فرش کے سنگ ریزے اوڑھ کر بارش کی شکل میں بکھرے۔ ہم ایک دوسرے کے نشانے پر تھے۔ مگر فوجیت میرے دشمنوں کو حاصل تھی۔ ٹھیک اسی وقت یکے بعد دیگرے گولیاں چلیں۔ ایک دشمن کو میں نے کریہہ انگیز چچ کے ساتھ فرش بوس ہوتے دیکھا۔ شاید یہ کبیل دادا اور اس کے ساتھی کی حرکت تھی۔ انہیں شاید اب تک سنبھلنے کا موقع مل چکا تھا۔ جگہ کی تنگی میں، میں ابھی اپنی گن کی آتش پیاس بجھانے کی سعی میں تھا کہ جنگی خان خطرہ بھانپتے ہی باہر کو دوڑا۔ جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کیا، وہ نہتا تھا۔ میں نے بیڈ کی آڑ سے اس کا نشانہ لے کر بلبی دبا دی۔ گولیوں کی خوف ناک آتش باڑ نے اس کا چشم زدن میں تعاقب کیا اور اس کی ساری کراویٹر کرکھ دی۔

میں سیدھا ہوا۔ کبیل دادا اور اس کا ساتھی دوڑتے ہوئے میری جانب لپکے... پستول، کبیل دادا کے ہاتھ میں تھا۔

”بہت حیرت ہے مجھے، آؤ۔“ وہ مجھ سے صرف اتنا ہی کہہ پایا اور باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں وارڈ سے باہر آگئے۔ میں نے اسے بتایا نیچے ایمر جیسی کی لابی میں جنگی خان کے دو ساتھی موجود ہیں... لہذا میں نے انہیں سلوپ والے ڈھلانی راستے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے میں اوپر آیا تھا۔

ہم اس جانب بڑھے ہی تھے کہ باہر پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ ہم تینوں بری طرح ٹھٹھک کر وہیں رک گئے۔

”ہم...!“ یکدم کبیل دادا کا ساتھی چچا اور ساتھ ہی اس نے کبیل دادا کو دھکا دیا۔ اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ سے وہ چھلنی ہو کے گرا۔ میں نے ایک دیوار کی آڑی

میں وہیں سے اسے پکار کر چلایا۔ اس نے ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا۔ شور و غل کی آواز پر وہ بھی بے چین نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پہلے تو اسے سانپ سونگہ گیا پھر فوراً ہی اس نے اپنے ایک ہاتھ کی ٹس میں لگی ڈرب کی سوئی پھینچ دی۔ وہ اور اس کا ساتھی بیک وقت بیڈ سے لڑھکنی کھا کر اترے۔ ٹھیک اس وقت جنگی خان اپنے دونوں مسلح ساتھیوں سمیت اندر داخل ہوا۔ میں ان کے قریب تھا مگر دروازے کے پیچھے۔ ان تینوں کو اپنے مطلوبہ بیڈ نمبرز بھی یاد تھے... یہی سبب تھا کہ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے مطلوبہ بیڈ کی طرف دیکھا اور گنیں سیدھی کر لیں۔ انہوں نے بالکل آخری وقت میں شاید کبیل دادا اور اس کے ساتھی کو بیڈ سے لڑھکنی کھاتے ہوئے پناہ لینے یا چھپنے کی غرض سے نیچے پرینگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب میرے حرکت کرنے کی باری تھی۔ ورنہ یہ تینوں ان دونوں کو بھون کر رکھ دیتے۔ میں نے عقب سے کھل کر پہلے جنگی خان کو زبردست ٹھوکر اس طرح رسید کی کہ وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ٹکرایا تب تک وہ اپنی گنوں کے برسٹ فائر کر چکے تھے مگر نشانہ خطا گیا تھا۔ وارڈ میں گولیوں کی بھیا تک ترنٹراہٹ نے دہشت کی فضا پیدا کر دی۔ نرسیں اور مریض موت کے خوف سے اپنی جانیں بچانے کے لیے اوڑھ اوڑھ کر کولوں کھڑوں میں چھپنے لگے۔ میری پیچھے سے مداخلت ان تینوں کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ اس صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھے۔ وہ تو بس اپنے شکار کو ترنٹوالہ سمجھے ہوئے تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ ان کی خراب قسمت نے مجھے ان کے پیچھے لگا دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ تینوں اس اچانک نکلنے والی ٹھوکر سے نہیں سنبھل پائے اور اپنے قدموں پر ہی بری طرح لڑکھڑا گئے۔ یہ میری ایک ”سہ رخ“ کوشش تھی جس میں مجھے کامیابی نصیب ہوئی تھی اور کبیل دادا اپنے ساتھی سمیت فوری خطرے سے بچ گئے تھے۔ مگر اب میں اپنے زہریلے دشمن کی خطرناک نظروں میں آچکا تھا۔ ٹھوکر لگنے سے ایک ساتھی کے ہاتھ سے گن گری گئی۔ دوسرے نے سنبھلنے کی کوشش چاہتے ہوئے میری جانب پلٹا کھایا۔ جبکہ میری ٹھوکر کا ہدف بننے والا جنگی خان تو بالکل ہی سنبھل نہ پایا تھا اور سیدھے ہاتھ کے خالی بیڈ پر جا پڑا تھا۔ جس کا مریض شاید خوف کے باعث پہلے ہی نیچے جا دبا تھا۔ اس وقت میرے وجود کا روم روم جوش سے تنا ہوا تھا۔ کیونکہ میں اب براہ راست قہقہہ موت سے ہمکنار کرنے والے سنگین خطرے سے دوچار تھا۔ بہ الفاظ دیگر میں نے خود کو بھڑکتی

رخ کیا ہو۔

ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں فوراً اس دیوار کی طرف لپکا جس کی کھڑکی سے اسپتال کے بیرونی گیٹ اور احاطے کا جائزہ لیا جاسکتا تھا۔ وہاں سے میں نے نیچے جھانکا تو میرے چہرے پہ گہری تشویش کی لکیریں ابھر آئیں۔ نیچے پولیس کے ساتھ ریجنرز کی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ میں پلٹا اور کبیل دادا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی ریجنرز والوں کی موجودگی پر پریشان ہو گیا۔ وہ خود کھامیہ انداز میں بولا۔ ”پولیس سے تو مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ مگر ریجنرز... یہ کہاں سے ٹپک پڑی ہے؟“

”ان سے مقابلہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر جنگی خان کو ان کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہیے۔“

”جنگی خان؟...“ وہ سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔ وہ نقاب میں تھا اس لیے کبیل دادا سے ابھی تک نہیں پہچان سکا تھا۔ جبکہ میں نے آواز سے اسے پہچانا تھا۔

”ہاں! وہ جنگی خان ہی تھا جو اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ہمراہ ہمیں نشانہ بنانے آیا تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔“ پھر میں نے مختصر اسے تفصیل بتادی۔ بیگم صاحبہ اور اول خیر کے بارے میں اس سے استفادہ کرنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر جوش غیظ سے بولا۔

”تو یہ جنگی خان تھا۔ اسے کسی بھی صورت میں پولیس یا ریجنرز کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہیے۔“

”میں خود اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوں مگر انسوس وہ بچ نکلا۔“

”خبردار!... جنگی خان کو ہلاک مت کرنا، اسے زندہ پکڑنا ہے۔“ وہ بولا۔ ”اس سے ہمیں بیگم صاحبہ کے بارے میں اگلا تا ہے۔“

میں چونکا۔ ابھی میں اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ نیچے برسٹ چلنے کی آواز کے ساتھ ہی چیخنے چلانے کی آوازیں ابھریں۔

”یہاں سے ہٹ جاؤ اس طرف... آؤ...“ کبیل دادا ایک طرف تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ ہم دونوں زینے سے ہٹ کر راہداری میں آگئے۔ پھر ایک خالی کراپا کر اس کے اندر چلے گئے۔ ”پولیس اور ریجنرز کے اہلکار کسی بھی وقت اوپر آسکتے ہیں...“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

یہ کوئی وی آئی پی وارڈ تھا جو خالی تھا۔ ہم دونوں

اور پلٹا۔ لفٹ والی دیوار کے زینے پر مجھے وہ مسلح آدمی دکھائی دیا جو جنگی خان کے سوا کوئی نہ تھا۔ اگرچہ اس نے نقاب چڑھایا ہوا تھا۔ میں نے فوراً برسٹ مارا۔ اس نے خود کو پیچھے گرا دیا۔ شاید اسے میری طرف سے اتنی جلدی جوابی فائرنگ کی توقع نہ تھی۔ وہ اگلا نشانہ باندھنے کے لیے پرتول رہا تھا کہ میری گن کے نشانے پر آگیا، اس کے پاس پیچھے سرکنے یا چھپنے کا موقع نہ تھا ماسوائے اس کے کہ وہ خود کو زینے کی طرف گرا دیتا۔ میں نے اس سمت اندھا دھند دوڑ لگا دی۔ جنگی خان تب تک لڑھکھا ہوا نیچے جا چکا تھا اور پھر شاید سنبھلتے ہی اس نے نیچے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ کبیل دادا اپنے زخمی ساتھی کی طرف متوجہ تھا۔ پھر شاید اس کی زندگی سے مایوس ہو کر وہ میری طرف دوڑا۔ میں زینے طے کرنے لگا۔ گراؤنڈ فلور تک زینے کے دو موڑ آئے تھے۔ دوسرے موڑ کی دیوار کی آڑ سے میں نے جھانکا تو وہاں مجھے پولیس نظر آئی اور اس دوران فائرنگ بھی ہوئی۔ مجھے نیچے لابی کے فرش پر جنگی خان کے ایک ساتھی کی خون میں لت پت لاش بھی نظر آئی۔ جس کے گرد خون کا تالاب بنا ہوا تھا۔ شاید پولیس نے اسے ”ہشٹ“ کر دیا تھا۔ دوسرا ساتھی کہاں تھا، نہیں پتا۔ اس دوران کبیل دادا کی مجھے ہانپتی آواز سنائی دی۔ ”واپس پلٹو... مجھے خطرہ ہے۔“ یہ کہہ کر وہ واپس مڑا۔ میں بھی اپنی گن جو دشمن سے چھینی تھی، سنبھالتا ہوا پلٹا۔ ہم دوبارہ اوپر آگئے۔ کچھ لوگ ہم سے بھی خوف زدہ نظر آنے لگے۔ وہ مجھے ہی دہشت گرد سمجھ رہے تھے۔ کیونکہ ہمارے ہاتھوں میں بھی اسلحہ تھا۔ نیز مختلف مقامات پر لگے کیمرزوں پر ہماری ویڈیو بھی بن رہی تھی۔ میرے لیے یہ زیادہ تشویش کی بات تھی۔ گویا تقدیر ایک بار پھر میری کشاکش اور مصیبتوں کی زمین کو وسیع کرنے پر آمادہ تھی۔

ہم دوسری منزل سے مزید ایک منزل اوپر آگئے۔ پولیس کے نرنغے میں ہم بھی آسکتے تھے۔ پولیس کے ہتھے چڑھنا میرے لیے کتنی مصیبت کا باعث بن سکتا تھا، یہ میں ہی جانتا تھا۔

تیسری منزل پر بھی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ یہاں بھی مریض اور حملے کے آدمی لوگ ہمیں دیکھ کر خوف سے چیخنے لگے۔ کچھ سراسیمہ ہو کر دبک گئے اور ہماری جانب سہمی ہوئی نظروں سے ہٹنے لگے۔

تیسری منزل پر پہنچ کر ہم محتاط تھے۔ کیا خبر نیچے پولیس کی موجودگی کے باعث جنگی خان نے بھی ادھر کا ہی

آوارہ گرد

”شہزی! ہمیں اپنی گنیں اس کمرے میں چھوڑنا ہوں گی... لگتا ہے جنگی گیا ہاتھ ہے۔ اب ہمیں باہر نکلنا ہوگا۔“ کبیل دادا نے سرگوشی کی۔ میں نے اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی۔ پولیس اور ریجنلر کی مداخلت کے دوران ہمارا جنگی خان پر ہاتھ ڈالنا از بس مشکل تھا اور خود ہم ہی بچھڑ سکتے تھے۔ لہذا ہم نے اپنی گنیں... اس دی آئی پی وارڈ کے اندر کہیں چھپا دیں۔ اس وقت پولیس اور ریجنلر اہلکار اسپتال میں دندناتے فائرنگ کرتے دہشت پسندوں کو نارگٹ کیے ہوئے تھے۔ اس لیے ہمیں باہر نکلنے کا موقع مل سکتا ہے۔

ہم راہداری کے موڑ پر پہنچے تو یہاں کچھ ڈرے سبے اور دیکھے ہوئے افراد دکھائی دیے۔ ان میں اسپتال کے عملے کے بھی چند لوگ شامل تھے۔ ٹھیک اسی وقت ہمیں عقب سے دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہم ٹھٹک کر رے اور پلٹ کر دیکھا۔ ریجنلر کے چند مسلح اہلکار اس طرف دوڑے آرہے تھے۔ میں یکدم سنانے میں آ گیا۔ اس وقت کبیل دادا نے سرسراہٹ ہوئی سرگوشی میں کہا۔

”خبردار...! بھاگنا مت۔ یہ مجرموں کے پیچھے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ میں نے فوراً اس کی تقلید کی اور ہم بھی ان ڈرے سبے لوگوں میں شامل ہو گئے۔ یہاں مجھے کبیل دادا کی ذہانت اور احتیاط پسندی کا کھلے دل سے اعتراف کرنا پڑا۔ کیونکہ گنوں کی ہمارے پاس عدم موجودگی نے ہمیں مصیبت سے بچا لیا تھا اور ریجنلر کے اہلکار آگے دوڑتے چلے گئے۔ ہم سب پر انہوں نے سرسری نگاہ البتہ ڈالی تھی۔

اسی وقت لوگ آپس میں تباہ خیال کرنے لگے۔

”لگتا ہے پولیس اور ریجنلر نے دہشت گردوں کو پکڑ لیا ہے۔“

”ہاں! کچھ مارے بھی گئے ہیں... ایک اور بولا۔“

”ان کا سرخنہ باقی بچا ہے۔“ عملے کے ایک وردی پوش آدمی نے کہا۔

”آخر یہ معاملہ کیا ہے...؟“

”میرا خیال ہے ریجنلر کے افسر کی ٹیم اور اس کے بیٹے کو یہ دہشت گرد ہلاک کر سنے آئے تھے۔“

اس بات پر میرے اور کبیل دادا کے کان کھڑے ہو گئے۔ شکر ہے کہ ان کا تعلق ان لوگوں سے نہیں تھا جو اس وارڈ میں داخل تھے جہاں ہمارا جنگی خان اور اس کے

دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ اور ادھ کھلی جھری سے کوریڈر پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہاں سے ہمیں زینے اور لفٹ نظر آرہی تھی۔

”میرا خیال ہے جنگی خان اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے کی سرٹوڈ کوشش کرے گا۔“ کبیل دادا میری طرف دیکھ کر بولا۔

”کیونکہ تمہاری بروقت مداخلت نے نہ صرف اس کا خون ریز منصوبہ چوہٹ کر ڈالا ہے بلکہ اسے مشکل میں بھی پھنسا دیا ہے۔“

”مشکل میں تو ہم بھی پھنسے ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں تمہارا شکریہ ادا کرنا بھول گیا دوست!... تم نے عین وقت پر میری جان بچالی۔ مگر مجھے... صدیقی کے مرنے کا افسوس ہے۔ وہ اپنے ساتھی کے متعلق بولا جو جنگی خان کے کسی ساتھی کی گولیوں کی بھیشت چڑھ گیا تھا۔

”آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ تم یہاں اسپتال میں کیسے اور بیگم صاحبہ کا کیا ہوا؟... وہ کہاں غائب ہیں؟ اول خبر بھی بیگم دلا سے اچانک کہیں نکل گیا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ بیگم صاحبہ کی کار پر فائرنگ کی گئی تھی؟“ میری بات پر کبیل دادا نے ایک گہری سانس لی۔ ٹھیک اسی وقت زینے سے ایک نقاب پوش دوڑتا ہوا دوسرے کوریڈر کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر یلخت میری کنپٹیاں چٹختے لگیں۔ وہ جنگی خان تھا۔ پھر میں نے دو تین پولیس اہلکاروں کو بھی اس کے تعاقب میں آتے دیکھا۔ ان میں ایک ریجنلر کا وردی پوش اہلکار بھی تھا۔ ”ہوشیار...“ میں ہولے سے بڑبڑایا۔ کبیل دادا نے بھی جھری سے جھانکا۔ ٹھیک اسی وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں نے دو پولیس والوں کو چکنے فرش پر گرے دیکھا۔ ایک پولیس مین اور ریجنلر کے اہلکار نے فوراً دیوار کی آڑ لے کر سنگل فائر کیا۔

”ہمارا شکار اسی منزل پر آ گیا ہے۔ اب کیا کریں؟“

میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ وہ گونگو سے لہجے میں بولا۔ ”جنگی خان شاید ان کی نظروں میں آ گیا ہے ورنہ وہ ہتھیار پھینک کر اور نقاب اتار کر بہ آسانی نکل سکتا تھا۔ خیر دیکھتے ہیں... ذرا باہر نکلو۔“

ہم کمرے سے کوریڈر میں آ گئے۔ مختصری فائرنگ کے بعد اب ایک دم سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ پھر دلچاس کی چٹچ اُبھری۔ یہ کسی عورت کی چٹچ تھی۔ اس وقت کچھ مزید پولیس اور ریجنلر کے اہلکار اوپر آ گئے۔

ساتھیوں سے خون ریز مقابلہ ہوا تھا۔ ورنہ وہ ہمیں بھی پہچان جاتے۔ لہذا میں نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہاں کسی ریجنرز کے انسر کی فیملی بھی موجود تھی؟“ میرا مخاطب حملے کا وہ فرد ہی تھا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ”اس لیے ریجنرز کی آمد متوقع تھی۔ البتہ... پولیس کہیں قریب ہی موجود تھی۔ فائرنگ اور شور شرابے پر... متوجہ ہوئی۔“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سامنے سے، جس طرف ریجنرز کے وہ دو تین اہلکار دوڑتے گئے تھے، ایک موٹی سی نرس اور جوان لڑکا جو دارڈ بوائے ہی لگتا تھا آکر ہم میں شامل ہو گئے۔

”دہشت گردوں کے سرغنہ نے میجر باجوہ کی بیوی اور بیٹے کو یرغمال بنا رکھا ہے اور دباؤ ڈال رہا ہے کہ اسے باہر نکلنے دیا جائے۔“ موٹی نرس نے... ہانپتے ہوئے بتایا۔

”میجر باجوہ...“ اس نام پر میں بری طرح ٹھنکا۔ کہیں یہ لوگ میجر ریاض باجوہ کی بات تو نہیں کر رہے... جو محکمہ گیرانگی کے اسٹیشنل انویسٹیگیٹو پارٹنمنٹ کا انچارج تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کہیں تم میجر ریاض باجوہ کی بات تو نہیں کر رہی ہو... سسر؟“

اس موٹی نرس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ وہ خاصی دہشت زدہ نظر آرہی تھی۔ جواباً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں! وہی ہیں۔ ان کے بیٹے کا ٹائپڈائیٹل بخار ہو گیا تھا۔ آنتوں میں سوراخ ہو گیا تھا... کل صبح ہی اسے داخل کیا گیا تھا ایمرجنسی میں۔ میری اسی وارڈ میں ڈیوٹی تھی۔ سرغنہ نے اسے ہی گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے۔ میں اور امجد بڑی مشکلوں سے وہاں سے بھاگے ہیں۔“ امجد اس کا وہ نو جوان ساتھی تھا۔

اب بات سمجھ میں آگئی تھی۔ میجر صاحب یقیناً یہاں اپنے بیمار بیٹے کو دیکھنے آئے ہوں گے اور یہاں یہ معاملہ آن پڑا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ اگر میجر ریاض باجوہ وہی تھے جو میں سمجھ رہا تھا تو اس کا مطلب تھا صورت حال واقعی کبھی تھی۔ ان لوگوں کو بھلا کیا معلوم تھا کہ درحقیقت دہشت گرد یعنی جنگی خان وغیرہ یہاں علاج کی غرض سے پہلے سے داخل کبیل دادا اور اس کے ساتھی کو ہلاک کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ ممکن ہے اب تک ان لوگوں نے جس وارڈ میں ہمارا جنگی خان وغیرہ سے خون ریز ٹکراؤ ہوا تھا اصل بات بتادی ہو۔ لہذا ہم بھی تفتیش کی زد میں آسکتے

تھے۔ مگر ریاض باجوہ... میرے محسنوں میں سے تھا۔ پولیس انتظامیہ میں یہی وہ واحد فرد تھا جو ابتداء ہی سے میرے مسائل کو غیر جانبداری سے دیکھتا آیا تھا اور مجھ سے پورا پورا تعاون کرنے کا بھی خواہاں تھا۔ مگر نقد پر نے اب تک مجھے اتنا موقع ہی نہ دیا تھا کہ میں اس سے کوئی خاطر خواہ مدد لے سکتا۔

میں نے اس نرس سے پوچھا۔ ”وہ وارڈ کس طرف ہے جہاں میجر صاحب کا بچہ داخل ہے؟“ ”اس طرف... اس راہداری کے اختتام پر۔“ اس نے سامنے دائیں جانب جہاں یہ راہداری ختم ہوئی تھی اشارہ کر کے بتایا۔

”دہشت گردوں کا سرغنہ ابھی وہیں موجود ہے؟“ ”ہاں۔“

میں نے فوراً مذکورہ سمت قدم بڑھا دیے تو عقب سے کبیل دادا نے مجھے پکارا۔ ”کدھر چل دیے...؟“ اس نے دانستہ میرا نام لینے سے گریز کیا تھا... باقی لوگ بھی میری طرف عجیب عجیب نظروں سے نکتے لگے۔

”تم ادھر ٹھہرو... میں ابھی صورت حال کا تھوڑا جائزہ لے کر آتا ہوں۔“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ مگر کبیل دادا نہ رکا۔ وہ میرے پیچھے ہی چلا آیا۔ آگے قدم بڑھاتے ہوئے میرا دل بے طرح انداز میں دھڑک رہا تھا۔

”تم وہاں کیا کرنے جا رہے ہو؟... پاگل ہو گئے ہو شہزی...؟“ پیچھے سے کبیل دادا کی پھر آواز سنائی دی مگر میں آگے بڑھتا رہا۔ سرے پہ پہنچ کر میں ٹھنک کر رک گیا۔ وہاں گولیاں چلنے کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں فوراً راہداری کی دیوار سے چپک گیا۔ عقب میں ذرا دور موجود ڈرے سب لوگ چیخیں مار کر آگے کود رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے ریجنرز کے دو اہلکار گرے تھے۔ ایک ساتھی انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہیں شاید گولیاں لگی تھیں جو یقیناً جنگی خان نے ہی چلائی ہوں گی۔ میری دانست میں جنگی خان بری طرح پھنس گیا ہے۔ میں آگے بڑھا۔ ایک اہلکار کے پیٹ میں گولی لگی تھی جبکہ دوسرے کے پہلو میں۔ ان کا تیسرا ساتھی جو انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا... اپنے ہاتھ میں پکڑے دائر لیس سیٹ پر کسی کو جلدی جلدی ہدایت دے رہا تھا۔ میں آگے بڑھا تو اس نے مجھے روکنے کا اشارہ

آوارہ گود

ہے، میرے راستے خود ہی آسان ہوتے چلے جائیں گے۔
اب تم آگے سے ہٹ جاؤ... اور مجھے نکلنے دو... یہ میرا
آخری حکم ہے ورنہ میں اس لڑکے کے سر میں سوراخ کر دوں
گا۔“

اس اثنا میں قریب کھڑی، لڑکے کی بد نصیب ماں اور
مہاجر کی بیوی خوف سے چیخ کر کھجی لہجے سے بولی۔
”نہیں... نہیں... خدا کے لیے میرے بیٹے کو مت
مارنا...“ پھر وہ اپنے شوہر کی طرف پلٹی۔
”پلیز... ارضی... اسے جانے دو... ورنہ... یہ
ہمارے بیٹے کو ہلاک کر دے گا۔“

میں نے مہاجر صاحب کے چہرے کے تاثرات کا بھی
جائزہ لیا۔ فرض اور قرض کے درمیان... وہ ایک زبردست
شش و پنج کا شکار نظر آ رہے تھے۔ وہ پھر شاید آخری حربے
کے طور پر جنگی خان کی طرف بہ غور تکتے ہوئے بولے۔
”تم میرے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔
مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا... اور میں تمہیں پہچان چکا
ہوں۔“

ان کے اس انکشاف پر نہ صرف میں چونک گیا تھا
بلکہ سیاہ نقاب سے جھانکتی ہوئی جنگی خان کی سفاک آنکھوں
میں بھی مجھے الجھن حیرتی محسوس ہوئی تھی... مہاجر باجہ آگے
بولے۔ ”تم یقیناً بدراقبال عرف بابن ڈکیت کے آدمی ہو...
اور ضرور اسی نے تمہیں یہاں میرے بیٹے کو اغوا کرنے کے
لیے بھیجا ہے۔“

یہ نام میرے لیے ہی نہیں بلکہ شاید کیبل دادا کے
لیے بھی اجنبی ہی تھا۔ مگر مجھے افسوس ہوا کہ مہاجر جنگی خان کے
بارے میں ایک غلط اندازہ قائم کیے ہوئے تھا۔ جو خطرناک
بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ معاملہ اتنا زیادہ سنگین نہ تھا جیسا
کہ باجہ صاحب سمجھ رہے تھے۔ جبکہ میرے نزدیک
معاملہ فقط اس قدر تھا کہ جنگی خان کا سرے سے ایسا کوئی
ارادہ ہی نہ تھا۔ نہ وہ ان کے نو عمر بیٹے کو اغوا کرنا چاہتا تھا نہ
ہی اسے ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا ہوگا۔ وہ تو محض ان
کے بیٹے کو ڈھال بنا کر یہاں سے فرار چاہتا تھا۔ پھر میں
نے جنگی خان کو کہتے سنا۔

”نہیں مہاجر... تم مجھے بالکل نہیں جانتے میں کون
ہوں۔ میں یہاں کسی اور مقصد کے لیے آیا تھا۔ مگر افسوس وہ
ناکامی سے دوچار ہوا۔ اب میں محض یہاں سے زندہ
سلامت نکلنا چاہتا ہوں۔ اپنی گاڑی میں سوار ہوتے ہی میں
تمہارے بیٹے کو چھوڑ دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ میں نے اس

کیا اور مجھ سے بولا۔ ”آگے مت جاؤ۔ ریڈ زون ہے۔“
مگر میں نہیں رکا۔ وہ یکدم غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ پر گن
تان کر حکمانہ درشتی سے بولا۔ ”خبردار ارک جاؤ، یہ میرا حکم
ہے... وہاں مہاجر صاحب کے بیوی بچے خطرے میں
ہیں۔“

میں نے سر و نظروں سے اہلکار کی طرف دیکھا اور
سخت لہجے میں بولا۔ ”مہاجر یا ض باجہ میرے دوست ہیں
اور دہشت گردوں کے اس سرغنہ کو میں اچھی طرح جانتا
ہوں۔ میں صرف صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔“
میرے پر اعتماد لہجے سے وہ مرعوب نظر آنے لگا۔ میں آگے
بڑھ گیا۔ کیبل دادا میرے پیچھے ہی تھا۔ وہ بھی میری بات پر
یقیناً چونکا ہوگا۔ دفعتاً میری ٹنگلی ہوئی ساعتوں سے ایک غرائی
ہوئی شہسا آواز گونائی۔

”مجھے یہاں سے نکلنے دیا جائے... ورنہ میں لڑکے
کے سر میں گولی اتار دوں گا۔“

یہ صفتِ رذیل... جنگی خان کی خوف ناک آواز تھی۔
میں نے راہداری کے سرے والی دیوار کی آڑ سے اپنا ڈراسا
سرا بھرا کر دیکھا۔ سامنے مختصر سی لابی تھی جس کے دائیں
بائیں... کچھ انجمنش وارڈ روم بنے ہوئے تھے۔ ایسے ہی
ایک کمرے کے سامنے مجھے جنگی خان کھڑا نظر آیا گیا جس نے
پندرہ سولہ سال کے ایک لڑکے کو گن پوائنٹ پر لے رکھا
تھا... قریب ایک خوب صورت عورت کھڑی روتے ہوئے
اس کی منتیں کر رہی تھی جو یقیناً مہاجر باجہ صاحب کی بیوی تھی
اور لڑکا... ان کا بیٹا۔ وہ بھی خوف و دہشت سے چلا پڑا ہوا
تھا۔ وہاں میں نے چکنے فرش پر ایک ریخیز ہلکار کی خون
میں لت پت لاش بھی پڑی دیکھی۔ باقی تین ریخیز ہلکار
دائیں بائیں چوکس کھڑے تھے۔ بلکہ پوزیشن لیے ہوئے
تھے اور اپنی گنوں سے جنگی خان کو ٹارگٹ کیے ہوئے تھے۔
ان کے درمیان میں مہاجر یا ض باجہ کھڑے تھے۔ وہ نہتے
تھے۔ کچھ پولیس کے جوان بھی موجود تھے۔

”دیکھو... تم اس طرح خود کو مزید خطرے میں ڈال
رہے ہو۔ نیچے بھی پولیس اور ریخیز نے پورے اسپتال کو
گھیرے میں لے رکھا ہے۔“ مہاجر یا ض باجہ اس کے
ساتھ ”کاؤنسلنگ“ میں مصروف تھے۔ جنگی کے سر پر خون
سوار تھا۔ سیاہ نقاب سے جھانکتی ہوئی اس کی آنکھوں میں
سفاکی مترشح تھی وہ فراہٹ آمیز درشتی سے بولا۔

”نہیں مہاجر! نہیں... مجھے بے وقوف بنانے کی
کوشش مت کرو۔ جب تک تمہارا بیٹا میرے رحم و کرم پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تھی۔ کیونکہ مجھ سمیت اس نے بھی میجر صاحب کو نیچے والوں کو ہدایت دیتے ہوئے لفٹ کا تذکرہ کرتے سنا تھا۔ اس نے زینے کی راہ لی اور نیچے اترنے لگا۔

یگانگت میرے خون کی گردش تیز ہو گئی اور پھر میں تیزی کے ساتھ میجر صاحب کے سامنے آ گیا۔ پولیس کو میں بھی مطلوب تھا۔ اور میجر باجوہ مجھے بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ لہذا مجھے اچانک سامنے دیکھ کر وہ بری طرح چوٹے تھے۔ میں نے ان سے بتی لہجے میں کہا۔

”میجر صاحب! وقت کم ہے اور صورت حال خطرناک... خدا کے لیے میرے ساتھ تھوڑا تعاون کریں۔ میں اس درندہ صفت آدمی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ خونی چوہداری ممتاز خان کا گماشتہ ہے اور یہ ہمیں ہلاک کرنے آیا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ میں اس پر قابو پا لوں گا۔ بس! آپ ایک کام کیجیے، نیچے موجود پولیس سمیت اپنے اہلکاروں سے کہہ دیجیے، وہ ہمارا راستہ نہ روکیں... میرے ساتھ میرا ایک ساتھی بھی ہے۔ جلدی کیجیے۔ میجر صاحب... ہم نیچے جا رہے ہیں اس خونی کے پیچھے۔“

باجوہ صاحب کے ساتھ میری پرانی انڈرا سٹینڈنگ تھی۔ جب وہ اس سے پہلے سول پولیس انتظامیہ میں تھے تو یہ واحد شخصیت تھے جو میرا کیس سمجھتے تھے اور آخر تک میری مدد کرنے کے خواہاں بھی۔ لہذا انہوں نے میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کی اور میں ان سے پر امید تھا۔ جس کا ثبوت یہ تھا کہ میں اور کبیل دادا اسلوب نما راستہ حمزی کے ساتھ طے کرتے ہوئے دوسری منزل پر آن پہنچے۔ ”تم کرنا کیا چاہتے ہو آخر؟“ کبیل دادا جھلکا کر بولا۔

”بچوں والی باتیں مت کرو دادا... تم اچھی طرح جانتے ہو میں کیا کرنا چاہتا ہوں...“ میں نے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

وہ فوراً سنبھل گیا۔ میں نے اسے اشارہ کیا۔ پھر ہم دونوں اس زینے کی دیوار کے دائیں بائیں چھپ کر گھات لگائے کھڑے ہو گئے جہاں سے جنگی خان نمودار ہونے والا تھا۔ بلاشبہ میں نے یہ ایک خطرناک قدم اٹھایا تھا مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ خدا نے مجھے ایک سنہری موقع دیا تھا تو وہی میری دستگیری بھی فرمائے گا۔

مجھے زینے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنہیوں پہ دھڑکنے لگا۔ میں اور کبیل دادا اُستے تھے۔ جبکہ وہ موڈی مردود جنگی خان مسلح تھا۔ لیکن ہمیں اس پر ایک فوقیت حاصل تھی۔ ہمیں اس سے پہلے

لیے یہ صفائی بیان کرنی ضروری سمجھی ہے کہ تم کوئی مشکل پیدا کرنے اور چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ بس! اتنا کافی ہے۔ اب مجھے راستہ دو۔“

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جبکہ مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ کہیں میجر صاحب کسی مفالطے کا شکار ہو کر صورت حال کو سنگین نہ بنادیں۔ مگر شکر ہوا کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگے۔ ممکن ہے کسی بدر اقبال عرف ہابن ڈکیت نامی آدمی سے ان کی کوئی پرانی دشمنی ہو... بہر حال جنگی خان کو نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ میں نے سناٹے دار نظروں سے دیکھا جنگی خان لفٹ کی طرف سرک رہا تھا اور ساتھ ہی محتاط نظروں سے گرد و پیش کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ میں اس سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر تھا اور اس کے دائیں بازو والی سمت میں کوریڈور کی اختتامی دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔

”خبردار... میرے پیچھے آنے کی کوئی جرأت نہ کرے۔“ معالفت کی طرف سرگتے ہوئے اس نے دھاڑ کر کہا۔

”میجر... نیچے فون کر کے ہدایات دے دو... ایسا نہ ہو کہ کسی قسم کی مہم جوئی آپ کو ہنگامی پڑ جائے۔“

”ٹھہرو... مم... میں بھی تمہارے ساتھ نیچے چلتی ہوں۔“ اچانک میجر صاحب کی بیوی نے جنگی خان سے کہا۔ وہ ماں تھی۔ اپنے لخت جگر کو ایک خونی شخص کی گرفت میں پا کر بے چین تھی اور اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہ خود کو بھی ایک خطرناک مجرم کے حوالے کرنے کو تیار تھی۔ ماں تھے سلام... مجھے اپنی ماں کا صبر پان چہرہ یاد آنے لگا... میرا دل جیسے کٹنے لگا۔ میں نے جنگی خان کی عیار آنکھوں میں بڑی حیرت منہ مسکراہٹ چمکتے محسوس کی۔ وہ مکاری سے چپکا۔

”ہاں، اس سے زیادہ اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ مگر خبردار...! میرے سامنے رہنے کی کوشش کرنا۔ میری نظروں سے ہٹنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا۔“ اس نے آخر میں تعینہ کی۔

میرا دل ایک خطرناک مزاحمتی خیال کے پیش نظر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دیوار کی آڑ سے میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے پہلے اپنے سامنے شدید شش و پنج کا ڈکار کھڑے میجر صاحب سے نیچے فون کروایا۔ پھر ان کی طرف سے اشارہ پاتے ہی وہ آگے بڑھا۔ میں سمجھا تھا وہ نیچے جانے کے لیے لفٹ استعمال کرے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنا رخ بدل لیا۔ یہ اس کی مکاری

آوارہ گرد

لایو... چوہدری ممتاز خان سمیت ان سب کے بھائیوں کے چہرے بے نقاب کرنا چاہتی تھی۔
مجھ پر جیسے وحشیانہ جنون سوار ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا اب تک اسپتال میں لگے سی کیمروں نے یہ سب کارروائی اپنی شیشے کی آنکھوں میں محفوظ کر لی ہوگی۔ کبیل دادا نے جنگی خان کی گمن پر قبضہ جمالیا تھا۔ مجھے سنبھالا دیتے ہوئے کہنا چاہا۔
”... شہزی... کیا کر رہے ہو؟ اسے لے کر نکل چلو...“

میں اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔
”لوگو! دیکھو، اسے پہچان لو... یہ ممتاز خان کا گرگا ہے... ایک اہم درندہ صفت حواری ہے۔ ممتاز خان کے بیٹے فرخ کو بھی میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ یہ اس کی اپنی بیٹی نوشابہ کی غلطی سے چلائی جانے والی گولی سے ہوا۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ میں ممتاز خان کے بیٹے فرخ کو صرف اغوا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر کسی تادان کے لیے نہیں بلکہ اسے وہی اذیت دینے کے لیے جو اذیت اس نے میری عابدہ کو اس خونی انسان جنگی خان کے ذریعے اغوا کر کے اور اس معصوم کو زبردستی شراب پلا کر مجھے دوچار کیا تھا۔ نوشابہ پولیس کو اپنا بیان دے چکی ہے جو سچ پر مبنی ہے... مگر ممتاز خان اسے ذہنی مریضہ قرار دے کر عام لوگوں اور میڈیا کے لوگوں اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ ممتاز خان کی قانونی سپورٹ کرنے والی قانون کی ایک کالی بھیڑ... ماضی کا ایس ایچ او اور ڈپٹی روشن خان... ماورائے قانون مجھے ہلاک کرنے کے درپے ہے۔ ملتان کے لوہے میں واقع اس کالجی ٹارچر سیل ہے جہاں اس نے مجھے غیر قانونی طور پر جیس بے جا میں رکھا اور اس لیے مجھے وہاں انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بنایا کہ میں اس کی مرضی کے ایک پہلے سے تیار شدہ بیان پر اپنا انگوٹھا لگا دوں۔ کھانا والی کے ایم این اسے راجا زبیر خان کے بیٹے راجا شفقت کے قتل کا جھوٹا الزام بھی میرے سر لگا یا گیا مگر جلد ہی زبیر خان کو اپنے ذاتی ذریعے سے علم ہو گیا کہ یہ قتل اس کے بعض سیاسی دشمنوں کے ہاتھوں ہوا، اور میرے حق میں ان کا بیان بھی جاری ہوا۔ ملتان کی سیشن کورٹ میں چوہدری ممتاز خان کے خلاف میں ایک کیس پہلے ہی جیت چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں ملتان کے معروف ادارے ”اطفال گھر“ کو مجرموں اور خراکروں کا ڈال... بنانے اور اس کے سر پرست حاجی اسحاق خان کے قتل کو حادوثاتی رنگ دینے کا راز آشکارا

گھات میسر آگئی تھی۔ جس سے جنگی خان واقف تھا اور جنگ کا یہی اصول ہوتا ہے جسے پہلے گھات مل جائے تو مد مقابل کی بات مقدر ٹھہرتی ہے۔ سب سے پہلے میجر ہاجوہ صاحب کی بیگم زینے سے نمودار ہوئی، اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے فوراً اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ وہ ذہین ثابت ہوئی اس نے کوئی تاثر اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس وقت جنگی نو عمر لڑکے کو گمن پوائسٹ پر لے کر نمودار ہوا۔ اپنے گرد و پیش سے غافل وہ بھی نہ تھا۔ مگر بات وہی تھی، ہم گھات میں تھے۔ اس کا رخ یوں تھا کہ دوسری منزل کا آخری قدم چھوٹے کرتے ہی اس کی پشت لمبے بھر کے لیے میری طرف ہوئی تھی۔ مگر اس کے چہرے کا رخ دوسری جانب کھڑے کبیل دادا کی طرف ہوا۔ ایک سیکنڈ کے ہزار دین حصے میں، میں نے اس کے ٹھٹھکنے کا فائدہ اٹھایا اور پھر جیسے میری رگوں میں لہو مثل پارا بن کے دوڑا۔ میں نے سب سے پہلے اس کی گمن والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ جمایا۔ گمن کی ٹال نو عمر لڑکے کی کٹھنی سے بٹکی۔ یہ حرکت جنگی خان کے سان گمان میں بھی نہ تھی۔ میری دوسری حرکت اسے کھد بڑنے کے عمل سے مشروط تھی۔ نتیجتاً وہ لڑکھڑا گیا۔ کبیل دادا نے اس نازک ترین لمحات میں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ حرکت کی اور جنگی خان کے گمن والے ہاتھ پر کھڑی پھلتی کا دار کیا۔ گمن اس کے ہاتھ سے کیا نکلی... ہاجوہ صاحب کی بیوی شیرنی کی طرح اپنے نو عمر بیٹے کو اپنے دونوں بازوؤں سے ڈھانچنے کو لگی۔

جنگی خان اب نہتا ہو چکا تھا اور اپنے دشمن ویرینہ کو اس حالت میں دیکھ کر میں بھوکے شیر کی طرح اس پر جھپٹا اور اس پر لاتوں اور گھونٹوں کی بارش کر کے، بے حال کر دیا۔ کبیل دادا نے میرا پورا پورا ساتھ دیا۔ اس وقت میری نظر سامنے دیوار کے کونے پہ لگے سی کیمرے پہ پڑی۔ میں نے جنگی خان کا نقاب چہرے سے ہٹا لیا اور اس کے سر کے بالوں کو اپنے آہنی ہاتھ کی کٹھنی میں دیوچ کر مکروہ چہرہ سی کیمرے کی طرف کر کے میں چلا کر بولا۔

”لوگو! پہچان لو اچھی طرح اس درندے صفت انسان کو، یہ جنگی خان ہے۔ چوہدری ممتاز خان کے چہرے کا دوسرا مکروہ رخ... اس نے اپنے ساتھیوں سمیت اسپتال میں دہشت مچائی اور میجر ہاجوہ صاحب کے بیٹے کو گمن پوائسٹ میں لے کر اغوا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے میڈیا سے تعلق رکھنے والی معصوم لڑکی آسیہ کی اجتماعی عصمت دری کر کے اسے جان سے مار ڈالا جو اس کیمرے کے ذریعے

خیز ڈرائے کی کوریج کر چکا تھا۔

کبیل دادا اس سارے قصے سے مطمئن اور خوش نہ تھا۔ مگر میں مطمئن تھا۔ مجھے میجر باجوه صاحب سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔

☆☆☆

ہمیں ہیڈ کوارٹر لا کر ایک بیرک میں بند کر دیا گیا جبکہ جنگی خان کو کسی اور جگہ لے جایا گیا تھا۔

ذرا تنہائی ملتے ہی کبیل دادا نے اپنی عادت کے مطابق میرے لئے لیٹا شروع کر دیے۔

”تمہیں یہ جوش بھری تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمہارے اس تقریری مقابلے نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ہم بہ آسانی جنگی خان کو یہ غمال بنا کر یہاں سے لے جاسکتے تھے۔“

”میں نے وہی کیا جو ان حالات میں مجھے کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ پھٹ پڑا۔

”شہزی! تم بہت خود غرض انسان ہو۔ تمہیں نہیں پتا

کہ بیگم صاحبہ کس حال میں ہوں گی؟ ہم جنگی خان سے ان

کے بارے میں اگلا سکتے تھے کہ وہ کہاں اور کس حال میں

ہے؟“ جب میں نے قدرے چونک کر مستفسرانہ نظروں

سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنے ساتھ پیش آنے

والے حالات و واقعات کی تفصیل سے مجھے آگاہ کیا جس

کے مطابق بیگم صاحبہ جب ایک دوسرے اسپتال سے اپنے

بیمار باپ چوہدری الف خان کی عیادت کے بعد واپس لوٹ

رہی تھیں (ان کے جانے کے بعد الف خان کی موت واقع

ہو گئی تھی) تو ان کی کار پر نامعلوم مسلح حملہ آوروں نے

فائرنگ کر کے ہار برسٹ کر ڈالے تھے۔ وہ بھی قریبی کار

میں سوار تھے۔ اس وقت بیگم صاحبہ کے ساتھ کبیل دادا عقیبی

نشست پر موجود تھا۔ انہوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش

چاہی تھی مگر ناکام رہے۔ کبیل دادا بیگم صاحبہ کو بچا کر نکل

بھاگتا چاہتا تھا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ خود زخمی ہو کر نیم بے

ہوش سا ہو گیا۔ دشمن اسے مردہ سمجھ کر بیگم صاحبہ کو اغوا کر کے

لے گئے۔ کبیل دادا نے بیگم دلافون کر کے اول خیر کو بمشکل

ساری صورتحال سے آگاہ کیا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب

آکھ کھلی تو اس کے ساتھی اسے اور ایک دوسرے زخمی ساتھی

کو اٹھا کر اسپتال لے گئے تھے۔ لہذا کبیل دادا کے

مطابق... ان مذکورہ مسلح افراد کا تعلق مستاز خان سے ہی تھا

اور جنگی خان ان میں شامل تھا۔ بعد میں اسے ان دونوں کے

بارے میں پتا چلا ہوگا کہ وہ زندہ ہیں اور ایک اسپتال میں

ہوا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایس ایچ اور دشمن خان کے خلاف بھی

کورٹ نے تادیبی کارروائی کا حکم جاری کیا اور اسے لائن

حاضر کر کے کوارٹر گھاٹ کیا گیا۔ نیز حکمہ گیرائی کی ایک اسپیشل

اینٹی کرمنل برانچ کے افسر ریاض باجوه کو نفیثی افسر مقرر

کیا گیا جو اب رینجرز کے میجر ریاض باجوه ہیں۔ ان کے

ریکارڈ میں یہ ساری باتیں موجود ہیں مگر افسوس کہ ایک بار

پھر طاقت اور اثر و رسوخ، ددلت اور اقربا پروری کے زور

پر اس کڑوے اور کھلے سچ کو ایک بیٹھے جھوٹ میں بدل دیا

گیا۔ مجھے انصاف چاہیے... قانون سے نہیں... آپ

سے... عوام سے... اہل علم و دانش اور صاحب دل لوگوں

سے... لیکن اگر تم لوگوں نے بھی بے بسی، بے بسی اور

مصلحت گوئی کی عینک چڑھا رکھی ہے تو ایسے مجرم تمہارے

سہا ج میں ہی نہیں، تمہارے اپنے گھر میں پیدا ہوتے رہیں

گے اور تمہارے لیے درد سہنے رہیں گے۔ خدا را اب تو

بے بسی کو خیر باد کہہ دو، کب تک شتر مرغ کی طرح ریت میں

منہ دبا کر بیٹھے رہو گے؟ بس! مجھے یہی کہنا تھا۔“

ٹھیک اسی وقت بھاری قدموں کی آواز ابھری۔ میں

جنگی خان کو دبوچ کر پلٹا۔ وہ میری آہنی گرفت سے آزاد

ہونے کے لیے چلا۔ کبیل دادا نے فوراً اسے گن پوائنٹ پہ

رکھ کر دھکا دیا۔ ہم اسے لے کر گراؤند فلور پر پہنچے۔ ہمارا

ارادہ جنگی خان کو ساتھ لے جانے کا تھا اور مجھے کچھ امید تھی

کہ ہم نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ میں

پہلے ہی میجر باجوه کو اعتماد میں لے چکا تھا۔ مگر اب معاملہ اور

تھا۔ ان کا بچہ جنگی خان کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس کی

ماں یقیناً اسے لے کر ادھر پہنچ چکی ہوگی اور پولیس میں ممکن تھا

کہ باجوه نے دوبارہ فون کر کے نئی ہدایات دی ہوں۔

لہذا وہی ہوا۔ نیچے جھپٹتے ہی رینجرز اور پولیس نے

ہمیں گھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد میجر باجوه بھی نیچے آگئے۔ ہم

تینوں کو ہی گرفتار کر لیا گیا۔ مگر میں نے باجوه صاحب سے

گزارش کی ہمیں وہ پولیس کی تحویل میں دینے کے بجائے

اپنی تحویل میں لیں۔ ہمیں باہر لایا گیا۔ یہاں اچاٹے میں

میڈیا اور ٹی وی چینل والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جن

کی چھتوں پر بڑے بڑے ڈش انٹینا نصب تھے۔ وہ ہماری

تصویریں لے رہے تھے۔ ویڈیو بنارہے تھے۔ ان کے

سامنے بھی میں نے سچ چچ کر وہی کچھ دہرایا جو ادھر سی سی

کیمرے کے سامنے دہرا چکا تھا۔ نیز انہیں بتا بھی دیا کہ وہ

دوسری منزل کی لابی کے سی سی کیمرے سے وہ فوج حاصل

کر سکتے ہیں جو اب تک کے ابتدا سے، اس سارے سنسنی

لیا۔

”ایک بات بتاؤ شہزی۔“ میری بات پر وہ بولا۔
میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”یہ مہجر باجوہ تمہارا شاہ سا نظر آتا ہے۔ یقیناً تمہارے ماضی میں بھی اچھے تعلقات ہوں گے اس سے۔ اور پھر تم نے اس کے بچے کو ایک خونی مجرم کی گرفت سے بھی بچایا۔ تم بھی اس سے اب تعاون کی درخواست کر سکتے ہو۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ شکر کرو... ہم پولیس کے ہتھے نہیں چڑھے۔“ میں نے نشانی آمیز انداز میں اپنی بات دہرائی۔ ”باجوہ صاحب سے مجھے اچھی توقعات ہیں... وہ مجھے ملنے کا موقع دے گا، تو میں ان سے تعاون کی درخواست کروں گا۔ بیگم صاحبہ اور اول خیر کی طرف سے تشویش و فکر کا شکار میں بھی ہوں۔“

میری بات سن کر وہ چپ تو ہو گیا مگر اندر سے پھر بھی پریشان اور غیر مطمئن سا تھا۔ اس نے پھر مضطربانہ انداز میں ٹھٹھکا شروع کر دیا۔ میں سوچنے لگا۔ پتا نہیں ایڈوکیٹ خانم شاہ کس حال میں ہوں گی؟ اس ہڑبونگ اور مارا ماری میں نجانے ڈاکٹر امیر رضی آپریشن تھیر میں اس کا آپریشن کر بھی پائیں ہوں گے کہ نہیں۔ تاہم کچھ تسلی تو تھی کہ خانم شاہ کہیں اور جگہ نہیں، بلکہ ایک اسپتال میں ہی ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں ایک نیا پریشان کن خیال میرے ذہن کو بے چین ضرور کر رہا تھا کہ مگر خدا نخواستہ خانم شاہ کو کچھ ہو جاتا ہے تو میرے لیے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ میرے سلسلے میں پولیس کے ہاتھ ایک ناپائیدار آسکتا تھا۔ یہ صورت دیگر اگر اس کی جان بچ بھی جاتی ہے تو بھی وہ پولیس کو سب سے پہلے زہیر خان اور میرے خلاف بیان دے سکتی ہے۔ میں تو اس کی زندگی کے بچ جانے کی دعا میں مانگ رہا ہوں، اور اس کی بھی کہ کاش خانم شاہ فیضی اور انتقام کی روشن سے ہٹ کر ہوش مندی سے کام لے کر معاملے کو دبانے کی کوشش کرے تو یہ ہم سب کے لیے بہتر ہی ہوگا۔

وقت گزرتا رہا... شام ہو گئی اور پھر رات کہیل دادا کی تشویش و پریشانی فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تو اب باجوہ صاحب کی طرف سے بھی مایوس ہو گیا تھا کہ وہ کسی قسم کا تعاون ہم سے کریں گے، خود مجھے بھی حیرت تھی کہ آخر ابھی تک باجوہ صاحب نے مجھ سے ملاقات کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ ایک ڈر بھی تھا دل میں کہ کہیں ریٹائرڈ کے حکام ہمیں پولیس کے حوالے نہ کر دیں۔ اس طرح معاملہ خطرناک اور سنگین ہونے تک بڑھ سکتا ہے۔ مجھے ہار بار اول

داخل ہیں تو وہ انہیں ختم کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں پہنچ گیا۔ مگر میری اتفاقی اور بردت مداخلت نے جنگی خان کا منصوبہ ناکام بنا دیا اور کہیل دادا کی جان بھی بچ گئی۔

بہر حال کہیل دادا کی قربانی یہ ساری صراحت سننے کے بعد میں نے اس سے ازراہ تشویش کہا۔

”اگر بیگم صاحبہ جو ہداری ممتاز خان کے قبضے میں ہے تو خاطر جمع رکھو... وہ کبھی بھی ایک بہن کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے گا۔“ میری بات سن کر کہیل دادا کے چہرے پہ ایک تلخ مسکراہٹ ابھری۔

”تم کس پھول میں ہوشہری؟ اپنے جواں سال بیٹے فرخ کی موت یا تل پر ممتاز خان کی لٹاؤ کے بغیر بیگم صاحبہ کی جان کا دشمن بن چکا ہے۔ روئے زمین پر اس وقت بیگم صاحبہ کا اس سے بڑا دشمن اور کوئی نہیں... اس نے بیگم صاحبہ کو کس مقصد کے لیے اغوا کیا ہوگا... یہ بھی تم نہیں جانتے... اس لیے کہ تم بیگم صاحبہ کے ماضی کے حوالے سے اس خوف ناک داستان الم سے واقف ہی نہیں ہو۔ حیرت ہے... تمہارے دوست اول خیر نے بھی تمہیں اب تک یہ نہیں بتایا کہ بیگم صاحبہ اور جو ہداری ممتاز خان کے درمیان کسے بہن بھائی والا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔“

اس انکشاف پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ اگرچہ مجھے اول خیر سے ہی صرف اس قدر معلوم ہو سکا تھا مگر اس سے زیادہ پوچھنے کا اب تک موقع مل سکا نہ اسے مجھے ان سے متعلق کوئی صراحت بتانے کا۔ اول خیر کو شاید اس لیے ہی تنظیم میں نمبر دو کی حیثیت حاصل تھی۔ کسی کہیل دادا کی طرح وہ بھی بیگم صاحبہ کے ماضی سے واقف تھا۔

کہیل دادا پر سوچ انداز میں اپنے ہونٹ جھینچے بیرک کے اندر ٹھٹھکا رہا تھا کہ بیرک کی حالت عام تھا نوں کے لاک اب جیسی نہ تھی۔ ان سے نسبتاً بہتر ہی تھی، ایک دیوار کے ساتھ لمبی سی سنگی بیچ بنی ہوئی تھی۔ میں اس پر اسی بیٹھا ہوا تھا۔ کہیل دادا کو بیگم صاحبہ کی طرف سے بے چینی کھائے جا رہی تھی۔ اور خود مجھے بھی بیگم صاحبہ اور بالخصوص اول خیر کی جانب تکفیر آمیز تشویش لاحق تھی۔ کہیل دادا مجھے بار بار کوسے جا رہا تھا۔ وہ اس کا ڈتے دار مجھے ہی ٹھہرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس کی بڑبڑ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو میں نے بھی اسے سناوی۔

”ہم دیسے بھی پولیس و فیرہ کی گرفت میں آسکتے تھے۔ مگر شکر کرو کہ ریٹائرڈ نے ہمیں اپنی کسٹڈی میں لے

خیر اور بیگم صاحبہ کی طرف سے بھی تشویش ستا رہی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ اول خیر کی طرف سے تو کسی حد تک یہ تسلی تھی کہ وہ بہر حال اس وقت تک جب وہ بیگم صاحبہ وغیرہ کی مدد کو نکلتا تھا، دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ مگر اب کہاں اور کس حال میں تھا؟ اس کا ہمیں کوئی علم نہ تھا۔

رات کا کھانا لانے والے سے میں نے میجر صاحب کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے یہی بتایا کہ وہ آج دوپہر سے ہی کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے اور پھر کہیں چلے گئے تھے۔

میں نے اور کنبیل دادا نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔۔۔ بھوک ہی ہماری اڑی ہوئی تھی۔ ایک گھنٹا مزید بیت گیا تو ایک سنتری نے آکر کہا۔ "تم دونوں میں سے شہزاد احمد کون ہے؟"

"میں... میں نے فوراً دھڑکتے دل سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"چلو، میجر صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ میجر بیک کا سلاح دار بغلی دروازہ کھولا۔ میں نے ایک نظر کنبیل دادا کے چہرے پر ڈالی اور سنتری کے ساتھ ہولیا۔

ایک طویل اور دوسری نسبتاً چھوٹی راہداری سے گزر کر ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ خاصا کشادہ کمرہ تھا۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے بڑی سی کرسی پر میجر ریاض باجہ براجمان تھے۔ ان کے جسم پر مخصوص وردی تھی۔ سینے پر ڈیپارٹمنٹل ٹیگ کے علاوہ... شولڈرز پر رنجزز کے مونوگرام چسپاں تھے۔ ان کے چہرے پر کبھی تازگی تھی۔ مجھے انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور سنتری کو واپس جانے کا اشارہ کر دیا۔

اب کمرے میں صرف میں اور میجر صاحب رہ گئے تھے۔ وہ ہولے سے کھنکھار کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"... شہزی اتم نہیں جانتے کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے تمہاری وجہ سے کس قدر شدید دہاؤ کی زد میں رہا ہوں اور تمہارے لیے ہی اب ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔" یہاں تک کہ وہ خاموش ہوئے۔ میری دھڑکتی نظریں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"پولیس مجھ پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے۔" جو وہ کہہ رہے تھے اس کا مجھے خود بھی پہلے سے اندیشہ تھا۔ بہر حال میں خاموشی سے ان کی بات

سن رہا۔

"مگر میں جانتا ہوں اس وقت تمہارا پولیس کے قبضے میں جانا شاید انصاف کے مفاد میں نہ ہو۔" وہ محتاط انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ مفاد کے سلسلے میں انہوں نے میرا نام لینے کے بجائے "انصاف" کہا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود بھی قانون کے رکھوالوں میں سے تھے۔ "مجھے تمہارا پہلے شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تم نے اپنی جان پر کھیل کر میرے بچے کی زندگی بچائی۔ مگر شہزی! قانون بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کبھی ہم بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ تاہم انسانی اہم روی کے حوالے سے تمہارے اس قابل لحاظ عمل کو آن وی ریکارڈ لانے کی کوشش کروں گا۔ مگر پولیس انتظامیہ اس واقعے کو کوئی اور رنگ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ایسا تم نے اپنے فرار اور اپنے مفاد کی خاطر کیا... اور اس سچویشن میں بظاہر ایسا ہی نظر آ رہا تھا مگر میں تمہیں مبارک باد پیش کروں گا کہ ملک کا نوے فیصد میڈیا اس وقت تمہارے حق میں ہے۔ اس وقت ملک کے ہر نجی و سرکاری ٹی وی چینلز سے اسپتال سے حاصل کردہ سی ٹی ویچ نشر ہو رہی ہیں۔ وہ والی بھی جس کے سامنے تم نے ایک جوش بھری تقریر کی تھی... جس کے تحت اعلیٰ حکام سمیت صوبائی وزیر اعلیٰ نے بھی اس بات کا سختی سے نوٹس لیا اور خصوصی تحقیقاتی کمیشن بھی قائم کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے۔ اپوزیشن جماعتیں بھی تمہارے حق میں راہ ہموار کر رہی ہیں۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے اس بات پر سکون کی سانس لی تھی کہ وہ خصوصی فوج میڈیا کے ہاتھ لگ چکی تھی... اور میں سمجھتا تھا کہ جنگی خان اور ممتاز خان سے میں نے یہ بہترین انتقام لیا ہے۔

"میجر صاحب! میں بھی آپ کا یہ دل سے شکریہ گزار ہوں... مگر... جنگی خان کو بھی پولیس کی تحویل میں نہیں جانے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ آپ بھی اس سے گفتگو کر کے آسہ کی لاش کے بارے میں اگلا سکتے ہیں۔ جو ثابت کی آخری سیل ثابت ہو سکتی ہے۔"

"یقیناً ہم ایسا ہی کر رہے ہیں۔" میجر باجہ... نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس لیے جنگی خان کو الگ رکھا گیا ہے۔ اس سے اور بھی کئی حوالوں سے گفتگو کی جا رہی ہے۔ مگر... وہ اتنا کہہ کر کے پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، میں بے چین سا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر اپنی کرسی کے عقب میں جا کھڑے ہوئے اور ہونٹ جھینپنے پر سوچ انداز میں چند ثانیے خاموش رہے، اس کے بعد بولے۔

یو پارک کے ایک اسکول میں استانی نے ایک شام گردے کل عام اور جنگ کا فرق بیان کرنے کے لیے کہا۔

لڑکے نے بلا تردد کہا۔ ”جب کوئی ریڈ انڈین قبیلہ دو چار سفید فاموں کو پکڑ کر مار دیتا ہے تو اسے کل عام کہتے ہیں اور اگر دو چار سفید فام کل کر پورے ریڈ انڈین قبیلے کو مار ڈالتے ہیں تو اسے ہم جنگ کہتے ہیں۔“

کراچی سے عبداللہ کا انکشاف

استفسار پر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہو گئے اور اچانک بڑے ڈرامائی انداز میں بولے۔

”... میں تمہیں کبھی بھی پولیس انتظامیہ کے حوالے نہیں کروں گا۔“ ان کا جواب... ان کی بات میرے لیے قسطی غبر متوقع تھی۔ جس نے مجھے خوش کن انداز سے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یکنخت میرا دل بے پایاں طمانیت اور مسرت سے دھڑکنے لگا۔ گویا ان کا میرے بارے میں اپنا یہ ذاتی اور آخری فیصلہ تھا... تاہم میں پھر بھی ان کی وضاحت چاہنے کی غرض سے کچھ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولا۔

”میجر صاحب! ان ساری باتوں اور سیاسی دباؤ کے باوجود آپ کا میرے بارے میں یہ ذاتی فیصلہ میرے نزدیک قابلِ تحسین ہے مگر... سر! صرف آپ کے اپنے ذاتی فیصلے سے بھلا کیا ہو سکتا ہے؟“

”یہ میرا اپنا ذاتی فیصلہ نہیں ہے شہزی!“ میجر ریاض ہاجوہ نے عجیب سے لہجے میں اور ایک انکشاف کیا۔

”ہر معاملے میں سیاسی دباؤ کی مداخلت اب ملک کو جیزی سے کھوکھلا کر کے کرپشن کی جانب دھکیل رہی ہے... اور ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے یہ ابن الوقت قسم کے طالع آزمائے... ملک و قوم کے مستقبل سے زیادہ اپنے اقتدار اور اپنی خرمستبیاں کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ البتہ تو یہ ہے کہ یہ عاقبت نااندیش یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ... یہ ملک ہے تو یہ لوگ بھی ہیں، ان کا جہاد و حشم بھی وطن عزیز کے باعث قائم ہے۔ خدا نخواستہ یہ نہ رہا تو پھر یہ کہاں جائیں گے؟“

”باہر!“ میں زہر خند مسکراہٹ سے بولا اور میجر ریاض ہاجوہ قدرے چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔

”جی ہاں سر!“ میں نے کہا۔ ”ایسے حالات اور مواقع پر یہ لوگ یہی تو کرتے ہیں اور آئندہ بھی کریں

مگر... شاید... یہ سب کچھ میں زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکوں۔“ ان کے لہجے کی شکست خوردگی اور افسردگی نے مجھے پریشان کر دیا۔ بے اختیار میرے منہ سے سوالیہ لکلا۔

”کیا مطلب ہے میجر صاحب؟“

وہ بولے۔ ”... سیاسی مصلحت ہمیں بے بس بنا ڈالتی ہے۔ ہمارے سسٹم کی خرابی کی بڑی وجہ یہی نا پسور ہے۔ ہمیں اور پرے احکامات موصول ہوئے ہیں کہ یہ معاملہ سول انتظامیہ یعنی پولیس کے سپرد کر دیا جائے... اور تم سمیت جنگی خان کو بھی پولیس کے حوالے کرنا ہوگا۔“

”یہ نا انصافی اور زیادتی ہے سر...!“ میں یکدم نمبرک کر بولا۔ ان کی ابتدا سے خوش امید کی گفتگو اب ایک دم مایوسی کی جانب گامزن ہوتے دیکھ کر میں چیخ اٹھا تھا۔ وہ مجھ سے اذرا روشنی بولے۔

”تم نگرانہ کر دو... اب معاملہ اور ہے۔ باہر کی دنیا تمہارے ساتھ ہے۔ کالی وردی والی پولیس اب تمہیں کالے اندھیروں میں نہیں رکھ سکیں گے... مجھ پر بھروسہ رکھو... میرا وعدہ ہے۔ جب تک تحقیقاتی کمیشن قائم نہیں ہو جاتا میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا، دیسے بھی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ہر جگہ ڈپٹی روشن خان جیسے لوگ نہیں ہوتے، فرض شناس پولیس آفیسر بھی ہوتے ہیں۔“

میں خاموش رہا۔ مگر اندر سے پریشان اور بے چین ہو گیا تھا... اگرچہ ان کی بات بھی صحیح تھی کہ اب مجھے کالے اندھیروں میں مار دے جانے کا خدشہ کم ہو گیا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ آنکھیں بند کر لی جائیں۔ جانے کیوں... پچھتاوے کا بھی احساس ہونے لگا کہ مجھے قانون کی گرفت میں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ دیکھا جاتا کہ... میری ممتاز خان جیسے بااثر آدمی کے سامنے... کیا حیثیت ہے۔ باہر کی دنیا میرے حق میں کتنی ہی چلتی رہے، کب کس کے سر پر جوں رہتی ہے۔ یہ بعد کی بات تھی، ایسے میں مجھے ایڈووکیٹ خانم شاہ کا خیال آیا۔ کاش... خدا اسے عقل دے کہ وہ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اپنی انتقامی روش سے باز آجائے اور مصلحت اور دانش مندی سے کام لینے کی کوشش کرے۔

بہر حال میں نے ایک حکی حکی سی گہری سانس خارج کرتے ہوئے میجر ہاجوہ... سے پوچھا۔ ”تو پھر اب میرے سلسلے میں آپ نے آخری فیصلہ کیا کیا ہے؟“ میرے

”شہزی! کیا میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟“ میجر باجوہ اچانک میری طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوئے۔

میں جواباً عطا انداز میں اور ہلکی سی مسکراہٹ سے بولا۔ ”سرا لگتا ہے آپ مجھے کسی بڑے اعزاز سے نوازا جاتے ہیں۔ پتا نہیں میں آپ کے اعتماد پر پورا اترتا بھی ہوں کہ نہیں۔“ میجر باجوہ مجھے بہ غور گہری اور پُرسوج نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بولے۔

”شہزی! تم شاید نہیں جانتے کہ میں تم میں ابتدا سے ہی خصوصی دلچسپی لیے ہوئے ہوں اور جب سیشن کورٹ کے جج نے مجھے تمہارے سلسلے میں تفتیشی افسر مقرر کیا تھا تب سے اب تک میں تمہاری ایک ایک ہسٹری پر نظر رکھے ہوئے ہوں... میں نے اندازہ لگایا کہ تم نہ صرف ایک پُر عزم دلیر انسان ہو بلکہ ایک دردمند جذباتی دل و دماغ کے حامل بھی ہو اور اس سے زیادہ حقیقت پسند۔ تمہارے اندر نہ صرف سماجی ناسوروں کے خلاف نیخ کنی کرنے کا جذبہ کدوئیں لیتا رہتا ہے بلکہ وطن عزیز کے لیے یہ تمہارا پُر عزم دل دھڑکتا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے، چائے کی چند چسکیاں لیں پھر قدرے دہیمی آواز میں بولے۔

”ملک تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ یہ تبدیلی منفی بھی ہو سکتی ہے اور مثبت رخ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ یہ سب ملک کی سیاسی بساط پر بار بار ایک ہی طرح کے مہروں کی آمد کی وجہ سے ہے مگر... اس میں مثبت تبدیلی کا کوئی رخ دور تک نظر آتا دکھائی نہیں دے رہا ہے... اور اس وجہ سے ملک کے کچھ خفیہ اداروں کی ملکی مفاد کے پیش نظر ایک انفرادی سوچ نے بہت خاموشی سے جنم لیا ہے... جسے باضابطہ طور پر POWER کا نام دیا گیا ہے یوں سمجھو یہ ”پادز“ ایک روبوٹ ہے... ایسا روبوٹ جس کے اندر ایک حتیٰ نوعیت کی پروگرامنگ فیڈ کردی گئی ہے... جس کا فقط ایک ہی مقصد ہے... یعنی وطن عزیز کی سلامتی اور اس کی بقا۔ کسی نظریے کا پرچار کیے بغیر یہ بہت خفیہ طریقے سے اپنی تیسری آنکھ کے ذریعے ایسے عوامل پر نظر رکھے ہوئے ہے جو ملکی سلامتی کے مفادات سے متصادم ہوں۔ پادز کی اس تیسری آنکھ نے جان لیا ہے کہ ملک کی سیاسی قوتوں نے اب تک ملک اور عوام کے مفادات کی خاطر کچھ نہیں کیا بلکہ ان باہمی رساکشی والی روش نے ملک کو تاریکی، تخریب کاری اور بے سکونی کی جانب ہی دھکیلا ہے۔“ وہ ذرا سانس لینے کو رکے۔ میری نظریں ان کے چہرے پر جمی

گئے۔ اس لیے تو ان لوگوں کے پاس پہلے ہی سے دو، دو ملکوں کی نیشنلٹی ہوتی ہے۔ اپنا روپا باہر کے ممالک میں صرف کیا ہوتا ہے۔ جس طرح گندی کھسی گندی میں ہمیشہ اپنا ایک پر بچا کر بیٹھتی ہے، اس طرح یہ لوگ بھی سیاست کے گندے جوہر پر اپنی ایک ٹانگ بچا کر رکھتے ہیں۔ یہ تو ہمارے ملک میں صرف سیاست سیاست کھیلنے ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ جواری ہیں۔ انہیں عوام سے عوام کی بنیادی سہولتوں ضرورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ فضول ایشوز میں کئی کئی مہینے ضائع کر ڈالتے ہیں۔ بسا اوقات سالوں کے سال بھی۔ مگر عوامی مفادات کے ایک بھی ایشو کو یہ ایک دن میں اعلان کر کے اور پھر اسے انتظار کا لیبل لگا کر دبا دیتے ہیں۔“

اپنی تھوڑی بہت اخباری حد تک سیاسی سوچ بوجھ کے مطابق میں نے غمی سے کہا تو میجر باجوہ..... بھی غمی سے مسکرائے۔

”ہاں! تم صحیح کہتے ہو۔ اب سیاست میں نیا رواج پروان چڑھ رہا ہے۔ جسے عام سیاسی سوچ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔“

گفتگو کہاں سے کہاں چلی گئی تھی مگر میری غیر معمولی اور فطری ذہنی فراست مجھے باور کروا رہی تھی کہ ضرور میجر ریاض باجوہ مجھ سے کچھ نہ کچھ شیئر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کوئی خفیہ اہم نوعیت کا راز میرے سامنے آشکارا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہے... پھر تیل دے کر کسی کو اندر بلا یا اور اسے چائے لانے کا کہا۔

چائے آنے تک انہی نوعیت کی گفتگو ہمارے درمیان ہوتی رہی۔ چوہدری ممتاز خان کے ساتھ جاری اس جنگ نے مجھے اب تک ہر طرح کی سوچ بوجھ عطا کر دی تھی۔ کچھ میری اپنی فطری زود فہمی کا بھی دخل تھا۔ تھوڑے نتیجے سے بہت کچھ اخذ کر لیا کرتا تھا۔ اس میں میری طبیعت اور مزاج میں شامل وجدانی ادراک کی کیفیات بھی گویا میری فطرت کا حصہ تھیں۔ جس کا مجھے کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ چوہدری ممتاز خان کے ساتھ جاری یہ جنگ ابھی کوئی اہم موڑ یا رخ اختیار کرنے والی تھی۔ یا پھر ادھر ہی اس کا ”دی اینڈ“ ہونے والا تھا۔

چائے آگئی۔ سادہ سے دو مک تھے۔ جو ایک سنتری چھوٹی سی ٹرے میں اٹھائے اندر داخل ہوا تھا اور خاموشی سے ایک ایک مک ہمارے سامنے رکھ کر لوٹ گیا تھا۔

آوارہ گرو

ہے، وغیرہ۔ بس اس کے ٹاسک اس کے کاز کو آ کے بڑھانا ہے، کامیابی سے خاموشی سے۔ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔“

میں خاموش تھا۔ کمرے میں دھڑکتی خاموشی طاری تھی۔ ماحول اور وقت تک رکا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔ میجر صاحب کی گفتگو اور لہجے میں مجھے ایک عجیب طرح کا ٹرائس محسوس ہو رہا تھا جو دیر سے دیر سے میرے دل و دماغ کو کسی سحر میں جکڑ رہا تھا۔

وہ بولے۔ ”شہزی! جب میری میجر کے عہد سے پر ترقی ہوئی اور مجھے ریجنرل فورس کا چارج سونپا گیا تو سب سے پہلا مشن جیسے اینٹی ڈکیت اسٹیمپنگ ٹاسک فورس کے انچارج کی حیثیت سے سونپا گیا اور میں نے جنوبی پنجاب کے ایک بڑے ڈاکوؤں کے گروہ کا بالکل قلع قمع کر کے رکھ دیا اور اس کے سرغنہ بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کو گرفتار کر لیا۔ وہ اور پھر ”پاور“ کے ایما پر میں نے اس کے ساتھ ایک خفیہ ڈیلنگ کر کے اسے ایک خاص مقصد کے لیے چھوڑ بھی دیا اور اس کا یہ فرار بالکل ڈرامائی اور خفیہ رکھا کہ مجھ پر بھی کوئی آنچ نہ آسکی۔“

بدر اقبال کے نام پر میں چونکا تھا۔ بلاشبہ یہ نام میرے لیے اجنبی ہی تھا مگر... میں نے اسپتال کے سنسٹی خیر ڈرائے کے دوران میجر ماجوہ... کے منہ سے اس کا تذکرہ سنا تھا جو انہوں نے جنگی خان سے کہا تھا کہ کیا تم بدر اقبال کے آدمی ہو؟ بہر حال میں خاموشی سے میجر صاحب کی اختتامی گفتگو سن رہا۔ وہ آگے بتانے لگے۔

”بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کے ساتھ ہمیں خفیہ ڈیلنگ کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی بڑی ٹھوس وجہ تھی۔ بابن ڈکیت نے اپنے سے کئی گنا بڑے اور خطرناک مجرم کو ہمارے سامنے بے نقاب کیا تھا اور اس کا نام تھا وزیر جان۔ وزیر جان بظاہر ایک مشہور صنعت کار ہے۔ بابن ڈکیت نے اس کی دو کنال پر پھیلی ہوئی عایدان کوٹھی میں نقب لگائی تھی۔ اس جیسے ڈاکو کو صرف مال و دولت کی حرص ہوئی ہے جو ڈکیتی کے دوران اس کے ہاتھ بھی لگی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے پرائز بانڈز اور شیراز وغیرہ پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ وزیر جان کی خواب گاہ کے ایک خفیہ لاگر میں رکھی ہوئی فائل پر بھی اس کی نظر پڑی۔ بابن ڈکیت کچھ زیادہ پڑھا لکھا انسان تو نہیں تھا مگر فائل کی مخصوص کوڈ ڈھپ اور اس پر چسپاں ایک عجیب سے مخصوص خولوگرام نے بابن ڈکیت کے دل میں ایک تجسس سا پیدا کیا۔ وہ فائل ”باسن“

ہوئی تھیں، وہ پھر بولے۔

”پاور کا ایک اپنا مخصوص نظریہ ہے جو۔ لوام کے عمومی بنیادی نظریے سے ہی میل کھاتا ہے۔ یعنی اسن، سکون... آہستگی اور خوشحالی۔ پاور اس کاز پر کام کر رہی ہے۔ کیونکہ پاور سمیت مکمل عوام کو اس ملک کی اس دھرتی کی ضرورت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ دھرتی ہے تو ہم ہیں۔ ورنہ ہم کدھر جائیں گے۔ پاور بہت خفیہ طریقے سے اپنے ممبر اپنی تیسری آنکھ سے چنتی ہے اور جیسے بھی انہوں نے ہی چنا ہے اور یہ ایک ”سائیکل“ ہے کیونکہ اب مجھے ایک ممبر چننا ہے اور میرا چناؤ تم ہو۔“

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ بظاہر میں گوگو کی کیفیات سے گزر رہا تھا مگر اندر میرے دل و دماغ میں ایک انجیل کی سی کیفیات طاری تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری زندگی ایک نیارخ ایک نیا موڈ اختیار کر رہی تھی۔ میں لیکھت جیسے اپنے ماضی سے بے خبر اور کٹ سا گیا اور میرے سامنے وہی کچھ تھا جو میں سن رہا تھا اور میجر صاحب کی باتوں کے تناظر میں ایک تصوراتی ماحول دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں میری باتیں عجیب اور اچھوتی لگ رہی ہوں گی مگر حقیقت یہی ہے کہ ہر بات کو ہے تغیر کا سامنا۔ یہ انسان کی فطرت ہے وہ زیادہ عرصہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ مثبت راستہ اختیار کرتا ہے یا منفی روش پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ خیر و بد ہمیں سے جنم لیتے ہیں۔ نئی نئی طاقتیں ادھر ہی سے جنم لیتی ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم بھی اس کا نتیجہ تھی۔ اندر ہی اندر پنپنے والی ایک خفیہ ”پاور“ جو منفی سوچ کی حامل تھی۔ اس نے دنیا کو دو بڑی عالمی جنگوں کی طرف دھکیلا... اور اب پھر وہی منفی نظریہ خود رو پودے کی طرح جنم لے رہا ہے... یعنی انسان زیادہ عرصہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ ایک ایسی ہی خفیہ منفی پاور دنیا کو ایک ”تیسری عالمی جنگ“ کی طرف دھکیل رہی ہے۔“ وہ ذرا رک کر مجھ سے مستفسر ہوئے۔

”شہزی! تم یہ ساری باتیں سمجھ رہے ہونا؟“

”بہت اچھی طرح سے سنا“ میں نے فوراً جواب دیا۔ مجھے اپنی آواز میں جوش کا ارتعاش سا محسوس ہونے لگا۔

”میں جس پاور کی بات کر رہا ہوں، وہ ہمارے وطن اور اس کے عظیم تر سلامتی مفادات کے لیے کام کر رہی ہے۔ بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کے ممبران یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ کہاں بیٹھے ہیں؟ ان کی لیڈر شپ کس کے ہاتھ میں

ابتدا میں اس نے کوئی دلچسپی یا تشویش ظاہر نہ کی ہم بھی انتظار کا کھیل کھیلتے رہے۔ ادھر بیرک میں قیدی کی حیثیت سے موجود بابرین ڈکیت کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ اس نے نادانستگی میں... کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ تب تک ہم نے بابرین ڈکیت کی ہسٹری کھنگالنا شروع کر دی اور صرف اس قدر ہی معلوم ہو سکا کہ وہ ملتان کے نواح میں واقع ”نئے پنڈ“ کے جاگیردار چوہدری الف خان کا نمک خوار رہ چکا تھا... پھر وہ اس کے لاڈلے بیٹے ممتاز خان کا خونی ہرکارہ بن گیا، مگر پھر جانے کیا ہوا کہ وہ اس سے بھی برگشتہ ہو گیا اور ڈاکوؤں کے ٹولے میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے گروہ کی بھی داغ بیل ڈال لی۔ ”باجوہ صاحب اتنا بتا کر تھوڑا خاموش ہوئے۔ میں چوہدری الف خان اور ممتاز خان کے ذکر پر تھوڑا چولکا۔

پھر وہ مزید گویا ہوئے، میں دھڑکتی سماعتوں سے ان کی گفتگو بہ غور سن رہا تھا۔ ”ہم نے وزیر جان کے خلاف خفیہ جال بھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ خاموشی سے انتظار کا کھیل کھیلنا ہمارا ایک اہم ترین خفیہ مقصد تھا۔ ہم اسے اس شش و پنج میں مبتلا کیے رکھنا چاہتے تھے کہ آیا اس کے چوری شدہ مال و دولت کی برآمدگی کے بعد کیا وہ فائل بھی ہمارے ہاتھ لگی تھی یا اسے بعد میں بابرین ڈکیت نے غیر اہم سمجھ کر ضائع کر دیا تھا... لہذا جب وزیر جان نے دیکھا کہ اب تک اس کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی تھی تو اس نے کچھ دنوں بعد خود ہی ہم سے رابطہ کیا اور اپنے چند آدمیوں کے ساتھ میرے پاس آن دھمکا۔ ہم جانتے تھے اگر ہم فائل کے سلسلے میں اسے گرفت میں لیتے یا پوچھنا چھوڑنے کی کوشش کرتے تو وہ نہ صرف صاف مکر جاتا بلکہ محتاط بھی ہو جاتا جبکہ ہم ابھی اسے اندھیرے میں رکھ کر اس کی مکمل ”رکھی“ کرنا چاہتے تھے۔ ہم اس کے سامنے یوں بن گئے جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔ وہ بھی بظاہر ہمارے سامنے پُر اعتماد نظر آنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے آدمی حساب و اعداد و شمار میں مصروف ہو گئے۔ ہماری عقابانی نظریں وزیر جان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد جب وہ مطمئن ہو کر لوٹنے لگا تو ہم نے بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر کے اسے رخصت کر دیا... بعد میں ایک خفیہ منصوبے کے تحت ہم نے پہلے ہی سے یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ بابرین ڈکیت کی گرفتاری کے دوران اس کے چند ساتھی، کچھ چوری شدہ مال و اسباب اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے یہی سبب تھا کہ ہم نے وزیر جان کو

نہایتی۔ وہ اسے ہیروں کا ہا کس سمجھا۔ کیونکہ ایک تو وہ پاکس کی شکل میں تھی دوسرے اس کے کھلنے کا کوئی سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم اسے ہلانے جلانے سے اندر کوئی چیز کھڑکتی ہی اسے محسوس ہوئی تھی۔ بابرین ڈکیت نے اسے بھی تھیلے میں ڈال لیا تھا۔

”ڈکیتی کی یہ کامیاب واردات کرنے کے بعد وہ اپنی خفیہ کمین گاہ یعنی جنگل ڈیرے پر پہنچا تو اس عجیب فائل کے بارے میں اس کا تجسس جاگا اور اسے کسی طرح کھول ہی دیا۔ مگر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ اس کے اندر سے ہیرے جواہرات کے برآمد ہونے کی توقع کیے بیٹھا تھا مگر اندر کا غدوؤں کے پلندے کے سوا کچھ نہ برآمد ہوا۔

”اس ڈکیتی کی خبر ہمیں موصول ہوئی تو ہم اپنے تربیت یافتہ جاسوس بوگیر کتوں کے ذریعے بابرین ڈکیت کا سراغ لگاتے ہوئے بالآخر اس کی خفیہ کمین گاہ جانچنے اور اس کے جنگل ڈیرے پر زبردست ریڈ کیا جو اس کے خونی گروہ کے خاتمے کے لیے بھی تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا۔

”اس کے گروہ کے کئی ساتھی مقابلے میں مارے گئے، کچھ گرفتار ہوئے ان میں بابرین ڈکیت بھی تھا۔ لوٹا ہوا مال و اسباب بھی ہاتھ آ گیا اور وہ فائل بھی۔ یہ فائل میرے لیے اہم ثابت ہوئی۔ فائل کا تفصیلی مطالعہ اور جائزہ لینے کے بعد ہی مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ بلاشبہ بابرین ڈکیت نے نادانستگی میں خود سے کئی گنا بڑے اور خطرناک و سنگین مجرم کے گھر پر نقب لگائی تھی۔ یادروالوں کے علم میں یہ بات آئی تو فیصلہ کیا گیا کہ وزیر جان کو ابھی گرفت میں لینے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا جبکہ دور رس نتائج اور وسیع تر مفادات کے حصول کے لیے اسے اندھیرے میں رکھ کر پس پردہ اس کی ڈوریاں ہلانے والوں کو بے نقاب کرنا زیادہ اہم تھا کیونکہ وزیر جان کی اہمیت صرف ایک کٹھ پتلی کی تھی اس کے لیے ہم نے ایک چال چلی اور کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ ہم انتظار کا کھیل کھیلتے رہے۔ وزیر جان سے صرف اس مقصد کے لیے رابطہ کیا کہ وہ مال خانے سے آکر برآمد کیا ہوا مال مسروقہ لے جائے۔ ابتدا میں تو اس نے حسب توقع کوئی دلچسپی نہ دکھائی، کیونکہ وہ یقیناً شدید شش و پنج کا شکار ہوگا۔ کیونکہ اسے اپنے چوری شدہ مال و دولت سے زیادہ اس خفیہ اور اہم نوعیت کی پاکس فائل کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش لاحق تھی مگر اس کے لیے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن... دانی صورت حال تھی۔ اگر وہ مذکورہ فائل کی ملکیت جتانے کی کوشش کرتا تو پھنستا تھا، نہ کرتا تو بھی اس کے لیے پریشانی کا سبب تھا۔

شمارہ دسمبر 2014ء کی جملگیاں

سرگزشت

ماہنامہ

مرد صالح

ایک بہت بڑی شخصیت کا سبق آموز زندگی نامہ

سونے کی سڑک

دہشت پسندوں نے گھنے جنگل میں خون کا دریا بہایا

دربائے نبیل

بزرگ ترین اور پراسراریت بھرے دریا کا تذکرہ

لی مان

ایک خونی ریس کی روداد جسے دیکھنے والے موت کی گود میں سو گئے

بہرہ پیا

ہنسان میں قتل ظالم بھی ہو سکتا ہے ٹیکہ لپک چمکیا

الکاحیہ

معرکہ الارا، بہورنگ طویل سرگزشت ”سراب“ فلمی دنیا کے دیکھ ان دیکھے قصے ”الف لیلة“ ایک لہجہ ہارڈ ہوائی کمپنی کے ملازم کی خودنوشت ”الوداع“

اور

ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ سچے واقعات انوکھے قصے، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر پرچہ مختص کرالیں

بھی اس کا چوری شدہ مکمل سامان اس کے حوالے دانستہ نہیں کیا تھا... اور اس پر یہی باور کیا تھا کہ باہن ڈکیت کے چند فرار ہونے والے ساتھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مقصد وزیر جان پر یہی باور کرانا تھا کہ وہ سمجھے وہ فائل بھی یقیناً باہن ڈکیت کے فرار ہونے والے باقی ماندہ ساتھیوں میں سے کسی ایک کے پاس ہوگی۔

”اس کے بعد ہم نے باہن ڈکیت کو سول پولیس انتظامیہ کے سپرد کر دیا تھا... مگر اس کی فیل ریکی کرتے رہے۔ ہماری سو فیصد توقعات کے مطابق کچھ دنوں میں ہی باہن ڈکیت کو ضمانت پر رہا کر لیا گیا اور رہا کرانے والا تھا، وہی صنعت کار وزیر جان... ہم جانتے تھے کہ اس نے یہ کیوں کیا تھا... مگر باہن ڈکیت کے لیے یقیناً یہ بات حیران کن ہی رہی ہوگی کہ اس نے جس گھر میں نقب لگا کی اس کے مالک نے اس کی ضمانت بھی کروائی۔

باہن ڈکیت جیسے خطرناک ڈاکو کو ہزار دانستہ پولیس انتظامیہ کے حوالے کرنے کا مقصد وطن عزیز کے وسیع تر مفادات میں تھا۔ کیونکہ وزیر جان جیسے خطرناک ملک دشمن عناصر اور اس کے پورے ملک میں پہلے نیٹ ورک کو بے نقاب کرنا زیادہ ضروری تھا۔ ہمارا ایک مقصد پورا ہو چکا ہے یعنی ہم وزیر جان پر مکمل طور پر یہ حقیقت باور کرانے میں کامیاب ہو چکے تھے کہ وہ فائل ہمارے ہاتھ سرے سے لگی ہی نہیں۔ اس نے باہن ڈکیت کی ضمانت کرائے کے بعد اپنے ساتھ لے جا کر اس سے باز پرس کی تھی۔ ہم دو خفیہ ایجنٹ اس کی ریکی پر لگا چکے تھے۔ وزیر جان، باہن ڈکیت پر زور ڈال رہا تھا کہ وہ اپنے مفروضات میں کوئی کچا کرے اور ان سے فائل دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے اس کے ساتھ باقاعدہ سودے بازی بھی کر ڈالی تاکہ لالچ میں آکر باہن ڈکیت اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے... مگر موقع ملتے ہی باہن ڈکیت اس کی گرفت سے نکل بھاگا اور معاملہ یہیں دب گیا۔ یوں گویا ہمارا مقصد بھی پورا ہو گیا۔“

میجر ریاض باجوه اپنی بات ختم کر کے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں کے درمیان جاری رہنے والی یہ بہت خفیہ میٹنگ اہم نوعیت ہی کی تھی۔ ”میرا خیال ہے اب مجھے مقصد کی بات پر آنا چاہیے۔“ وہ آخر میں ایک گہری سانس خارج کر کے بولے۔

میں ان کی آخری بات پر یہی مطلب اخذ کر پایا کہ مجھے بھی کہیں ”باور“ کے ایما پر میجر ریاض باجوه دانستہ پولیس کے حوالے کر کے اپنا کوئی اہم خفیہ مقصد تو نہیں حاصل کرنا

میجر صاحب کی اس بات پر میرا دل خوشی سے دھڑکا۔ تاہم ایک الجھن تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”میں آپ کا مشکور ہوں میجر صاحب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اتنی اہم نوعیت کی گفتگو اور ”پادر“ وغیرہ جیسے خفیہ راز سے مجھے ہی آگاہ کرنا کیوں ضروری سمجھا؟“ وہ جواباً مسکرا کر بولے۔

”اس لیے کہ پادر والوں کا انتخاب تم جیسے ہی نوجوان ہوتے ہیں۔ ان کی تیسری آنکھ بھی دھوکا نہیں کھاتی، تم خود کو خوش نصیب سمجھو کہ اب تم بھی پادر میں سر دست عمومی نوعیت کی شمولیت اختیار کر چکے ہو۔ نیز یہ ساری باتیں تمہیں بتانے کا اہم مقصد یہ بھی تھا کہ تم اپنے جن دشمنوں سے برسرِ پیکار ہو، وہ ہمارا بھی نازگت ہیں اس لیے تمہارے علم میں یہ سب لانا از بس ضروری تھا کیونکہ آج کل وزیرِ جان تمہارے دشمن دیرینہ ممتاز خان کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر رہا ہے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ وزیرِ جان... ممتاز خان کو بھی اپنی ملک دشمن سرگرمیوں میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ تم نے آج کل ممتاز خان کو بری طرح زج کر رکھا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ وزیرِ جان کا حلیف بننے کے بعد وہ اس کی مدد سے تمہیں شکست سے دوچار کرنے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں، تم مجھ سے کسی بھی لمحے مدد یا راہنمائی کے لیے رابطہ کر سکتے ہو۔“

”آخر وزیرِ جان کس قسم کی ملک دشمن کارروائیوں میں ملوث ہے...؟“ میں نے پوچھا۔

”اس بات کو ابھی رہنے دو۔ کوئی اور بات؟“ وہ میری طرف مستغیرانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”ہمیں جنگی خان بھی چاہیے... اس سے ہمیں کچھ پوچھ سمجھ کرنی ہے۔ وہ ہمارے لیے اہم ہے۔ اگر پولیس انتظامیہ کے حوالے کر دیا گیا تو دوسرے دن وہ ہاہر ہوگا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ طویل میٹنگ نما گفتگو اختتام کو پہنچی تھی۔ میں نے آخر میں باجوه صاحب سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ اگر میرے قین ساتھیوں، ارشد، شوکی اور شکیل کے سلسلے میں بھی کچھ کر سکیں تو ان کی مہربانی ہوگی۔ انہوں نے اس بات کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔

مجھے واپس بیرک میں چھوڑ کر سنتری لوٹ گیا۔ گیبیل دادا ادگہ رہا تھا۔ کھڑکی کی آواز پر چونک کر بیدار ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دیوار گیر سنگی بج سے یکدم اٹھ بیٹھا۔ میں نے اسے ساری بات بتادی۔ البتہ ”پادر“ سے متعلق میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی وزیرِ جان سے

چاہ رہے ہیں؟ اگر ایسا تھا تو یہ میرے لیے سرا سر گھانے کا سودا ہوتا۔ ایک تو میں باہن ذکیت کی طرح کوئی خطرناک مجرم نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ پولیس میری جان کی دشمن بنی ہوئی تھی، میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اگر باجوه صاحب نے مجھ سے ایسی کوئی ڈینگ کرنا چاہی تو میں ان کی اس بات سے شدید اختلاف کا اظہار کر دوں گا۔

باجوه صاحب بولے۔ ”شہزی! تم ایک بہادر اور ہا عزم نوجوان ہی نہیں بلکہ فطرتاً شریف اور باضمیر انسان بھی ہو۔ ایک ایسے انسان جو اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کوئی سودا کرنا پسند نہیں کرتا۔ تمہاری شرافت کے پیچھے ایک دلولہ انگیز جوش و جذبہ کار فرما رہتا ہے۔ جو تمہیں معاشرے کے ناسوردوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے اکساتا ہے۔ مگر شہزی! کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ جب یہی معاشرے کے ناسور جو ملک و قوم کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہوں اور اس کا اغیار کے ساتھ سودا بھی کرنے کے لیے نپرتول رہے ہوں تو تمہاری کیا رائے ہوگی ایسے عناصر کے خلاف؟“

میں نے فوراً جواب دیا۔ ”میجر صاحب! میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ میرے بارے میں اچھے جذبات و خیالات رکھتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ ہر سچے پاکستانی محبِ وطن کی طرح میری رگوں میں بھی حبِ وطن کا جذبہ دوڑ رہا ہے۔... میں سمجھتا ہوں یہ ہر اس انسان کا فطری جذبہ قرار پاتا ہے جس کا خیر ہی اس دھرتی سے اٹھا ہو جو یہاں پنپتا اور پلٹا بڑھا ہو... میجر صاحب!... مجھے بھی اپنے وطن سے محبت ہے اور یہ وہ لاشعوری محبت ہے جو مجھے ہمیشہ ایسی جنگ پر اکساتی رہتی ہے کہ میں سماج کو درندہ صفت عناصر سے پاک کروں جنہوں نے وطن عزیز کے عام لوگوں کی زندگی اپنے اثر و رسوخ اور دولت و طاقت کے گھنٹہ میں اجیرن کر رکھی ہے اور جو اپنے مکروہ مفادات و مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر مجبوروں اور بے کسوں کو ظلم و جبر اور نا انصافی کی جگہ میں پیسنے سے گریز بھی نہیں کرتے۔“

”گڈ...“ میجر باجوه توصیفی لہجے میں بولے۔ ”جیسا کہ میں نے بتایا کہ مجھ پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ تمہیں پولیس انتظامیہ کے حوالے کیا جائے مگر ہم ایسا نہیں چاہتے... اگرچہ ہم مجبور بھی ہیں، اس کا پادر والوں نے ایک آسان حل تجویز کیا ہے۔ جب تم دونوں کو پولیس انتظامیہ کے حوالے کیا جا رہا ہوگا، تو منصوبے کے مطابق پولیس دین پر حملہ کر دیا جائے گا۔ تم دونوں فرار ہو جانا۔“

اوارہ کرد

محض خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں اور جو تیرے ساتھ عنقریب ہونے والا ہے اس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔“
ابھی ہمیں ریجنرز ہیڈ کوارٹر سے نکلے ایک اندازے کے مطابق بہ مشکل پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں سکے کہ اچانک ایک دھماکے کی آواز ابھری۔
”پاور۔“

لیکھت میرے ذہن میں ابھرا۔ یقیناً میری طرح کبیل دادا بھی سمجھ گیا ہوگا۔ ہمارے بچاؤ کے لیے ہمارے ہی خواہ حرکت میں آگئے ہیں۔ اگرچہ اسے تو میں نے ”پاور“ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف جان کاری کی غرض سے اتنا بتایا تھا کہ میجر صاحب کو میں اعتماد میں لے چکا ہوں، وہ ہماری مدد کریں گے۔ تاہم میجر صاحب نے مجھے یہ بھی بتادیا تھا کہ ”پاور“ بے گناہ کشت و خون کے بازار گرم نہیں کرتی جبکہ ہمیں پولیس کے قبضے سے چھڑانے کے لیے ”پاور“ کے خفیہ اور تربیت یافتہ کمانڈو ایجنٹ بغیر پولیس اہلکاروں کا خون بہائے ہمیں ان کے قبضے سے آزاد کرانے والے تھے۔

ایک دھماکے کے محض چند سیکنڈوں بعد دودھماکے ادھر پر تہہ ہوئے۔ ہماری دین کو بھی زبردست جھٹکا لگا۔ وہ رک گئی اور اسی وقت گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری۔ اور یہ بھی مسلسل چند منٹوں تک جاری رہی۔ آتشیں قہقہوں کے دوران مجھے انسانی چیخوں کی بھی آوازیں سنائی دیں۔ ہماری دین کے ڈرائیور سمیت محافظ پولیس والے بھی جگر پاش چیخوں کے ساتھ ڈھیر ہو رہے تھے۔ کیونکہ ڈرائیونگ کیبن کی جالی دار دیوار سے ہم انہیں تڑپتا گرتا اور ان کے جسم سے خون اچھلتا دیکھ رہے تھے۔ میرا ذہن سائیکس سائیکس کرنے لگا اور چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ کیونکہ یہ سب میجر صاحب کے پاور ایجنٹوں کے منافی ہو رہا تھا اور یہاں تو کشت و خون کا بازار گرم کیا جا رہا تھا۔ لیکن ہماری دین کے بند دروازے پر کسی نے برست مارا اور پھر اک جھٹکے سے اسے کھول دیا۔ میری سنسناتی نظروں نے تین چار سیلاب پوشوں کو دیکھا۔ انہوں نے ہم پر نظر ڈالی۔۔۔ پھر جنگلی خان کی طرف دیکھ کر ایک نے اسے مخصوص اشارہ کیا۔ میری نظروں نے جنگلی خان کے چہرے کا جائزہ لیا اور ہل کے بل میرے رگ و پے میں سنسنی کی پھریری دوڑتی چلی گئی۔ وہ میری طرف بڑی استہزائیہ مسکراہٹ سے گھور رہا تھا۔ میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجا چکی تھی۔ معاملہ کچھ اور ہی... محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ نقاب پوش

متعلق کوئی بات بتائی۔ صرف اس قدر بتایا کہ باجودہ صاحب سے میری پرانی شناسائی ہے اور پھر موجودہ حالات سے ان کے بیٹے کو جنگلی خان کی خونی گرفت سے آزاد کرانے پر وہ مجھ سے ہر طرح کے تعاون کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

بہر حال کبیل دادا کے لیے بھی یہ بات مسرت انگیز تھی کہ نہ صرف ہمیں ایک ڈرامے کے تحت آزاد کر دیا جائے گا بلکہ ہمارا شکار جنگلی خان بھی ہمارے حوالے کر دیا جائے گا۔

چنانچہ باقی سب کچھ تیزی سے ہوا تھا۔ پولیس کی تین گاڑیاں جن میں بند دین بھی شامل تھی ہمیں لینے کے لیے ریجنرز کے ہیڈ کوارٹر آن پہنچیں۔ ہم تینوں کو بند دین میں سوار کرایا گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں باندھی گئی تھیں۔ میں نے دیکھا جنگلی خان کے مکروہ چہرے پر حسب توقع طمانیت اور بشارت کے آثار نہ تھے۔ وہ ریجنرز سے پولیس کے ہتھے چڑھنے پر یقیناً خوش تھا۔

یہ کس قدر اچھے اور دکھ کی بات تھی کہ ایک خطرناک خونی مجرم... جسے قانون سے خوف کے بجائے ”تحفظ“ کا احساس ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی پشت پناہی کرنے والے ”ڈان“ اسے قانون کے شکنجے سے بہ آسانی چھڑالیں گے۔ یہ سب غیر جمہوری سیاست گری کے بل بوتے پر ہوتا تھا۔ شاید اسی لیے ”پاور“ جیسی خفیہ طاقت نے جنم لیا تھا جو ہر کوڑہر سے اور لوہے کو لوہے سے کاٹنے کی قائل تھی۔ مجھے میجر ریاض باجودہ کی بات بالکل درست معلوم ہو رہی تھی کہ یہ روش اب ایک ناسور بن کر ہمارے سماج میں کیا بلکہ ملک کی جڑوں میں ذہنیک کی طرح گھس آئی تھی اور دھیرے دھیرے چاٹ رہی تھی۔ لہذا ملکی اور قومی سلامتی کے وسیع تر مفادات اور بقا کے لیے ضروری تھا کہ زہریلی روش کو زہری سے ختم کیا جائے۔“

پولیس کی تینوں گاڑیاں ریجنرز کے ہیڈ کوارٹر سے نکلیں اور طوفانی رفتار سے سڑک پر آکر دوڑنے لگیں۔

میں اور کبیل دادا ایک ساتھ بیٹھے تھے، جبکہ ہمارے سامنے والی سیٹ نمائینج پر جنگلی خان براجمان تھا۔ وہ مجھے کبھی زہریلی نظروں سے گھورنے لگتا تو بھی فاتحانہ نظروں سے، اس کے بدنیت ہونٹوں پر بھی بڑی زہر خند مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ بڑی خارولانے والی تھی تاہم مجھے بھی تسلی تھی اور میں برماتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے اندر ہی اندر اپنا اہال کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خوش ہو لے بیٹا، جو تو سمجھ ہوئے ہے، وہ تیری

اندر آئے اور سب سے پہلے انہوں نے جنگی خان کو اس کی ہتھکڑیوں سے آزاد کیا جبکہ مجھے اور کبیل دادا کو گن پوائنٹ پر لے کر بازو سے دیوے دین سے بچنے لے آئے۔ یہاں مجھے پولیس کی دو گاڑیاں تباہ شدہ دکھائی دیں اور ان کے قریب اور اندر پولیس والے خون میں نہائے مردہ حالت میں نظر آئے۔ کبیل دادا ابھن آمیز نگاہ سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے پوچھ رہا ہوں۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

مجھے اب تک اندازہ ہو چکا تھا کہ بازی الٹ ہو گئی ہے۔۔۔ یا اور سے پہلے دشمنوں کا بھی یہی منصوبہ ہوگا۔۔۔ اور وہ میرا ”کھٹراگ“ بالائی بالائی بنا چاہتے تھے۔ اگر یہ بات حقیقت تھی تو اب میری اور کبیل دادا کی زندگی کی کوئی ضمانت نہ تھی۔

یہ ہمارا دوسرا ہی قصہ پاک کر سکتے تھے۔

ان کے اور بھی نقاب پوش مسلح ساتھی مجھے نظر آئے، ایک کار اور ایک جیپ بھی دکھائی دی جو یقیناً انہی کے زیر استعمال تھی۔ جنگی خان آزاد ہو چکا تھا، جبکہ میں اور کبیل دادا ایک قید سے نکل کر دوسری بدترین قید میں جا چکے تھے۔ ہمیں رائفٹوں کے کندسے مار کے جیپ کی طرف دھکیلا جانے لگا۔۔۔ اور عقبی دروازہ کھول کے اندر دھکیل دیا گیا۔

”یہ سب کیا ہے شہزی؟“ کبیل دادا نے ہولے سے پوچھا۔ اس کا چہرہ ہلکی سا ہورہا تھا۔

”معاملہ الٹ ہو گیا ہے دادا“ میں نے بھی دہمی آواز میں کہا۔ ”جن لوگوں کو آتا تھا، ان سے پہلے دشمن نے شب خون مار دیا۔ ان کا بھی منصوبہ یہی تھا شاید۔“

”مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ میجر صاحب۔۔۔“

”کہا ناں۔۔۔ معاملہ الٹ ہو گیا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی، اور پھر اچانک اسی جیسے میرے تاریک پڑتے دل و دماغ میں خوش آئندہ امید کا ایک جگنو ٹٹھمایا۔۔۔ وقت یہی تھا اور راستہ بھی۔۔۔ شکاری بدل بھی سکتے تھے۔

جیپ ایک جھیلکے سے آگے بڑھ گئی اور اس کے عقب میں کار روانہ ہوئی۔ جنگی خان ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کے عقب والی سیٹ پر تین مسلح افراد جنہوں نے اب اپنے چہروں سے نقاب ہینچ لیے تھے۔ وہ جنگی خان کے ساتھی ہی تھے یعنی جوہری ممتاز خان کے کارندے۔ شاید قانون کی بازی میرے حق میں پلٹتے ہوئے اس نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اس لیے اس نے یہ

چال چلی تھی۔

”جی جوہری صاحب۔۔۔ سب منصوبے کے مطابق ہو گیا تھا۔ دونوں شکاری ہمارے قبضے میں ہیں۔۔۔ جی۔۔۔ اچھا جو حکم۔۔۔ ابھی بات کروا تا ہوں۔“

اچانک میں نے جنگی خان کی آواز سنی۔ وہ یقیناً ممتاز خان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ گھما کر عقبی سیٹ پر بیٹھے آدمی کی طرف سیل فون بڑھایا۔ اس کا اسپیکر دائیں کر دیا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھی نے سیل فون کو ایسے ہی میری طرف بڑھا کر ہاتھ روک لیا۔ وہ میرے چہرے کے قریب تھا۔

چند ثانیوں بعد مجھے ممتاز خان کی کھڑکھڑاتی آواز سنائی دی۔

”ایک بار پھر خوش آمدید۔۔۔ شہزاد احمد خان المعروف شہزی۔ حالات کا یہ پلٹنا تمہیں یقیناً ناگوار مگرا ہوگا۔“ ایک پُر امید اور خوش آئند وقت کے سو فیصد طمانیت بخش قیاس نے مجھے کافی حد تک سنبھال دیا تھا۔ اس لیے میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”ممتاز خان یہ ایک جنگ ہے۔ اس کی بازی اتنی ہلٹی رہتی ہے۔ آج تمہارے حق میں تو کل میرے حق میں۔“

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ری جل گئی۔۔۔ مگر بل نہیں گیا۔ تم کسی خوش بھی میں مت رہنا، شہزی کہ تم نے اسپتال میں جو ڈراما سی سی کمرے کے سامنے رچایا تھا، اس کا پھل اتنی آسانی سے کھا لو گے، کیونکہ ایک ایسا ہی ڈراما تمہارے جواب میں ہم نے بھی رچایا ہے۔ کوئی نہیں جان سکتا کہ ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے قانون کے رکھوالوں کے ساتھ خون ریزی کے دوران چھڑانے والے میرے ساتھی تھے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ تمہارے ساتھیوں نے ہی قتل و غارت گری کا یہ بازار گرم کیا ہے۔“

اس کے زہر میں نہجے ہوئے الفاظ میری سماعتوں کو چھلنی کرنے لگے۔ ایک ظالم اور بے حس انسان نے بے گناہ پولیس اہلکاروں کے خون کی ہولی کھیلی تھی، جس کا مجھے بھی شدید دکھ تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم جیسے بے حس اور درندہ مفت انسان سے ہر قسم کی توقع رکھی جانی چاہیے ممتاز خان! مگر یاد رکھنا۔۔۔ تمہارے یہ اوچھے ہتھکنڈے ایک دن تمہیں ہی لے ڈوبیں گے اور وہ وقت دور نہیں رہا۔“

جواب میں سیل فون کا دائیں اسپیکر اس کے کریہہ قہقہوں سے گونجنے لگا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

اوارہ کرد

جنگی خان کا بے سدھ وجود لڑکھک کر باہر آ گیا۔
 ”یہ سب بے ہوش ہیں۔ ہمیں اٹھنا ہوگا اس جگہ سے...“
 میں نے کبیل دادا سے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
 دشمنوں کی دوسری گاڑی یعنی کارنائر برسٹ ہونے
 کے باعث بے قابو ہو کر پلر کے ایک خلا میں جا گھسی تھی۔
 سڑک پر پہچی آہنی میخوں نے دونوں گاڑیوں کے نائر
 برسٹ کر ڈالے تھے۔

میں نے جنگی خان کو کاندھے پر ڈال لیا۔ جبکہ اس
 دوران کبیل دادا نے ایک بے ہوش دشمن کی جیبوں کی تلاشی
 لے کر سیل فون اچک لیا تھا۔ میں نے تیزی سے پہلے
 گرد پیش کا جائزہ لیا... روڈ پر چلنے والی ٹریفک کی آؤک
 جاؤک کچھ زیادہ نہ تھی۔ کچھ راہ گیر بھی تھے۔ چند لوگ اس
 طرف متوجہ بھی ہوئے تھے کہ اس طرف کچھ ہوا ہے۔ اس
 لیے میں اور کبیل دادا فوراً وہاں سے ہٹ گئے اور نسبتاً محفوظ
 جگہ پر آ گئے۔ یہ سڑک سے قدرے دور بھر علاقہ تھا۔ اس
 دوران کبیل دادا نے سیل فون پر ٹیکم دلا رابطہ کر کے اپنے
 کچھ ساتھیوں کو بانا پورہ والی روڈ پر آنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے
 پہلے ٹیکم دلا جانے پر اعتراض ہوا، مگر حالات ایسے تھے کہ
 اور پھر کہاں جاتے؟ بقول کبیل دادا کہ ٹیکم ولا اب محفوظ جگہ
 ہے۔ وہاں دہارہ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا پھر اب میجر ہاجرہ
 صاحب کی مدد بھی شامل ہو چکی تھی۔ اور اسپتال والے سنسنی
 خیز واقعہ کے بعد ڈپٹی سوپر وژن خان کی چہرہ دستیوں کو بھی
 بریک لگ چکے تھے۔

دقت گزرتا رہا۔ بے ہوش کرنے والی ڈالس کا نہ
 جانے کب تک اثر ڈال ہوتا تھا۔ جنگی خان دہارہ ہوش میں
 آ کر مسئلہ کھڑا کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہاندھنے کے
 لیے ہمارے پاس ایسا کوئی ہندو بست نہ تھا۔ تاہم یہ ہمارے
 لیے کچھ زیادہ فکر کی بات نہ تھی۔ میں اکیلا بھی جنگی کی درگت
 بنا سکتا تھا۔ مگر مسئلہ ظاہر ہے شور شرابے کا تھا۔ وہ اس سے
 لاکھ اٹھا کر بھاگ سکتا تھا۔

کچھ دیر اور بیت گئی، ایک کار میں دو آدمی ہمیں لینے
 کے لیے ہانا پورہ کے اس روٹ پر آ گئے جہاں ہم ایک روڈ
 سائڈ پر چھپے کھڑے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مضبوط رسی بھی
 لائے تھے۔ جنگی خان کو ہوش آنے لگا تھا۔ کبیل دادا کے
 دونوں ساتھیوں نے مضبوطی کے ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں
 جکڑ دیے۔ اس کے بعد ہم سب کار میں سوار ہو کر ٹیکم ولا کی
 طرف روانہ ہو گئے۔

کچھ سکون آور لمحات میسر آئے۔ تو کبیل دادا میری

دونوں گاڑیاں ایک ذیلی سڑک سے مین روڈ کی
 طرف موڑ کاٹنے لگیں۔ دفعتاً فٹکل ہوئی فضا میں تلے اد پر
 ایسی آوازیں ابھریں جیسے پھسے غبارے پھٹے ہوں۔
 ہماری جیب سے ایسی ہی آوازیں ابھریں اور اسے ایک
 زبردست جھٹکا لگا اور سڑک کے موڑ پر اوور ہیڈ برج کی ایک
 دیوار سے جا ٹکرائی۔ مجھے ونڈ اسکرین کے ٹوٹنے اور شیشے
 ٹکھرنے کی آوازیں کے ساتھ کچھ انسانی چیخیں بھی سنائی
 دیں۔ بالکل عقبی سیٹوں میں درمیانی نشست کی پشت گاہ
 نے مجھے اور کبیل دادا کو جھٹکا لگنے پر اتنا سہارا دے دیا کہ
 ہمیں زیادہ چوٹ نہ آئی۔ پھر سب کچھ جیسے تیزی اور میکا نیکی
 انداز میں ہوا تھا۔ جن چند لوگوں کی جھٹک مجھے نظر آئی تھی وہ
 اپنی وضع قطع میں ایک مخصوص ساخت کے حامل تھے۔ جسم
 چست لباس میں ملفوف تھے۔ آنکھوں پر بنجا (Ninja)
 اسٹائل کے نقاب تھے، ہاتھوں میں بھی عجیب ساخت کے
 اسٹیل والے پستل نظر آ رہے تھے۔ جن سے دھماکوں کے
 بجائے زٹ... زٹ... کی آواز... برآمد ہو رہی تھی۔ وہ
 شاید نیم بے ہوش کرنے والے ڈالس (Dots) فار
 کر رہے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے، جن کا میں منتظر تھا۔ ان
 کے انداز و اطوار اور کام نمٹانے کے طریقہ کار میں مجھے ایک
 میکا نیکی عمل محسوس ہوا۔ ایک ایک ساعت کی جیسے انہوں نے
 کیمیکلکیشن کر رکھی تھی اور تیزی سے اپنا کام نمٹایا تھا۔ پہلے
 مجھے اور کبیل دادا کو جیب سے نیچے اتارا۔ اس کے بعد
 ہمارے ہاتھوں کی انگلیاں کھولی گئیں صرف ایک بجا ٹائپ
 آدی نے مجھ سے سوال کیا۔ اس کے بولنے کا انداز بھی مجھے
 کسی روبوٹ جیسا لگا تھا۔ ”تمہارا شکار کدھر ہے؟“

”اگلی سیٹ پر... ڈرائیور کے برابر۔“ میرے منہ
 سے بھی بے اختیار جواہر میکا نیکی الفاظ برآمد ہو گئے۔

”اوکے... اپنا شکار لے کر نکل جاؤ... ہم زیادہ
 دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”پولیس
 پر ان کے حملے کے باعث صورت حال مخدش ہو گئی ہے۔
 لہذا یہاں سے نکل جاؤ۔“ اپنی بات ختم کر کے وہ پلٹا۔ پھر وہ
 سب قریب کھڑی ایک سفید رنگ کی ہائی روڈ میں سوار
 ہو گئے۔ سڑک پر پہچی آہنی میخوں والی فولادی پٹی بچھ کر
 انہوں نے ہائی روڈ کے پچھلے حصے میں لپٹ کر رکھ دی گئی۔
 میں اور کبیل دادا چند ثانیے بکا بکا سے رہ گئے۔ پھر
 جب ”ہی ٹوٹے“ کی گاڑی حرکت میں آئی تو ہمیں بھی جیسے
 چابی بھرنی۔ گویا انہیں بھی پولیس پر حملے کا علم ہو چکا تھا۔
 میں تیزی سے جیب کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو

تہ خانے کی ہیئت دیکھ کر مجھے بادی انکسر میں ساڑ
ہاؤس کا ہی گمان ہوا تھا۔ ایک سے ایک تشدد کرنے والے
آلات اور آہنی اوزار رکھے ہوئے تھے۔ کمر استیصال شکل
کا اور قدرے کشادہ تھا۔ دو کرسیاں ایک چوبی بیچ بھی تھی۔
کبیل دادا نے مجھے بتایا تھا کہ بیگم صاحبہ جب ایک
دوسرے اسپتال سے اپنے بیمار باپ چوہدری الف خان کی
عبادت کے بعد واپس لوٹ رہی تھیں تو ان کی کار پر نامعلوم
مسلح حملہ آوروں نے فائرنگ کر کے ٹائر برسٹ کر ڈالے
تھے۔ اس وقت بیگم صاحبہ کے ساتھ میں بھی عقبی نشست پر
موجود تھا۔ ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بھی ہمارا ایک
آدمی موجود تھا۔ ہم نے ان کا مقابلہ کرنے کی بھی کوشش
چاہی تھی مگر ناکام رہے۔ میں بیگم صاحبہ کو بچا کر نکل بھاگنا
چاہتا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ خود زخمی ہو کر نیم بے ہوش سا
ہو گیا تھا۔ دشمن مجھے مردہ سمجھ کر بیگم صاحبہ کو اغوا کر کے لے
گئے۔ میں نے بیگم و لافون کر کے اول خیر کو بمشکل اس ساری
صورت حال سے آگاہ کیا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب آنکھ کھلی
تو مجھے سامنے یہاں اسپتال داخل کرا چکے تھے۔ میرے
ہمراہ زخمی ساتھی بھی تھا۔

جنگی خان کی احتیاطاً جامع تلاشی لینے کے بعد اسے
وہیں چھوڑ کر ہم اوپر نسبتاً آرام دہ اور بہتر کمرے میں آ گئے۔
ہمارے اعصاب شل تھے، کچھ کھاپی کر خود کو پرسکون کیا اور
اس دوران میں نے بیگم صاحبہ کی کار پر حصے سے متعلق ایک
سوال کبیل دادا سے کیا۔ ”تمہیں کس طرح یقین ہے اس
بات کا کہ یہ حملہ ممتاز خان نے ہی کروایا ہوگا؟“

”اس لیے کہ اپنے جواں سال بیٹے فرخ کی موت پر
ممتاز خان کسی لحاظ کے بغیر بیگم صاحبہ کی جان کا دشمن بن چکا
ہے اور اس وقت روئے زمین پر اس کے سوا بیگم صاحبہ کا اور
کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔“ کبیل دادا نے جواب دیا۔

”حیرت ہے... دونوں سگے بہن بھائی ہونے کے
باوجود اس قدر جانی دشمن؟ میں نے ایک تکلیف دہ حیرت کا
اظہار کرتے ہوئے کہا تو وہ قدرے چونک کر میری طرف
دیکھتے ہوئے بولا۔

”سگے بہن بھائی؟“

”کیوں؟... میں نے غلط کہا؟“

”کیا تمہیں اول خیر نے اب تک بیگم صاحبہ اور
چوہدری ممتاز خان کے بارے میں ماضی کے حوالے سے
کچھ نہیں بتایا؟“

”صرف اس قدر کہ دونوں بہن بھائی ہیں اور کچھ

توصیف کیے بنا نہ رہ سکا۔“ یار شہزی اتم نے مجھے بہت
حیران کیا... بے شک اول خیر کی صحبت نے ہمیں ایک استاد
ٹائپ آدمی بنا دیا ہے مگر اس میں تمہاری اپنی بھی ذہانت اور
خدا داد صلاحیتوں اور فطری دلیری کا دخل ہے۔“

کبیل دادا جیسے کڑوے کیلے اور ہر وقت مجھ سے خار
کھائے ہوئے انسان کے منہ سے میرے لیے ایسے الفاظ
معمولی بات نہ تھی۔ میں نے کہا ”دادا! اول خیر کا تو میں
احسان مند رہوں گا ہی ساری عمر... مگر حقیقت یہی ہے کہ
وقت اور حالات کی بھٹی میں صرف ہمت والے باعزم لوگ
ہی کندن بنتے ہیں۔ بے حوصلہ لوگ تو جل کر خاکستر ہو جاتے
ہیں۔ ویسے اس میں ہماری خوش نصیبی کا بھی دخل تھا۔ کہیں
نقدیر کی یاوری کام آتی ہے تو کہیں ذہنی صلاحیت اور بروقت
قوت فیصلہ... خیر... اب یہ بتاؤ، بیگم و لافونج کر ہم نے پہلا
کام اس خبیث جنگی خان کا منہ کھلوانا ہوگا۔ مجھے بیگم صاحبہ اور
اول خیر کی طرف سے شدید فکر کھائے جا رہی ہے۔“

وہ بولا... ”فکر نہ کرو، بس ذرا بیگم و لافونجے دو، پھر
دیکھنا یہ جنگی خان کس طرح فر فریوٹا ہے۔“ اس نے دانستہ
اس کا نام بگاڑا۔ میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

”ایک بار پھر سوچ لو کبیل دادا، اب کیا ہمارا بیگم و لافونج
رنگ کرنا مناسب رہے گا؟“

میری جرح سے کبیل دادا تپ جایا کرتا تھا... مگر اس
بار ایسا نہ ہوا... وہ ٹھنڈے دماغ اور تارمل لہجے میں بولا۔
”ابھی اور کوئی ٹھکانا قابل عمل نہیں رہا۔ ہمیں بیگم و لافونج جانا
ہوگا۔ وہاں ہمارے اور ساتھی بھی موجود ہیں۔ یہ رڈیل جنگی
خان اتنی آسانی سے اپنا منہ کبھی نہیں کھولے گا... مگر بیگم و لافونج
کے تازہ ریل میں یہ ناک سے بھی بات کرنے پر مجبور
ہو جائے گا۔“

مجھے اس کی بات پر صا د کرنا پڑا۔ کبیل دادا نے دشمن
سے حاصل کیا سیل فون آف کر دیا تھا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم و لافونج گئے۔

کبیل دادا نے وہاں موجود اپنے ساتھیوں کو کچھ
ضروری ہدایات دیں۔ اس کے بعد میں اور وہ بے ہوش اور
نیم مردہ سے جنگی خان کو لے کر ایک تہ خانہ نما کمرے میں
آ گئے۔ اول خیر کی طرف سے بیگم و لافونج کے لینڈ لائن نمبر پر یا
موجود کسی ساتھی کے سیل فون پر ابھی تک کوئی اطلاع وغیرہ
نہیں آئی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں اور کس حال میں تھا، کچھ پتا
نہیں تھا۔

اوارہ کرد

آنکھیں ڈال کر چلا ہے۔ "اس کے پر غرور لہجے کی طرہایت نے میرے تن بدن میں آگ لگادی اور میں دانت چیس کر ترکی بہ ترکی اس سے بولا۔

"...تم نے بالکل ٹھیک کہا... حرام کے جنے... اس لیے کہ تم جیسے زر خرید کتے مرتے ہی رہتے ہیں سڑکوں پر... اس لیے موت بھی تمہاری خباثتوں کا علاج نہیں، میں تمہاری موت کو تمہارے لیے بھیک بنادوں گا... جنگلی کتے..."

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ صاف لگتا تھا وہ میرے اندر کے کھولتے ہوئے ابال اور ایک بے نام سی بے چینی کو بھانپ کر حظ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذہ بلاشبہ چوہدری ممتاز خان کا ایک تربیت یافتہ اور بہت سدھایا ہوا کتا تھا۔ کھل کر... بڑی دلیری سے بھونک رہا تھا۔ اس بار کبیل دادا نے ایک کرسی سنبھالتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہمیں نیگم صاحبہ کے بارے میں تم سے کچھ پوچھنا ہے... بتادو تو ایک رعایت تمہیں مل جائے گی کہ تمہاری موت آسان کر دی جائے گی۔"

"نیگم صاحبہ کو تم اب بھول جاؤ، کبیل دادا!" وہ ایک ایسی خون رنگ لہجے میں بولا۔ "تم سب کا سورج اب ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا ہے۔" میں نے ٹپش ناک انداز میں اپنے ہونٹ بھیچے اور اپنے بوٹ کی ٹھوک اس کے چہرے پر مار کے فریاد کیا۔ "خبیث کتے! سورج ازل سے غروب ہو کے طلوع ہوتا آ رہا ہے۔ صرف تم جیسے کتوں کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ جایا کرتا ہے۔۔۔ مجھے بھی تمہارے منہ سے بہت کچھ اگلوٹا ہے۔"

میرے بھاری لاٹ کی ٹھوک سے اس کی ہاتھیں پھٹ گئیں... اور وہاں سے خون کی لکیریں بہہ نکلیں... وہ مگر وہ نسل خنزیر بہ دستور زہر خندا انداز میں مسکراتا رہا اور میرے اندر کی غیظ ناک آتش انقام کو مزید بھڑکاتا رہا۔ ایسے میں یکلخت میرے ذہن میں جھماکے سے ایک خیال ابھرا۔ اس خبیث کو اچھی طرح... بالخصوص میرے اندر سلگتی بھڑکتی آتش انقام کا اندازہ ہوگا اور شاید اسی لیے یہ خبیث مجھے ٹپش دلا کر اکسانا چاہتا ہے کہ ہم جلدی سے اسے موت کی نیند سلا دیں۔ کبیل دادا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کیا۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ لاسیدہ سی لمبی میز رکھی تھی۔ جس کے چوبی تختے کے سرے پر لوہے کی "بونگ" نصب تھی۔ یہ آہنی سرے اور پائپ موڑنے کے کام آتی ہے جو عموماً لیٹھ مشینوں کے کارنگروں کے ذریعہ استعمال ہوتی ہے۔

زیادہ نہیں، نہ ہی پھر بعد میں بھی ایسی کوئی صراحت بتانے کا موقع ملا اسے۔ نہ میں نے... دوبارہ پوچھا۔

"اور... کبیل دادا کے منہ سے نکلا۔ "...زن، زر اور زمین کے معاملات میں سگے رشتے بھی دشمن ہو جاتے ہیں... مگر ممتاز خان اور نیگم صاحبہ... آپس میں سوتیلے بہن بھائی ہیں مگر ممتاز خان تو اسے اپنی سوتیلی بہن بھی نہیں مانتا۔ وہ اسے سرے سے اپنی بہن ہی نہیں تسلیم کرتا۔"

اس دوران کبیل دادا نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے، ریوٹ کنٹرول سے ٹی وی آن کر دیا۔ حسب توقع مختلف ٹی وی ڈی چینلز پر بار بار مذکورہ اسپتال کے سنسنی خیز واقعات کی فوج دکھائی جا رہی تھیں اور شاید یہ سلسلہ کل سے ہی جاری تھا۔ اب کچھ نشر و اشاعت میں کمی آگئی تھی۔ مگر دقتاً فوج دکھائی جا رہی تھی۔ کچھ اینکر پرسن اور سینئر تجزیہ کار اس پر بحث و مباحثہ بھی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ فوج ان کے ہاتھ لگ چکی تھی جس میں جتنی خان کو میں نے ممتاز خان کے ایک خونی ہر کارے کی حیثیت سے بے نقاب کیا تھا وغیرہ... اس کے ساتھ آج والے تازہ ترین واقعات پر بھی خبریں دکھائی جا رہی تھیں۔

کبیل دادا نے ٹی وی کی آواز آستہ کر دی۔ مجھے اول خیر کی لکڑستانے لگی جس کا میں نے اظہار بھی کیا۔

"نہ جانے اول خیر کا کیا ہوا...؟ وہ کہاں اور کس حال میں ہوگا؟ ابھی تک اس سے رابطہ کرنے کا کوئی اور راستہ ہی نہیں ہمارے پاس۔ بجز اس کے... وہ خود ہم سے رابطہ کر کے بتا سکے کہ..."

"وہ یہاں کے نمبر پر رابطہ کر سکتا ہے مگر..." کبیل دادا میری بات کاٹ کر بولا۔ "میرے خیال میں اسے اب تک رابطہ کر کے خیریت سے متعلق اطلاع دینی چاہیے تھی ہمیں۔"

"یہی میں سوچ رہا تھا۔" میں نے گوگو سے لہجے میں کہا تو کبیل دادا ایک دم اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"آؤ... ذرا اس کی توجہ خیر لیتے ہیں۔ یہ بھی ہمیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔" اس کا اشارہ خانے میں موجود جتنی خان کی طرف تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں تازہ دم ہو کر لیجے آ گئے۔

جتنی خان کو ہوش آچکا تھا۔ اس کے ہاتھ ہیر ہم نے باندھ رکھے تھے۔ ہمیں کچھ کروہ زہر خندا ہنسی کے ساتھ بولا۔ "مجھے اس طرح بے بس کر کے تم دونوں کی خوش فہمی میں مت رہنا... کیونکہ جنگلی خان ہمیشہ موت کی آنکھوں میں

کبیل دادا کی بات کا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ وہ ایسے ہی میری جانب خون خوار سی نظروں سے گھورے اور مسکرائے جا رہا تھا۔۔۔ جس نے میرے دماغ میں آگ سی بھروی اور میں نے ہونٹ بھیج کر ابھی ہتھوڑی والا اپنا ہاتھ سر سے بلند کیا ہی تھا کہ جنگی چیخ کر بولا۔

”شہر جاؤ شہزی۔۔۔“

میرا ہتھوڑی والا ہاتھ سر سے بلند ہی رہ گیا۔ کبیل دادا کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ ابھری۔ میں بھی پہلے ہی سمجھا تھا کہ جنگی خان کی ساری اکڑفوں نکل گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کی غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری تھی، اس میں رحم یا شکست خوردگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

”تم ایک باپ کی اولاد ہو تو میرے ساتھ دوبدو مقابلہ کرو۔۔۔ شہزی! تم میرے ایک بہادر دشمن ہو، اس طرح کی حرکت تمہیں زیب نہیں دیتی۔۔۔ تم نے مجھے زیر کر دیا تو میرا وعدہ ہے جو پوچھو گے سچ سچ بتا دوں گا۔ پھر چاہے میرا جو حشر ہو۔“

”باپ۔۔۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ دو حرفی لفظ میرے لیے میری ذات و زندگی اور میری شناخت کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا تھا۔ یہ وہ سوالیہ نشان تھا جو ایک آنکڑے کی طرح ازل سے میرے سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ اور میں خود کو تختہ دار پر جھولتا ہوا محسوس کرتا آیا تھا۔ باپ۔۔۔ بیٹے کا مان اور باپ کا فخر و خرد۔۔۔ جس نے مجھے اس وقت خود سے دھتکار دیا۔ خود سے جدا کر دیا۔۔۔ جب میں لفظ ”باپ“ کے عنوان سے آشنا ہوا تھا۔ جنگی خان نے میری کمزور رگ کو چھیڑ دیا تھا اور میں چند ثانیوں کے لیے جیسے اپنے گرد و پیش سے ہی بے خبر ہو گیا تھا۔

جنگی میرے لیے قابل نفیرین شخص تھا۔ اس مردود کی ناپاک شکل پر جب بھی میری نظریں پڑتیں تو آسیر کا معصوم چہرہ میرے چشم تصور میں گردش کرتا رہتا۔ عابدہ کو بھی اغوا کرنے کا اس نے ناقابل تلافی جرم کیا تھا۔ ایسے بدترین دشمن سے دوبدو مقابلے کی تو میری بھی خواہش تھی، اب جو اس نے مجھ سے چیخ کے انداز میں یہ بات کہی تھی تو اس نے جیسے میرے جوش جنوں خیزی کو فزوں تر کر دیا تھا۔ اس کا ٹھنڈا اس کا غرور تو ذکر خاک چٹانا اب میرا مقصد ہو گیا تھا۔ یلکھت میں نے بونگ کے لیور پر ہاتھ مارا اور اسے الٹا اٹھا دیا۔ جنگی خان کا بازو آزاد ہو گیا۔ اس کا بازو پھنسانے سے پہلے کبیل دادا اس کے دونوں ہاتھوں کی رسی پہلے ہی کاٹ چکا تھا۔ باقی پیروں کی رسی میں نے کھول

میں کبیل دادا کا اشارہ سمجھ گیا اور بونگ کا ایک لیور نیچی سے گھماتا چلا گیا۔ بونگ کے دو آہنی سرے جو پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے، وہ کھلنے لگے۔ ایک خاص حد تک انہیں کھول کر میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ اس نے جبکہ کر جنگی خان کو کسی بکرے کی طرح ٹانگ سے پکڑ کر کھینچا۔ پھر میں نے بھی اس کی مدد کی۔ اپنے دائیں ہاتھ کی منگی میں اس کا گریبان پکڑ کر نصف دھڑ تک اسے اوپر اٹھایا کہ اس کا ہایاں بازو بونگ کے کھلے ہوئے دونوں سروں کے درمیان اٹک جائے۔ اس کے بعد دوسرے ہاتھ سے میں نے بہ سرعت لیور گھما کر جنگی خان کا بازو پھنسا دیا۔ اب وہ ایک بازو کے سہارے پر اپنی دونوں رین بستہ ٹانگوں پر جھول رہا تھا۔۔۔ میں نے غور کیا۔ وہ تھوڑا ہانپ رہا تھا۔ تب پتا چلا کہ وہ ہسنے کی کوشش کر رہا تھا بالآخر ہنس پڑا۔ ایک ہڈیانی تہتہ اس کے حلق سے بلند ہوا تھا۔ وہ ہمارے قبضے میں تھا۔ ہمارے رحم و کرم پر تھا مگر مسلسل ہماری اس فتح کی دھجیاں اڑا رہا تھا اور ہماری فتح کو ہماری خوش فہمی قرار دے رہا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک مضبوط اعصاب کا ہی نہیں زبردست قوت برداشت کا حامل بھی محسوس ہو رہا تھا۔

کبیل دادا نے لیور کو آہستہ آہستہ گھما کر اس کا بازو اچھی طرح کس دیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مزید کون سا حربہ تشدد کے طور پر جنگی خان پر آزمانا چاہتا ہے؟ کبیل دادا نے مجھے دیوار پر جھولی ایک مخصوص ساخت کی ہتھوڑی اٹھانے کا کہا۔ اس ہتھوڑی کے پچھلے سرے پر تین اکھیڑنے والے تین کانٹے دار کھانچے بنے ہوئے تھے۔ کبیل دادا نے اس سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”شہزی! ہتھوڑی کے پچھلے سرے کو جب تم زور سے اس کے آہنی کھانچے میں جکڑے ہوئے بازو کی کہنی پر مارو گے تو ہل بھر میں اس کی نہ صرف کہنی کی ہڈی چکنا چور ہو جائے گی بلکہ اس کے ناپاک وجود کو بھی سرے پاؤں تک ایک ایسا کرٹ دوڑا دے گی جس کی اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ اس کے بعد جب تک یہ اپنا منہ نہیں کھولے گا اس کی ہر ہڈی کے جوڑے ساتھ ہی حشر ہوتا رہے گا۔“

کبیل دادا کی بات درست تھی۔۔۔ اس کا تجربہ مجھے بھی تھا۔ بازو کی کہنی پر ذرا سی بھی چوٹ لگتی تو پوسے بدن کو ایک جھکا لگتا تھا جیسے کرٹ دوڑ گیا ہو۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ہتھوڑی تھامے میں جب جنگی خان کی طرف بڑھا تو اس پر

آوارہ خسرو

سریے سمیت مجھ پر ہل پڑا۔ اس نے میرے سر پر ضرب لگائی چاہی تو میں نے سر بچاتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے اس کے سریے والے ہاتھ کی کلائی دبوچ لی اور دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس کی کلائی بھی موڑ ڈالی، ترخنے کی ہلکی آواز سے خانے کے محدود ماحول میں ابھری اور ساتھ ہی جنگلی خان کی کریہ جھنجھ بھی سہا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور جنگلی خان بھی خاک جاتے پر مجبور ہو گیا میں نے اپنے دانت اور ہونٹ دونوں بھیج کر اپنے ہاتھ کی مٹھی میں اس کے بال پکڑ لیے۔۔۔ اس نے غراتے ہوئے اپنے سر کی گھر میری ناف سے ذرا نیچے رسید کر دی۔ میں اسے خاصا معزوب کر چکا تھا لہذا مجھے اس کی طرف سے ایسی جارحانہ حرکت کی امید کم ہی تھی اس لیے میں تھوڑا مار کھا گیا۔۔۔ مگر خاصی زوردار ثابت ہوئی۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ وہ غراتا ہوا اپنے قدموں پر اٹھ کر پھر میری طرف لپکا۔۔۔ ادھر میں ابھی اپنی ٹانگوں پر سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے دوسرے ہاتھ کا گھونسا میری ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔ لڑکھڑانے کے دوران ٹھوڑی پر لگنے والی اس نوری ضرب نے میرے قدم فرش سے اکھڑ ڈالے، میں پشت کے بل گرا۔ کلائی جھنجھنے کے باعث جنگلی خان وحشی سا بن گیا تھا۔ پھر میں نے اسے میز سے کوئی بھاری آہنی شے اٹھاتے دیکھا اور میں نے حواس قابو میں رکھتے ہوئے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک اوزار چمکا جو اس نے میری طرف بھیج مارا۔ میں اگر بروقت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے نہیں جھک جاتا تو یقیناً بھاری لوہے کا وہ ٹکڑا میرے سر یا چہرے سے ضرور ٹکراتا۔ ہلکی شاخیں کی آواز میری سماعتوں سے لگرائی تھی، میں نے اٹھتے ہی اسے دبوچ لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بڑی طرح بھڑکے۔

کھیل دادا ایک طرف کھڑا سینے پر ہاتھ باندھے یہ مقابلہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی دلچسپی کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔ جنگلی خان کی کلائی ٹوٹنے پر اس کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ مجھے بھی ایسا کوئی کاری وار جواب میں ضرور دے۔۔۔ یہی سبب تھا کہ مجھ سے لڑنے کے دوران اس کی خوف ناک نظریں بھی تیزی سے خانے میں موجود ٹارچے کے لیے استعمال ہونے والے مختلف اوزاروں کو تلاش کر رہی تھیں، مگر اب میں اسے ایسا کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا اس جنگ کا خاتمہ میں نے مزید دس منٹوں کے اندر اندر اسے پیٹ کے بل فرش پر بوس کر کے کیا۔ اس کے دونوں

ڈالی۔ جنگلی خان اب ہاتھوں پیروں سے آزاد ہو چکا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف نکلے جا رہا تھا۔ جیسے اسے مجھ سے یہ توقع ہی نہ تھی۔ کھیل دادا نے اگرچہ اس درمیان مجھے ٹوکنے روکنے کی سعی چاہی مگر میں نے اسے خاموشی سے ایک طرف کھڑے رہنے کا کہہ دیا تھا۔

”اب کیا کہتے ہو جنگلی خان؟“ میں نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ پاؤں پھیلا کر تن کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو وہ بھی جیسے یک دم لڑنے کی مخصوص پوزیشن لے کر کھڑا ہو گیا۔

بلاشبہ جنگلی خان کا قد مجھ سے ذرا دبلا ہوا تھا۔ مگر اس کی جسامت کسی موٹی کھال والے گینڈے جیسی ہی تھی، جبکہ میں کسرتی جسم کا پالک تھا۔ میری مونچھوں کی بناوٹ بھی مخصوص اسٹائل کی تھی اور سر کے گھٹنے کرلی بالوں سے کالوں کی طرف قلمیں میں نے خاصی بڑھا رکھی تھیں۔ میں اس وقت چست۔۔۔۔۔ بلیک جینز اور لائٹ کلر کی ٹی شرٹ میں تھا۔ جنگلی خان کے بدھیت ہونٹوں پر صرف ایک لمحے کے لیے بڑی مکروہ مسکراہٹ ابھری اور آنکھوں میں درندگی کی چمک لہراتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں اپنی جگہ سے ٹس سے ٹس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کا بھاری گینڈے جیسا جسم میرے جتنے کھڑے آہنی وجود سے ٹکرایا اور میں نے فقط اتنا کیا کہ بہ سرعت دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچ کر اسی کی جھوک میں اور کچھ اپنے وجود کی مخصوص حرکت سے کام لیتے ہوئے اسے عقب کی دیوار پر دے مارا۔ وہ وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ دوبارہ پلٹا تو میں نے اس کی سیاہ روپیشانی پر سرخی کا نشان ابھرتے دیکھا، جو یقیناً خانے کی دیوار سے ٹکرانے کا۔۔۔۔۔ ٹھفہ تھا۔۔۔ اس بار وہ گھونسا تان کر میری جانب لپکا اور میں نے کھڑے کھڑے اپنی ٹانگ کو حرکت دے ڈالی، میری ٹانگ اس کے پیٹ سے ذرا بلند سینے اور پیٹ کی درمیان نازک جگہ پر پڑی تھی۔ اسے ایک جھٹکا لگا۔ آؤغ کی ہلکی آواز غراہٹ کی صورت میں اس کے حلق سے خارج ہوئی، اس کا سر آگے کو تھوڑا جھکا، دوسری حرکت میرے ہاتھ کے گھونٹنے نے کی اور اس کا جڑا بل کر رہ گیا۔ اس نے وحشت خون رنگ انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور لپک کر ایک آہنی اوزار سے مشابہ سر یا اٹھا لیا۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں اپنے ٹانگ بھاری بھر کم وجود پر برا غرور ہے۔ اب تم نے لوہے کے اس پردے کا سہارا لے لیا؟“ میں نے اس کے غرور پر ایک کاری لفظی وار کیا۔ جس نے اسے بلبل کر رکھ دیا اور پھر گھورتے ہوئے وہ

سانس بھی اکھڑی اکھڑی چل رہی تھیں۔

ناکامی کے احساس تلے کبیل دادا کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس جنوں خیز طیش میں آ کر جب اس نے ایک نوکیلا آہنی سریا اس کی گردن میں گھونپنے کا ارادہ کیا تو ٹھیک اس وقت تہ خانے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ساتھی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سل فون تھا اور چہرے پر جوش کے سے آثار تھے۔ وہ اندر داخل ہوا اور کبیل دادا کی طرف اپنا سل فون بڑھاتے ہوئے مؤدبانہ بولا۔ ”استاد... چھوٹے استاد! دل خیر کا فون ہے۔“

دل خیر کے ذکر پر میں بری طرح چونکا تھا۔ کبیل دادا نے جھپٹ کر سل فون لے کر اپنے کان سے لگا لیا اور بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، اول خیر! میں کبیل دادا بولی رہا ہوں۔ تم کہاں ہوں؟ بیگم صاحبہ کیسی ہیں؟“ میری دھڑکتی نظریں کبیل دادا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دوسری جانب سے اس کی گفتگو سن رہا۔ درمیان میں کچھ ایسے سوالات بھی کیے جس نے مجھے چونکا دیا۔ کچھ شام نام اس کے منہ سے دہرانے کے انداز میں ادا ہوئے تھے۔ مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی کہ اول خیر سلامت تھا۔ میں خود بھی اس سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ ”تم پھر اتنی دیر تک کیا کرتے رہے؟ تمہیں بہت پہلے ہمیں مطلع کر دینا چاہیے تھا۔ تم بھلا تنہا اتنا اہم اور خطرناک کام کیسے کر سکتے تھے۔ کیا خود کو سپر مین سمجھتے ہو تم... کیا تمہیں احساس نہیں کہ اس طرح تم نے بیگم صاحبہ کو مزید خطرے میں ڈال دیا ہے؟“

میں نے کبیل دادا کو غصے سے یہ کہتے سنا۔ وہ اول خیر کی کسی حرکت پر بری طرح برہم ہو رہا تھا اور اس کی کوئی بات بھی اب سننا گوارا نہیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے غصے میں فون میرے حوالے کیا۔ ”تم بات کرو... میں اوپر جا رہا ہوں۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

فون میرے حوالے کر کے اس نے آنے والے ساتھی کو ہدایات کی کہ جنگی خان کو ہلاک کر کے اس کی لاش ٹھکانے لگا دو۔ مگر میں نے سختی سے اسے یہ کام کرنے سے منع کر دیا۔

”ابھی نہیں، یہ ہماری قید میں ہی ہے۔ اس کی مرہم پٹی کروانے کا بندوبست کرو، میرے ذہن میں اس کا منہ کھلوانے کا دوسرا طریقہ ہے۔ میں اب وہ اس پر آزمایا جا رہا ہوں۔“ میری بات پر کبیل دادا نے حسب توقع اختلاف کرتے ہوئے مسخراڑانے والے انداز میں کہا۔

”اب اس کا منہ کھلوانے کی ضرورت نہیں رہی... کیا

ہاتھ میں لے پشت کی طرف موڑ کے رسی سے جکڑ ڈالے۔ اور پھر اسے فرش پر کمر کے بل لٹا دیا۔ پھر کھڑے ہو کر اس کی گردن پر اپنا بوٹ رکھ دیا۔ ”بس اجنگلی خان... میں نے تجھے تیری اوقات دکھا دی۔ اب تو اپنا وعدہ پورا کر... ہم نے تیرے ساتھ بہت وقت ضائع کر لیا۔“

میں نے نفرت سے ہونٹ سیکڑ کر کہا تو وہ ہڈیانی قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اگر بتا بھی دیا تو تم کون سا تیر مار لو گے؟“

”اپنا منہ کھولا ہے... یا نہیں؟“ میں نے بوٹ کا دباؤ اس کی موٹی تہ والی گردن پر بڑھاتے ہوئے غرا کے کہا۔ ”بیگم صاحبہ کی کہانی اب تمام ہونے والی ہے... شہزیادہ... اور تمہاری بھی۔“ وہ ہڈیانی انداز سے بولا۔ میں نے طیش ناک انداز میں اپنے ہونٹ بھیج لیے مگر مجھ سے پہلے کبیل دادا کو اس کی لغو بیانی پر غصہ آ گیا اور جنونی انداز میں اس نے جنگلی خان کو لاتوں، مکوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے سر پر جیسے خونی سودا سوار ہو گیا تھا۔ وہ جنگلی خان کو پیٹنے کے دوران مختلفات کی بھی بوچھاڑ کرتا رہا۔ اور اس کے گرد و گھنٹال چوہدری ممتاز خان کو بھی انتہائی سبق سکھانے کے عزائم کا بھی اظہار کرتا رہا۔ کبیل دادا ہانپ گیا۔ اس سے جنگلی خان کے منہ سے بیگم صاحبہ کے بارے میں ایسے خوفناک الفاظ برداشت نہیں ہو سکے تھے۔ وہ مجھ سے بولا۔ ”یہ ایسے منہ نہیں کھولے گا... شہزیادہ... اسے الٹا کر میز پر لٹاؤ۔ پھر دیکھو میں اس رڈیل کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔“

ہم دونوں نے رن بستہ جنگی کو اٹھا کر میز پر بٹخ دیا... پھر کبیل دادا نے مجھے ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا اور کبیل دادا کو جنگلی خان پر تشدد کے گر آزماتے دیکھنے لگا۔ میرے نزدیک یہ سب معمولی نوعیت کے گرتے تھے۔ جس میں آہنی ٹکڑے اور مادہ تھجج کے اوزار بھی شامل تھے۔ وہ نو زپلاس کی مدد سے اس کے ہاتھوں پھروں کے ناخون بھی کھینچ رہا تھا۔ مادہ تھجج اس کے منہ میں گھیسو کر اس کا منہ پھاڑ ڈالنے کی حد تک کھول ڈالا تھا۔ اور اس کے منہ کے اندر اوپری تالو کو آہنی برے سے چھید رہا تھا۔ غرضیکہ جنگلی خان کی حالت پل بھر میں اس نے قابل رحم حد تک زبوں کر ڈالی۔ وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ مانی کے چھینٹے مار کر کبیل دادا اسے دوبارہ ہوش میں لے آیا... مگر جنگلی خان نے اپنا منہ نہیں کھولا۔ وہ تو بات تک کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل بے حس کر ڈالا تھا۔ ہر درد اور اذیت ناک ٹکلیفوں سے وہ بے نیاز پڑا تھا۔ اس کی

آوارہ گرد

ساتھ اس مہم پر لے کر نہیں نکلتے گا۔ اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے کا کہ...! نہ ہی خود تجھے آنے کی، تو جہاں ہے وہیں آرام سے بیٹھا رہ۔ یہ ہمارا اپنا ایک پرانا سیپا (مسئلہ) ہے... ہم خود اسے حل کر لیں گے۔ بس تو دعا کرنا۔“

اس کی بات سن کر میں بے چین ہو گیا۔ ایسے حالات میں، میں اول خیر کے ساتھ ہونا چاہتا تھا۔ اگر وہ میرے لیے ہر وقت ایک بھائی اور سچے جاں نثار ساتھی کی طرح پریشان اور فکر مند رہتا تھا تو میں بھی اس کی طرف سے تشویش زدہ رہتا تھا کہ وہ مجھ سے دور ہو کر نہ جانے کس مصیبت کا شکار ہو بیٹھا ہے۔ ہم دونوں کے دل اور دماغ تک... سچے ساتھ اور بچے غم گساروں کی طرح ایک ساتھ سوچتے تھے، ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ میں ٹپ کر بولا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا میرے یار... میں کبیل دادا کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر نہیں مانا تو پھر اپنے طور پر تمہاری طرف نکلنے کی کوشش کروں گا... مگر... کچھ بتا تو سہی۔“

”نا کا کہ... نا... تو نے اس طرف نہیں آنا، خود میں اس وقت جہاں ہوں، ادھر ہر لمحے مجھے موت کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے... کہنا یہ ہمارا اپنا ایک پرانا معاملہ ہے... جو شاید اب اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اب تخت یا تختہ ہوگا، یا ہم رہیں گے یا یہ چوہدری ممتاز خان... کیونکہ اس نے بیگم صاحبہ کو یرغمال بنا کے اپنی قبر کھودی ہے یا پھر...“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر یکدم بولا۔ ”اچھا کا کہ سب رب رکھا... اپنے یار کی کامیابی کے لیے دعا کرتا... زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ میں خود تو سے رابطہ کروں گا... تو اس نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش سست کرنا۔ یہ بھی ممکن ہے دوبارہ اس نمبر پر میں نہ ہی ملوں... یہ میرا نمبر نہیں ہے۔“

میں اسے پکارتا رہ گیا۔ مگر دوسری جانب سے وہ رابطہ منقطع کر چکا تھا۔ میرے اندر شدید دھڑکن پکڑی ہوئی تھی، نہ جانے اب آگے کیا ہونے جا رہا تھا؟ چوہدری ممتاز نے واقعی ایک انتہائی قدم اٹھایا تھا... بیگم صاحبہ کو یرغمال بنانا معمولی بات نہ تھی۔ یقیناً اول خیر نے بیگم صاحبہ کا سراغ اپنی جان جو سم میں ڈال کر ہی لگایا ہوگا اور اس کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت شدید خطرے میں ہے۔ نہ جانے چوہدری ممتاز اور بیگم صاحبہ کا آپس میں کیا معاملہ تھا؟ بظاہر تو ایسا ہی لگتا تھا کہ زمین یا جائیداد کا ہی کوئی کھینچا ہوگا دونوں بہن بھائیوں کے بیچ... مگر مجھے ایک نئی اسرار کی وجہ اور بھی محسوس ہوتی تھی اس دھن کی... جس کا اچھی جیسے شبہ ہی تھا کہ

تم بہرے ہو... اول خیر نے رابطہ کر کے تازہ صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔“

”میں بہرہ نہیں ہوں۔ تم عقل سے پیدل ہو۔“ میں نے اس سے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”میں اس سے آسیہ کی لاش کے بارے میں اگھوانا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی اس مردود جنگی کا ابھی زندہ رہنا ضروری ہے۔ یہ اب میرا شکار ہے۔ لہذا اس کی مرہم پٹی کا بندوبست کرو، میں تب تک اول خیر سے بات کرتا ہوں۔“

کبیل دادا ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ اس وقت اسے جلدی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ نہ الجھ سکا۔ اس نے آئے ہوئے ساتھی کو وہی ہدایت دے ڈالی جو میں نے کہی تھی۔ اس کے بعد وہ نکل گیا۔ میں ایک دوسرے کمرے میں آ گیا اور اول خیر سے بات کی۔

”میری آواز سن کر وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”او خیر... کا کے اتیری آواز سن کر تو مجھ میں نئی جان پڑ گئی۔ کیا ہو رہا ہے یہاں؟“

میں نے کہا۔ ”اول خیر تم پہلے اپنی بتاؤ۔ کیسے ہو؟ کہاں ہو۔ ٹھیک تو ہوتا؟ بیگم صاحبہ کا کوئی سراغ ملا؟“

”کا کا ابڑی ٹیڑھ پڑ گئی ہے۔ ایک نئی ”سج“ سے واسطہ پڑنے والا ہے۔“ وہ بولا۔ وہ کبھی کبھی مجھ سے ٹھیک پنجابی کے مخصوص الفاظ بولی لیتا تھا۔ ”سج“ سے اس کی مراد... ایک نئی مصیبت سے تھی۔

”آگے بتا... کیا صورت حال ہے۔ تو ہے کہاں؟ میں نے پوچھا۔“

”میں اس وقت کھانا والی کے ایک قریبی دیہات چک لوہاں میں ہوں۔ چوہدری ممتاز نے اپنے کچھ پرانے مہروں کو حرکت دی ہے۔ کا کا اب کچھ لگتا ایسا ہی ہے کہ چوہدری بیگم صاحبہ ولا معاملہ مکاٹا چاہتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اس نے اتنا بڑا قدم کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ بیگم صاحبہ اس کے ایک آدمی کی قید میں ہے۔“

”کیا بیگم صاحبہ کی جان کو خطرہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ابھی تک تو کوئی فوری خطرہ نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن وہ اپنا ایک اہم اور دیرینہ مقصد پورا کرنا چاہتا ہے۔ تب تک وہ بیگم صاحبہ کو کوئی جانی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

”کون سا مقصد؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”یہ لمبی کہانی ہے۔ اس کو چھوڑ دو اور دیکھو کبیل دادا ابھی تھوڑی دیر میں روانہ ہونے والا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم بھی اس کے ساتھ کھانا چاہو گے مگر کبیل دادا تمہیں کبھی بھی اپنے

ہونا متوقع تھا؟ اس نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کبیل دادا مجھے کبھی بھی اس مہم میں شامل نہیں کرے گا، اور تاہی اس کے لیے مجھے اس سے الجھنے کی کوئی ضرورت تھی۔ یہ اول خیر نے مجھے نصیحت کی تھی، اور درست کی تھی۔ کبیل دادا کبھی بھی اتنی بڑی حیثیت نہیں دے سکتا تھا، وابتدا سے ہی مجھے بیگم صاحبہ سے متعلق ایسی مہمات سے دور رکھنے کی کوشش بھی کرتا آیا تھا۔ مگر اول خیر کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو پایا تھا مگر اب اول خیر تھا یہاں نہ بیگم صاحبہ... اور ظاہر ہے بیگم صاحبہ کے بعد کبیل دادا ہی کو اپنے گروہی ساتھیوں کی کمانڈ کرنا تھی، کیونکہ تنظیم میں اسے ”بڑے استاد“ کی حیثیت حاصل تھی۔

ابھی میں انہی سوچوں کے بھنور میں ڈوب اُبھر رہا تھا کہ اچانک کمرے میں ایک ساتھی داخل ہوا، میں ذرا چونکا۔ وہ مجھ سے بولا۔

”آپ کو بڑے استاد بلارہے ہیں۔ جلدی آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں چونکا۔ کبیل دادا کا اس وقت بلاوا کیا معنی رکھتا تھا؟ یکفخت ایک خوش آئند امید بھری مسرت سے میرا دل زور سے دھڑکا تھا اور میں ایک ہل... ضائع کے بغیر اس کے پیچھے ہر یا۔ کبیل دادا کے پاس پہنچا تو مجھے ایک جھٹکا لگا۔ مجھے اس قدر ان کی جلد تیاری کی توقع نہ تھی، لیکن پھر معاملے کی نزاکت اور حالات کا تقاضا محسوس کر کے ان کے پہلو سے الٹ رہنے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔

کبیل دادا اپنے کم و بیش پندرہ مسلح ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا اور باقی دو تین غیر مسلح ساتھی تھے، جنہیں... غالباً بیگم و لا میں ہی رہنا تھا۔ ان کے پاس ہر قسم کا اسلحہ تھا۔ ٹانگن ایم ایم اسالٹ رائفل تک تھیں۔ باہر گاڑیوں میں بھی یقیناً بلاسٹنگ ایسینشن موجود ہوگا۔ ایسی ہی ایک رائفل اور پستول کبیل دادا نے میری طرف بھی اچھال دی۔ اس ہتھیار کی کلنگ نے میرے اندر کے پرجوش دلولہ انگیز نوجوان کو انگڑائی لے کر بیدار کر دیا۔

نواہی ہتھیار کا بوجھ محسوس کرتے ہی میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہریں دوڑتی چلی گئیں اور میں ول ہی ول میں کبیل دادا کا مکھڑوہوئے بنانا رہ سکا تھا جب اس نے یہ سب چھاننے کے بعد حکمانہ انداز میں مجھ سے فقط اتنا کہا تھا۔ ”شہزی... اس مہم میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔“ اور میں نے فوراً اپنا سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

لیتی شاہ کا اس میں اہم رول رہ چکا تھا شاید... جو پتا نہیں زندہ بھی تھا یا مر چکا تھا۔ اول خیر کی باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہوا تھا کہ اس ہار بیگم صاحبہ کے آدمیوں اور چوہدری ممتاز کے درمیان گھمسان کا اور فیصلہ کن رن پڑنے والا ہے۔ اور اس میں کئی قیمتی جانوں کے ضیاع کا بھی اندیشہ تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ اول خیر جیسے یار نے مجھے اس متوقع اور خوف ناک جنگ سے دور رکھنا چاہا تھا۔ یہی بات میری سمجھ میں آتی تھی کہ وہ مجھے اس رن میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں یہاں بیگم و لا میں ہاتھ دھرے بیٹھا خدا نخواستہ کسی افسوسناک قتلے کے انجام کا منتظر رہتا۔ اول خیر کی ہی جیسے بیگم صاحبہ کی جان بھی خطرے میں تھی اور اول خیر تو میرا رشتہ تھا اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو میں اس سے زیادہ اول خیر کو اپنا سا سمجھتا... اس نے ہی مجھے جینا سکھایا تھا۔ اس نے ہی مجھے بتایا تھا کہ کس طرح دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اس سے خبردار زما ہوا جاتا ہے۔ اس نے ہی مجھے سکھایا تھا کہ وقت پڑنے پر کیسے ایک سچے جاں نثار دوست، ساتھی اور غمگسار کی طرح اپنی جان کی بھی پردا کیے بغیر دوسرے قابل قدر دوست کے کام آیا جاتا ہے۔ کئی ایسے مواقع پر میری طرف بڑھتی یقینی مسرت کا رخ اس نے اپنی جانب موڑ لیا تھا اور مجھے زندگی کے راستے پر ڈالا تھا۔ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ اور اب وہ خود کو بیگم صاحبہ کی وفاداری میں خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے وہاں آنے سے روک رہا تھا۔ جبکہ بیگم صاحبہ کے ساتھ میرا معاملہ عمومی نوعیت کا ہے... مگر ایک حقیقت یہ بھی تھی... یا پھر یہ بیگم صاحبہ کی دلکش شخصیت کا سحر تھا کہ اسے ممتاز خان کی قید میں پا کر مجھ سے بھی چین سے رہنا نہ جارہا تھا۔ وہ بھی تو میرے کئی ایسے آڑے دشتوں میں کام آتی رہی تھیں ادا اول خیر نے آج تک میرے ساتھ جو بھلائی کی تھی، اس میں کسی نہ کسی زاویے سے بیگم صاحبہ کا ہی ہاتھ اور سپورٹ شامل تھی۔

یہ ساری باتیں گزرتے چند ثانیوں میں میرے دل و دماغ میں گھوم گئی تھیں... اور مجھے اول خیر سے ایک طرح کا گلہ بھی ہونے لگا کہ اس نے میرے بارے میں اپنے تئیں اندازہ لگا یا کہ میں اتنا خود غرض ہوں گا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے زندگی اور موت کی اس خون ریز جنگ کو تماشے کے روپ میں دیکھتا ہوں گا۔ یہ ناممکن تھا۔

مجھے افسوس تھا کہ اس نے مجھے اپنے ٹھکانے کی تفصیل نہیں بتائی تھی کہ وہ کہاں تھا... اور بیگم صاحبہ کس کے قبضے میں اور کس جگہ مقید تھیں۔ ان کا یہ فیصلہ کن گراؤ کس مقام پر

آوارہ گرد

پرانٹا پیشہ اپنالیا تھا... مگر بابن ڈکیت کا وزیر جان سے ملاپ ابھی تک انجمن کا باعث تھا اور میرے لیے تو زیادہ حیرت و انجمن کا باعث تھا۔ کیونکہ میں پہلے ہی سے ان دونوں ناموں سے آشنا تھا۔ ریجنل فورس کے میجر ریاض باجوہ کی زبانی میں نے ان دونوں افراد کا تذکرہ سنا تھا۔ مگر انہوں نے مجھے وزیر جان اور بابن ڈکیت کے بچ ہونے والی جس کشمکش کی کہانی سنائی تھی، وہ موجودہ حالات کے تناظر میں کسی طرح بھی میرے نزدیک ”فٹ“ نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ بقول میجر صاحب کے وزیر جان اور بابن ڈکیت کے درمیان ایک خفیہ ”نسل“ تھی جس کی بابن ڈکیت کے سامنے تو کوئی اہمیت نہ تھی، مگر وزیر جان کے لیے بابن ڈکیت بہت خاص حیثیت رکھتا تھا... جس کی تفصیل میجر ریاض باجوہ مجھے ہیڈ کوارٹر میں مجھ سے دن ٹو دن ملاقات میں بتا چکے تھے۔ اور وہ میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ اب یہی بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ آخر بعد میں ایسی کیا وجہ ہوئی تھی کہ وزیر جان نے بابن ڈکیت کو بالآخر اپنا زیر دست کر دیا تھا۔ ایک اور بات پر مجھے حیرت تھی کہ ان دونوں کے اس خفیہ گھجڑے سے ”پاور“ والے کیوں کر ابھی تک لاعلم تھے؟ جبکہ بقول میجر صاحب کے وہ وزیر جان کی اپنی تیسری آنکھ سے مکمل ریکی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں کئی سوالات اور بھی میرے ذہن رسا میں آئے تھے... مگر سردست کبیل دادا کی تازہ ترین جاری مہم کے حوالے سے یہ تھی کہ ایک خاص مقصد کے لیے ممتاز خان نے بھی وزیر جان سے چٹنگیں بڑھالی تھیں۔ ان کی معلومات کے مطابق وزیر جان، ممتاز خان کے باپ چوہدری الف خان مرحوم کا قریبی دوست بھی رہ چکا تھا۔ مگر بعد میں وہ دوستی پھسکی پڑنے لگی تھی... تاہم اب اچانک ممتاز خان نے اپنے باپ کے دوست سے مراسم بڑھانے شروع کر دیے تھے تو اس میں کوئی راز تھا... کوئی گہرا راز۔ جبکہ میری اپنی ذاتی معلومات کے مطابق جو میجر باجوہ صاحب سے حاصل کر رہے ہیں، ماضی میں بابن ڈکیت ممتاز خان کا بھی آدمی رہ چکا تھا۔ تو گویا اول خیر کی بات بھی درست تھی کہ ممتاز خان اپنے بعض وسیع تر خفیہ مقاصد کی خاطر پرانے مہروں کوئی بساط پروا پس لارہا تھا۔ وہ مفادات کیا تھے؟ یہ سب ابھی اندھیرے میں تھا۔

بہر طور... قصہ یہ تھا کہ بیگم صاحبہ کی بازیابی کے لیے اول خیر نے سر توڑ کوشش کی تھی... مگر ابھی تک وہ اس بات کا پتا نہ چلا سکا تھا کہ اسے یرغمال بنا کر کس مقصد کے لیے اور کہاں رکھا گیا تھا۔ تاہم اول خیر نے اتنا ضرور پتا چلا لیا تھا کہ اسے چک نوال کے کسی آس پاس ذیہات میں رکھا گیا

دو تیز رفتار جیپوں اور ایک کار میں ہمارا کارواں بیگم ولا سے سرشام روانہ ہوا تھا اور یہ سفر تھا ملتان روڈ پر تینوں گاڑیاں قادر پور تک ساتھ جو سفر تھیں، اس کے بعد ایک طے شدہ منصوبے کے تحت تینوں گاڑیاں الگ ہو گئیں۔ دونوں جیپیں ایک ساتھ دائیں جانب قادر پور کی طرف جانے والی ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئی تھیں، آگے جا کر ان دونوں نے بھی اپنی الگ الگ راہ پر آگے ہو لینا تھا۔ دونوں کا ٹارگٹ ایک ہی تھا۔ یعنی انہیں چک نوال پہنچنا تھا جبکہ میری اور کبیل دادا کی منزل اور بھی یعنی ساہیوال۔ وہاں ہم نے وزیر جان نامی آدمی پر ہاتھ ڈالنا تھا۔

کبیل دادا نے مجھے ساری تفصیل دوران سفر کار میں بتادی تھی۔ کار میں ہم صرف چار افراد تھے، ڈرائیور، اس کے برابر میں ہمارا ماحد نامی ساتھی، عقبی سیٹ پر میں اور کبیل دادا ساتھ بیٹھے تھے۔

اول خیر سے حاصل شدہ مراحت کے مطابق چوہدری ممتاز خان کے جواں سال بیٹے فرخ کی حادثاتی موت یا تل کی ذمہ داری بیگم صاحبہ اور مجھ پر ڈالتے ہوئے ممتاز خان نے انتقامیہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ اس خطرناک اقدام پر عمل کرنے کی ایک بڑی وجہ چوہدری الف خان کی اچانک طبعی موت بھی سمجھ میں آتی تھی۔ کیونکہ کبیل دادا کی گفتگو کے مطابق مجھے یہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ... جب تک ممتاز خان اور بیگم صاحبہ کا باپ الف خان زندہ تھا، ان دونوں بہن بھائیوں نے ایک دوسرے کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی... چنانچہ جب بیگم صاحبہ باپ کی حیات کے بعد مذکورہ اسپتال سے کبیل دادا کے ساتھ واپس لوٹ رہی تھیں تو الف خان کا انتقال ہو گیا۔ بیگم صاحبہ سے پہلے یہ اطلاع ممتاز خان تک پہنچ چکی تھی۔ مگر وہ اس سے پہلے ہی اپنے مقرب خاص کارپرداز... جتنی خان کو بیگم صاحبہ کے پیچھے لگا چکا تھا۔ جتنی خان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیگم صاحبہ کی کار پر کامیاب حملہ کر کے اسے یرغمال بنا کر سیدھا گرامیں مگر پہنچا تھا۔ ممتاز خان اگرچہ بیگم صاحبہ کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا مگر نہ جانے درمیان میں ایسا کیا ہوا تھا کہ اسے ہلاک کرنے کے بجائے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت اس نے بیگم صاحبہ کو پراسرار طور پر غائب کر دیا۔ اول خیر نے اپنی جان جو حکم میں ڈال کر بیگم صاحبہ کے پراسرار ”غیاب“ کا پتا چلانے کی کوشش کی تو اس سلسلے میں بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کا نام سامنے آیا۔ بابن ڈکیت اب ساہیوال کے ایک صنعت کار وزیر جان کی پشت پناہی میں آچکا تھا۔ شدید تھی کہ اس نے پھر اپنا وہی

میرا خیال کنال لارج میں نقب لگانے کا رسک لیے بغیر اگر ہم وزیر جان کو باہر سے ہی یرغمال بنانے کی کوشش کریں تو اپنا مقصد جلد حاصل کر سکتے ہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے میری تجویز سے اختلاف کیا۔ ”یہ لمبا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ پورے ساہیوال کی پولیس انتظامیہ ہمارے پیچھے پڑ جائے گی، پھر ہمارا یہاں کوئی خفیہ ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ وزیر جان کو یرغمال بنا کر ہم کہاں کہاں لیے پھریں گے۔“

ماجد میری تجویز سے کچھ اتفاق کرتے ہوئے دادا سے بولا۔ ”استاد! ہمیں شہزی کی بات پر تھوڑا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم وزیر جان کو اغوا کر کے چک نواں کی طرف نکل سکتے ہیں، کیونکہ ہماری اگلی منزل اسی طرف ہی ہے۔ چھوٹے استاد (اول خیز) نے وہاں اپنے چھوٹے ٹھکانے کا بندوبست تو کر رکھا تھا۔“ دادا نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارے ذہن میں کیا لائحہ عمل ہے؟“

دہ بولا۔ ”اس کی رہائش گاہ میں ہی اسے یرغمال بنایا جائے۔ پھر وہاں تشدد کے ذریعے اس سے ہابن ڈکیت اور بیگم صاحبہ کے بارے میں انکوائیا جائے۔ ہمیں چوبیس گھنٹے وہاں گزارنا ہوں گے کم از کم۔۔۔ اور اسے وہیں سے ہی ڈوریاں ہلانے پر مجبور کرتے رہیں گے۔“

میں نے غور کرنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ تجویز یہ بھی بری نہ تھی۔

بالآخر طے پایا کہ مذکورہ بلاک سے قدرے پہلے کسی نسبتاً ویران جگہ پر کار چھوڑ کر صرف میں اور کبیل دادا کنال لارج کی طرف بڑھیں گے، جبکہ ہمارے باقی دو ساتھی یہ شمول ڈرائیور کار میں ہی ہماری کسی فوری ہدایت کے منتظر رہیں گے۔ پھر ایسا ہی کیا گیا۔ اس وقت گزاری اور رات گہرے ہونے تک ہم نے کچھ کھایا نہ پیا۔۔۔ اس کے بعد روانہ ہو گئے۔

مذکورہ بلاک کے جس خصوصی راستے پر ہرڈل راڈ لگا کے گاڑ ڈکھڑے تھے، اس کے عقب میں بیشتر پلاٹ خالی پڑے تھے۔ جدھر جھاڑ جھکاڑ پھیلا ہوا تھا۔ وہاں کا راستہ ایک سپاٹ دیوار سے بند کیا گیا تھا۔ میں اور کبیل دادا اس سمت میں آئے تو ایک نو تعمیر شدہ کوٹھی کا ڈھانچا ہمیں دکھائی دیا۔ جو کنال لارج کی جنوبی دیوار سے متصل تھا۔ تفصیلی جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ مذکورہ کوٹھی کی کنسٹرکشن کا کام ابھی جاری تھا اور آخری مراحل پر تھا۔ یہ خالی تھی، تاہم یہ بات

ہے۔ وہ ہابن ڈکیت کی تحویل میں تھی۔ نیز وزیر جان کے آدمیوں کی، ہابن ڈکیت کو مکمل سپورٹ حاصل تھی جبکہ ممتاز خان خود بھی وہیں تھا۔

جنگل خان کو ممتاز خان نے بیگم دلا کی دیگر سرگرمیوں پر نظر رکھنے پر مامور کر دیا تھا۔۔۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ کبیل دادا مرا نہیں بلکہ زخمی ہوا تھا تو اس نے اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ساتھ مذکورہ اسپتال میں ہلا بول دیا تھا۔ مگر میری وجہ سے جنگل خان بری طرح ناکام ہو کر خاک چاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

چنانچہ اب بیگم صاحبہ کے اغوا اور یرغمال بنانے والے محرکات کا ماسٹر مائنڈ وزیر جان سمجھا جا رہا تھا۔ اول خیز کی کبیل دادا کو فراہم کردہ مستند معلومات آخری یہی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ اول خیز کی معلومات کے مطابق کبیل دادا نے اپنی اس اہم ترین فیصلہ کن مہم کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا تھا۔ اپنے ساتھی اول خیز کی طرف روانہ کروئے تھے جہاں انہوں نے ہابن ڈکیت پر حملہ کرنا تھا۔۔۔ اور دوسرے مرحلے میں ہم نے وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا تھا۔

ہم نے سب سے پہلے وزیر جان کی رہائش گاہ ”کنال لارج“ پر شب خون مار کر وزیر جان سے دودھ ہاتھ کرنا تھے اور بیگم صاحبہ کی باعزت بازیابی کے لیے اسے تختہ مشق بنانا تھا۔

کبیل دادا کو ابھی میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں پہلے سے ہی وزیر جان اور بدر اقبال المعروف ہابن ڈکیت کے ناموں اور حیثیت سے واقف ہوں۔

ہم رات سے پہلے ساہیوال پہنچ چکے تھے۔ شہر کے ایک پوش علاقے میں وزیر جان کی محل نما کوٹھی ”کنال لارج“ عین وسط میں واقع تھی اور جس بلاک میں تھی اس طرف جانے والے راستے پر بھی وردی پوش مگر بظاہر غیر مسلح چوکیدار ٹائپ محافظ نظر آتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس بلاک میں اعلیٰ سرکاری افسر اور ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے چند گنے چنے کاروباری شخصیات کی رہائش بھی تھی۔ اور ذاتی پروٹیکشن کی خاطر انہوں نے اپنی سکیورٹی بھی الرٹ کر رکھی تھی۔ گویا کنال لارج میں داخلے کی توہور کی بات تھی۔۔۔ پہلے مذکورہ بلاک میں داخل ہونے کی کوئی تدبیر کرنا تھی۔

ہم ساہیوال پہنچ کر ایک ہائی فیک ریسٹورنٹ کے ٹی ہال میں موجود تھے۔ یہاں آنے سے پہلے ہم ایک چکر وہاں کا لگا چکے تھے اور جائزہ بھی لے چکے تھے۔

میں نے کبیل دادا کو تجویز دیتے ہوئے کہا۔ ”دادا

اختیار کرتے ہوئے پہلے اوپری منزل کا جائزہ لیتے رہے۔ یہاں چند ہی کمرے تھے۔ گراؤنڈ کا رقبہ نسبتاً زیادہ تھا۔۔۔ ایک بالکونی کے تار یک گوشے کی آڑ سے جھانک کر ہم نے نیچے بھی نظر ڈالی تھی۔

سیاہ رنگ کے سلاؤنڈنگ گیٹ کے دائیں جانب اندرونی سمت میں گارڈ کیبن نظر آتا تھا۔ درمیان میں پختہ روڑا تھی۔ دائیں بائیں وسیع لان تھا، وہاں ذرا ذرا فاصلے سے آہنی پائپ نصب تھے کہ جن پر گلوب روشن تھے، کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی دی تھی، پھر خاموشی چھا گئی۔ نیچے پورے درج میں دو تین بیش قیمت بھاری گاڑیاں کھڑی دکھائی دی تھیں۔

مرکزی داخلی دروازہ سا گوان کی لکڑی کا تھا، وہ دکھش محراب کی صورت میں تھا۔ ہم نے اوپر سے بیرونی جائزہ لینے کے بعد اندر کا رخ کیا۔ مرکز میں ہال نما کمراتھا یہاں سے ایک چکر دار دلکش ریننگ والا زینہ نیچے جاتا تھا۔ وزیر جان کا حدود در بند کیا تھا، اس کی خبر نہ تھی۔ اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس کی فیملی مختصر سی ہے۔

ہال کمرے کا دروازہ کبیل دادا نے کھول لیا تھا۔ اندر ماربل کے چکنے سلوپی فرش پر بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا جو خاصا دلیر اور نرم تھا۔ دائیں بائیں فنیسی اسٹینڈ پر سنگ مرمر کے بڑے بڑے گلدان دھرے تھے۔ کبیل دادا نے پتل ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔ یہاں دو مختصر راہداریاں تھیں۔ ایک سیدھی تھی۔ دوسری اور سیانی کمروں سے گزر کر عقیقی سمت کی دیوار تک جا کر دائیں بائیں تقسیم ہو کر گھوم رہی تھی۔ یہاں احتیاطاً کبیل دادا نے دو تین کمروں کو کھول کر دیکھا بھی تھا، وہ خالی اور تاریک پڑے ہوئے تھے۔ باقی کمروں کے دروازے کے نچلے ہار یک خلا سے تاریکی دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ وہ بھی خالی ہوں گے۔ یہ صورت دیگر نیچے سے زیر و پاور کے بلب کی روشنی تو ضرور دکھائی دیتی۔ ہم دے پاؤں نیچے آگئے۔ یہ اوپنا ہال تھا۔ یہاں بھی بیش قیمت قالین فرش پر بچھا ہوا تھا۔

یہاں ایک چوڑی راہداری اور دائیں بائیں رخ پر دولشت گاہیں نظر آتی تھیں۔ ہلکے پاور کے دد بلب یہاں بھی روشن تھے۔ گہری خاموشی میں ہلکی ہلکی گھر ر۔۔۔ کی آواز سنائی دے رہی تھی، یہ شاید اسے سی کے کپریس کی تھی۔ اچانک لائٹ آف ہو گئی۔ ہم دونوں مجری طرح ٹھٹھک گئے۔ کبیل دادا شاید شش و پنج کا شکار ہو گیا تھا کہ آیا پتل ٹارچ روشن کرے یا نہیں۔۔۔ اچانک لائٹ آگئی، اور

میں ممکن تھی کہ اندر ایک سے زائد چوکیدار موجود ہو سکتے تھے۔۔۔ مگر ہمیں کئی تھی کہ وہ ایک خلی اندر کنسٹرکشن عمارت میں کس قدر ”چوکس“ ہو سکتے تھے۔ اس کی چھت یا بالکونی سے ہم کنال لاج میں داخلے کی راہ بہ آسانی نکال سکتے تھے۔ ہمارے پاس نقب زنی کا مختصر ضروری سامان موجود تھا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ آسمان روشن تھا۔ آخری تاریخ کا چاند کہیں پر سے بھٹکا ہوا تھا۔ ہم جھاڑ جھنکاڑ سے لبریز جس خالی پلاٹ پر موجود ہو چکے ہوئے تھے اس سے بار ایک سڑک تھی اور پھر چھیل میدان تھا۔ وہاں سے آتی ہوئی مرطوب ہوا شاخیں شاخیں کی آواز پیدا کر رہی تھی۔

ہم دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے مطلوبہ کوشی کی عقی دیوار سے آن گئے۔ یہاں سے ساتھ ملحقہ کنال لاج کی طرف ایک نظر ڈالی یہاں دن پلس سے زیادہ بلند عمارت کوئی نہ تھی۔ اوپری منزل میں ہلکی روشنی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ اس طرح کی عالیشان کوشیوں میں عموماً عجیب سی پرسکون خاموشی پائی جاتی ہے۔ جبکہ ان کا سیکورٹی الارم سسٹم آن ہوتا ہے جو اس قدر حساس نوعیت کا ہوتا ہے کہ اگر ایک پرعدہ بھی کسی اندرونی چھت یا دیوار سے ٹکرا جاتا تو گارڈز کیبن میں اس کی خبر ہو جاتی۔

بہر طور ہم نے مناسبت سے سیاہ لباس ہی پہن رکھا تھا۔ تاکہ تاریکی کا حصہ ہی معلوم ہو۔ ایک آنکڑے داری ٹکائی گئی۔ جس پر ہر ایک گز پر موٹی گانٹھ باندھی گئی تھی۔ تاکہ اس کے سہارے ری پر مضبوطی کے ساتھ گرفت جما کر راستہ پانا جاسکے۔ بہت ہونے سے آنکڑا عقی دیوار کے سرے پر نصب خم دار آہنی بریکٹوں میں پھنسا یا گیا اور پھر ہم دونوں باری باری اوپر پہنچ گئے۔

یہ کوشی اوپری اور خالی ہونے کے باعث باوی اختر میں بھوت بھٹکے کا تاثر پیش کر رہی تھی۔ مگر اس وقت یہی پراسرار خاموشی اور دیران ماحول ہمارے تحفظ کی ضمانت بھی تھا۔

نقب زنی کے معاملے میں، کبیل دادا کی مہارت، پھرتی اور چابکدستی کا مجھے قائل ہونا پڑا تھا۔ حالانکہ میں نے اول خیر کو بھی یہی کام کرتے دیکھا تھا۔ مگر بلاشبہ کبیل دادا کی بات اور تھی۔۔۔ جنھں اگلے چند منٹوں میں ہم کوشی سے کنال لاج کی ”پلس منزل“ کی بالکونی پر پہنچ چکے تھے۔

اندر کا محل وقوع کیا تھا اس سلسلے میں ہماری معلومات منفرتھی، اول خیر سے جو ممکن ہو سکا تھا، اس نے معلومات کبیل دادا تک پہنچائی تھی۔ وہی فی الحال کافی تھی۔

میں یہ کوشی بھی دیران لگی تھی، تاہم ہم گز بہ قدی

سے میں ود چار تھا۔ شاسائی کے ایک ہلکے شائبہ نے یہ غور اسے دیکھتے رہنے پر ایک مکمل آشنائی کو ظاہر کیا تھا۔ یقیناً وہ بے یقینی کے متلاطم سمجھنے نے گویا ایک طوفانی کجولے کی شکل میں مجھے لپیٹ لیا اور ماضی کے سولہ برس پہلے کے اس اطفال گھر میں مجھے پھینک دیا۔۔۔ اور پھر جیسے میری نظروں کے سامنے پیش منظر نہ رہا۔ اب میں پس منظر کو باطنی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ جب میرا باپ مجھے یعنی ایک آنکھ، نو سال کے بچے کو اطفال گھر والوں کے حوالے کر کے لوٹ رہا تھا اور میں معصومانہ حیرت اور پریشانی سے باپ کو آواز دے رہا تھا۔ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ابو۔۔۔ یہ کون سی جگہ ہے؟۔۔۔ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ مجھے کیوں چھوڑ کے جا رہے ہو؟“

تو باپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر عرض اور دکھی آواز میں کہا تھا۔ ”بیٹا۔۔۔ اب تو یہیں رہے گا۔۔۔ تیرے لیے یہی بہتر ہے اور صحیح بھی کہ تو اب ادھر ہی رہے۔ میں تیرے پاس آتا رہوں گا۔“

وہ افسردہ بھی نظر آ رہا تھا۔ دکھی بھی، مگر اس سے زیادہ مجبور بھی۔۔۔ کیوں؟ باپ تو اولاد کو سینے سے لگاتا ہے۔ اولاد تو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اس کے دل کا قرار ہوتی ہے۔ فخر ہوتی ہے۔ پھر کیوں میرا باپ ایسا قدم اٹھا رہا تھا۔ ایک سوال تھا۔۔۔ جس نے برسوں سے بے چین کر رکھا تھا۔ میرے جسم کو ہی نہیں میری روح تک کو جھیر جھیر کیے دے رہا تھا۔ آج اس کڑے سوال کا جواب میرے سامنے تھا۔

میں جب پس منظر سے پیش منظر میں آیا تو ایک اور کیفیت نے مجھ پر غلبہ پایا۔ یہ جوش محبت تھی یا پھر ایک بے نام سے صدے کی مار تھی۔۔۔ یا شاید کسی ازلی مگر کم مشہد رشتے کے تعلق کا السیت بمراد یاد کہ مجھے چکر سا آ گیا۔ میں جوشیزاد احمد خان عرف شہزی۔۔۔ آہنی اعصاب اور مضبوط قد کاٹھ کا حامل چھنٹ کا جوان تھا۔۔۔ ماضی کے ایک دردناک و جاں مسل حوالے کی تلواریں کے ایک ہی دار سے ڈھے گیا۔ اور گرتے گرتے بھی بھری شہادت کے بعد سہمی تصدیق ہو گئی۔۔۔ جب میں نے اپنے باپ کی آواز سنی۔

”ارے۔۔۔ اسے کیا ہو رہا ہے۔۔۔ یہ گھر ہا۔۔۔ ہے۔“

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

واقعی لائٹ ہی تھی۔ یعنی زیر و پاؤں کے پس نہیں تھے، تیز لمبوں کی روشنی تھی اور ہمارے ارد گرد پانچ مسلح افراد ہم پر گنیں تانے کھڑے تھے۔

”خبردار۔۔۔ اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لو۔۔۔ ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔“

ایک نسبتاً دراز قامت شخص نے تھکمانہ درشتی سے کہا۔ میرا پورا وجود سائیں سائیں کرنے لگا اور کپٹیاں سنسانے لگیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں۔

میں نے اور دادانے ان کے حکم کی تعمیل کی، دو افراد پھرتی کے ساتھ آگے بڑھے، اور ہمارے ہاتھ پشت کی طرف ہاتھ دیے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہم چوہے دان میں آن پھنسے تھے اور ہماری اندر داخلے تک کی ہر کارروائی کسی اسکرین پر دیکھی جا رہی تھی۔

اس کے بعد دراز قامت نے اپنے ایک ساتھی سے تھکمانہ کہا۔ ”باس کو بتا دو جا کر۔۔۔ ہم انہیں ریڈ روم میں لے جا رہے ہیں۔“

بڑی عجیب اصطلاح کا استعمال کیا گیا تھا ایک رہائشی جگہ کے لیے۔ بہر طور ہمیں کن پوائنٹ پر جس کشادہ کمرے میں لایا گیا تھا۔ وہ کسی بھی ”ریڈ“ شے کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ بظاہر عام سا کمرہ تھا اور برائے نام فرنیچر۔ ہم دونوں کو بیٹھنے نہیں دیا گیا تھا بلکہ سامنے دیوار کی جانب سیدھا کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔

”باس آ رہے ہیں۔“ ایک نے اندر داخل ہو کے دراز قامت شخص سے کہا۔ باس سے ان کی مراد یقیناً وزیر جان ہی ہو سکتا تھا۔ پھر دروازہ کھلا۔ بیٹن قیمت سلپنگ ریشمی گاؤن میں ایک شخص بڑے کردار سے پشت پر ہاتھ رکھے اندر داخل ہوا۔ قد درمیانہ تھا، سر کے بال سفید تھے، چہرہ بھاری تھا، آنکھیں چھوٹی تھیں۔ عمر ساٹھ سے کم نہ تھی، مگر قابل رشک محبت نے اسے ساٹھا پاٹھا بنا رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ہمارے ذرا قریب آیا تو اچانک جیسے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر میں سر سے پاؤں تک پتھرا گیا۔ اگر سیکے کی کیفیات اسی کو کہتے ہیں جس میں پورا وجود سن ہو کر بے جان محسوس ہونے لگتا ہے، مگر آنکھوں سے سب دیکھا اور دماغ سے سمجھا جاتا ہے تو میں یقیناً سیکے میں ہی آ گیا تھا۔ دماغ میں شور کی سی آوازیں سماعتوں کو چھلنی کیے دے رہی تھیں۔ پورا وجود سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دل میں بیک وقت کئی کیفیات تھیں جن

صلہ

جمال دوستی

ذہانت اور خوب صورتی خدا کی ودیعت کردہ خوبیاں ہیں... جو اس دولت سے مالا مال ہوتے ہیں... وہ اس پر غرور اور فخر بھی محسوس کرتے ہیں... مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ تیسری چیز جذبہ محبت ہوتی ہے... جو کسی کو بھی اپنا بنا سکتی ہے... اور اس بے بہا دولت کا کوئی متبادل نہیں...

دو بھائیوں کے درمیان پائی جانے والی عداوت اور محبت کی عجب کتھا...

میرا دوست اسکالر ہاں ہمیشہ عورتوں کی موجودگی میں بے آرامی محسوس کیا کرتا تھا لیکن میں نے کبھی اسے ان کے ساتھ بڑا رویہ اختیار کرتے نہیں دیکھا۔ اس لیے اس عورت سے اس انداز میں بات کرتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارا یہاں آنا... یہ کار ہی گیا۔“
وہ آتش دان کے پاس رکھی آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔



میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ "کیا تمہارا کوئی بھائی بھی ہے؟"

"نہ سچ نہیں ہے۔" لینا نے کہا۔ "میلانجی نے مجھے نہیں بھیجا بلکہ اس نے تو مجھے تم سے ملنے سے منع کیا تھا لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم دونوں ساتھ کام کرتے ہیں۔" ہائس نے ایک گہری سانس لی اور میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے بولنے کے انداز اور رکھ رکھاؤ سے میں نے اندازہ لگالیا کہ تم سرکاری ملازم ہو۔ تمہارے بیروں اور ٹانگوں کی سوجن بتا رہی ہے کہ تم گھنٹوں ایک ہی جگہ پر کھڑے ہو کر کام کرتی ہو اور تمہارے ہاتھوں پر لگے سیاہی کے دھبے ظاہر کرتے ہیں کہ تمہارا تعلق پوسٹ آفس سے ہے جہاں میرا بے وقوف بھائی اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔"

لینا کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ ہلکی انداز میں بولی۔ "اُسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے مسٹر ہائس ورنہ اس کی ملازمت ختم ہو جائے گی۔" ہائس نے کہا۔ "بہت عمدہ۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس فضول ملازمت سے اس کی جان چھوٹ جائے۔"

لینا اور میں نے ہیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں ہائس کے قہقہے کا منظر تھا۔ شاید وہ کہہ دے کہ یہ محض ایک مذاق تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہائس نے دوبارہ میگزین اٹھا لیا اور معاملہ کرنے میں مشغول ہو گیا۔

میں نے اس عورت سے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟ اگر میں مدد کر سکا تو ضرور کروں گا۔" "مسٹر ہائس ٹھیک کہتے ہیں۔"

"میں کرشین برانچ آفس میں کاؤنٹر کلرک ہوں اور ان کا بھائی میلانجی میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے اور مسٹر ہائس کے برعکس وہ بہت ہی پیارا انسان ہے۔" ہائس نے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا لیکن کچھ بولا نہیں۔

"مسئلہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس پر الزام ہے کہ وہ ڈاک لے جانے والی لڑکی امبر کو تنگ کر رہا ہے اور اسے اپنی جانب مائل کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔"

"کیا میں اس کی تفصیل جان سکتا ہوں؟"

"اس لڑکی نے شکایت کی ہے کہ وہ اسے پھول، چاکلیٹ اور ای میلز وغیرہ بھیجتا رہتا ہے۔"

"مجھے تمہارا کیس لینے میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

"لیکن کیوں؟" وہ عورت دروازے میں کھڑی

ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں دستی بیگ تھا اور وہ اپنے نازک فریم والی عینک سے اسے کھور رہی تھی۔ "ابھی تو میں نے اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتایا۔"

میں ان دونوں کے درمیان آتے ہوئے اس عورت سے بولا۔ "تم میرے دوست کی ہاتھوں کا برانہ مٹانا۔ اس کا منگل کے روز ایک چھوٹا سا آپریشن ہونے والا ہے۔"

"میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ میری طرف سے معذرت کرو۔" ہائس منہ بتاتے ہوئے بولا۔

"میرا نام والٹڈر ہے۔" میں نے اس عورت سے کہا۔ "میں والٹڈر۔"

اس عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے سنہرے بال تراشے ہوئے تھے اور اس نے برائے نام میک اپ کر رکھا تھا گوکہ وہ بد صورت نہیں تھی لیکن اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے اپنی وہ اسکول ٹیچر یاد آگئی جسے میں نے کبھی پسند نہیں کیا جس کی زندگی کا واحد مشن یہ تھا کہ وہ مجھے ایک ذہین طالب علم بنادے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اس میں ناکام رہی۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی مین۔" وہ عورت جیسے انداز میں ہائس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرا نام لینا ہے۔" وہ ناک سیکھرتے ہوئے بولی۔ "یہ یو کیسی ہے؟"

ہائس نے میگزین پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "میں مختلف اقسام کے پانچ سو سے زائد پر نیوم کی خوشبو پہچان سکتا ہوں لیکن تمہارے لباس کی تنگ میرے لیے اچھی ہے۔"

"مجھے تو یہ کسی تنہا کوئی بولگ رہی ہے۔" وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ہائس جو تنہا کو استعمال کرتا تھا اس کی ناگوار تنگ بعض اوقات ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی میں نے اس عورت کو کاؤنٹر پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آتی ہو؟"

"یہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔" ہائس نے کہا۔ "یہ میرے نام نہاد بھائی کی طرف سے آئی ہے اور مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

یہ سن کر ہم دونوں کے منہ حیرت سے کھل گئے اور

صلہ

میلا جی نے کبھی بتایا کہ یہ دونوں بھائی آپس میں کیوں نہیں ملتے؟

”وہ اس بارے میں بات کرتا نہیں چاہتا لیکن جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں کہ وہ اپنے بھائی کی حرکتوں سے نالاں ہے جو وہ اپنے آپ کو شر لاک ہو مڑ ثابت کرنے کے لیے کرتا رہتا ہے۔“

”کیا تم اس بارے میں جانتی ہو؟“

”میں نے اسے کریدا تو تم لوگوں کے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ میلا جی کو اسی بات کی شرمندگی ہے۔ وہ ڈرتا ہے کہ کہیں لوگ اس کے خاندان کے بارے میں غلط رائے نہ قائم کر لیں۔“

”کیا تم بھی ہا بس کو خطلی سمجھتی ہو؟“

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کی پروا نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے البتہ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ ایک اچھا سراغ رساں ہے اور اسی لیے میلا جی کو اس کی ضرورت ہے۔“

”کیا میلا جی مجھ سے بات کرنا پسند کرے گا۔“

”بالکل نہیں۔ اس نے مجھے یہاں آسنے سے منع کیا تھا۔ اگر اسے یہ معلوم ہو گیا تو شاید وہ کبھی مجھ سے بات نہیں کرے گا۔“

”اور تم ایسا نہیں چاہو گی۔“ میں نے چپتے ہوئے

لہجے میں کہا۔

وہ جانے کے لیے مڑی اور اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”نہیں۔“ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور شوخ لہجے میں بولی۔ ”میں ایسا نہیں چاہوں گی۔“ دوسری صبح میں انتظار کرتا رہا کہ ہا بس ناشتے سے فارغ ہو جائے تو اس سے بات کروں۔ دو کپ کافی اور ایک سلاٹس کھانے کے بعد میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”بھولو کیا بات ہے؟“

میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔ ”گو یا تمہارا ایک بھائی بھی ہے۔“

وہ کچھ کہے بغیر اٹھا اور پورچ سے صبح کا اخبار اٹھا لایا۔ پھر اس نے آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے اخبار کھولا اور اپنا چہرہ اس کے پیچھے چھپا لیا۔

”میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا نام شر لاک ہو مڑ اسرار برادر تھا۔ مجھے تو یہ کہانی بھی بالکل ویسی ہی لگ رہی ہے۔ وہ تم سے زیادہ اسرار ہے اور تم اس سے حسد کرتے ہو۔“

”اور تمہارا خیال ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتی البتہ میلا جی کو ضرور جانتی ہوں۔“

وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔“

”اور خود میلا جی کیا کہتا ہے؟“

”کھا رہے ہے کہ وہ اس سے انکار کر رہا ہے۔“

”تم اس لڑکی کے الفاظ کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی

ہو؟“

”کیونکہ ہمارے ہاں نے تحقیقات کا حکم دے دیا

ہے اور اس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ

تھانک میلا جی کے کریڈٹ کارڈ سے خریدے گئے تھے اور

ای میل بھی اسی کے کمپیوٹر سے بھیجی گئی ہیں۔ لہذا میلا جی کی

پوزیشن بہت خراب ہو گئی ہے۔ اگر ایسا ایک اور واقعہ ہو گیا

تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔“

بظاہر یہ کیس بہت سیدھا سا رہا تھا۔ وہ شخص ایک لڑکی

کی خاطر بے وقوف بن رہا تھا۔ ایسی کہانیاں میں ہمیشہ سے

سننا آتا ہوں اور اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ البتہ یہ بات

واضح تھی کہ لینا اس کے لیے گہرے جذبہ بات رکھتی تھی اور

میلا جی کے لیے اس کی وچپسی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔

”اب بتاؤ مسٹر مین۔“ ہا بس طنزیہ انداز میں بولا۔

”کیا تم یہ کیس لینے کے لیے تیار ہو؟“

میں نے اس کی جانب دیکھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ

پوری بات سننے کے بعد اس عورت کی مدد کرنے پر آمادہ

ہو جائے گا لیکن وہ لا تعلق بنا بیٹھا رہا۔

”میں اس بارے میں ضرور سوچوں گا۔“ میں نے

کن انکھیوں سے اس عورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

لینا کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔

ہا بس اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے مینیکل پیس پر سے تمباکو کا

پیکٹ اٹھایا اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

”چلو، میں تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔“

لینا اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھنے

لگی۔ ہا بس نے ماچس نکال کر پائپ سلگایا اور ایک گہرا کش

لے کر فضا میں دھواں چھوڑ دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ اب میں سمجھی کہ وہ کیسی تھی۔“ لینا برا

سامنے بناتے ہوئے بولی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں بھی

اس کے پیچھے پیچھے پورچ تک گیا اور بولا۔

”مجھے افسوس ہے لیکن وہ عام طور پر ایسا نہیں کرتا۔“

”مجھے بھی اس سے یہ امید نہیں تھی۔“ لینا بولی۔

”میں اس کے بھائی کے لیے ضرور کچھ کروں گا۔ کیا

جساتے ہوئے بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن مجھے ایسی باتوں سے نفرت ہے۔"

تقریباً دو گھنٹے تک باپ کے مسلسل کش لینے کے بعد ہانس نے اعلان کیا کہ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔

"تمہارے خیال میں اصل کہانی کیا ہے۔" میں نے

پوچھا۔ "کیا امبر جھوٹ بول رہی ہے؟"

"اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر واقعی اسے تحائف موصول ہوئے ہیں جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے اور میلاچی کے کریڈٹ کارڈ سے خریدے گئے ہیں تو یہ معاملہ جھوٹ سے بڑھ کر کچھ اور لگتا ہے۔ میرے بھائی کے کمپیوٹر سے جو پیغامات بھیجے گئے۔ اس سے تو یہی لگتا ہے کہ اس میں اندر کے کسی آدمی کا ہاتھ ہے۔"

"امبر بھی تو اندر کی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے اسی پر شبہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس معاملے میں کسی تیسرے فریق کے ملوث ہونے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

"گو یا تم لینا پر شک کر رہے ہو؟"

"نہیں، وہ میرے بھائی سے کافی قریب دکھائی دیتی ہے۔ اگر وہ اسے نوکری سے نکلوانا چاہتی تو ہمارے پاس مدد کے لیے کیوں آتی؟"

"گو یا ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔"

"ایسی بات بھی نہیں۔ اگر یہ کسی تیسرے فریق کی حرکت ہے تو پہلا سوال یہی ذہن میں آتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کر سہے گا؟"

"ہاں یہ سوچنے والی بات ہے۔"

"فرض کرو کہ وہ تیسرا فریق مسٹر ایکس، میلاچی کو ملازمت سے نکلوانا چاہتا ہے تو اس سے اسے کیا فائدہ ہوگا۔ میرے بھائی کی فطرت ایسی ہے کہ کوئی اس سے پیشہ وارانہ حسد نہیں کر سکتا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میلاچی کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو تیسرا فریق حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"وہ چیز کیا ہو سکتی ہے؟"

"وہ ایک جیتی جاگتی عورت ہے لینا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ شخص میلاچی کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے تاکہ لینا تک اس کی رسائی ممکن ہو سکے۔"

اس کی بات میں وزن تھا پھر بھی میں اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "وہ کوئی مس ایکس بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک سوئس صدی سے ہانس اور اس دور میں سب کچھ ممکن ہے۔ ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کوئی عورت

ہانس نے اخبار تھوڑا سا ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے بھائی سے حسد نہیں کرتا بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ سچ ہے کہ میلاچی مجھ سے زیادہ ذہین ہے اور اسی وجہ سے میں اس کی طرف سے مایوس ہو گیا ہوں۔"

"مایوس وہ کیسے؟"

"اس کا ذہن بہت اچھا ہے لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کو ڈانٹتا ہے جیسی معمولی ملازمت میں ضائع کر رہا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنی ذہانت کو قوم اور ساری دنیا کے مسائل حل کرنے میں استعمال کرے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر اخبار سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا لیکن میں اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ واقعی اس ڈاک لے جانے والی لڑکی امبر کو ہراساں کر رہا ہے۔"

اخبار کے پیچھے سے ایک ایسی آواز آئی جو گھوڑے کی ٹھنکار سے مشابہت رکھتی تھی۔ میں نے کہا۔ "کیا میں اس کا مطلب نہیں سمجھوں۔"

"میں اور میرا بھائی ایک ہی میٹرل کے بہنے ہوئے ہیں۔" ہانس نے کہا۔ "اور اگر اس کے ساتھ کچھ غلط ہو تو وہ جذباتی اور ذہنی اعتبار سے اس کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

"کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اسے ایک ایسے جرم کی پاداش میں ملازمت سے برخاست کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا۔"

"میری خواہش ہے کہ وہ اس ملازمت سے فارغ ہو جائے، چاہے اس کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے تاکہ وہ مجبور ہو کر کوئی بہتر ملازمت تلاش کرے۔"

"کیا تم نے کبھی کسی ملازمت کے لیے درخواست دی ہے۔ ہر جگہ گزشتہ ملازمت کے بارے میں پوچھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ پہلے والی ملازمت کیوں چھوڑی۔ ذرا سوچو اس وقت کیا ہوگا جب وہ یہ بتائے گا کہ اسے ایک لڑکی کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کے الزام میں ملازمت سے برطرف کیا گیا تھا۔"

ہانس نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اخبار میں مشغول رہا۔

"وہ خوش قسمت ہوگا اگر اسے کسی کفن دفن کی دکان پر رات کی شفٹ میں کام مل جائے۔ کیا تم یہی چاہتے ہو؟"

ہانس نے اخبار نیچے کیا اور میرے چہرے پر نظریں

برابر والے کاؤنٹر پر ایک چندھیا کی ہوئی آنکھوں اور سپاٹ چہرے والا شخص بیٹھا ہوا تھا؟ اس کے بال مہین اور جلد اتنی زرد تھی کہ جیسے اس نے تیزاب میں غسل کیا ہو۔ اگر میرے کانوں میں اس کی آواز نہ آتی تو یہی شبہ ہوتا کہ وہ سو رہا ہے۔ اس کے برابر میں لینا بیٹھی ہوئی تھی جس نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا اور خاص طور پر میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلدستے کو ہانک لیا ہی نظر انداز کر دیا۔

میرے لیے ایک طرح سے یہ اچھا ہی تھا کیونکہ اس وقت میری توجہ آخری کاؤنٹر پر بیٹھے ٹھکر کی طرف تھی۔ اس کا جسم درمیانہ، سیاہ آنکھیں، لمبی ناک اور سر پر گہرے گھنے بال تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ پھرتیلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک گاہک سے پارسل وصول کرنے کے بعد اسے ہاتھوں سے تولا اور بولا۔ ”دو پاؤنڈ چھ اونس“ پھر اس نے پارسل پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ”پارسل پوسٹ سے اس کے اخراجات 11.41 ڈالر ہوں گے اور یہ اگلی جمعرات کو مل جائے گا۔ ارجنٹ میل سے 13.05 ڈالر ہوں گے اور یہ کل تین بجے تک مل جائے گا۔“ گاہک حیرت سے منہ کھولے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ شاید سوچ رہا ہوگا کہ یہ انسان ہے یا کمپیوٹر جو اتنی روانی سے حساب لگا رہا ہے لیکن مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ وہ جنمیں ہابس کا بھائی میلا جی تھا۔ اس کی مستعدی کی وجہ سے لائن تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ جب میں کاؤنٹر کے قریب پہنچا تو وہ میری طرف متوجہ ہوا لیکن میں نے کہا۔

”شکریہ، میں اس خاتون کا انتظار کر دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے لینا کی طرف دیکھا جو ابھی تک یہ ظاہر کر رہی تھی جیسے اس نے مجھے نہیں دیکھا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ میلا جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”نیکسٹ۔“

میں وہاں کھڑا اپنے آپ کو احسب سمجھ رہا تھا کیونکہ قطار میں سے تین آدمی نکل کر مجھ سے آگے چلے گئے تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ لینا جان بوجھ کر مجھے انتظار کروا رہی ہے۔ ان دونوں نے مجھے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس دوران ہابس بھی قطار میں ایسی جگہ کھڑا ہو گیا کہ میں اسے نہ دیکھ سکوں۔ خدا خدا کر کے لینا کے پاس کھڑا ہوا گا ہک فارغ ہوا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“

میں نے اسے مسکرا کر دیکھا اور اس کی جانب پھولوں

میلا جی کو لینا سے دور کرنا چاہ رہی ہے۔“

ہابس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ امید نہ رکھنا کہ میں تمہارا شکر یہ ادا کروں گا۔“

ہم پروگرام کے مطابق کرشن پوسٹ آفس پہنچے تو وہاں بیرونی برآمدے میں کئی چھوٹے چھوٹے کاؤنٹر بنے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا جو مجھے لینا کے کاؤنٹر پر پہنچ کر اسے دینا تھا۔ ہابس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب میں لینا کو یہ گلدستہ پیش کروں گا تو یقیناً اس کے کسی ساتھی کی طرف سے حاسدانہ رد عمل سامنے آئے گا۔ میں نے ہابس سے پوچھا کہ وہ مجھے قربانی کا بکرا بنانے کے بجائے خود یہ کام کیوں نہیں کرتا تو اس کے پاس کا جواب بھی موجود تھا۔ ہابس کو زعم تھا کہ اس کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہے اور اس کا کام یہ ہوگا کہ جب میں لینا کے سامنے اپنی وارفتگی کا اظہار کروں تو وہ دور رہ کر اس کے ساتھیوں کا رد عمل دیکھے۔

میں نے اس خیال کو پسند نہیں کیا۔ ہابس کے برعکس مجھے ادا کار بننے کا کوئی شوق نہیں تھا اور نہ ہی مجھے یقین تھا کہ یہ کارنامہ سرانجام دے سکوں گا۔ لینا کافی پرکشش تھی لیکن میری پسند سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی وہ اسکول ٹیچر یاد آ جاتی جسے میں نے بھی پسند نہیں کیا۔

میرا قطار میں چھنا نمبر تھا۔ جب لینا کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ مجھے کسی گارڈن پارٹی میں بن بلایا مہمان سمجھ رہی ہو۔ اس کے باوجود میں نے زبردستی مسکراتے کی کوشش کی کیونکہ آنے والے مرحلے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اگر وہ ہابس کو پہچان لیتی تو شاید اسے زیادہ خوشی نہ ہوتی لیکن وہ بھی بدل کر آیا تھا۔ اس نے سفید بالوں والے بزرگ شہری کا روپ دھار رکھا تھا۔ چہرے پر سفید داڑھی اور ہاتھ میں چھری پھلور تھی۔ میں قطار میں کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے ڈبوں، لفافوں اور دوسری ڈاک کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی غیر ملکی زبان میں بڑبڑا رہا تھا جس کی وجہ سے وہاں پر موجود دوسرے لوگوں کے لیے اسے نظر انداز کرنا مشکل ہو گیا۔

اس کاؤنٹر کے چار حصے تھے۔ مجھ سے قریب ترین کھڑکی پر ایک فربہ اندام عورت اپنے خشک سیاہ بالوں کو پونی ٹیل کی صورت میں باندھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے

میں کہا۔ ”جلدی سے ہاں کہہ دو۔ اسے روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔“

اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور مٹھیاں بچھنی لیں پھر ٹکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ”میں ایک بچہ کر پندرہ منٹ پر تمہیں برگر کنگ میں ملوں گی لیکن وہاں تیس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔“

”اس وقت تک کے لیے خدا حافظ۔“ میں نے کہا اور پھولوں کا گلدستہ اس کے چہرے کے سامنے کر دیا جسے اس نے کاؤنٹر کے نیچے گرا دیا۔

باہر آنے سے پہلے میں اس موٹی عورت کے کاؤنٹر کے سامنے رک گیا۔ اسے آزمانے کے لیے میں نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیری اور پرسشوں نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ اس کا پورا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ یقیناً حسد کرتی تھی لیکن میلا جی سے نہیں بلکہ لینا سے۔ اس لیے مجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے میں نے اس عورت کی طرف بڑھ کر اپنے آپ کو گالی دی ہو لیکن دوسرے لمحے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ میرا مقصد صرف مشتہر افراد کی فہرست میں سے ایک نام خارج کرنا تھا۔

میں برگر کنگ جانے کے بجائے پوسٹ آفس کے عقب میں کھڑے ہو کر لینا کا انتظار کرنے لگا تاکہ اسے احساس ہو جائے کہ میں اس کے ساتھ لہجے کرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہوں۔ جب وہ برگر کنگ جانے کے لیے روانہ ہوئی تو میں بھی اس کے ساتھ ہولیا جس پر وہ خاصی براہم ہوئی۔ ریسٹوران پہنچ کر میں نے کھڑکی کے پاس ایک ایسی میز کا انتخاب کیا جہاں سے پوسٹ آفس صاف نظر آ رہا تھا۔ اگر کوئی میری جاسوسی کرتا تو وہ میری نظروں میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

مجھے اسکا ٹر ہاؤس بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ابھی تک بوڑھے کے روپ میں ایک بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا تھا جہاں سے وہ ہر وقت ریسٹوران اور پوسٹ آفس پر نظر رکھ سکتا تھا۔

لینا نے اپنا برگر اٹھایا اور بولی۔ ”کیا واقعی یہ کسی پلان کا حصہ ہے یا تم نے میرے ساتھ ڈیٹ پر آنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے؟“

”دوہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں کا خیال ہے کہ تمہارا کوئی ساکھی تم پر نظر رکھتا ہے اور شاید وہ اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے میلا جی کو پھاس رہا ہے۔“

”یہ محض احمقانہ بات ہے۔“

کا گلدستہ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم میرے ساتھ لہجے کرنا پسند کر دگی؟“

لینا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ میلا جی کی طرف دیکھا اور پھر سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“

میں نے اپنا کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر لکھا۔ ”یہ بھی ہاؤس کے منصوبے کا حصہ ہے۔“

اس کے باوجود وہ قائل نہیں ہوئی اور کہنے لگی۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ یہ ممکن ہوگا۔ تم دیکھ رہے ہو، ہم آج کتنے مصروف ہیں۔“

میں کن آنکھوں سے کاؤنٹر پر بیٹھے دوسرے کلرکوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابھی میں نے موٹی عورت کے گالوں کو سرخ ہوتے دیکھا اور سوچنے لگا کہ کیا ہاؤس کا منصوبہ کامیاب ہو رہا ہے۔

میں نے لینا سے کہا۔ ”یہ پھول اپنے پاس رکھ لو اور لہجے میں میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ تمہیں اس پر کوئی افسوس نہیں ہوگا۔“

وہ اسب بھی میری پیشکش قبول کرتے ہوئے ہنسی پکپک رہی تھی۔

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟“ عقب سے کسی کی غصے میں بھری آواز سنائی دی۔ ”ڈاک خانے کے ملازمین اپنے دوستوں کے ساتھ دل لگی میں مصروف ہیں جبکہ ہم لوگ جن کے ٹیکسوں سے انہیں تنخواہ ملتی ہے قطار میں کھڑے اپنی باری کے منتظر ہیں۔ جب میں یہاں آیا تو جوان تھا اور اب میرا کیا حال ہو گیا ہے۔“

مجھ سمیت سب لوگوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک بوڑھا شخص چھڑی چھڑی فضا میں لہرا کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ دوسرے گا ہک مسکرانے لگے۔ لیکن ان میں سے کچھ تائیدی انداز میں سر ہلا رہے تھے۔ کلرک بھی اپنا کام چھوڑ کر اس بوڑھے کو دیکھنے لگے۔ اس کے علاوہ محلے کے کچھ اور لوگ بھی ڈاک خانے کے عقبی حصے سے نکل کر آ گئے تھے۔ سب کی نظریں اس بوڑھے شخص یعنی ہاؤس اور لینا پر جم گئیں۔ البتہ میلا جی گرد پیش سے بے نیاز اپنے کام میں لگا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ہاؤس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ”تم نے میری پوری بات نہیں سنی تو جوان خاتون۔ میں پوسٹ ماسٹر جنرل اور صدر کو خط لکھوں گا۔“

”تم جانتی ہو یہ کون ہے؟“ میں نے لینا سے سرگوشی

صلہ



بول کر لیے اور ایک بار پھر توج پر آنے کے لیے تیار ہو گئی۔ دونوں ٹکرک یعنی وہ موٹی غورت اور چندھیائی آنکھوں والا بھی ڈیوٹی پر تھے۔ اس بار ہا بس نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا تھا۔ وہ ایک لمبی ڈانگری اور پرانی سی بیس بال کیپ پہنے کوئی موٹر مکینک لگ رہا تھا۔

کنج کے دوران لینا خاموش اور بھیجی سی تھی کیونکہ میلا جی نے اسے گزشتہ روز سے بالکل نظر انداز کیا ہوا تھا اور اسے ڈر تھا کہ اس کے بغیر وہ مر جائے گی۔ ہا بس ایک بار پھر بس اسٹاپ پر کھڑا ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ جب میں لینا کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔ گوکہ میں جانتا تھا کہ اس تحقیقات سے کچھ حاصل نہ ہوگا لیکن ہا بس کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہ رہا تھا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا لہذا میں نے اپنی کارروائی جاری رکھی اور لینا پر یہ ظاہر کرتا رہا کہ اس کے ساتھ تیس منٹ گزار کر مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔

میں لینا کو چھوڑ کر واپس جانے والا تھا کہ اچانک شور اٹھا اور گاؤنٹر کے پاس سے کسی کے چیخنے کی آواز آنے لگی۔ میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا تو دیکھا کہ میلا جی حیران پریشان کھڑا ہوا ہے۔ اس کے گال سرخ ہو رہے تھے اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ وہ بے یقینی یا تردید کرنے کے انداز میں سر ہل رہا تھا اور اس کے قریب ہی ایک خوب صورت لڑکی ڈاک تقسیم کرنے والے کی وردی پہنے اس پر برس رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی جیب

”کون سا حصہ؟“ میں نے چپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”یعنی یہ کہ کوئی تم پر نظر رکھے ہوئے ہے یا تم نے میلا جی کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔“

اس کا چہرہ ایک لخت گلابی ہو گیا اور وہ بولی۔ ”میری نظر میں دونوں ہی باتیں احمقانہ ہیں۔ اب ہم اسکول میں نہیں پڑھ رہے بلکہ بالغ ہو چکے ہیں۔“

”کیا بالغان پر پابندی ہے کہ وہ کسی میں دلچسپی نہیں لے سکتے؟“

اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور برگر کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”بہر حال، وہاں کوئی بھی مجھ میں دلچسپی نہیں لیتا، کوئی بھی نہیں۔“

”کیا میلا جی بھی نہیں؟“

”وہ دوسروں کے مقابلے میں سب سے کم ہے۔“

اس کے حلق میں کچھ پھنس گیا تھا جسے اس نے کوک کا ایک گھونٹ لے کر صاف کرنے کی کوشش کی۔

میں نے کسی کو پوسٹ آفس سے آتے دیکھا تو کہا۔

”مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آ رہا۔“

”کیوں؟“

میں نے وردازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خود ہی دیکھ لو۔“

اندر آنے والا شخص میلا جی ہا بس تھا۔ اس نے وردازے میں رک کر ریستوران کا جائزہ لیا۔ لینا اسے دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ ہلانے لگی۔ میلا جی کو یوں جھٹکا لگا جیسے وہ کسی چٹان سے ٹکرا گیا ہو۔ اس نے شانسی سے سرخم کیا اور گاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ اس نے اپنے لیے کسی چیز کا آرڈر دیا۔ اس دوران اس کی پشت ہماری طرف رہی۔ پھر وہ اپنا مطلوبہ سامان لے کر تیزی سے واپس چلا گیا۔

ہا بس ابھی تک بس اسٹاپ پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میلا جی اس پر نظر ڈالے بغیر اس کے پاس سے گزر گیا یا تو وہ اتنا اسرارٹ نہیں تھا جتنا ہا بس سمجھتا تھا یا پھر محبت نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ گوکہ پہلے دن ہمیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی لیکن ہا بس کا اصرار تھا کہ اس مشق کو جاری رکھا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن میں پھر پوسٹ آفس پہنچ گیا۔ اس بار میرے ہاتھ میں دل کی شکل کا بنا ہوا غبارہ اور ایک ٹیڈی بیر تھا۔ میلا جی نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور اپنے گاؤنٹر پر Closed کی تختی رکھ کر اندر غائب ہو گیا۔

لینا بھی کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس نے اپنا سبق یاد کر رکھا تھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر میرے تھانف

سال تھی اور وہ پورٹ لینڈ جینڈ کے پنک مارٹن کا زبردست مداح تھا۔ اس کی پسندیدہ آئس کریم روکی روڈ تھی۔ اس نے پورٹ لینڈ کمیونٹی کالج میں دو سیمسٹر تعلیم حاصل کی لیکن اکتانکس اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی لہذا اس نے پوسٹل سروس میں شمولیت اختیار کر لی اور چھ سال گزر جانے کے باوجود بھی کاؤنٹر کلرک ہی تھا اور یہ سب سے اونچی پوزیشن تھی جو وہ حاصل کر سکتا تھا لیکن وہ اس ملازمت سے مطمئن تھا۔ اس کے پاس بی ایم ڈبلیو کا رتھی اور اس نے اپنے بھائی ٹاڈ کے ساتھ مل کر تار تھ دیسٹ پورٹ لینڈ کے علاقے میں کرائے پر مکان لے رکھا تھا جس کا ماہانہ کرایہ تقریباً تین ہزار ڈالر تھا۔

اس کا بھائی ٹاڈ بھی دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اسے بیسن ہائی اسکول سے نکال دیا گیا اور وہ کئی بار جیل جا چکا تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست میں دکانوں کے تالے توڑنے سے لے کر جعلی چیک لکھنے تک ہر طرح کا چھوٹا بڑا جرم شامل تھا۔ اب یہی دونوں بھائی ہماری تحقیقات کا مرکز تھے۔ شام ساڑھے سات بجے جب اندھیرا پھیلنے لگا تو ہم مطلوبہ مکان پر پہنچ گئے اور خوش قسمتی سے ہمیں گاڑی کھڑی کرنے کے لیے ایسی جگہ مل گئی جو مکان سے نظر آسکتی تھی۔ کھڑکیوں پر ویز پر دے پڑے ہوئے تھے اور پورچ کی روشنیاں بند تھیں جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ تاہم میں نے احتیاطی تدبیر کے طور پر دو مرتبہ ان کا فون نمبر ملایا لیکن کھنٹی بجتی رہی اور کسی نے فون نہیں اٹھایا۔

جب ہمیں مکمل یقین ہو گیا تو دروازے کی طرف بڑھے لیکن اندر جانے سے پہلے میں نے دروازے کی کھنٹی بجائی اور جب پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے تو ہاؤس نے اپنا چھوٹا سا تھیلا نکالا جس میں تالا کھولنے کے اوزار اور مختلف چابیاں تھیں۔ ہاؤس نے دو بار یک تار نکال کر تالے کے سوراخ میں ڈالے اور سیکنڈ میں دروازہ کھل گیا۔ ہاؤس جاسوسوں والے مخصوص انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس کی نظریں باریک بینی سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے تصویروں کے فریم کے پیچھے جھانکا۔ قالین ہٹا کر دیکھے اور اپنے صدمہ سے مدد سے نہ جانے کیا تلاش کرتا رہا جبکہ میں سیدھا کمپیوٹر کی طرف گیا۔ وہاں میز پر ایک لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں تحقیقات شروع کر دیں گوکہ اس میں پاس ورڈ لگا ہوا تھا اور کوئی بھی عام انسان

سے سرخ سلک کے کھڑوں کا ایک بنڈل نکالا اور اسے کاؤنٹر پر پٹخ دیا۔ میلاچی پنک جھپکائے بغیر اس بنڈل کو دیکھ رہا تھا جیسے ابھی ردے گا۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا لیکن حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

امبر بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ ستواں ٹاک، چہرے کے دلکش نقوش اور متناسب جسمانی خطوط جو ردی میں بھی نمایاں تھے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک ڈاک لے جانے والی لڑکی میں ہونی چاہئیں۔ اگر وہ ہمارے علاقے میں ڈاک تقسیم کرتی تو میں ہر روز اس کا انتظار کیا کرتا۔ اسے دیکھ کر پہلی بار مجھے میلاچی کی بے گناہی پر شبہ ہونے لگا۔ اگر کوئی شخص کسی لڑکی کی خاطر دیوانہ ہو جائے تو وہ امبر ہی ہو سکتی ہے۔

اس وقت میرے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ اس کا فون نمبر معلوم کر دوں لیکن عین اسی وقت ایک شخص سوٹ اور ٹائی میں ملبوس عجبیہ کمرے سے برآمد ہوا اور میلاچی کے چہرے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری یہ حرکت ناقابل معافی ہے۔ تمہیں فوری طور پر معطل کیا جاتا ہے اور میں پوری کوشش کروں گا کہ تم دوبارہ کہیں بھی کام نہ کر سکو۔ اپنا سامان سمیٹو اور فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔“

میں ہاؤس کا رد عمل جاننے کے لیے مڑا لیکن سپاٹ چہرے والے شخص پر نظر پڑتے ہی رک گیا۔ اس کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ وہ جذبات سے عاری نظر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور مجھے یہ جاننے میں بالکل بھی مشکل پیش نہیں آئی کہ وہی میلاچی کو پریشان کرنے کا ڈنٹے دار ہے۔

میں نے ہاؤس کو مضطرب انداز میں بیرونی برآمدے میں ٹھلکتے دیکھا تو بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے مطلوبہ شخص کو دیکھ لیا ہے۔“

اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی اور وہ بولا۔ ”مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اگر مناسب وقت دیا جائے تو ہمارا مجرم خود کو ظاہر کر دے گا۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا ہے۔“

سپاٹ چہرے والے شخص کا نام ٹیڈ فلیس تھا اور وہ کھنٹے کے اندر میں نے اس کے بارے میں اتنا کچھ جان لیا۔ جتنا وہ خود اپنے بارے میں جانتا ہوگا۔ فلیس بک اور دوسرے قانونی ذرائع سے مجھے معلوم ہوا کہ اس کی عمر تیس

صلہ

”ہمارے پاس چھپنے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔“ اس نے لینا کو چھپتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف امید کر سکتا ہوں کہ ہم سب اس عورت کے پر لوم کی خوشبو سے نہیں پکڑے جائیں گے۔“

لینا نے زبان نکال کر اس کا منہ چڑایا اور ہم سب چھپنے کی جگہ تلاش کرنے لگے۔ ہابس الماری میں چھپ گیا۔ لینا رینگتی ہوئی صوفے کے پیچھے چلی گئی اور میں نے دفتر کی جانب دوڑ لگا دی۔ اب سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا لہذا میں دروازے کے پیچھے چھپ گیا اور اس کی اوٹ سے لونگ روم کی طرف جھانکنے لگا۔

ٹیڈ فلپس سامان سے بھرا ہوا تھیلے کر اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں اس کا بھائی تھا جو ٹیڈ کا ہم شکل ہونے کے باوجود قد و قامت میں اس سے کہیں زیادہ تھا۔ ٹیڈ کچن کی طرف بڑھا اور تھیلے سے سامان نکال کر مقررہ جگہ پر رکھنے لگا جبکہ ٹیڈ نے اپنی جیکٹ اتاری اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

”کچھ پینے کے لیے لاؤ بھائی۔“ اس نے کرخت آواز میں کہا۔ ٹیڈ نے حکم کی تعمیل کی اور ایک ٹرے میں دو بوتلیں اور گلاس لے کر آ گیا۔ ٹیڈ نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور بولا۔

”کاش میں بھی وہ نظارہ دیکھ سکتا۔“ ٹیڈ نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ اس بار وہ نہیں بچے گا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔“

”اگر تمہیں یہ معلوم ہوتا کہ کیا کر رہے ہو تو وہ کبھی تمہارے بارے میں جان نہ پاتا اور تم ہمیشہ بھی سمجھتے رہے کہ بہت زیادہ عقل مند اور اساتذہ ہو۔“

”یقیناً۔“ ٹیڈ نے کہا۔ ”اب تم مجھے الزام دے رہے ہو جبکہ میں نے سارا خطرہ مول لیا۔ جبکہ تمہیں صرف اس سامان کو فروخت کرنا ہوتا تھا اور تم پچھلے چند دنوں سے یہ کام بھی نہیں کر رہے تھے۔“

ٹیڈ نے اسے ہاتھ سے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”تم نے کوئی پوچھس کی؟“

”کیسی پو؟“ ٹیڈ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا، اس کی آنکھیں پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر دونوں کمرے میں گھسنے لگے۔ وہ بار بار ناک سکیڑ کر کچھ سوچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب ٹیڈ صوفے کے قریب پہنچا تو میں نے اپنی

اسے کھولے بغیر کمپیوٹر پر کام نہیں کر سکتا لیکن میں تو کمپیوٹر ڈاکٹر ہوں۔ میرے لیے یہ پاس ورڈ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

میں نے سرچ فیلڈ میں میلانجی ہابس کا نام ٹائپ کیا اور اسکرین پر کئی دستاویزات، تصویریں اور فائلیں نکل گئیں۔ میں نے تصویریں دیکھنا شروع کیں۔ ان میں میلانجی کا ڈرائیونگ لائسنس، ووکرڈنٹ کارڈ، لائبریری کارڈ اور ایک انشورنس کارڈ اسٹکین کے ہوئے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ٹیڈ فلپس کس طرح یہ تحائف مثلاً پھول، چاکلیٹ اور دیگر اشیاء امیر کو بھیجنے کے قابل ہوا۔

اس کے بعد میں نے میلانجی کے نام کی ایک اور فائل کھولی اور اسے دیکھ کر میرا سانس حلق میں اٹک گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حقیقت میں کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

”ہابس۔“ میں نے آواز لگائی۔ ”تم یقیناً اسے دیکھنا چاہو گے۔“

میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔ ہابس لونگ روم میں آیا اور ہماری نظریں الارم کی جانب اٹھ گئیں جو شاید کام نہیں کر رہا تھا۔ دروازے پر دستک بدستور جاری تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں ایک آواز سنائی دی۔

”میسن! مسٹر ہابس! میں جانتی ہوں کہ تم یہاں ہو۔ مجھے اندر آنے دو۔“

یہ آواز لینا کی تھی۔ ہابس نے میری طرف دیکھ کر برا سا منہ بنایا جیسے یہ بھی میری ہی غلطی ہو۔ میں نے اس کے دیکھنے کی پروا نہیں کی اور دروازہ کھولنے چلا گیا۔

”یہاں سے چلی جاؤ۔“ میں نے دروازے کی اوٹ سے کہا۔ ”ہم تمہارے لیے ہی کام کر رہے ہیں اور تقریباً کیس کو حل کرنے کے قریب پہنچ گئے ہیں۔“

”میں نے تمہارا تعاقب کیا۔“ اس کی آنکھوں سے جوش جھلک رہا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم کس چیز کی تلاش میں ہو اور میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا مکان کے سامنے والے صے پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑی۔ میں نے جلدی سے اسے اندر بھیج کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر میں نے دروازے کی درز سے جھانک کر دیکھا۔ ایک بی ایم ڈی بیوڈرائیوڈے میں داخل ہو رہی تھی۔

”وہ واپس آگئے ہیں۔“ میں نے ہابس سے کہا۔

مزید وار کرتا لیکن لینا نے ناؤ کے سر پر نیل لپ دے مارا، اور وہ وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

ٹیڈ نے میرے جڑے پر ایک اور مکا مارا، اس کے بعد پسلیوں پر ضرب لگائی اور مجھے بالکل بے بس کر دیا۔ اب مجھے فیصلہ کن کارروائی کرنا تھی۔ میں نے لپک کر صوفے پر سے لپ ٹاپ اٹھایا اور جیسے ہی گھوما اس نے میرے جڑے پر ایک اور گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے جلدی سے لپ ٹاپ سامنے کر لیا۔ اس کا گھونسا لپ ٹاپ سے ٹکرایا تو کسی چیز کے چٹنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ لپ ٹاپ کی ہارڈ ڈسک ضائع ہو گئی اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے پوری قوت سے گھونسا مارا تھا اور لپ ٹاپ پر ٹکنے سے اس کے ہاتھ میں شدید چوٹ آئی ہو۔ جیسے ہی وہ لڑکھڑایا میں نے اس کی ٹھوڑی پر لپ ٹاپ سے ضرب لگائی اور وہ بھی بے ہوش ہو گیا۔

ہاں اور لینا حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انجان بفتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا؟" "میں حیران ہو رہا ہوں ڈاکٹر۔" ہاں نے کہا۔ "میں نے کبھی تمہیں اس طرح طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

جب ہم نے دونوں بھائیوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے تو لینا نے ہاں پر عصہ اتارتے ہوئے کہا۔ "تم تو کہہ رہے تھے کہ میرے پر فیوم کی خوشبو سے وہ ہم تک پہنچ جائیں گے لیکن اب کیا ہوا۔ تمہارے تمباکو کی ناگوار بو نے ہی تمہیں پکڑا دیا۔"

ہاں نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس تم سے فضول بحث کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے مادام! البتہ تم سے اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے بھائی کو فون کر کے فوراً یہاں بلا لو۔"

"میلاجی؟ کیوں؟"

"تم صرف اسے فون کر دو۔" ہاں نے کہا۔ "اور اس سے کہنا کہ تم مشکل میں ہو اور اس کی مدد درکار ہے۔ جب تم فون کر چکو تو مزید ہدایات دوں گا۔"

لینا نے ہاں کے کہنے پر عمل کیا اور اس کے بعد ہاں نے اسے کچھ ہدایات دیں۔ دس منٹ بعد ہم دونوں اپنی کار میں بیٹھے میلاجی کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ نظر آیا میں نے نو گیارہ ڈائل کیا اور فون ہاں کو پکڑا دیا۔

"میرا نام میلاجی ہاں ہے۔" اس نے آواز بدل کر کہا۔ "اور میں نے ابھی ابھی دو ایسے افراد کو پکڑا ہے جو

سائنس روک لی۔ شاید ہاں نے لینا کے پر فیوم کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا لیکن ناؤ اس سے زیادہ تیز نکلا۔ اس نے الماری کا دروازہ کھولا جہاں اسکا ٹر ہاں حیرت کے مارے پلکیں جھپک رہا تھا۔

"میں سمجھ گیا تھا۔" ناؤ نے کہا۔ "یہ کسی تمباکو کی خوشبو ہے۔" اس نے ہاں کو گردن سے پکڑا اور الماری سے باہر نکلیا اور ٹیڈ سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟" ٹیڈ نے لٹی میں سر ہلایا اور بولا۔ "میں نہیں جانتا لیکن یہ کوئی جانا پہچانا لگتا ہے۔"

دونوں بھائیوں کی پشت دفتر کی جانب تھی اور میرے لیے کارروائی کرنے کا یہ اچھا موقع تھا، میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکوں۔ مثلاً بیس بال کا بلا، آتش دان کا بیچ یا دیوار پر لگی ہوئی آرائشی کوار وغیرہ لیکن مجھے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کون ہے لیکن یہ یہاں سے زندہ واپس نہیں جائے گا۔" ناؤ نے کہا۔

ہاں ہو کر میں نے میز پر سے لپ ٹاپ اٹھایا اور خاموشی سے لیوٹنگ روم میں داخل ہو گیا گوکہ میں نے پوری احتیاط کی تھی لیکن قدموں کی آہٹ ان تک پہنچ گئی۔ وہ حمزہ سے گھوڑے اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے لپ ٹاپ اوپر اٹھایا اور بولا۔ "اس میں تمہاری حرکتوں کے بارے میں تمام ثبوت موجود ہیں اگر تمہیں اس کی ضرورت ہے تو ہاں کو جانے دو۔"

ٹیڈ نے کہا۔ "ہاں! اور ناؤ گھوم کر اسے دیکھنے لگا۔ ہاں کے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی، اس نے اپنا گھٹنا ناؤ کے جسم کے نازک حصے پر مارا، اور اس کے ساتھ ہی ٹیڈ کے کان پر گہنی سے وار کیا میں نے لپ ٹاپ صوفے پر رکھا اور اس جنگ میں شامل ہو گیا لیکن ٹیڈ نے تیزی سے میرے گردے پر ضرب لگائی۔ میں نے پلٹ کر اس کے سر پر گھونسا رسید کیا لیکن اس نے جواب میں میرے پیٹ پر لامت رسید کی اور مجھے لگا کہ اب میرے لیے اس جنگ میں مزید حصہ لینا مشکل ہے۔

اس دوران ہاں نے مارشل آرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناؤ کو گھٹن چکر بنا دیا۔ وہ اس کے حملوں سے بچنے کے لیے کبھی کمرے کے ایک طرف جاتا اور کبھی دوسری جانب، اس نے اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے کافی ٹیل کا ایک کونا پکڑ لیا اور اس سے لنگ گیا۔ ممکن تھا کہ ہاں اس پر

"خوش قسمتی!" میں نے طنزیہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ ثبوت الماری میں چھپنے سے پہلے حاصل کیے یا بعد میں؟"

اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یڈ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میلاجی نے اسے دفتر سے سامان چراتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ جب اس نے اس خدشے کا اظہار اپنے بھائی ناڈ سے کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ اسے کسی بھی طرح راستے سے ہٹا دیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا بھائی واقعی ان کے جرائم سے واقف ہو چکا تھا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی ساتھی لینا کے لیے پسندیدہ جذبات رکھتا تھا۔"

"اوہ۔ تبھی آج وہ دونوں ڈیٹ پر جا رہے ہیں۔"

ہابس کا چہرہ سفید ہو گیا اور اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ میں چاہتا تو اس موضوع پر مزید بات کر سکتا تھا لیکن یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس رخ حقیقت کو قبول کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس کا بھائی جسے وہ ذہانت میں اپنے سے برتر سمجھتا تھا کسی عورت کی محبت میں گرفتار ہو سکتا ہے۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہابس۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "وہ دو مرتبہ میرے ساتھ ڈیٹ پر چلی جائے تو وہ جان لے گی کہ تمہارا بھائی کس قدر بورخص ہے۔ ذہانت، خوب صورتی کا متبادل نہیں ہو سکتی۔" "اور خوب صورتی۔" ہابس نے تیزی سے کہا۔ "یقیناً ذہانت کا بدل نہیں ہے۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ جیکٹ ٹھیک کی اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگا جہاں اب بھی چند زخموں کے نشان تھے اور میرا ہونٹ بھی سوجا ہوا تھا۔

"تم کہیں باہر جا رہے ہو؟" ہابس نے پوچھا۔

"ہاں، اور تم اپنی حیرت انگیز قوت مشاہدہ سے معلوم کر سکتے ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔"

"اس نے میرے طنز کو نظر انداز کر دیا اور بولا۔ "یقیناً کوئی فضول سی فلم دیکھنے جا رہے ہو۔"

"کسی حد تک تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہیں بتانے میں کوئی ہرج محسوس نہیں کرتا کہ میں بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں اور آج اس ڈاک ہانٹنے والی لڑکی امبر کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا ہوں۔"

شاید مجھے میری محنت کا اس سے بہتر صلہ نہیں مل سکتا۔

بڑے پیمانے پر چوری میں ملوث ہیں۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور بولا۔ "یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ میرے پاس ان کے جرائم کے کافی ثبوت موجود ہیں اور میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ تم یہاں آ کر انہیں اپنی تحویل میں لے لو۔"

اگلی شام حالات معمول پر آ گئے۔ ہابس اپنی آرام کرسی پر نیم دراز جرائم سے نمٹنے کی ٹیکنیک کے موضوع پر کوئی کتاب پڑھ رہا تھا جب مجھے لینا کی طرف سے ایک طویل ای میل موصول ہوئی۔ میں نے ہابس سے کہا۔ "تمہاری ہدایات کے مطابق لینا نے اس کیس میں ہماری شمولیت کے بارے میں میلاجی کو کچھ نہیں بتایا لیکن تم کیوں نہیں چاہتے کہ اسے یہ بات معلوم ہو۔"

"مجھے اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔" اس نے کہا۔

"میں نے جو کچھ کیا، اس میں میری اپنی غرض شامل تھی۔"

"یہ کیسی محبت ہے کہ تم دونوں بھائی آپس میں بات نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "جبکہ فلیس برادرز ایک دوسرے کو بچانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔"

ہابس نے ٹاک سکریٹری اور دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم بقیہ خبریں سننا نہیں چاہو گے؟" میں نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔ "مجھے پہلے ہی تازہ ترین پیش رفت کے بارے میں سب معلوم ہو چکا ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ تم تو سارا دن اس کرسی سے ہلے تک نہیں۔"

"اس صورت حال کا ایک ہی ممکنہ نتیجہ لگتا تھا جو میں نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر معلوم کر لیا۔"

"تم کہہ رہے ہو تو مان لیتا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اس ای میل میں کیا لکھا ہے۔"

ہابس نے کتاب پر سے نظریں ہٹائیں اور ٹھنڈی سانس لینے ہوئے بولا۔ "میرے بھائی کا پاس اور اس کیس پر کام کرنے والے فیڈرل ایجنٹس میلاجی کے ردل سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسے پوسٹل انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دینے کی سفارش کی ہے۔"

"اور تم کیا کچھ جانتے ہو؟"

"تم تو اس کہیوٹر کو تباہ کرنے والے تھے جس میں سارا ثبوت موجود ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے فلیس کے بھائی کی الماری سے ای میل کا بیک اپ کیا جن سے ان

بھائیوں کی چوری ثابت ہوئی۔"

جوابی چال

امجد رئیس



اس نے ایک خوبصورت چال چلی ... مہرہ بھی خوب چٹا تھا جس نے کوئی جرم کیے بغیر بساٹ پر مات سجادی ... شاطر کو خبر تھی نہ مہرے کو بھٹک ملی کہ جوابی چال کیا آنے والی ہے ... حریف مات کھانے کے لیے آمادہ نہ تھا ... اس نے بساٹ ہی الٹ دی۔

ایک اداکار اور اداکارہ کی بڑھتی ہوئی بڑے فنکار تھے

”مسٹر موراندر آجائیں۔“ مارٹا نے تاثر سے عاری آواز میں کہا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر اس کے لیے راستہ صاف کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ مور نے اداکارہ کے فرنٹ روم کی ٹیس آرکس کا جائزہ لیا۔ مارٹا نے جب اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو مور کا سر غیر محسوس انداز میں لفی میں ہلا تھا۔

وہ آدمی دروازہ قامت تھا۔ رنگت میں زردی کی آمیزش تھی۔ چہرہ ہتھیریلے تاثرات کا حامل تھا۔ اگر جیک دی ریپر پر مودی بنائی جاتی تو وہ اس کردار میں فٹ ہو جاتا۔ مارٹا کلورٹ پگچا ہٹ کا شکار تھی کہ اسے اندر آنے دے پائیں۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ محض ظاہری حالت کی بنا پر کوئی فیصلہ کرنا نامناسب ہوگا۔

اس نے اپنا نام مور بتایا تھا۔

”میں نے یہاں آنے میں تاخیر سے کام لیا ہے۔“

جاسوسی ڈائجسٹ

145

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

مارٹا نے سائڈ بورڈ کے پاس جا کر سگریٹ باکس نکالا۔ ”تم مجھے تفصیل بتانے کا خطرہ کیوں مول لے رہے ہو؟“ مارٹا نے سگریٹ سلگایا۔ ”اور تمہارا اصل نام کیا ہے۔ نیز کیا یہ بات تمہارے گینگ یا ادارے کو ناگوار نہیں گزرے گی؟“

”ان کو اس کی ہوا نہیں لگ پائے گی۔“
”اگر میں پولیس کو فون کر دوں تو کیا ان لوگوں کو پتا نہیں چل جائے گا۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ تم ایسا کر دو گی۔ دوسرے میں تمہیں اس بات کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔“ مور کا چہرہ کڑھکی اختیار کر گیا۔

مارٹا نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔
”تم یہ سب باتیں اس لیے کر رہے ہو کہ تم میرے ایک بڑے مداح ہو؟“

”حقیقت کچھ اس سے زیادہ ہے، مس مارٹا۔“
”اوہ، وہ کیا ہے؟“

”میں پانچ برس سے تمہاری محبت میں مبتلا ہوں۔“
اس نے دھمے لگے میں کہا۔ ”لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ فاصلے کی محبت ہے، اس میں کوئی آلودگی نہیں... نہ میں نے بھی تم سے ملنے کی کوشش کی۔ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو تم دو بارہ میری شکل نہیں دیکھ سکو گی۔ میں تمہیں ختم کرنا نہیں چاہتا۔“

کچھ دیر مارٹا اس کے الفاظ کو تولتی رہی۔ ”میں خوشی اور خوش فہمی دونوں محسوس کر رہی ہوں اور خوش قسمتی بھی۔ لیکن تم مجھے ایک ماہر قاتل دکھائی دیتے ہو؟“
”ہاں میں ایسا ہی ہوں۔“ مور کی آواز میں پھر خشکی در آئی۔

مارٹا نے بے چینی سے ایک طویل کش لیا اور سگریٹ بجھا دیا۔ ”تمہاری ڈیوٹی ہے کہ تم مجھے ختم کر دو۔ تم بظاہر ایسا کرنا نہیں چاہتے... پھر منصوبہ کیا ہے؟“

”مجھے جو کام سونپا گیا ہے، اس میں ایک شق ہے۔“
وہ رک کر پھر بولا۔ ”اگر تم آج رات کی فلائٹ سے یورپ چلی جاؤ تو تمہیں ختم کر لے کا فیصلہ بھی تحلیل ہو جائے گا۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ڈیوٹی نبھانے پر مجبور ہوں گا۔“ اس کی آواز میں تکلیف کا ہلکا سا عنصر ابھر کر غائب ہو گیا۔ تاہم مارٹا نے محسوس کر لیا۔ اس کے ہونٹ لڑاٹھے۔ وہ بات کی دہنگ پہنچ گئی تھی۔

”میکس لڑنا“ مارٹا نے ناگواری سے کہا۔ ”میں

وہ بولا۔ اس کے ہونٹوں نے فقرہ ادا کرنے کے لیے خفیف سی حرکت کی تھی۔ ”مجھے جو کہنا ہے، کہوں گا اور پھر چلا جاؤں گا۔ تاہم پہلے یہ بتا دوں کہ میں فون پر پوری طرح صاف گوئی سے کام نہیں لے سکتا تھا۔“
اداکارہ مارٹا کی سبز آنکھیں سکر گئیں۔

”یعنی تمہارے پاس ایسی کوئی اطلاع تو نہیں ہے جو میری زندگی اور موت سے متعلق ہو؟“

”نہیں، نہیں... کچھ تو حقیقت ہے۔ ہاں میں نے اپنا اصل نام نہیں بتایا تھا۔“

مارٹا کے دلکش نقوش میں تلخی نمودار ہوئی۔ اس نے مشکوک نظروں سے لمبے آدمی کو گھورا۔

وہ بولا۔ ”وضاحت کرنے سے پہلے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ میں یہ سب کچھ تمہیں کیوں بتا رہا ہوں؟ میں نے تمہارا ہر ڈراما دیکھا ہے... میں ایمان داری سے سمجھتا ہوں کہ تم ایک حسین تر عورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت اداکارہ بھی ہو۔ اسٹیج پر تم جیسی فنکارہ میں نے پہلے نہیں دیکھی۔“ مور نے کہا۔

”یہ کوئی ٹرک ہے، آنو گراف لینے کی؟“ مارٹا نے سوال کیا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا۔ تاہم مجبوراً، مجھے اصل بات تو بتانا پڑے گی لیکن میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ تمہیں نقصان پہنچانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“
اداکارہ نے اظہار حیرت کیا۔ ”مجھے نقصان پہنچانے کا سوال کیونکر پیدا ہو گیا؟“

”یہ میرا دھندا ہے۔“ مور کا لہجہ خشک تھا۔ میرا تعلق ایسے گینگ سے ہے جو مخصوص لوگوں کو ختم کرنے کے لیے مجھے معقول ادائیگی کرتا ہے۔“

مارٹا کی آنکھوں میں ہراس کی جھلک دکھائی دی۔
”تم کہنا چاہ رہے ہو کہ کسی نے مجھے ہلاک کرنے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں؟“
”گینگ نے مجھے یہ کام سونپا ہے۔ اگرچہ میں یہ نہیں کرنا چاہتا۔“

”کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی پھر مارٹا نے لب کشائی کی۔“ میرا کیا تعلق ہوتا ہے تمہارے دھندے سے اور درحقیقت کون مجھے ختم کرنا چاہتا ہے اور کیوں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“
”مجھے کام دیا گیا ہے۔ وجہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

مور نے دلچسپی سے مارٹا کو دیکھا۔ "تم اسے بلیک میل کرو گی؟"

”یہ کٹ تھروٹ بزنس ہے۔ ٹاپ پر رہنے کے لیے مستعد رہنا پڑتا ہے۔ میں نے یہ مقام محنت سے حاصل کیا ہے جبکہ لیون نے سٹریٹ، میکس کے بستر میں حاصل کیا تھا۔ میں جو کچھ کروں یہ قطعی جائز ہوگا۔“ مارٹا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”براؤ وے ٹیئر میں انسانی قدروں کا خیال رکھتے ہوئے اوپر نہیں جایا جاسکتا۔ لیکن میں نے یہ کر کے دکھایا ہے۔ یہ میرا حق ہے اور میں کوئی سمجھوتا نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ اگر میکس سیدھے راستے پر نہ آیا تو اسے سبق سکھانے کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔“ مور نے کندھے اچکائے۔ ”بہر حال اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جنہیں بہر حال میری پوزیشن سمجھنی چاہیے۔ تمہاری اصل پریشانی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اگر میں اپنا کام سرانجام نہیں دیتا تو میرے لیے شدید مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ گینگ ظاہر ہے رقم پکڑ چکا ہوگا۔ میں انکار کر کے خطرات خرید بھی لوں تو وہ تمہیں ختم کرنے کے لیے کسی اور کو بھیج دیں گے۔“ مور نے صورتِ حال کی وضاحت کی۔

جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے متفر ہے۔ لیکن وہ اس حد تک چلا جائے گا... وہ پاگل ہو گیا ہے۔“

”میں میکس فرزند کو نہیں جانتا۔ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“
 ”تمہارے گینگ کو پتا ہوگا۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ
 میکس نے تمہارے گینگ کے ذریعے تمہیں ہار کیا ہے۔“
 ”کیوں؟“

”میں اس کے نئے ڈرامے میں لیڈنگ رول کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ جبکہ وہ لیون جوڑن کو سائن کر چکا ہے۔ اگر میکس مجھے راستے سے نہ ہٹا سکا تو لیون اس پر مقدمہ کر دے گی۔ میرا نام پہلے مشتہر ہو چکا تھا۔ میں اس کے لیے لیون سے زیادہ مصیبت کھڑی کر سکتی ہوں۔“ ہارٹا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”میں نے پڑھا تھا کہ تم فرانس میں مووی رول پلے کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔“ مور نے کہا۔

”وہ رول اتنا جاندار نہیں ہے۔ میکس کے ذرا سے
میں میرا لڈنگ رول تھلکے چاؤے گا۔“ میکس جانتا ہے کہ
میں فرانس نہیں جا رہی۔۔۔۔۔ اگر اس نے آج شام تک
میرے حق میں فیصلہ نہیں کیا تو میں لیون کے بارے میں اس
کی بیوی کو بتاؤں گی اور تم سمجھ سکتے ہو کہ میں کیا بتاؤں گی۔“
مارٹا تھلکا کے بولی۔

[illegible]

کام ختم کر کے چلا جاتا۔ ایک بار پھر شکریہ۔

☆☆☆

دراز قامت، لرزرو شخص جب میکس کے دفتر میں داخل ہوا تو چکنے سروالے پر ڈیوسر کی آنکھوں میں ٹھکر کی پر چھائیاں تھیں۔ امید و بیم کی کیفیت تھی۔

”کام بن گیا، جان؟“ میکس کا پہلا سوال تھا۔ لبا آدی ایک آرام دہ نشست پر براجمان ہو گیا اور میکس کی بے قراری سے لطف اندوز ہونے لگا۔

”تم نے جواب نہیں دیا؟“ میکس کی بے چینی بڑھ گئی۔

جان نے جواب دیا۔ ”میں اپنے وقت کا بہترین مینسٹر ادا کار تھا۔ مارتا نے فرانس کے لیے فلائٹ پکڑ لی ہے۔“

”اس نے تمہیں پہچانا تو نہیں؟“ میکس نے دوسرا سوال کیا۔

جان نے منہ بتایا۔ ”احقانہ سوال ہے۔ دروازہ کھلنے اور اندر جانے کے پانچ منٹ کے اندر میں نے تاڑ لیا تھا کہ وہ مجھے اصلی اجرت یافتہ قاتل سمجھ رہی ہے۔۔۔ اور وہ پہچانتی بھی کیسے؟ اسے صرف براڈوے سے دلچسپی ہے۔ مزید یہ کہ براڈوے تھیز میں اسے زیادہ سے زیادہ آٹھ برس بیٹے ہوں گے۔ جبکہ میں کلیولینڈ ٹھہر میں شوکر تا تھا۔ وہ بھی دس برس پرانی بات ہے۔“

میکس نے سکون کی سانس لی۔ ”وہ میری توقع سے زیادہ چالاک نکلی۔ اس کے پاس میری اور لیون کی پگھل تھیں۔“

”ایسا ہے تو وہ فرانس سے بھی ریکارڈنگ تمہاری بیوی کو ارسال کر سکتی ہے؟“ جان نے کہا۔

”فی الحال تو خطرہ مل گیا ہے لیکن تمہاری کیا رائے ہے؟“

”تو کسی اور کے ذریعے خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔“

”نہیں..... نہیں..... یہ میرے بس میں نہیں ہے۔“

میکس نے چند یا پر ہاتھ پھیرا۔

”بہر حال میں نے جو ڈراما کیا ہے وہ میرا خیال ہے کہ وہ یہ حرکت نہیں کرے گی۔ اسے فرضی گینگ نے خوف زدہ کر دیا ہے۔ لیکن تمہاری بھی غلطی ہے۔ اگر تم پوری بات مجھے بتا دیتے تو میں وہ ٹیپ بھی وصول کر لیتا۔“ جان نے کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کیا تم ان رپورٹ تک نہیں جا سکتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آخری وقت میں ارادہ بدل دے۔“

”ٹھیک ہے چلا جاؤں گا۔“ جان نے گھڑی دیکھی۔

”جیسے ہی مجھے اطلاع ملی کہ وہ فلائی کر چکی ہے۔ سمجھو کہ آنے والے ڈرامے میں تمہارا پارٹ بکا ہے۔ اب

مارتا کے چہرے کی سرخی، زردی میں تبدیلی ہونے لگی۔ کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔

مارتا نے کانپتے ہاتھوں سے ایک اور سگریٹ سلگایا۔ ”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے کمزور آواز میں سوال کیا۔

”ایک ہی راستہ ہے جو مجھ سمیت سب کے مسئلے حل کر دے گا۔ ہاں، البتہ کیریئر کے اعتبار سے تم کسی حد تک نقصان میں رہو گی۔ لیکن یہ جان سے قیمتی نہیں ہے۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”تم فرانس کی فلائٹ پکڑ لو۔ میں اس بات کی رپورٹ گینگ کو کر دوں گا۔ تمام مسئلے ختم ہو جائیں گے۔“ مور نے سپاٹ آواز میں حل پیش کیا۔

”اور میں اس طرح براڈوے میں لائف ٹائم چانس کھودوں؟“

مور شانے اچکا کر رہ گیا۔ ”قبرستان میں رہ کر کوئی سپراسٹار نہیں بن سکتا۔“

مارتا نے کمرے میں ٹھہنا شروع کر دیا۔ وہ تیزی سے سگریٹ پھونک رہی تھی۔

”اچانک وہ رک گئی۔“ اگر میں تمہیں باڈی گارڈ رکھ لوں؟“

”میری خودکشی ہو گی۔ ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔“ مور نے سنجیدگی سے صاف جواب دیا۔

مارتا نے ایک اور سگریٹ نکالا پھر رک گئی۔

”تمہارے خیال میں کوئی چانس؟“

”کو چانس۔“

”میں فلائٹ پکڑ لوں تو سب ٹھیک رہے گا؟“ وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

”ہاں۔“ مور نے بنے تاثر آواز میں کہا۔ ”تم فرانس جا کر مووی میں حصہ لو۔ تمہارے اندر صلاحیت ہے وہ تم آگے بڑھ سکتی ہو۔ براڈوے، میکس اور لیون کو جہنم میں جمو گلو۔ زندگی کے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے کرو۔“

”ہاں جہنم میں جمو گلو۔“ مارتا کے لبوں پر خفیف سی ناقابل فہم مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔ اس کے چہرے کے نارمل تاثرات لوٹ آئے۔ آل رائٹ... اپنے آدمیوں کو بتا دو کہ میں فرانس جا رہی ہوں۔“

”مجھے تم سے اسی دانشمندی کی توقع تھی۔“ مور نے نری سے کہا۔ ”تمہارے فیصلے نے ہم دونوں کی پریشانی ختم کر دی ہے۔ مجھے اظہار تشکر میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں... یہ میری چاہت کا معاملہ تھا۔ ورنہ میں ماضی کی طرح آتا اور

ہو چکی ہے۔۔۔"

"تم بے معنی باتیں کر رہے ہو جس کا کوئی سر نہیں ہے۔ کسی پیشہ ور قاتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔" میکس نے اسی طرح سپاٹ آواز میں کہا۔

"دائیں بائیں ہونے سے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ویسے بھی مجھے تمہیں قاتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مس مارٹنا نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں بتادوں کہ وہ بھی کوئی لاوارث نہیں ہے تم نے گولٹی کا نام تو سنا ہوگا؟"

"تم ایک جرائم پیشہ شخص کا نام لے رہے ہو۔" "ہاں۔" اسمتھ نے سر ہلایا۔ "گولٹی مارٹنا کے آن گنت پرستاروں میں سے ایک ہے اور متعدد مردوں کی طرح مارٹنا کے ساتھ جذباتی تعلق رکھتا ہے۔ مسٹر گولٹی کو مارٹنا کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے میں خوشی ہوئی ہوگی۔ اس نے ایک ادارے کے ذریعے مارٹنا کو مجھ سے ملوادیا۔"

"تم کس ادارے کی بات کر رہے ہو؟" میکس نے خوف محسوس کیا۔ اس کی آواز کا سپاٹ تاثر ٹوٹ چکا تھا۔ "ہم ادارے کی تشہیر نہیں کر سکتے۔ اتنا سمجھ لو کہ وہ بھی ایسا ہی کوئی گینگ ہے جیسے مور کسی گینگ کی نمائندگی کرتا ہے۔ کیا سمجھے؟"

"میں کسی مور کو نہیں جانتا۔" میکس کا چہرہ ٹپک گیا۔ "مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مارٹنا سخت شعل ہے اور وہ تمہارا ادارہ تمہارے ہی انداز میں لوٹانا چاہتی ہے۔ ہم لوگ عموماً اپنے کام کی وضاحتیں پیش نہیں کرتے لیکن مس مارٹنا کی خواہش تھی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے جا رہا ہے، اس کا ہیک گراؤنڈ تمہیں بتا ہونا چاہیے۔" اسمتھ کی مسکراہٹ زہر خند میں تبدیل ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آ رہا تھا۔

میکس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ "میں کچھ نہیں سمجھاؤں؟" اس نے مری مری آواز میں کہا۔ "تم سب سمجھ رہے ہو۔" اسمتھ نے گمن کا سا کلفنر چیک کیا۔

میکس سیکھ کے عالم میں اسے گھور رہا تھا۔ اس نے مارٹنا کو ڈرانے کے لیے محض ایک اداکار کو ہار کیا تھا۔ جبکہ مارٹنا نے اصل قاتل ہار کر لیا تھا۔

اسمٹھ ٹپک کہہ رہا تھا۔ میکس سب سمجھ گیا تھا۔ اس کی جال اسی پرالت گئی تھی۔

براڈوے قمیض کے مزے بھی لے لی لو۔"

☆☆☆

"کس قسم کا پیغام ہے؟" میکس نے ملوک انداز میں سوال کیا۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہ مجھے بذات خود تمہیں دینا ہے۔" اجنبی کی آواز آئی۔ "کیا میں اوپر نہیں آ سکتا؟" آواز نرم اور مہر سکون تھی۔

"ٹھیک ہے، آ جاؤ۔" میکس نے کہا۔

"پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں، شکریہ۔"

پانچ منٹ بعد ڈورنیل کی آواز آئی۔ میکس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک درمیانی عمر کا فربہ مائل آدمی کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ گول تھا۔ عام اور بے ضرر۔۔۔

"مسٹر میکس؟"

"ہاں، تم اسمتھ ہو؟"

اسمٹھ نے سر ہل کر جواب دیا۔ میکس نے اسے اندر بلا کر دروازہ بند کر دیا۔ اسمتھ نے کمرے کا جائزہ لیا۔

"یہاں تنہا رہتے ہو؟" اسمتھ نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"ہاں، کیا پیغام لائے ہو؟"

"کچھ پینے کو ملے گا؟" اسمتھ نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

"ہاں، بیٹھ جاؤ۔" میکس نے جیسے بادل ناخواستہ کہا اور فریج کی جانب بڑھ گیا۔

"ہاں، کیا پیغام ہے کس نے بھیجا ہے۔ کوئی سفارش وغیرہ؟" میکس نے جام سجا کر اسمتھ سے سوال کیا۔

اسمٹھ مسکرایا۔ "مس مارٹنا تمہاری حرکت سے بہت براہم ہے۔ وہ بہت خوف زدہ ہو گئی تھی۔ تم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

میکس نے گلاس پیچے رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ تاہم اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں نہیں سمجھاؤں تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟"

"تم نے اسے مارنے کے لیے ایک پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کیں، مسٹر میکس! مارٹنا کو پوری طرح یقین نہیں آیا تھا کہ وہ محض اس لیے اسے قتل نہیں کرے گا کہ وہ اس کا پرانا مداح تھا۔ ساری کہانی تمہیں بتا ہے۔ دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنے سرکل میں کسی مورخ کی ہٹ مین کو نہیں جانتا۔ پتا نہیں تم نے کس کو ہار کیا تھا۔ بہر حال تمہارا کام ان معنوں میں تو ہو گیا کہ مارٹنا فرانس کے سفر پر روانہ

شیکسپیر کا کیا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتہ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جوا ری بن کے سامنا کرے ہر مجبور ہوتا ہے... جوا ری... انسانی جذبات کے رد عمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر لٹی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

جوا ری

احمد اقبال

انہار ہو میں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان



58

اوپر رمضان۔ اس کا دہلا پتلا میرے مقابلے میں یوز حاجم زیادہ وزنی نہیں تھا۔ میں نے چند منٹ بڑی مشکل میں گزارے۔

بچے سے میری کمر میں کنکر چبھ رہے تھے۔ دونوں طرف قبر کی دیواروں سے مٹی جھڑ رہی تھی اور گہرائی کی خنکی میری ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ بچے سے چبھنے میری گردن پر چڑھ چکے تھے اور اب گریبان کے راستے سینے اور پیٹ پر چل رہے تھے۔ یہ احساس بڑی دہشت رکھتا تھا کہ میرے مردہ جسم کو ایک دن ایسے ہی قبر میں لٹایا جائے گا اور لٹانے والے میرے اپنے ہوں گے جو جلد از جلد مجھ پر مٹی ڈال کے جانا چاہیں گے۔

ایک آواز نے بہت قریب سے سوال کیا۔ ”کہاں گیا...؟“

جیلے کے آخر میں جو گالی تھی، وہ غصے، حیرانی اور جھنجھلاہٹ کا نتیجہ تھی۔ میں نے سانس بھی روک لی۔ جس سے سوال کیا گیا تھا، وہ کیا جواب دیتا۔ ”ہاں نہیں، گولی تو لگی تھی۔“

پہلے نے اسے براہ راست گالی دی۔ ”گولی لگی ہوتی تو یہاں میرا نہ پڑا ہوتا۔ دیکھ، خون ہے کہیں، جھک کے دیکھ۔“ پہلا شخص سخت مشتعل تھا۔

”ہاں... خون تو خیر نہیں ہے مگر تم بھی دیکھ رہے تھے اور یو الور تو تمہارے پاس بھی تھا۔“

”یہی تو غلطی کی میں نے کہ تیرے نشانے پر اعتبار کیا۔“

”تم نے بھی تو ہتھ مارا تھا سامنے سے... گولی تو چھوٹی سی ہوتی ہے۔“ دوسرا امنیایا۔

بات مکمل ہونے سے پہلے اس کے جھانپ پڑا جس کی آواز بھی میں نے سنی۔ ”کبواس بند کر، ایک گولی بھتی، وہ بھی ضائع کر دی۔“

”شیدے مارتا کیوں ہے، جو میرا کام تھا میں نے کر دیا تھا۔ میرا لڑکا اسے یہاں لے آیا تھا۔“

”اب اس اندھیرے میں وہ کہاں ملے گا، بھاگ گیا ہوگا۔ دوبارہ کیوں آئے گا ادھر؟“ پہلا بولا جسے شیدے کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا یقیناً شید اس کا اصل نام ہوگا۔ یہ نہ ہو وہ کہیں چھپا بیٹھا ہو۔ الٹا میں نشانہ بنالے اور دیکھ مانی... خبردار جو کسی کے سامنے کوئی بات کی۔“ شیدے کا لہجہ اب قدرے مصالحانہ ہو گیا تھا۔

”میں پاگل ہوں، میرے پاچے ہزار دے...“

بظاہر اس میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے مگر میں نے جبک کر اسے پھر آواز دی۔ ”رمضان۔“

قبر کی سانڈ سے مٹی کھسکی اور اس کے ساتھ ہی میرے پیرو... یوں لگتا تھا جیسے قبر مجھے کھینچ رہی ہے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور پلٹ کر اس بچے کو دیکھا جو مجھے یہاں تک لایا تھا۔ وہ خاموشی سے غائب ہو گیا تھا۔

خطرے کے احساس کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ میرا ذہن ان معاملات کی پراسراریت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ پہلے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ایک خواب جیسا منظر دیکھ کے مجھے خوف زدہ ہونے اور یوں سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہونے کی ضرورت نہ تھی لیکن خوف ایک بار پھر احساس پر غالب آ رہا تھا۔ رمضان کی زندگی کا یقین کرنے کے لیے مجھے قبر کے اندر اترنا پڑتا مگر اب مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مرانہ ہوتا تو قبر میں کیوں ہوتا۔ یہ تصور کرنا کہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ اتنا خوف زدہ ہوا کہ گھر سے بھاگا اور یہاں آ کے چھپ گیا۔ چھپنے کے لیے اسے جگہ کی کیا کی تھی۔ خود اپنی مرضی سے کون مردے کی طرح قبر کی گہرائی میں سوتا ہے۔

اندھیرا مزید گہرا ہو گیا تھا۔ یہاں گھنے درختوں میں سائے زیادہ تاریک تھے۔ چھٹی حس ایک بار پھر مجھے خبردار کر رہی تھی۔ اس معصوم بچے کا کردار بھی اب مجھے مشکوک لگنے لگا تھا۔ وہ سیدھا مجھے یہاں کیسے لے آیا جیسے یہ رمضان کا گھر ہو۔ اس کا معصوم ذہن کسی سازش میں استعمال ہوا تھا۔ گاؤں کے غریب بچے کے لیے پاچے دس روپے بھی بڑی دولت سمجھتی۔ پھر اسے جیسا کہا گیا، اس نے وہی کیا۔ چاروں طرف دیکھتے ہوئے میں نے اپنا رپو الور نکال لیا۔ خواب کا منظر مجھے یاد آ رہا تھا۔ مجھے پولیس نے گھیر لیا تھا۔ یہاں ابھی تک مجھے پولیس دکھائی نہیں دی تھی۔ خطرہ بہر حال اپنے وجود کا احساس دلا رہا تھا۔

اچانک نیم تاریکی میں ایک ہتھ اڑتا ہوا آیا اور میری ٹانگ کے سامنے سے گزر گیا۔ نشانہ یقیناً میرا سر تھا۔ میں نے اسی سمت میں فائر کیا تو جواب میں فائر آیا۔ بے اختیار میں قبر میں گر گیا اور تب مجھے رمضان کے وجود میں زندگی کا احساس ہوا۔ اس کا جسم لاش کی طرح اکڑا ہوا سخت اور ٹھنڈا نہیں تھا۔ مجھے کہیں قریب سے انسانی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس تین منٹ چوڑی جگہ میں یہ کام مشکل تھا مگر میں نے رمضان کو کھینچ کر بٹھایا اور خالی جگہ میں خود بیٹھ کر اسے اپنے اوپر ڈال لیا۔ وہ سو فیصد زندہ تھا۔ ورنہ کسی لاش کو ایسے اٹھانا اور لٹانا ممکن نہ ہوتا۔ اب لپچے میں تھا اور میرے

جوارس

میں کسی کو بتاؤں اور گاؤں والے اس کے کفن دفن کا بندوبست کریں لیکن وہ بھی دس سوال کرتے کہ تم کون ہو؟ قبرستان میں کیا کر رہے تھے۔ وہ تو عام گزرگاہ نہیں ہے۔ یہ سب سوچ کے میں نے بوجھل دل کے ساتھ رمضان سے رخصت لی۔ اپنے حساب سے وہ بہت جی لیا اور اس جیسے شخص کو عزت کی موت نہیں مل سکتی تھی جو زندگی میں کبھی باعزت نہیں رہا تھا۔

میں نے دل کو تسلی دی کہ رمضان کا بھانجا شاید زندہ ہو جو مجھے فاطمہ یعنی نورین کے بارے میں کچھ بتا دے۔ ورنہ اس کہانی میں ابھی ابھی دو کردار شامل ہوئے تھے۔ شیدا اور بانی۔ رمضان کے ساتھ ان کی دشمنی سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن ایک نے پتھر مارنے کے میرا سر پھاڑنے کی کوشش کی تھی اور دوسرے نے مجھے گولی مارنے کی۔ ان کے پاس ایک ہی ریوالتور تھا جو شیدے کا تھا اور اس نے نامعلوم وجہ کی بنا پر مانی کے حوالے کر دیا تھا۔ کیا اس لیے کہ بعد میں مانی کو مجرم بتا دے؟

میں واپس چل پڑا۔ اندھیرے میں واپسی کے لیے میں نے اندازے سے وہ راستہ اختیار کیا جو مجھے جنگل میں اپنی گاڑی کی طرف لے جاتا۔ یہاں بھی ٹاپلی (شیشم) کے درخت زیادہ تھے۔ اندھیرا اب اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں ٹھوکریں کھاتا، سنبھلتا اپنے حساب سے ایک ہی سمت میں چلتا گیا۔ پھر جیسے مجھ پر پہاڑ گر گیا، کسی درخت پر سے کوئی رچھ کی جسامت کا جالور مجھ پر آگرا۔ میں اس ناگہانی آفت کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ گرتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کوئی جنگلی جالور نہیں ہے۔ بھاری وجود کا میرے جیسا انسان ہے۔ میں میچے گرا، زمین پر کنکر پتھر اور خشک ٹہنیاں بکھی ہوئی تھیں۔ میرے سنبھلنے سے پہلے حملہ آور کے ہاتھ میری گردن دیوچ چکے تھے۔ یہ صرف ایک لمحے کی بات تھی پھر میں نے جسم کو جھٹکا دے کر کروٹ لی اور اس شخص کو نیچے گرا کے خود اس کے اوپر آگیا۔ اپنے نادیہ دشمن کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ شیدا ہوگا۔ میرے پراسرار طور پر غائب ہو جانے کے بعد وہ دونوں فرار نہیں ہوئے تھے۔ وہ مجھے قبرستان کے علاوہ گرد و لوار کے جنگل میں تلاش کر رہے تھے۔

مجھے صرف بس اتنی ہی مہلت ملی۔ مہلت ملتی تو نہ جانے میں کیا کرتا۔ حملہ آور کی گردن توڑ دیتا یا اسے معذور کر کے پوچھتا کہ وہ کون ہے اور کیوں میرا دشمن ہو رہا ہے۔ لیکن کسی بھی سوال کی نوبت آنے سے پہلے ہی پیچھے سے میرے

ابھی...

”کس بات کے پانچ ہزار دوں؟ پاگل کے بچے... ایک لاکھ ملتے مجھے تو پانچ ہزار تھے بھی مل جاتے... چل...“

”یہ سب میں نہیں جانتا۔ میں نے تو اپنا کام پورا کیا۔“ اس کی آواز کچھ فاصلے سے آئی۔

دوسرے نے یعنی شیدے نے کیا کہا مجھے سنائی نہیں دیا۔

میں نے بڑا سخت وقت گزارا تھا۔ چوٹے مجھے کاٹ رہے تھے۔ شاید مردہ سمجھ کے میرا گوشت چکھ رہے تھے اور خون پی رہے تھے۔ کیونکہ میں زندہ تھا، بوجھ سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میرے جسم کا ہر حصہ اکڑ گیا تھا۔ میں نے لاش کی طرح اوپر پڑے رمضان کو اٹھایا اور پھر خود بھی اٹھا۔ اتنی کم جگہ میں یہ آسان نہ تھا۔ رہی سہی توت کی مدد سے میں نے پہلے رمضان کو باہر ڈالا اور پھر خود قبر سے نکلا اس جہد جہد میں مزید مٹی مجھ پر گری۔ مٹی کا ذائقہ میرے منہ میں محسوس ہونے لگا اور میری سانس میں دھول بھر گئی۔ باہر نکل کے کھلی ہوا میں لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے بہتر محسوس کیا تو رمضان کی طرف متوجہ ہوا۔

اب اس کا جسم مجھے کچھ سرد لگا۔ شاید یہ مکمل ہوا کا اثر تھا۔ میں نے سوچا لیکن پھر تصدیق کرنے پر میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اب رمضان زندہ نہیں تھا۔ روج کے پرداز کر جانے کے بعد اس پر موت غالب آچکی تھی۔ مدد ہے اور دہشت سے میرا برا حال ہو گیا۔ میری آخری امید یہی شخص تھا۔ کچھ دیر پہلے تک وہ زندہ تھا۔ میرے نمودار ہونے کے بعد کیا ہوا کہ کسی نے اسے مار کے قبر میں پھینک دیا۔ وہ نوراً نہیں مرا تھا۔ شاید اسے زہر دیا گیا تھا یا کوئی ایسی دوا جس کا اثر کچھ دیر بعد ہوتا تھا۔

رمضان کی ڈرامائی موت سے دو چار ہونا میرے لیے ایک ذہنی شاک تھا جس نے مجھے خود اپنے تحفظ کے خیال سے بیگانہ کر دیا۔ مجھے صدمہ بھی تھا کہ میرے اور فاطمہ کے درمیان یہی شخص رابطے کا ذریعہ بن سکتا تھا جو اب نہیں رہا۔ اس کی لاش کو وہیں پڑا چھوڑ دینا ایک مجبوری تھی۔ قانون کا تقاضا تھا کہ میں اس کی موت کے حالات کی رپورٹ لکھواؤں۔ یہ اس لیے ناممکن تھا کہ میں خود قانون کی نظر میں ایک مفرور مجرم تھا اور ملک سلیم اختر بن جانے کے باوجود پہچان لیے جانے سے ڈرتا تھا۔

شرافت اور انسانیت کا تقاضا تھا کہ میں قریبی گاؤں

بلا ارادہ نکل گئی تھی۔ اس نے رک کر کہا۔ ”فالٹو باتیں مت کر۔“

”مجھے پانی تو پلا دو اور بھوک بھی لگی ہے مجھے۔“
 ”ادھر کچھ نہیں ہے، صبح تک چپ کر کے پڑا رہ۔“
 ”اچھا مجھے سیدھا بٹھا دو۔ دیوار کے سہارے، تمہیں اپنی ماں کا واسطہ... ورنہ اس کی روح کو تکلیف ہوگی۔“
 یہ جذباتی اپیل کارگر ثابت ہوئی۔ اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ شاید وہ ہنس پڑتا۔
 دانت پیس کر زیر لب گالیاں دیتا وہ اٹھا اور اس نے مجھے بھیج کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ میں نے خاصا بہتر محسوس کیا اور اس سے کہا۔ ”بڑی مہربانی شیدے پہلوان۔“

وہ لوٹ کر چار پائی کی طرف جاتے جاتے رکا اور پلٹ کر مجھے گھورنے کے بعد پھر حقہ پینے بیٹھ گیا۔ حقہ شاید ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس نے کش کے بعد منہ سے دھوئیں کے بجائے ایک اور گالی نکالی۔ میرا دوسرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیرنشانے پر لگا تھا۔ وہ پہلوان بھی تھا۔
 ”صبح کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ غرایا۔ ”تیرا باب آئے گا اور تجھے لے جائے گا۔ پراٹھے بھی کھلائے گا گرم گرم اور کھن کے بڑے والی لسی لائے گا۔“

میں نے سادگی سے کہا۔ ”تمہاری طرح میرے بھی ماں باپ نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم نے پہلے بھی ایسا کام نہیں کیا پہلوان۔“
 ”کیسا کام؟“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ پہلوانی کی عمر گزر جاتی ہے تو کرنے کو کچھ نہیں رہتا۔ نیا رستم آجاتا ہے کوئی تو پرانے کو سب بھول جاتے ہیں۔ گزارا مشکل ہو جاتا ہے بندے کو اور کوئی کام نہیں آتا۔ دمی، پتر جوان ہو جاتے ہیں... پتر آج کل کے ٹکے مگر بیٹیوں کا کیا کرے بندہ۔ نہ انہیں گھر سے نکال سکتا ہے نہ بھوکا مار سکتا ہے۔“

میں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھا۔ ”تو چپ نہیں رہ سکتا؟“

”میرا مطلب تھا، بندہ مجبور ہو کے غلط کام کرتا ہے۔ پہلوانی چھوڑ کے بد معاشی پر اتر آتا ہے، کیا کرے۔“
 وہ بولا۔ ”میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا پہلے۔“

”اور آئندہ بھی نہیں کرو گے مجھے پتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن وہ تمہیں مجبور کر دیں گے پھر... بلیک میل

سر پر ڈنڈا پڑا اور میں وہیں گر گیا۔ میں بھول گیا تھا کہ شیدے کا ساتھی مانی بھی ہے۔

ہوش آنے پر میں نے خود کو کچکی دیواروں والے ایک کمرے میں پڑا ہوا دیکھا۔ میں فرش پر دیوار کے ساتھ تھا اور میرے ہاتھ پیر مضبوط ری سے باندھے گئے تھے۔ مخالف گوشے میں دیوار سے لائین لگی ہوئی تھی اور اس کے اجالے میں بان کی چار پائی پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ مجھے یوں نظر آ رہا تھا جیسے کمرے میں دھواں بھرا ہوا ہو۔ یہ چوٹ کا اثر تھا جو ہنوز پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر میں منظر واضح ہو گیا۔ وہ بھاری جسم کا شاید پچاس سال سے اوپر کا آدمی تھا جس کا پیٹ نکلا ہوا تھا اور سر گھٹا ہوا تھا۔ اس نے سونے کھد رکا کرتہ پہن کھا تھا اور کھد می کے بنے ہوئے چار خانے کے ڈیزائن کی دھوٹی باندھی ہوئی تھی۔ اپنے چہرے کے کرخت نقوش اور گیلی موٹھوں کے ساتھ وہ پہلوان بھی ہو سکتا تھا اور مقامی بد معاش بھی۔ وہ چار پائی کی مٹی سے پاؤں لٹکائے حقہ تھاے بیٹھا تھا۔ سر جھکا کے اس نے ایک کش لیا۔ حقے میں کڑکڑاہٹ ہوئی اور اس نے منہ سے بھاپ جیسا دھواں خارج کیا۔

”شیدے!“ میں نے لہجے کی کمزوری پر قابو پا کے کہا۔ ”مجھے کیوں لائے ہو یہاں؟“

وہ بری طرح چونکا جس سے تعذیب ہو گئی کہ وہی شیدا تھا مگر جواب دینے کے بجائے، وہ مجھے گھورتا رہا۔

میں نے کہا۔ ”مجھے کیوں باندھ کے ڈالا ہوا ہے یہاں؟ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔“

”بکواس کرتا ہے...“ اس نے مجھے گالی دی۔ ”تو نام بھی جانتا ہے میرا۔“

”یہ نام میں نے مانی سے سنا تھا۔“

اسے حیرانی کا دوسرا جھٹکا لگا۔ ”تو مانی کو بھی جانتا ہے۔“

”اس نے قبرستان میں تمہارا نام لیا تھا اور مجھ پر گولی بھی چلائی تھی۔ ایک گولی اور ہوتی تو تم مجھے مار ڈالتے۔“

”ادے سیانے... مارنا ہوتا تو تیرے گلے پر چھری پھیر دیتے۔“ اس نے جیب سے ایک گراری والا چاقو نکالا

اور اسے گھولا تو کڑکڑکی آواز کے ساتھ خنجر کی تدمم سی چمک نظر آئی۔ یہ ایک احمقانہ حرکت تھی جو اس نے مجھے خوف زدہ رکھنے کے لیے کی مگر مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔

”آخر تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے؟“

”دشمنی تو کوئی نہیں میری۔“ اس کے منہ سے یہ بات

خبر آتی

میں نے یقین کی قوت کے ساتھ کہا۔ "جھوٹ بول رہے ہو تم پہلوان... انہوں نے کہا ہوگا کہ تم نے حلف کی پاسداری نہ کی تو تم پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ تمہاری بیٹی پر جن آسکتے ہیں پھر وہ بھی اپنے گھر نہیں جائے گی۔"

پہلوان کی حالت غیر ہونے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رو پڑے گا۔ میں نے اس کی دھمکی رگ پکڑ لی تھی۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "دیکھو پہلوان... تم مجھے نہیں جانتے... تم بھی شہر میں نہیں رہے، دیکھو ہوں گے تم نے ملتان اور لاہور جیسے شہر... مگر تمہاری زندگی یہاں گزری ہے جیسے تمہارے ماں باپ کی گزری تھی۔ تم پہلوان تھے۔ آس پاس کے علاقے میں تمہارے مقابلے کا کوئی نہ تھا۔ بہت دن تک جیتے ہوئے تم نے... لوگوں نے تمہیں کندھے پر اٹھایا ہوگا اور بہت نذرانے دیے ہوں گے۔ انعام ملے ہوں گے۔ میں شہر کا آدمی ہوں۔ بہت پڑھا لکھا اور میں نے پاکستان کے باہر کی دنیا بھی دیکھی ہے۔"

"دیکھی ہوگی۔ مجھے کیوں بتا رہا ہے۔"

"اس لیے کہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم جن لوگوں کے جال میں پھنس گئے ہو، وہ تمہاری مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں جن کو تم نیک لوگ کہہ رہے ہو، میں ان کی حقیقت جانتا ہوں۔ تم کو بیٹی کی شادی کرنی ہے پیسے کی ضرورت ہے لیکن پہلوان ہوگا وہی تمہارے ساتھ جو میں نے بتایا۔ وہ تمہیں ایک پیسہ نہیں دیں گے ایک گولی ماریں گے اور پھر خود سوچ لو کہ تمہاری بیوی اور بیٹی کا کیا ہوگا۔"

وہ بری طرح ڈر گیا۔ "پھر میں کیا کروں؟ محرم کے بعد میری بیٹی کی رخصتی کیسے ہوگی اگر اس پر جن آگئے؟..."

"کوئی جن نہیں آئیں گے۔ جنات کا وجود برحق... مکروہ خدا کے بندوں کے دشمن کیوں ہوں گے اور کسی کو ذرا کے حلف لیا جائے تو عذاب اس پر آتا ہے جو حلف اٹھوائے... مجھے پر اعتبار کر سکتے ہو تو بتاؤ انہوں نے کتنی تم دینے کا وعدہ کیا تھا؟ اس سے دگنی رقم میں دے سکتا ہوں۔ تم سے کوئی غلط کام کرائے بغیر... دیکھو، تم مجبور ہو، تمہاری بیٹی میری بہن تو نہیں لیکن سمجھ لو کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ اس کی رخصتی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔"

"انہوں نے... دس ہزار دینے کا کہا ہے۔" وہ نظر جھکا کے بولا۔

"یہاں تو میرے پاس بیس ہزار نہیں ہیں۔ نام کیا ہوا ہے؟"

وہ چونکا۔ اس نے جیب میں سے ایک گھڑی نکالی

کریں گے تمہیں، بلکہ میل سمجھتے ہو؟ تم سے کہیں گے کہ تم نے ان کی بات نہ مانی..."

"کون سی بات؟" وہ بے وقوفی کی حد تک سیدھا تھا۔

"فرض کرو، وہ تم سے کہیں گے تم نے ان کے کہنے پر دوسرا غلط کام نہ کیا تو وہ پولیس کو بتا دیں گے کہ رمضان کو تم نے قتل کیا تھا۔"

وہ اچھل پڑا۔ "رمضان کو؟ اوئے اس کی میری کون سی دشمنی تھی اور پھر وہ بڑھا آدمی..."

"تم نے اسے قتل نہیں کیا؟ چلو مان لیتا ہوں مگر جب وہ کہیں گے تو پولیس ان کی مانے گی اور تمہیں پکڑ لے گی۔ وہ گواہ بن جائیں گے۔ تم کو پھانسی بھی ہو سکتی ہے لیکن ان کی بات مانو گے تو وہ پھر پیسہ دیں گے۔ جیسے اب دیا ہے اور تم بھی لالچ میں پڑ جاؤ گے۔ تمہاری میری بھی کوئی دشمنی نہیں مگر انہوں نے پیسہ دیا۔ دس ہزار، بیس ہزار..."

"کوئی پیسہ نہیں دیا ابھی... وہ چلتا ہے۔"

"اوہوہو... یہ زیادہ برا ہوا۔ پیسہ وصول کیے بغیر یہ کام کیا۔ واقعی بہت بے وقوف ہو پہلوان۔ اب سمجھ لو کہ مجھ سے پہلے وہ تمہارا کام تمام کریں گے۔" میں گلے پر چھری پھیرنے کا ایکشن نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے حلق سے ذبح ہونے والے بکرے جیسی آواز نکالی۔ "ورنہ ایک گولی تمہارے لیے بھی... ان کا جیسا بھی بیج جائے گا۔"

"بکو اس کرتا ہے تو... وہ نیک لوگ ہیں۔" وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود چلتا ہے۔

میں نے سمجھ لیا تھا کہ پہلوان میرے پھیلانے ہوئے حال میں پھنس گیا ہے۔ ایک قہقہہ لگا کے میں نے کہا۔ "نیک لوگ؟ ایسے کام کراتے ہیں نیک لوگ؟ کون ہیں وہ؟"

"میں... میں نہیں بتا سکتا۔ انہوں نے قسم لی ہے۔"

اور... اور... اور دشمنی بھی دی ہے؟ یہ کہا ہے کہ تمہاری بیٹی کو اغوا کر لیں گے۔"

"مجھے کی طرح مت بھونک... وہ ایسے لوگ نہیں ہیں... بہت پہنچے ہوئے بندے ہیں۔"

اچانک میرے دماغ میں جیسے گھڑکی سی کھل گئی۔ وہ منظر جو ابھی تک بے یقینی کی تاریکی میں تھا، میری نظر میں روشن ہو گیا۔ "وہ غدر سائیں کے مرید ہیں؟ درگاہ کے مجاہد جو تباہ ہو گئی؟"

وہ ہلکا ہوا۔ "نہیں... نہیں تو... وہ شہر کے بد معاش ہیں۔"

”تم حلف اٹھاؤ کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا اور تم کو چھوڑ دوں گا تو مجھے پچیس ہزار ملیں گے۔ میں میرے اور پانچ اس مانی کے... اور کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا: ”مجھے منکھور ہے۔“
”میں آتا ہوں قرآن پاک لے کر۔“ وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ پہلوان برائے فروخت تھا۔ میں نے اسے دگنی قیمت دے کر خرید لیا تھا۔ یہ میرے نزدیک زندگی کی قیمت تھی۔ میری زندگی کی قیمت۔ شاید ساتھ ہی دوسرا کرا بھی تھا کہ پہلوان گیا اور لوٹ آیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں سبز شٹیل اور گولے کے غلاف میں لپٹا ہوا قرآن پاک تھا۔ اسے عقیدت سے چوم کے اور آنکھوں سے لگا کے اس نے میری طرف بڑھایا۔

”میرے ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”تم اس پر دونوں ہاتھ رکھو۔“ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے قرآن میرے سامنے کیا۔

میں نے قرآن کو گواہ بنا کے وہ سب کہہ دیا جو پہلوان مجھ سے کہلوانا چاہتا تھا۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ قرآن پاک کو چار پائی پر رکھا اور میرے ہاتھ کھول دیے۔
”اب تم میرے ساتھ چلو۔“

دو منٹ بعد میں آزاد اور اپنے ہمراہوں پر کھڑا تھا۔ پہلوان کا اعتماد بحال کرنے کے لیے میں نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم نے صحیح فیصلہ کیا اور صحیح وقت پر۔ میں حلف نہ اٹھاتا تب بھی وعدہ پورا کرتا۔... چلو۔“

وہ خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑا۔ باہر آ کر شب کا چاند برائے نام سا اجالا پھیلا رہا تھا۔ اس کی روشنی جنگل میں دھند کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر ستاروں کا سفر جاری تھا۔ ساکت درختوں میں پرندے بھی خوابیدہ اور خاموش تھے۔

میں نے رخ بدلتا تو پہلوان رکا۔ ”چودھری کی حویلی تو ادھر ہے۔“

”یہاں میں نے اپنی گاڑی چھپائی تھی۔“ میں نے کہا۔

”ہم پیدل بھی جاسکتے ہیں۔“
”وقت زیادہ لگے گا اور مجھے بعد میں پھر آنا پڑے گا گاڑی لے جانے کے لیے۔“
”میں گاڑی میں نہیں جاؤں گا۔“ معلوم نہیں خوف نے پہلوان کے دل میں کیا خش ڈال دیا تھا۔ فیصلہ کر لینے

جس کی چین ٹوٹ گئی تھی۔ ”ڈھائی بجے ہیں۔“
”پھر تو بہت ٹائم ہے۔ تم نے چودھریوں کی حویلی دیکھی ہے؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”یہاں سے نزدیک ہے۔“

”تم وہاں جاؤ۔ چودھری انور سے کہو کہ میں ہزار ابھی دے دے۔ وہ دے دے گا۔ کہنا ملک سلیم نے کہا تھا۔“

وہ سمجھنے کے قریب آتے آتے پھر مشکوک اور خوف کا شکار ہو گیا۔ ”وہ مجھے پکڑ لے گا۔“

”تم کو مجھ پر اعتبار تو کرنا ہی پڑے گا۔ نہیں کرو گے تو یہ وقت گزر جائے گا اور تمہیں بہت نقصان ہوگا پھر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کا دماغ میری باتوں سے کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک وعدہ دس ہزار دینے والوں نے کیا تھا جس پر اب اسے اعتبار نہیں رہا تھا۔ دوسرا وعدہ میں نے دگنی رقم کا کیا تھا جو صبح ہونے سے پہلے مل سکتی تھی کوئی جرم کے بغیر۔ بس اس کو رقم ملنے کے بعد مجھے آزاد کر دینا تھا۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ بندہ ہاتھ نہیں آیا۔

”کس سوچ میں پڑ گئے پہلوان... ان پر اعتبار کیا تھا تو مجھ پر بھی کر کے دیکھو... صبح ہونے سے پہلے تمہیں دگنی رقم مل سکتی ہے کوئی خطرہ مول لیے بغیر...“

”تم مانی کو بھی پانچ ہزار دے سکتے ہو؟“ وہ لہجے سے مجھے رضامند لگا۔

”اگر تم کہتے ہو تو یہ بھی ہو جائے گا۔ چودھری انور سے پچیس مانگ لینا۔“ میں نے کہا۔

”کیا ایسے کوئی بھی تمہارے نام سے کچھ بھی مانگ لے... چودھری دینے سے پہلے کوئی سوال نہیں کرے گا؟“ وہ بدستور تذبذب کا شکار تھا۔

”اچھا تم مجھے کوئی کاغذ قلم لا دو۔ میں چودھری کے نام چٹھی لکھ کر دیتا ہوں۔“

اس نے ٹی میں سر ہلایا۔ ”زبانی بھی وہی بات ہے۔ وہ مجھے پکڑ لے گا اور مارتا ہوا یہاں لائے گا۔“

میں نے اپنی کوشش جاری رکھی کہ اس کے اندیشے دور کروں اور اس کا اعتماد حاصل ہو جائے۔ ”پہلوان! تم نے ان بد معاشوں کو پہنچا ہوا سمجھ لیا۔ ان کی مان لی۔ میں شریف آدمی تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ مارے جاؤ گے تو یقین نہیں کرتے... بتاؤ میں کیا کروں؟“

جواہر

پوچھتا رہا کہ شک کی اب تو کوئی بات نہیں رہی۔ انور نے رقم میرے حوالے کی اور میں نے پہلوان کی طرف بڑھادی۔
نوٹوں کی گدڑی سنبھالتے ہوئے اس کے ہاتھ کاپٹتے رہے اور اس کے ہاتھ پر پسینے کی نمی چمکتی رہی۔

”رقم پوری ہے۔ چاہو تو گن لو۔“ میں نے کہا۔
”نہیں... اس کی ضرورت نہیں۔“ پہلوان ہٹکایا۔
”اب میں جاؤں؟“

میں نے کہا۔ ”تم کو گاڑی میں بھی پہنچایا جاسکتا ہے بلکہ روکو... مجھے اپنی گاڑی لینے جانا ہے... تم ساتھ چلو۔“

انور نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ ”کہاں جانا ہے؟ میں بھی ساتھ چلوں؟“ اس نے انگریزی میں پوچھا۔

”نہیں جانا پڑے گا۔ واپسی پر میں دو گاڑیاں کیسے لاؤں گا۔“ میں نے اردو میں جواب دیا تا کہ پہلوان کو شک نہ ہو۔ ”تم تیار ہو کے آ جاؤ۔“

انور کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ پہلوان کی موجودگی میں کوئی سوال کرنا مناسب نہ ہو گا۔ اس کے ذہن میں ایک نہیں کئی سوال ہوں گے لیکن پہلوان کے لیے اس نے میرے کہنے پر خاموشی سے ہچکس ہزار نکالے اور مجھے دے دیے۔ انور کی اس ”تا بعد اری“ نے یقیناً پہلوان کو متاثر کیا ہوگا۔ اسے یقین آ گیا ہوگا کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ اکیلا آتا تب بھی اسے رقم مل جاتی۔ اس کے سارے اندیشے مٹ گئے تھے۔ وعدے کے مطابق میں نے اپنی آزادی کی قیمت چکا دی تھی۔ میں قابل اعتماد ثابت ہوا تھا۔ اب اسے یقین آ گیا ہوگا کہ میں غلط بیانی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ جن کو وہ پہنچا ہوا یا نیک سمجھتا تھا وہ خطرناک لوگ تھے۔ وہ اسے دس ہزار بھی نہ دیتے۔ ایک گولی خرچ کر کے اس کا کام تمام کرتے اور پھر نہ جانے اس کی بیٹی اور بیوی کے ساتھ کیا ہوتا۔

وہ میرے ساتھ چلتا ہوا پیچھے نک گیا جہاں دو کاریں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ تیسرے گیراج میں جیب تھی اور چوتھے میں ٹویوٹا کی ڈبل کیمین پک اپ۔ پہلوان کا چہرہ فکرات میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑا۔ ”اب کیوں فکر مند ہو؟ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔“

”آپ سچے اور کمرے بندے ہو۔ مجھے ان کی فکر ہے جو آج کے پوچھنے کے ہمارا بندہ کدھر ہے؟“
”تم کہہ سکتے ہو کہ وہ ادھر آیا ہی نہیں۔“

کے باوجود وہ بے یقینی کا شکار تھا اور نہیں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک تھا جو اس نے پہلے دس ہزار کے لیے کیا تھا یا یہ ٹھیک ہے جو اب پچیس ہزار فوراً ملنے کی امید میں کر رہا ہے۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ ہارا ہوا جواہر ہے یا جیتنے والا۔ یہ دس کے مقابلے میں پچیس کی طاقت تھی جس نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کیا۔ بکا ہوا آدمی پھر بک سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ کوئی بات اس کے علاوہ تھی جس نے پہلوان کو یہ جوا کھیلے پر مجبور کیا۔ اس کی نظر میں وہ پہنچے ہوئے نیک لوگ میری بات سے برے نہیں بن گئے تھے۔ وہ یہاں کار بننے والا تھا۔ کچھ نہ کچھ پہلے سے جانتا تھا یا سن رکھا تھا کہ ہیر سائیکس کے مرید کیا کرتے ہیں۔ اعتقاد کے باوجود کوئی بات مشہور ہوتی ہے یا سامنے آتی ہے تو اعتقاد کی بنیادیں ٹل جاتی ہیں۔ شاید پہلوان کا اعتقاد اس کی مجبوری تھی۔ سب کی طرح وہ بھی خائف اور خاموش تھا۔ میری باتوں پر اس کا یقین کر لینا بھی ثابت کرتا تھا۔

وہ آدھے گھنٹے کا راستہ تھا۔ ہم ندی کے پل سے گزرے تو گدلا پانی سرسراہٹ کے بغیر نیچے سے گزرتا جا رہا تھا۔ دور کہیں گیدڑ چلائے پھر کتے بھونکنے لگے۔ پہلوان مردہ قدموں سے میرے ساتھ چلتا گیا۔ معلوم نہیں اس وقت وہ کیا سوچ رہا تھا۔ شاید یہ کہ وہ ہیر سائیکس کے مریدوں سے کیا بہانہ کرے گا؟ کیا جھوٹ بولے گا؟ اور کیا وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب رہے گا؟ ان کو شک ہو گیا پھر؟

چودھریوں کی حویلی کے دربان نے مجھے سلام کیا اور اجنبی کی طرف ایک نگاہ ڈال کے گیٹ کھول دیا۔ میں سیدھا انور کے کمرے کے دروازے پر گیا۔ میری دستک پر انور نے غنودگی میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“ اور میرا جواب سن کے لائٹ جلا دی۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے کہا۔ ”تو! اس وقت؟“ پھر اس کی نظر پہلوان کی طرف سوالیہ انداز میں اٹھی۔

میں نے صوفے پر بیٹھ کر کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”پچیس ہزار نقد ہیں تیرے پاس تو نکال... ان کو دینے ہیں۔“

انور نے اتنا ہی وقت لیا جتنا میری بات کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا۔ پھر اس نے پٹ کھسکا کے کسی تجوری کو کھولا۔ رقم نکال کے الماری پھر بند کی۔ میں پُر اعتماد نظروں سے پہلوان کو دیکھ کے سکراتا رہا۔ خاموشی کی زبان میں

دلوں اور تو کہاں تھا سلیم؟ سب کو پریشانی میں ڈال کے کہاں غائب ہو گیا تھا؟

"غائب تو جن بھوت ہو سکتے ہیں۔ میں ایک کام سے گیا تھا۔ غلطی ہوئی کہ سب کو بتا کے نہیں گیا۔ جسے بتا کے گیا تھا کہ سب کو بتا دے وہ چالیس منٹ بعد فوت ہو گیا۔"

"فوت ہو گیا؟ کیا کہانیاں سن رہا ہے؟" ماں جی نے خفگی سے کہا۔

"ہوتا ہے ماں جی۔ آدمی بلبلا ہے پانی کا... جنگ بھلا ہٹا کٹا بندہ حلوہ کھا رہا تھا۔ ادھر حلوہ ختم ادھر زندگی ختم... کھانے سے پہلے مر جاتا تو وہی حلوہ سوم کی نیاز میں کام آتا۔ دس بندے تو کھا لیتے اتنا وہ اکیلا کھا کے مرا۔"

وہ خفا ہو کے واپس چلی گئیں۔ میں اور انور چہتے ہوئے کمرے میں چلے گئے، میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "بیٹھنے سے پہلے جا خود کافی بنا کے لایا کسی سے بنا۔"

اس نے دروازے سے منہ نکال کے ہانک لگائی اور کسی کو حکم جاری کر کے صوفے پر بیٹھا اور سگریٹ جلائی۔

"اب بتا میرے بیکس ہزار کا حساب۔"

"تو نے یہ سگریٹ کب سے شروع کی؟"

"ابھی تو جلائی ہے تیرے سامنے... یہ نمونہ کہاں سے پکڑ کر لایا تھا اپنے جیسا؟" اس نے اوپر منہ کر کے دھواں چھوڑا۔

"ابھی بتاتا ہوں ماں جی کو۔"

"بتا دے گا تو کیا ہوگا بھوتی کے... کچھ نہیں...

ہماری مائیں بیویاں اور حویلی کی مالک کہلانے والی عورتوں کو مہربان ہوتا ہے۔ مرد بننے سے پہلے ہی حویلی کے کسی فرزند اور جند نے کب سگریٹ شروع کی، کب شراب، کب وہ بالغ ہوا اور کس کے ساتھ سب سے پہلے اٹھارہ مرد لگی کیا۔ لیکن ملک سلیم اختر صاحب! ان تمام ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو یہ سمجھی سکھانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ ان کی اوقات کی حد کیا ہے۔ وہ سب خود ہی سیکھ لیتی ہیں کہ کیا برداشت کرنا ہے۔ کیا نظر انداز کرنا ہے تو بھی مرد بن۔"

"میرا خیال ہے کہ میں نامرد ہی اچھا۔ کیا شادی کے بعد ریشم کی حیثیت بھی نہیں ہوگی؟ پاؤں کی جوتی والی؟"

"دیکھ سلیم! تو پڑھا لکھا بندہ ہے اس لیے یہ باتیں کر رہا ہے۔ بد قسمتی سے میں بھی پڑھ گیا مگر کتابوں سے موروٹی خون کا اثر تو نہیں جاتا۔ میں دنیا دیکھ آیا۔ عزت

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ انہیں شک ہو گیا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں تو وہ پتا چلا لیں گے پھر کیا ہوگا؟"

نہ میرے پاس اس کے سوال کا جواب تھا اور نہ میں اسے کسی قسم کی یقین دہانی کرا سکتا تھا۔ انور نے گاڑی کھولی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے ساتھ آیا اور پہلوان پچھلی سیٹ پر متضاد جذبات کے گرداب میں گم رہا۔ جو پیدل آدمی کھٹنے کا راستہ تھا، وہ کار میں دس منٹ کی مسافت تھی۔ پہلوان کا سوال ہنوز میرے ذہن میں تھا لیکن اس وقت انور نے اس کے اترتے ہی گاڑی چلا دی۔

"اب بول یہ کیا سلسلہ ہے؟" انور نے خفگی سے کہا۔

"غصے کو پی جا... پور چشم۔ دیکھ وہ صبح کا ستارہ ہے۔ کیا سہانا سماں ہے۔"

"بھاڑ میں کیا سہانا سماں اور صبح کا ستارہ۔"

میں نے اسے ٹوکا۔ "ادھر نہیں۔ میری گاڑی گاؤں کے پار کنگ ایریا میں کھڑی ہے۔ دو منٹ کا فاصلہ ہے۔ چونکہ جواب و دمنٹ میں نہیں دیا جاسکتا اس لیے ریلیکس کر، مسکرا صبح کی ہوا میں لیے گہرے سانس لے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "یار میں کیا کروں خواہ مخواہ فینشن لینے لگا ہوں۔"

"تو شادی کر لے فوراً... فینشن اس میں بہت زیادہ ہوگی مگر بقول شاعر... درد کا حد سے گزرتا ہے دوا ہو جاتا۔ بس یہاں رک جا۔"

وہ حیران ہوا۔ "مجھے تو یہاں کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی۔"

"نظر تو مجھے بھی نہیں آ رہی مگر میں جانتا ہوں کہ گاڑی ان درختوں، جھاڑیوں میں موجود ہے۔"

دس منٹ کے بعد دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چودھریوں کی حویلی میں داخل ہوئیں تو رات کی گہری تاریکی کچھ سرمئی اندھیرے میں ڈھلنے لگی تھی۔ گاؤں کی ایک مسجد سے اذان سہرنا کی دی۔ پھر مخالف سمت سے... ہم گاڑیاں چھوڑ کے درمیانی محن کر اس کر رہے تھے جب انور کی ماں فجر کی نماز کے لیے باہر آئی اور ہم دونوں کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

"تم دونوں کہاں سے آ رہے ہو اس وقت؟"

میں نے کہا۔ "ذرا صبح کی سیر کے لیے گئے تھے۔ محنت کے لیے اچھی ہوتی ہے۔"

"مگر جھوٹ اچھا نہیں ہوتا۔ رات بھر باہر رہے ہو تم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

جواہر

دیکھا۔ وہ کفن پہنے نظر آئے۔ سفید لٹھے کے کفن پر خون کے دھبے تھے۔ تجھے بتایا تھا میں نے کہ وہ حادثے میں مارے گئے تھے۔

”تو نے کہا تھا کہ نادر شاہ نے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ وہ زندہ جل کے سر گئے تھے کسی عورت کے ساتھ۔“

”ہاں، حادثہ پہلے ہوا تھا جب ڈاکوؤں نے انہیں لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ تو میں نے ان کو خون آلود کفن میں دیکھا اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نادر شاہ سے بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال دوں۔ انہوں نے اپنا خون معاف کیا۔“

”ان کی روح کا مشورہ ٹھیک تھا۔“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں ان کو دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور ان سے ملنے بڑھا تو وہی ہوا۔ میں دروازے سے ٹکرا گیا۔ استاد کا مارٹم اور اس کی بیوی دھماکا سن کے آئے اور مجھے سنبھالا۔ میرے دوبارہ سونے تک بھائی وہاں رہی۔ لیکن یار پھر دوسرا خواب دیکھا میں نے۔“

”ایک کھٹ میں دو مزے۔ ایک رات میں دو خواب۔ ایک انٹرول سے پہلے ایک انٹرول کے بعد۔“

میں نے انور کے مذاق کی پروا نہیں کی۔ ”دوسرے خواب میں رمضان تھا۔ میں اس سے فاطمہ یعنی نورین کا پوچھنے گیا۔ وہاں رمضان کا بھانجا پولیس کے ساتھ آ گیا۔ میری گرفتاری پر ایک لاکھ کا انعام وصول کرنے کے لیے۔ پولیس نے مجھے پکڑ لیا اور دین میں بٹھا کر لے گئے۔ اس خیال سے کہ اب کی بار مجھے بھائی کے تختے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ میں دین سے کود گیا۔ لیکن بیڈ سے فرش پر گرا۔ جب آنکھ کھلی تو فرش پر تھا۔“

”تو اپنے دماغ کا علاج کرا۔“

”کل میں رمضان سے ملنے گیا تھا۔ خواب کو بھول گیا تھا۔ لیکن یار رمضان کے گھر پہنچا تو منظر وہی جو مجھے خواب میں نظر آیا تھا۔ سو فیصد وہی۔ بس اچانک مجھے خیال آیا کہ خواب تو سچ ثابت ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باقی خواب بھی سچ ہو جائے یعنی پولیس واقعی مجھے نہ پکڑ لے۔ میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اب خیال آتا ہے کہ کیا بے وقوفی کی۔ میں وہاں چھپا رہا جہاں گاڑی تھی۔ شام تک کچھ نہ ہوا تو میں اتر آیا اور ڈرتے ڈرتے رمضان کے گھر گیا۔ رمضان گھر میں نہیں تھا۔ باہر کچھ لوگوں سے پوچھا۔ رمضان کا ایک بھانجا بھی ماموں کے ساتھ تمام جرائم میں شریک رہتا تھا اور ماموں بھانجا جیل بھی ساتھ ہی کاٹتے تھے۔ مجھے کسی سے کچھ معلوم

کہیں حکمراں نہیں ہے۔ خاندان کا سربراہ ہر جگہ مرد ہے۔ عورت بھی شادی کے بعد اس کا نام اختیار کرتی ہے جیسے نام کی تختی مکان پر یا قبر پر لگاتے ہیں کہ فلاں کی ملکیت ہے۔ تو عورت بھی ملکیت ہو جاتی ہے مرد کی۔ اولاد بھی مرد کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ مارکر بیٹ تھپڑ وزیر اعظم برطانیہ ہو یا اندرا گاندھی۔۔ ایک ملازمہ کافی کی ٹرے رکھنے آئی۔

”اس کو اس کا مقصد؟“ میں نے ملازمہ کے جانے کے بعد کہا۔

”ریشم اسی گاؤں کی لڑکی ہے۔ اسے پاؤں کی جوتی بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ شادی کے بعد میرے سر کا تاج نہیں بن سکتی۔ وہ پاؤں کی جوتی ہونا خدا کی مرضی اور اپنی تقدیر سمجھتی ہے۔ بہر حال تو زیادہ فکر مند نہ ہو۔ میں نے بہت کچھ بدل دیا ہے اور خود کو بدلنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ چل کافی پی اور بتا اس پہلوان کی بیٹی کیا بہت خوب صورت ہے؟“

”بیٹی تو ہے۔“ میں اس سوال پر بھونچکا رہ گیا۔ ”مگر اسے تو میں نے دیکھا بھی نہیں۔“

”میں سمجھا کہ اس کے ساتھ رات گزارنے کے پچیس ہزار دیے۔“

”انور! تو جانتا ہے مجھے۔“ میں نے مشتعل ہو کر کہا۔

”اچھا اچھا، غصہ مت ہو سو ری یار۔ مجھے پتا ہے تو میرے جیسا نہیں ہے۔“ اس نے سگریٹ کو فرش پر مسل دیا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پرسکون کیا۔ ”تصور تیرا نہیں، جس ماحول میں تیری تربیت ہوئی، وہ ایسا ہی تھا۔“

پھر میں نے اسے بتا دیا کہ میں نورین کے چکر میں رمضان سے ملنے گیا تھا اور وہاں میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں نے اس سے اپنا خواب بھی بیان کیا۔ ”یار میں نے ایک رات میں دو خواب دیکھے۔“

”دونوں میں نورین نظر آئی مگر تیرے ہاتھ نہیں آئی۔“

”پتا نہیں میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کبھی موقع ملا تو ان روحانیات اور نفسیات وغیرہ کے کسی ماہر سے پوچھوں گا۔ خواب مجھے حقیقت لگتا ہے۔ نیند میں چلنے والے کی طرح میری حالت ہوتی ہے۔ پہلے میں نے بھائی کو

نہ ہوا لیکن ایک سچے نے رہنمائی کی اور مجھے رمضان کے پاس لے گیا قبرستان... وہاں وہ ایک خالی قبر میں لیٹا ہوا تھا۔

اسے مار دیا۔
"کس نے؟" انور سوچتے ہوئے بولا۔ "اور کیوں؟"

اختصار سے کام لینے کے باوجود میں ایک گھنٹا بولتا رہا۔ اتنی دیر میں سورج بھی کافی ادا پر اٹھ چکا تھا اور باہر مجھے اجلی دھوپ نظر آرہی تھی۔ انور نے میری سائی بات بڑے دھیان سے سنی تھی۔

میں خاموش ہوا تو اس نے گھڑی دیکھی۔ "یہ سب تو دو گھنٹے پہلے بتا دیتا تو..."

"تو کیا ہوتا۔ پہلو ان سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ نیک بندے کون ہیں جو مجھے زندہ سلامت گرفتار دیکھنا چاہتے تھے۔"

"معلوم ہو جائے گا۔ اگر پہلو ان خود نہ مارا گیا۔ اس کا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ وہ بے وقوف آدمی ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "اس کے دماغ کا خانہ خالی ہے یا اس میں بھوسا ہے۔"

انور نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ تو بولی ہے مگر زیادہ دیر نہیں ہوئی، میں کرتا ہوں کچھ بندوبست۔"

انور کچھ اپ سیٹ تھا۔ مجھے کچھ بتائے بغیر وہ باہر نکل گیا اور دس منٹ بعد واپس آ گیا۔

"کیا بندوبست کیا تو نے؟" میں نے کہا۔ "ناشتہ کا؟"

وہ ہنس پڑا۔ "وہ بھی کیا مگر میں نے چار بندے بھیج دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پہلو ان سے تیری ڈیلیوری لینے والے اتنی جلدی نہیں آئیں گے۔ جلدی کی بات ہوتی تو وہ آدمی رات کو آ جاتے۔"

"یہ چار بندے کیا کریں گے؟"

"یہ پہلو ان کے گھر کی نگرانی کریں گے اور کوشش کریں گے کہ انہیں یہاں لے آئیں۔ زندہ یا مردہ۔

پہلو ان کے لیے میں نے کہا ہے کہ اسے نیلی کے ساتھ یہاں پہنچا دیں۔" انور نے کہا۔

میں نے کہا۔ "رمضان کے ساتھ تو میرا معاملہ تھا۔ وہ اور اس کا بھانجا جرائم پیشہ بدنام لوگ تھے۔ ابھی تک وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہا ہے۔ فاطمہ کے بارے میں اور نورین کے معاملے میں۔ کسی سے سچ اگلوانا آسان نہیں تو مشکل بھی نہیں۔ بس پولیس والا طریقہ آزمانا پڑتا ہے۔

رمضان نے بہت مار کھائی ہوگی لیکن اب اس کی وہ عمر نہیں رہی اور وہ کمزور بھی ہو گیا ہے۔ وہ سب اگل دیتا مگر کسی نے

نہ ہوا لیکن ایک سچے نے رہنمائی کی اور مجھے رمضان کے پاس لے گیا قبرستان... وہاں وہ ایک خالی قبر میں لیٹا ہوا تھا۔

اسے مار دیا۔
"کس نے؟" انور سوچتے ہوئے بولا۔ "اور کیوں؟"

اختصار سے کام لینے کے باوجود میں ایک گھنٹا بولتا رہا۔ اتنی دیر میں سورج بھی کافی ادا پر اٹھ چکا تھا اور باہر مجھے اجلی دھوپ نظر آرہی تھی۔ انور نے میری سائی بات بڑے دھیان سے سنی تھی۔

میں خاموش ہوا تو اس نے گھڑی دیکھی۔ "یہ سب تو دو گھنٹے پہلے بتا دیتا تو..."

"تو کیا ہوتا۔ پہلو ان سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ نیک بندے کون ہیں جو مجھے زندہ سلامت گرفتار دیکھنا چاہتے تھے۔"

"یہی بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔ رمضان کا کچھ تعلق ضرور تھا درگاہ سے لیکن اگر دو نوارح کے عام عقیدت مندوں...

کی طرح نہیں۔ مجھے شک ہے کہ رمضان اور اس کا بھانجا بھی پیر سائیں کے ساتھی تھے۔ وہ عام لوگوں جیسے بے وقوف اور سیدھے سادے دیہاتی نہیں تھے۔ ان کا ایک

کرمٹل ریکارڈ تھا۔ وہ کئی بار جیل کاٹ چکے تھے۔ کبھی ساتھ ساتھ کبھی الگ الگ... جب میں نے فاطمہ کو دیکھا تو میں خود بھی قیدی تھا۔ فاطمہ میرے یقین کے مطابق نورین تھی۔"

انور سستار ہا۔ "تیرے یقین کے مطابق۔"

"ہاں، میرا خیال ہے کہ اس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا تھا۔ وہ پاگل نہیں تھی۔ غالباً اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی یا اس کو دواؤں کے زیر اثر رکھا گیا تھا۔ دو بار اس نے

نورین ہونے سے انکار کیا۔ لیکن ایک بار اس کے رویے سے لگتا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ وہ خوف زدہ تھی۔

اب یہ تو بھی جانتا ہے کہ پیر صاحب یعنی تیرے تایا اپنا کاروبار کیسے چلاتے تھے۔ وہ دماغ کو متاثر کرنے والی دوا میں استعمال کرتے تھے۔ شاہینہ بھی یہ بات جان کئی تھی۔ اس نے ریشم کو زہر دیا۔ پیرے پاس ہے وہ میڈیکل

رپورٹ۔ ریشم اس لیے بچ گئی تھی کہ دوا پرانی ہو کے اثر کھو چکی تھی۔ بعد میں جس طرح اس نے خود میرے سامنے

تفصیل سے بتایا کہ یہ کیا دوائیں ہیں جو آدمی کے دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ اعتراف جرم کرانے والی سب دوائیں

اب عام استعمال میں ہیں لیکن برین واشنگ کی مخصوص دوائیں ذہنی امراض کے اسپتالوں اور خفیہ ایجنسی والوں کی

مدد سے مل جاتی ہیں۔ شاہینہ انتہائی حسین ہی نہیں ذہین اور خطرناک عورت تھی۔ کتنی آسانی سے اس نے اکبر کو ٹھکانے

لگا دیا اور ہر ایک کی نظر میں مجرم کون بنا؟ تو..."

"اب تو میں کہتا ہوں کہ اچھا ہوا شاہینہ ماری گئی۔

ورنہ تجھے تو وہ چاہتا کے قید میں رکھتی۔ تو اس کے اشاروں پر چلنے والا روبوٹ ہوتا۔ کیا واقعی تو نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا؟ یا یہ بھی چال تھی؟"

"یہ چال نہیں تھی۔ میں واقعی اس کے ٹرانس میں تھا۔

اس نے مجھے اپنا بنا لیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فاطمہ کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ نورین ہی تھی اور اس سے پہلے کہ یہ

نہ ہوا لیکن ایک سچے نے رہنمائی کی اور مجھے رمضان کے پاس لے گیا قبرستان... وہاں وہ ایک خالی قبر میں لیٹا ہوا تھا۔

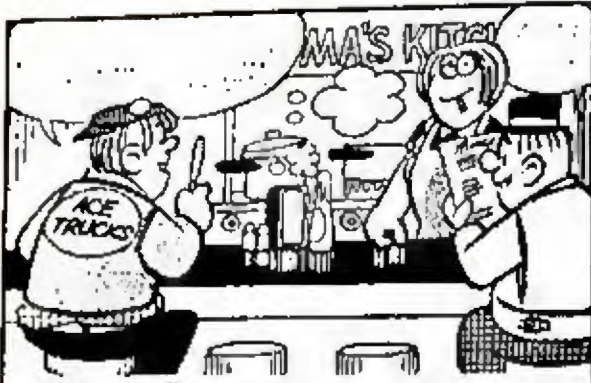
اسے مار دیا۔
"کس نے؟" انور سوچتے ہوئے بولا۔ "اور کیوں؟"

اختصار سے کام لینے کے باوجود میں ایک گھنٹا بولتا رہا۔ اتنی دیر میں سورج بھی کافی ادا پر اٹھ چکا تھا اور باہر مجھے اجلی دھوپ نظر آرہی تھی۔ انور نے میری سائی بات بڑے دھیان سے سنی تھی۔

میں خاموش ہوا تو اس نے گھڑی دیکھی۔ "یہ سب تو دو گھنٹے پہلے بتا دیتا تو..."

"تو کیا ہوتا۔ پہلو ان سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ نیک بندے کون ہیں جو مجھے زندہ سلامت گرفتار دیکھنا چاہتے تھے۔"

جواہر



یہاں کھانا کھا کر مجھے اپنی مرحومہ بیوی یاد آ جاتی ہے۔ بالکل وہی ذائقہ ہوتا ہے



وہ بے چاری جو بھی پکاتی تھی، جلاؤ لیتی تھی

”تو اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”انور! میں نے جیل کالی ہے۔ مجرموں کے درمیان رہا ہوں۔ ان میں بردہ فروش بھی تھے۔ ایک تو بڑا خاص آدمی تھا۔ ایک مشہور ہیر کے آستانے سے تعلق تھا۔ وہ بڑی بے خوفی سے بتاتا تھا ایسی ہی باتیں اور جیل کے اندر بھی اس کے ساتھ خاص مہمانوں والا سلوک ہوتا تھا۔ یہ جتنے ڈبا ہیر ہیں جو اپنی روحانی طاقت کی پبلیٹی کراتے ہیں محبوب آپ کے قدموں میں، جو مانگو گے ملے گا، دشمن نیست و نابود ہوگا۔ ایسے بد معاش ہیری مریدی کو کاروبار بناتے ہیں تو انہیں قانون کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنی آمدنی کا حصہ ادھر بھی پہنچاتے ہیں۔“

”جو درگاہ تہا ہوگئی، وہ ایسا ہی جرائم کا ڈاکٹر؟“

”مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں۔ زیادہ تر ہاتھیں گھر کے بھیدی شاہینہ نے بتائیں۔ رمضان جیسے نہ جانے کتنے ہوں گے جو جانتے بوجھتے یا انجانے میں شریک جرم بنتے ہوں گے۔ یہ بارہ مرید سب کو کنٹرول کرتے تھے۔ وہ سب بے روزگار ہو گئے۔ مجھے شک ہے کہ رمضان کو انہوں نے مارا۔ یہی لوگ مجھے زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ پوچھ کیوں؟“

”اب تو پوچھتے بغیر ہی بتا دے افلاطون۔“

”دیکھ ہیر سائیں مجھے اپنا جانشین مقرر کر چکے تھے

راز فاش ہوتا، ہیر سائیں کے حکم پر وہ فاطمہ کے ساتھ روپوش ہو گیا۔“

”لیکن کچھ عرصے بعد وہ لوٹ آیا، فاطمہ کہاں گئی؟“

”مجھے اس سے یہی معلوم کرنا تھا لیکن میری اپنی غلطی سے یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا اور ہیر سائیں کے مددگاروں میں سے کسی نے اسے بازو دیا۔ انہیں ڈر ہوگا کہ رمضان کچھ بک نہ دے جس سے ان کے مذموم کاروبار کا راز فاش ہو جائے۔“

”تیرا کیا خیال ہے، یہ مذموم کاروبار کیا تھا؟“ انور بولا۔ ”بردہ فروشی؟“

”مجھے ڈر ہے کہ دیگر جرائم کے ساتھ وہاں یہ بھی ہوتا تھا۔ عورتیں ہی وہاں زیادہ لائی جاتی تھیں۔ سب پر جن آتے تھے اور سب جوان ہی ہوتی تھیں۔ شوہروں کے یا سسرال والوں کے مظالم کا شکار یا جنسی تا آسودگی کی مریض۔ زیادہ عمر کی یا بہت کم عمر کی لڑکی یا کوئی مرد مجھے نظر نہیں آیا جس پر جن آتے ہوں۔ اب ایسی نو جوان عورتوں میں سے کچھ غائب ہو جائیں اور فروخت کر دی جائیں تو کوئی قیامت نہیں آتی۔“

انور نے اتفاق میں سر ہلایا۔ ”وہ پہلے ہی سسرال میں ناپسندیدہ ہوتی ہیں۔ شوہر الگ پریشان ہوتے ہیں کہ جنات سے کیسے نمٹیں جو اس کی بیوی پر عاشق ہو گئے۔ انسان ہوتا تو نمٹا جاسکتا تھا مگر وہ درگاہ سے غائب ہو جائے تو بات چھی نہیں رہ سکتی۔“

”جیسا کہ تو نے کہا سسرال والے یا شوہر تو جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ ہیر سائیں جن اتار دیں ورنہ انکی عورت کو گھر میں رکھنا مشکل... فکر کرتے ہیں صرف ماں باپ یا بھائی۔ اگر انہیں بتایا جائے کہ تمہاری بیٹی یا بہن صرف ڈراما کر رہی تھی اس کی کسی سے یاری تھی اور وہ اسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ گھر سے تو جا نہیں سکتی تھی۔ یہاں اسے موقع ملا اس کا یا رہی یہاں آیا اور دونوں نکل گئے۔“

انور بولا۔ ”مگر درگاہ پر محافظ تھے۔“

”وارنٹوں کو کہا جاسکتا ہے کہ لڑکی کے آستانے کا رڈ کو نشہ پلا کے مدہوش کر دیا تھا۔ اب پولیس میں رپورٹ لکھواتے ہیں تو سوچ لو تمہارا کتنی بدنامی ہوگی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ بہتر ہے خاموش ہو جاؤ یا کہہ دو جنات نے اس کی جان لے لی۔ ایک قبر بنادو، یہ ہو سکتا ہے کہ وارنٹوں کو دھمکی دے کر خاموش کر دیا جاتا ہو یا تھوڑا بہت پیسہ دے کر۔“

بڑے ہو گئے ہیں چھوٹے اور چھوٹے اتنے بڑے۔
 ”آپ اور شرمسار نہ کریں۔“ انور نے اسے عزت سے بٹھایا۔

”دوسری بات یہ کہ تم سے ملنے نہیں دہمیں تمہارے
 یار سے ملنے اور اسے اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔“ اس
 نے سچ سچ بندوق کا رخ میری طرف کر دیا۔ ”جان عذاب
 میں ہے کل سے دو دو لڑکیاں تو باقاعدہ آٹھ آٹھ آنسو بہا
 رہی ہیں۔“

”یعنی سولہ آنسو۔“ میں نے ہنس کے کہا۔ ”کوئی وجہ
 بھی تو ہوگی؟“

”وجہ ہے تو دو رات بھر یہاں بیٹھا گپ لگا رہا۔
 میں نے بندہ بھیجا تو اسے گیٹ سے ہی ٹال دیا گیا کہ یہاں
 کوئی نہیں۔ صبح تیسری میری بھوی رونے والوں میں شامل
 ہو گئی۔ تیری کوئی ہوتی تو چار ہوتیں۔ یہ کیا مذاق ہے؟“ اس
 نے بندوق سے نیچے رکھ لی۔

میں نے کہا۔ ”آئی ایم سوری۔“

”میں سچ سچ گولی مار دوں گا۔ سخت چڑ ہے مجھے اس
 لفظ سے۔ گولی مار کے میں بھی کہہ دوں گا آئی ایم سوری۔“
 ”چا چا جی! یہ رات کو دوائی یہاں نہیں تھا۔ ابھی صبح
 وار دہوا ہے۔ مجھے تو رشک آرہا ہے اس پر۔ کتنے لوگ ہیں
 اس کے لیے پریشان ہونے والے، آپ خود آگئے
 یہاں... اس حویلی میں، آپ میری وجہ سے نہیں آئے۔“
 وہ کھڑا ہو گیا۔ ”اچھا غلطی ہو گئی۔ چلا جاتا ہوں۔“
 انور نے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ ”ناراض نہ
 ہوں چا چا جی، آپ کا حویلی میں آنا میرے لیے بڑی عزت
 کی بات ہے۔ جیسے بھی آئے آپ نے شان کا خیال نہیں
 کیا۔“

سکندر شاہ نے بیٹھ کر گہری سانس لی۔ ”سب ختم ہو گیا
 پتھر انور، وہ جھوٹی انا، اونچے شملے کی بات، آن پر جان دینے
 کا زمانہ، وقت نے میرا بھی سر جھکا دیا ہے۔ مت یاد دلا
 پرانی باتیں۔“

”اچھا آپ کے آنے کا ماں جی کو بتا دوں۔“ انور
 اٹھا اور باہر چلا گیا۔

”انور نے غلط نہیں کہا۔ رات کو میں یہاں نہیں تھا۔“
 ”تو پھر کیا امر آؤ جان کے کوٹھے پر تھا۔ یا چلہ کاٹ
 رہا تھا اجڑے مزار پر...“

میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا کہ سکندر سے جھوٹ
 بولوں یا سچ کہ انور ماں کے ساتھ نمودار ہوا۔ عمر میں انور کی

اور اس کا اعلان بھی ہو گیا تھا۔ سارے مرید یہ بات جانتے
 تھے۔ پھر سائیکس کی اولاد دزینہ نہیں تھی۔ ایک بیٹا تھا جو لاہر
 ہے۔ بیٹے کی جگہ داماد لے سکتا تھا۔ خاندانی شجرہ یا رشتہ ہو تو
 جائزین کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ عام عقیدہ ہے کہ روحانی قوت باپ
 کے بعد بیٹے میں آ جاتی ہے۔ داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے۔ اکبر
 زندہ رہتا تو پھر سائیکس کا وھندا چلتا رہتا بلکہ دن دوئی رات
 چوگنی ترقی کرتا۔ وہ نہیں رہا تو شاہینہ نے مجھے آگے کر دیا۔
 باپ کی مرضی نہیں تھی تو ہو گئی۔ شاہینہ نے اسے قائل کر لیا اور
 گویا جائزین کے لیے سوزوں امیدوار مل گیا۔ پھر سائیکس ایم
 ڈی تھے یا حیاتر میں تو بارہ مرید اس کا دوبار میں ڈائریکٹر کی
 حیثیت رکھتے تھے۔“

”کیا مطلب ہے تیرا، اب وہ زبردستی تجھے گدی پر
 بٹھائیں گے؟“

”اوتے گدھے تو گدی پر نہیں بیٹھے گا تو لٹا دیں گے،
 کسی قبر میں۔“

”یہ کام گمن پوائنٹ پر کیسے ہو سکتا ہے۔ چودھری
 صاحب؟“

”گمن پوائنٹ کلچر ہمارے ملک میں بہت عام ہے۔
 استغنے لیے جاتے ہیں۔ نکاح ہو جاتے ہی اور پھر بچے۔“

”گمن پوائنٹ پر بچے؟“

”میرا مطلب تھا کہ شادی ہو گئی تو بچے آٹو ٹیک...
 مقدمات کا فوری فیصلہ ہوتا ہے لوٹ مار تو کوئی بات ہی
 نہیں۔ یہ تاریخ میں پہلا واقعہ ہو گا کہ گمن پوائنٹ پر کسی کو
 پھر بنایا جائے گا اور یہ اعزاز تیرے حصے میں آ رہا ہے۔“

”یار مذاق چھوڑ۔“
 ”ہاں، مذاق چھوڑ، پاس آ گیا ہے۔ یہ بھی گمن
 پوائنٹ پر لے جائے گا تجھے۔“ انور نے باہر کی طرف اشارہ
 کیا۔

باہر ایک فور وکیل ڈرائیو جیب سے سکندر شاہ اتر رہا
 تھا اور اس کے ہاتھ میں واقعی بندوق تھی۔

انور بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ تو نے چودھریوں کی تاریخ
 بدل دی۔ تیری وجہ سے آج سکندر شاہ نے کبلی بار حویلی میں
 قدم رنچ فرمایا ہے۔“

سکندر اتنی دیر میں برآمدے تک پہنچ گیا تھا۔ انور
 نے اور میں نے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ ”شاہ جی؟
 آپ بڑے ہی نہیں بڑے دل والے ہیں کہ خود یہاں
 آ گئے۔“ انور نے بغل گیر ہو کے کہا۔

”وقت وقت کی بات ہے چودھری صاحب، اب

سکندر نے اپنا جارحانہ دفاع جاری رکھا۔ ”رشتوں کی بھی کیا پروا تھی اسے... غرض تھی اس کی... تیرے بیٹے نہ ہوتے تو وہ کسی بھائی کو نہ پوچھتا۔ رشتہ میرا بھی تھا مگر کیسے بے عزت کیا اس نے مجھے... دشمن ہو گیا جان کا۔“

”چل اب چھوڑ پرانی باتیں۔ جو مر گئے ان کا حساب اللہ پر چھوڑ، میں ایک دن کئی انور کے ساتھ تو بڑا رونا آیا۔ سب اینٹ پتھر اور مٹی کے ڈھیر پڑے تھے۔ پیری فقیری جھوٹ سہی، ردفق کیسی لگی رہتی تھی۔ تو الیاں اور سال کے سال عرس، لنگر...“

سکندر اس ذکر کو ختم کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ”اچھا بھر جانی! میں تو آیا تھا اس کو لے جانے... ملک سلیم کو... رات سے غائب تھا۔ بتائے بغیر نکل گیا تھا۔“

”رات کا تو پتا نہیں، صبح دونوں کو فجر کی نماز کے وقت ساتھ دیکھا تھا۔ افسوس کہ میرے اور تیرے گھر میں سوگ ابھی ختم نہیں ہوا۔ ورنہ تجھے خالی ہاتھ نہ جانے دیتی۔“

سکندر نے کہا۔ ”دنیا سے خالی ہاتھ ہی جانا ہے بھر جانی، کیا رکھا ہے ان رسوں میں، کب آ رہی ہو تم اپنی امانت وصول کرنے، شرع میں کوئی حکم نہیں سوگ تین دن سے زیادہ کرنے کا۔“

”لیکن ابھی تو... مراد کا چہلم بھی نہیں ہوا اور تیری بہو عدت میں ہے، دنیا کیا کہے گی؟“

”اتنا خیال ہے تمہیں تو چہلم کے بعد سہی۔ میں نے سب کچھ ان کے حوالے کر دیا ہے۔“ اس نے میری اور انور کی طرف اشارہ کیا۔ ”ریشم کو لاؤ اپنا گھر آباد کرو۔ اللہ کرے گا پھر پہلے جیسی رونق ہو جائے گی، رب را کھا۔“

میں نے کہا۔ ”شاہ جی، ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔“

اب دس بج رہے تھے۔ یہ تو تھا کہ پہلو ان سے مجھے وصول کرنے والوں کو اتنی جلدی نہیں ہوگی کہ نہار منہ پہنچ جائیں۔ وہ لوگ بھی لوٹ کر نہیں آئے تھے جو... پہلو ان کی حفاظت اور اسے خطرے کی صورت میں نکال کے حویلی پہنچانے کے ذمے دار تھے۔ سکندر شاہ کی جیب میں بیٹھ جانے کے بعد میں نے مختصر الفاظ میں اپنی غیر حاضری کی وجہ بیان کی۔ دس منٹ میں سوال جواب کی منگنا کش بھی نہ تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں جیسے جن پھر گیا تھا۔ کوئی اسے گھر سے باہر نہیں تھا۔

”کہاں گئے آخر سب لوگ... وہ کہاں ہیں جن کو میں نے بھیجا تھا؟“ انور بولا۔

ماں یقیناً زیادہ تھی۔ سکندر شاہ کھڑا ہو گیا۔ ”سلام بھر جانی۔“ اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کے کہا۔

”اللہ خوش رکھے، بیٹھ۔“ انور کی ماں سامنے بیٹھ گئی۔

خاسوشی کا ایک دم وقفہ آیا جس میں شاید وہ دونوں ان کو یاد کرتے رہے جو اب نہیں تھے اور دشمنی کی بنیاد ڈال کے اسے روایت بنانے کے ذمے دار تھے۔

”مجھے افسوس ہے چودھری صاحب کا...“

”تم اس وقت نہیں آئے تھے۔“ انور کی ماں نے تلخی سے کہا۔

”آیا تھا۔ جنازے میں تھا، ہاں گھر نہیں آیا تھا۔ اب چھوڑو بھر جانی، پرانی باتیں بھلا کے آیا ہوں میں۔ آپ بھی بھلا دو۔ ان بچوں کے لیے جو بچ گئے ہیں۔ ہم اور آپ ان کو پھلتا پھولتا پیار محبت سے رہتا دیکھ لیں۔“

”مراد کے بارے میں بات کرنے کی ہمت نہیں مجھ میں۔“ انور کی ماں نے کہا۔

”مجھے دیکھو، میں بھی تو زندہ ہوں۔“ سکندر بولا۔

”اور اس کی ماں؟“

”کہنے کو زندہ ہے مگر چلتی پھرتی لاش ہے۔ تم ریشم کو لینے تو آؤ گی، دیکھ لینا۔“

”نہیں، اس سے پہلے بھی آؤں گی میں۔“

ایک خادمہ چائے کے برتن اور دوسری ٹرے میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ گئی۔ انور نے سب کو چائے بنا کے دی جو ماحول کے بوجھل پن کا شکار تھے۔ ”اچھے ویلے اجڑ گئے شاہ جی، حویلی اجڑ گئی۔ اس کی روئیں ختم ہو گئیں ورنہ کیا شان تھی۔ کلکٹر بھی آتا تھا۔ اس جیسے لوگوں سے مہمان خانہ بھر رہتا تھا۔ چودھری صاحب بڑے یار ہاش اور مہمان نواز تھے۔ تو نے بھی کچھ تو دیکھا ہے سلیم...“

میں چونکا۔ ”جی، دیکھا تھا۔ ان کو شکار کا بڑا شوق تھا لیکن وہ بیماری کی وجہ سے مجبور تھے۔“

”بس بھر جانی، یاد کر کے کیا ملے گا۔“ سکندر شاہ بولا۔

”شاید سے پہلے اکبر گیا۔ اب وہاں بھی کوئی نہیں۔ انور نے مجھے بتایا کہ ڈاکوؤں نے سب کو مار دیا۔ اور درگاہ برابر کر دی۔“

”وہ تو بھر جانی، اللہ کا عذاب سمجھ۔ درگاہ کہاں تھی جرائم کا ڈاکا تھا۔“ سکندر شاہ نے اپنے دفاع میں کہا۔

”اس میں شک نہیں مگر دونوں بھائیوں میں رشتہ تو تھا۔“

رکھوں گا۔ دو حجرہوں میں... وہ نہیں مانے اور امام کو دھکا دیا۔ اس کا سر دیوار سے لگا۔ یہ یوسف نے دیکھا۔ مولوی صاحب نے ایک کا راستہ روکا اور کہا کہ میری لاش پر سے گزر کے اندر جاسکتے ہو۔ اس مرید نے کہا جیسی تیری مرضی اور اس کو لاش بنا دیا۔ بس یوسف نے پیچھے سے اس کو گولی مار دی۔ اس کے بعد دوسرا مرید اندر گھس گیا۔ عورتوں نے بڑی چیخ پکار کی۔ مرید نے اندر سے حکم دیا کہ کسی کو زندہ مت چھوڑو پھر مقابلہ ہوا۔ بس میں بچا ہوں۔

”اور وہ مرید... اس کے سانگھی؟“

”میرا خیال ہے وہ بھی مارے گئے۔ دو کی لاشیں میں نے دیکھی تھیں۔ ایک کا یوسف نے مرنے سے پہلے بتایا تھا مگر مرید کا پتا نہیں، بھاگ گیا یا ابھی تک کسی گھر میں چھپا ہوا ہے۔“

انور اٹھا۔ ”اچھا ہم ابھی آتے ہیں۔ تم حوصلہ رکھو۔ خون مت بہنے دو۔ میں تمہیں گاڑی میں سے کپڑا لاکے دیتا ہوں، کس کے پٹی باندھو۔“

انور کے جانے سے پہلے میں نے اپنی قمیص اتار کے درمیان سے دو حصوں میں پھاڑ دی۔ ”ہاتھ ہٹاؤ، میں پٹی باندھتا ہوں۔“

میں نے بنیان بھی اتار دی اور گولا سبنا کے زخم کے دہانے پر جملکے پٹی باندھ دی۔ ”بس تھوڑا حوصلہ کرو۔ ہم تمہیں اسپتال لے جائیں گے۔“

یہ اندازہ نہ مجھے ہو سکتا تھا اور نہ انور کو کہ ان قاتلوں کی تلاش کہاں سے شروع کریں، لوگ ابھی تک خوف سے گھر در گھر میں دیکھے ہوئے تھے۔ ہر گلی میں پھر کے گھر گھر کا دروازہ بھانا خود کو بھی قتل کے لیے پیش کرنا ہوتا۔ وہ کسی بھی گھر میں ہو سکتے تھے لیکن یہ خطرہ مول لیے بنا چارہ نہ تھا۔ میں نے اور انور نے آہٹ کیے بغیر آگے پیچھے چلنا شروع کیا۔ میری بھی کوشش تھی کہ آہٹ نہ ہو۔ ہمارے کان کسی سنسان محسوس ہونے والے گھر کے اندر سے سنائی دینے والی آواز پر تھے مگر لگتا تھا گاؤں میں کوئی زندہ ہی نہیں بچا۔ جان کے خوف سے سب اندر دیکھے پڑے تھے۔ اگر گاؤں کی کچھ آبادی باہر نکل کے ہمارا ساتھ دیتی تو ہم چاروں طرف سے حصار بنا لیتے۔

اس وقت قدرت نے ہماری مدد کی۔ ایک گھر کے اندر سے عورتوں کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی جو ہم سے پچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ کسی مرد نے گالی دی اور ایک فائر ہوا۔ عورتوں کے ساتھ بچے چیخ مار کے رونے لگے۔

مطرے کی بونٹا میں محسوس ہوتی تھی۔ انور نے اور میں نے اپنا اپنا ریوڑ لال لیا۔ سکندر شاہ جیپ میں سے اپنی شکاری رائفل اٹھا لیا۔ ابھی ہم گلیوں میں جا کے کسی گھر سے معلومات حاصل کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ میرے کانوں نے کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔

میں نے انور کو متوجہ کیا۔ ”یہ آواز ادھر سے آرہی ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔ تم لوگ ادھر ہی ٹھہرو۔ سب کا ایک ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔“

”میں تجھے کور کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور احتیاط سے خود کو کسی دیوار یا درخت کی اوٹ میں رکھتا آگے چلتا گیا۔ کراہنے کی آواز اب واضح تھی۔ انور نے کہا۔ ”کون ہے؟“

جواب میں کمزور سی آواز سنائی دی۔ ”چودھری جی... ادھر۔“

انور آواز کی سمت گیا۔ اس نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہاں ایک کچے گھر کی شکستہ دیوار کے پیچھے ایک زخمی پڑا تھا۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ وہ زخم کو دبا کر کسی طرح خود کو یہاں تک کھینچ لایا تھا مگر اس کا بہت خون ضائع ہو چکا تھا۔ انور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟ یہ کس نے کیا؟“

وہ بڑی مشکل سے ہانپتے ہوئے بولا۔ ”وہی، دوسرے تھے۔ وہ اپنے ساتھ چار بندے لائے تھے۔“

”چار تم بھی تھے، پھر کیا ہوا، پہلوان کہاں گیا؟“

”کچھ پتا نہیں جی، وہ گھر میں نہیں تھا ہمارے آنے سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ ہم نے اس کے گھر میں جا کے دیکھا کوئی نہیں تھا۔ سب سامان پڑا ہے۔ وہ اندھیرے میں بیوی بچوں کو لے کر چلا گیا تھا۔“

”اور یہ لوگ کب آئے؟“

”دن چڑھنے کے بعد، اور پہلوان نہیں ملا تو انہوں نے ساتھ کے گھر در گھر سے پوچھا۔ ان کو مارا بھی۔ ان کو پتا ہوتا تو وہ بتاتے۔ وہ ہر گھر کے اندر گھس کر دیکھتے رہے۔“

”اور تم دیکھتے رہے؟“ انور نے غصے سے کہا۔

”آپ نے بولا تھا کہ خواجہ خج میں مت پڑنا، یوسف اور اس کا بھائی یعقوب مسجد کے سامنے تھے۔ وہاں انہوں نے پیش امام کو مارا۔ اور اس کے گھر میں گھسنا چاہتے تھے۔ امام صاحب نے کہا کہ اندر پردہ دار عورتیں ہیں۔ میری بیوی اور بیٹی۔ کیا میں پہلوان کو ان کے ساتھ چھپا کے

استعمال کیا جو پولیس کرتی ہے۔ میں نے اسے نکا کر دیا۔ اس کے پیٹ پر بندھے ازار بند کے ٹوٹے ہی شلوار خود بخود اتر گئی۔ میں نے اسے قمیص کے کنارے پکڑ کے اٹھایا تو شلوار پیروں میں پہنچ گئی۔

عام طور پر میں نے کسی کو قابو کر لینے کے بعد اپنے غصے کو بھی قابو کیا ہے لیکن یہاں مجھے ناکامی ہوئی۔ میرا دماغ پر کنٹرول نہ رہا اور میں نے اس کے گیند جیسے پیٹ پر رات ماری۔ وہ ڈکراتا ہوا گرا تو میں نے دوسری ٹھوک اس کی پسلیوں پر رسید کی۔ میں نے اس کی قمیص بھی ہینچ کر تار تار کر دی اور جب وہ بالکل مادر زادنکا ہو گیا تو میں چلا کے کہا۔ ”اوئے دیکھو، باہر آؤ۔۔ اس کا نکالنا چ دیکھو۔ جس جس کو بدلہ لینا ہو جوتا ہاتھ میں لے کر آجائے۔ آؤ اور اس کے منہ پر پیشاب کر دو۔“

”یہ تو کیا کر رہا ہے سلیم! ہوش میں آ۔“ انور نے میرا شانہ ہلا کے کہا۔

”ٹھیک کر رہا ہوں میں۔ بڑی تذلیل اٹھائی ہے ان سب نے۔ آج اس درندے کی باری ہے جو ان کے گھروں کی عزت لوٹا رہا۔“

میری آواز کافی گھروں تک پہنچ گئی تھی۔ لوگوں نے جھانک کر دیکھا اور پھر تین چار افراد نکل آئے۔ وہ سب مشتعل تھے۔ ایک نے سرید کے منہ پر تھوکا اور جوتا مار کے گالیاں بکتا رہا۔ دوسرے نے اسے ٹکڑیوں میں کاٹ دیا اور پھر سچ اس کے منہ پر پیشاب کر دیا۔ وہ بے بس اور نیم جاں تھا۔ اچانک تقدیر پلٹ گئی تھی۔ شکاری خود شکار ہو گیا تھا۔ اس وقت اگر انور ہوش سے کام نہ لیتا تو گاؤں کے لوگ اس کو جان سے مارنے کے بعد بھی مارتے رہتے۔ جو اب ہر طرف سے آ رہے تھے اور تماشا گاہ میں آٹھ دس خون کے پیاسے جمع ہو گئے تھے۔ دیواروں کے اوپر سے اور دروازے کھول کے عورتیں چیخ رہی تھیں۔ ”چھوڑنا مت اس گتے کیونکہ کو۔۔۔“ وہ رو رہی تھیں اور کوس رہی تھیں۔

پھر ایک نیم پاگل بوڑھی عورت وحشیانہ انداز میں لپکی۔ اس کے ہاتھ میں سریا تھا۔ ”مجھے میری بیٹی دے۔ کہاں ہے میری بیٹی۔۔۔ میں خون پی جاؤں گی تیرا۔“ انور نے مشتعل ہو کے میری طرف دیکھا۔ ”اب سنبھال ان پاگل لوگوں کو۔“

مجھے ہوش آچکا تھا۔ میں نے بوڑھی عورت کے ہاتھ سے سریا چھین لیا اور ایک ہوائی فائر کیا۔ ”چلو بس، بہت ہو گیا۔ بندے کو مارنا نہیں ہے۔ مہربان جاؤ پیچھے۔“

میں نے انور کو اشارہ کیا اور ہم اس گھر کی دیواروں کے دونوں طرف جا کھڑے ہوئے۔ گھر کے ساتھ ایک طرف کبریاں باندھنے کی جگہ تھی۔ دوسری طرف پانی سے بھرا ہوا گڑھا۔ میرا خیال تھا کہ زندہ بچ جانے والے مرید کے ساتھ ابھی تک کم سے کم ایک محافظ تھا۔ انہوں نے کسی بات پر مشتعل ہو کے ایک نکل اور کر دیا تھا۔ چیخ پکار سے وہ ڈرنے والے نہیں تھے۔ مدد کے لیے آنے کی ہمت کس میں رہی تھی۔ جو آتا وہ بھی مارا جاتا۔ مرید کی گھر گھر پہلوان کو تلاش کرنے کی بد معاشی ابھی جاری تھی۔ اب یہ لگتا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کے کسی اور گھر کا رخ کریں گے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ پہلے مرید مست سائڈ کی طرح دندنا تا باہر آیا۔ ناکامی کا غصہ اسے زیادہ تھا۔ وہ کتنے بے گناہوں کو مار چکا ہے۔ اس کا احساس نہیں تھا۔ اسے پیچھے آنے والے محافظ پر زیادہ بھروسہ تھا۔ خود اپنے ہاتھ کے ریوالور کو اس نے باہر آتے ہوئے ٹخنوں سے اونچی شلوار کے نیچے میں اڑسا۔ وہ زیر لب کچھ بول رہا تھا جو گالیاں ہی ہو سکتی تھیں۔

تقریباً ایک ساتھ میں نے اور انور نے چلا کے کہا۔ ”رک جاؤ، وہیں رک جاؤ۔ ایک قدم آگے پیچھے مت کرنا۔ ورنہ سر میں سوراخ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

مرید نے سائڈ کی طرح ڈکرا کے محافظ کو گالی دی۔ ”نمک حرام۔۔۔ زندہ مت چھوڑاؤ۔۔۔ کو۔۔۔ جہنمی۔“

محافظ گالیاں کھانے کے بے مزہ نہ ہوا لیکن اسے حکم کی تعمیل میں پلٹ کے دیکھنا پڑا۔ موقع ملتا تو وہ فائر بھی کرتا مگر انور کی گولی نے اسے گرا دیا۔ وہ مٹی میں گر کے پانی سے باہر آنے والی پھلی کی طرح تر پنے لگا۔

”سائنس بھی روک لے مرید کی اولاد۔۔۔ ذرا ہلا تو تیرے سر کا بھیجا نکال دوں گا۔“ میں نے دہاڑ کر کہا۔

مرید اپنی جگہ پر بخمد ہو گیا۔ میں آہٹ کیے بغیر آگے بڑھا اور اس کو تیل کی طرح اپنے سر سے ٹکڑیوں میں کاٹ کر اس کی گردن پر پھیر رکھ دیا۔ دہاڑ سے اس کا سانس رکنے لگا ہو گا کہ وہ دُح کیے ہوئے پھیپسے کی طرح تر پنے اور غرائے کی آوازیں نکالنے لگا۔ میں اگر چاہتا تو ذرا سے دہاڑ والے جھٹکے سے اس کی گردن توڑ دیتا مگر میرا ارادہ اسے غیر مسلح کر کے قابو کرنے کا تھا۔ انور نے میری مدد کی اور تلاشی میں وہ ریوالور نکال لیا جو مرید نے نیچے میں اڑس رکھا تھا۔ مگر نے کے بعد وہ شلوار میں نیچے چلا گیا تھا۔ میں نے وہ طریقہ

سلام کرتے تھے اور سکندر شاہ کے جاننے والے اسے... ایک دو نے حیرانی سے پیچھے میرے ساتھ چادر سے ڈھکی ہوئی پُراسرار شخصیت پر بھی نور کیا جو عورت بہر حال نہیں تھی در نہ برقع میں ہوتی۔ انور کو حویلی کے دروازے سے کچھ فاصلے پر اتار کے سکندر شاہ کے ساتھ سیدھا نکل گیا۔ اس گاڑی کا نام جہاں سکندر نے ایک نئی گاڑی شپ آباد کی تھی پہلے کچھ اور تھا مگر اب اس نے بدل کر بیٹے کے نام پر مراد نگر کر دیا تھا۔ پرانے نام لوگوں کی زبان سے اتنی جلدی نہیں اترتے۔ سکندر شاہ نے اس سڑک پر جو آگے جا کے ملتان کی جی ٹی روڈ سے ملتی تھی ہر جگہ مراد آباد کے زرد پور ڈالگو اسے تھے جو رات کو ہیڈ لائٹس میں روشن دکھائی دیتے تھے۔ نام کاغذات میں بھی بدل گیا تھا۔ یہ ایک عام دھکی باب کا رڈ عمل تھا جو اپنے اکلوتے بیٹے سے محروم ہو گیا تھا مگر اس کے نام کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

کسی وضاحت کے بغیر سکندر نے مرید کو سیکورٹی والوں کے حوالے کیا۔ "اسے پنجرے میں بند رکھو... اور خبردار یہ مرنے نہ پائے۔"

مرید چلانے لگا۔ اللہ رسول کے واسطے دینے لگا مگر سیکورٹی گارڈ اسے سمجھ کر لے گئے۔ میرا استقبال سب سے پہلے ریشم نے کیا۔ "بھائی! کہاں چلے گئے تھے تم؟" وہ ددڑ کے مجھ سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

"لڑکی یہ کیا پاگل پن ہے۔ کیا پہلے میں نہیں جاتا تھا؟" میں نے اس کے آنسو پونچھے۔

"تم بتا کے جاتے تھے۔" وہ سسکیاں لینے لگی۔

روبی چند منٹ بعد نمودار ہوئی۔ "تشریف لے آئے محترم۔" روزینہ کو مراد کے گھر والے سب روبی کے نام سے پکارتے تھے۔ اس نے بھی اسے روبی کہنا شروع کر دیا تھا۔

"یہاں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی بچہ ہوں جو گم ہو گیا تھا۔ میں ریشم آپ کی سسرال میں رات بھر اس آٹو کے پیچھے کو سمجھاتا رہا... تمہارے چودھری صاحب کون؟" ریشم نے آنسو پونچھ کے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ "انور کو...؟"

"آہ... غضب خدا کا، ابھی سے ہونے والے مجازی خدا کا نام لیتی ہے۔ نکاح ٹوٹ جاتا ہے اس سے۔" روبی مسکرائی۔ "ہونے سے پہلے ٹوٹ جاتا ہے مولوی صاحب؟"

میں نے اس کے شوخ لہجے پر غور کیا تو مجھے اس کے

جھوم کا ہسٹریا گولی کی آواز پر یوں سرد پڑ گیا جیسے بھڑکتی آگ کو پانی سرد کر دے۔ وہ خود بخود پیچھے ہٹ گئے۔ وہ سب چودھری انور کو پہچانتے تھے اور اس کے حکم کے غلام تھے۔ انور نے کہا۔ "اس بندے کو ہم لے جا رہے ہیں۔ لیکن خبردار جو کسی نے ہمارا نام لیا اور کسی کو کچھ بتایا جس جس کے ساتھ ظلم ہوا، سب کو انصاف ملے گا۔ میں پورا کروں گا نقصان۔ لیکن ظاہر ہے زندگی کا نقصان میں پورا نہیں کر سکتا۔ چلو شاہاش... جو مر گئے ہیں انہیں کفن دین دو۔"

"اگر پولیس نے پوچھا چودھری صاحب..."

"پولیس نہیں آئے گی یہ میری ذمہ داری ہے، چلو..." اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور لوگ واپس ہو گئے۔

میں مرید کو جنگی قیدی کی طرح بالکل برہنہ حالت میں آگے آگے چلاتا ہوا گاڑی تک لے گیا۔ وہ بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے وہ کراہ بھی رہا تھا اور مجھ سے رحم بھی مانگ رہا تھا۔ مجھے خدا رسول کے واسطے دے کر معافی کا خواستگار بھی تھا۔ میں نے اسے جیب میں پیچھے بیٹھنے کو کہا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

انور کچھ دیر بعد نمودار ہوا۔ اس نے گاؤں کے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ مقابلے میں مارے جانے والوں کی لاشیں اٹھا کے حویلی میں پہنچا دیں۔ وہ محافظ جس کو میں نے پٹی بانہ بھی تھی کسی لمبی امداد کے ملنے سے پہلے مر گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ پٹی محض ہمدردی کے لیے تھی۔ اگر ہم اسے فوری طور پر جیب میں ڈال کے لے جاتے جیب بھی وہ راستے میں مرجاتا۔ میں نے پتلون پہنی ہوئی تھی لیکن اس مجرم کے جسم پر کچھ نہ تھا۔ اس حالت میں اسے حویلی لے جانا مشکل تھا۔ انور نے کسی گھر سے ایک چادر فراہم کی جسے وہ اوڑھ کر بیٹھ گیا۔ سکندر شاہ بڑے سکون سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ساری آدائیں سنی ہوں گی مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں تھا۔

"مجھے جیب کا خیال تھا۔ ان کا کوئی شیطان زادہ اسے آگ نہ لگا دے۔" اس نے جیب اسٹارٹ کرنے کے بعد کہا۔

سکندر کے ساتھ انور بیٹھا تھا۔ "شاء جی! میرا خیال ہے قیدی کو پوچھ گچھ کے لیے آپ لے جاؤ۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ میں تم کو اتار کے ملک

سلیم کو بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ اس کو چادر میں چھپا دو۔"

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ آتے جاتے لوگ انور کو بھی

جواہر

سے اتنی بد حال تھی کہ لگتا تھا صدمے سے مر جائے گی۔ دن رات روتی تھی اور ہفتہ ہفتہ نہ منہ دھوتی تھی اور نہ کپڑے بدلتی تھی۔ اتنی جلدی وہ مراد کو کیسے بھول سکتی ہے۔ میرے دل میں شکوک کے جراثیم پھیل رہے تھے؟ کیا وہ ایسی ہی لڑکی تھی؟ جذبات کے کھیل میں ابھی تو ساری حدیں پھلانگ گئی۔ بظاہر مختلف نظر آنے والی مگر بالکل شاہینہ جیسی۔ اس سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع مجھے شام کو پھر ملا جب وہ ٹرے میں دو گنگ کافی کے رکھ کر میرے کمرے میں آئی اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”باقی سب گدھے گھوڑے بیچ کر سوئے پڑے ہیں۔“ اس نے ایک گنگ میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے کہا۔ ”تم اتنی شوخ کیوں ہو رہی ہو؟“
 گنگ اس کے ہاتھ میں کانپا۔ ”کیا مطلب؟“
 ”مطلب تم اچھی طرح سمجھتی ہو۔ اچانک تم نے رنگین لباس پہننا شروع کر دیا۔ یہ میک اپ اور میئر اسٹائل، انسی مذاق، یہ سب کیا ہے؟“
 اس نے گنگ نیچے رکھ دیا۔ ”جہیں وہ اچھا لگتا تھا۔“

میرا سفید مائٹی لباس، رونا دھونا۔“
 ”میرے اچھا لگنے کی بات نہیں ہے روہی۔۔۔ لوگ کیا کہیں گے؟“

”لوگوں کو جو کہنا تھا کہہ چکے اور میری بلا سے بولتے رہیں ساری عمر۔۔۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔“
 ”جہیں ان کی پروا ضرور کرنی چاہیے جو اس گھر میں ہیں، مراد کے ماں باپ۔“

”مسٹر افلاطون۔“ وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟ میں عقل سے بالکل پیدل ہوں۔ کسی کے جذبات کا لحاظ نہیں مجھے، میں خود غرض اور بے حس ہوں۔ چہلم سے پہلے ہی شوہر کے خیال کو دل سے نکال پھینکا۔ میں نے؟“

”ایسا کوئی بھی سمجھ سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”کوئی کون...؟ سب سے پہلے انگلی اٹھانے والے تم ہو۔ مگر ملک صاحب ایہ روپ میں نے اپنی مرضی سے نہیں بدلا۔“ وہ بولی۔
 ”میں سمجھا نہیں۔“

”یہ بابا کا حکم تھا۔“ وہ اپنے سر کو پاپا کہتی تھی۔ ”انہوں نے سمجھایا مجھے... کہا کہ ہم تقدیر کے فیصلے کو بدل نہیں سکتے اور قبول کرنا ہوتا تو سوم، چہلم، برسی تک روکے کراد حوصلے اور صبر کے ساتھ آج کر لو۔ فرق کسی کو نہیں پڑا۔“

لباس میں بھی بیوی کے سفید رنگ پر شوخ پھولوں کے رنگ دکھائی دے رہے۔ مراد کی موت کو ایک مہینا ہو گیا تھا اور اب چہلم قریب تھا۔ بے شک دلی جذبات کا ظاہر داری سے تعلق لازمی نہیں لیکن یہ کوئی کراچی لاہور جیسا بڑا شہر نہیں تھا جہاں کسی کے پاس غم یا خوشی کے لیے زیادہ وقت نہیں ہوتا اور کوئی کسی کے معاملات سے تعلق بھی نہیں رکھتا۔ لگتا تھا کہ روہی کو بھی بڑی بہن شاہینہ کی طرح کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں۔ رسم و رواج اور معاشرتی بندھنوں کی زنجیر وہ پہلے ہی توڑ چکی تھی جب اس نے مراد کے ساتھ ماں باپ کا گھر چھوڑ دیا تھا کیونکہ اپنی زندگی کے فیصلوں پر وہ اپنا اختیار رکھنا چاہتی تھی۔ اس کا بدلا ہوا روپ بھی بغاوت کے اعلان سے کم نہ تھا۔

میں نہادھو کے اور لباس بدل کے نکلا تو وہ مجھے کچن میں مل گئی۔ ”ایک کپ چائے کا سوال ہے۔“
 ”جواب ہے نو... کھانا تیار ہے بس۔۔۔ دس منٹ۔“

”روہی ایک بات کہوں؟“
 وہ مسکرائی۔ ”یعنی آپ اجازت طلب کر رہے ہیں مجھ سے؟ بیوی حکم چلائے گی تم پر... بہترین زن مرید شوہر بنو گے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ لباس بہت خوب صورت ہے تمہارا... مجھے بہت اچھا لگا۔“
 وہ پتیلی میں جھانکتے ہوئے ہنس پڑی۔ ”تھینک یو... لیکن یہ کہنے کے لیے اتنا تکلف۔“

میں کہنا چاہتا تھا کہ مراد کے ماں باپ کو شاید اچھا نہ لگا ہو مگر اسی وقت ریشم اندر آ گئی اور اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ مجھے جتنی کوفت ہوئی اس سے زیادہ عداوت کہ نہ جانے روہی کیا سوچتی ہوگی نیزے بارے میں۔

میں پلٹا ہی تھا کہ روہی نے روک لیا۔ ”وہ بات تو اوہوری چھوڑ دی تم نے۔“
 ”کون سی بات؟“ میں نے کہا۔

”چودھری صاحب کو رات بھر کیا سمجھاتے رہے؟ مسئلہ فیث خورث؟“ وہ بولی اور پھر ہنسی۔
 ”نیسا غور... کیا کون سا مسئلہ؟“ ریشم بولی۔
 ”شادی کے بعد اسی سے پوچھتا۔ مجھے تو شرم آتی ہے۔“

میں جواب دیے بغیر کچن سے نکل گیا اور سوچتا رہا کہ راتوں رات بدلی کا مزاج کیسے بدل گیا۔ مہینا بھر پہلے وہ غم

"مگر انہوں نے مراد سے ملنے کی ضد کی... پھر؟"
 "میں انہیں بھلاتی رہوں گی۔ وہ شہر سے باہر کام کر رہے ہیں۔ دہی چلے گئے ہیں۔ رات کو آئے تھے جب آپ سو رہی تھیں اور یہ ڈراما چل گیا تو میں مراد کو بھی لے آؤں گی۔"

"مراد کو کہاں سے لے آؤ گی؟"
 وہ ہنسی۔ "ملک صاحب! آپ کو مراد کے میک اپ میں ان کے سامنے کھڑا کر دوں گی۔"
 "ہونہہ... مجھ میں اور مراد میں ذرا سی بھی مشابہت نہیں۔"

"کیوں؟ اس کی طرح تمہاری دو آنکھیں، دو کان اور ایک ناک ہے۔ قد بھی وہی ہے اور جسامت بھی... اور تم مراد کے کپڑے پہن لو اور کوئی اچھا میک اپ آرٹسٹ مل جائے جو تمہارے چہرے میں مشابہت پیدا کر دے۔"
 میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "کہاں کی سوچ رہی ہو تم... میں یہ ڈراما نہیں کر سکتا۔"

"تو نہ کرو، مل جائے گا کوئی ایکٹر... مراد کا ہم شکل... نی وی والے سب کے ڈپٹی کیٹ تلاش کر لیتے ہیں۔" وہ اٹھی اور شرے کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر رکی اور یولی۔ "وہ ریشم پوچھ رہی تھی۔"
 "کیا پوچھ رہی تھی؟"

"یہی کہ مسئلہ فیثا غورٹ کیا ہوتا ہے جو تم رات بھر انور کو سمجھاتے رہے۔" وہ ہنسی اور باہر نکل گئی۔
 مجھے روٹی کے مذاق میں طنز محسوس ہوا۔ یوں جیسے وہ کہنا چاہتی تھی کہ رات بھر تم اور وہ جاگیر دار کیا کرتے رہے۔ کون ہے جو اندازہ نہ کر سکے، مردوں کے بہانے ایسے ہی ہوتے ہیں، مجھے سخت تذلیل محسوس ہوئی اور سخت غصہ آیا۔ الو کی پھٹی، یہ کیا سمجھتی ہے اور ریشم کو بھی سمجھانا چاہتی ہے کہ میں اور انور رات کو کسی کے ساتھ داد پیش دیتے رہے؟ اسے کیا پتا میں کہاں تھا اور کس حال میں تھا۔ خیر، پتا چل جائے گا۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ نہ جانے ریشم جیسی سیدھی سادی لڑکی سے اس نے کیا کہا ہو گا اور اس نے کیا سمجھا ہو گا۔ وضاحت کے مطمئن کرتی ہے۔

رات کو مجھے سکندر شاہ نے اپنے ساتھ آنے کا کہا۔ ہم پچھلے حصے کی طرف سے زینہ اتر کے ایک تہ خانے جیسی جگہ میں پہنچے جہاں دیواروں کے ساتھ بہت سے کارٹن بچے ہوئے تھے۔ درمیان میں چھت کے ٹکڑے سے مرید اللہ لگا ہوا تھا اور اس حالت میں بھی لباس سے محروم تھا۔ اس کی

سوائے خود کے... انہوں نے کہا کہ پتا نہیں کس کا دکھ زیادہ ہے۔ تمہارا، میرا یا مراد کی ماں کا۔ ایسا تر ازو کوئی نہیں کہ ہم اس کا وزن کر لیں۔ حکم ہے کہ سوگ تین دن سے زیادہ نہ کرو۔ ایک ہے زندگی کی ضرورت۔ مراد اب نہیں مل سکتا جتنا ہم چاہو کرو۔ اس نے ایک ڈسنے داری چھوڑی ہے، تمہاری مجھ پر... میری تم پر... اور اس کے بچے کی ہم سب پر۔ تم مراد کو بھلا دو... جیسے میں نے بھلا دیا۔ خود زندہ رہنے کے لیے مجھے بھی حوصلہ چاہیے۔ آنسو حوصلہ نہیں دیتے۔ دیکھو کس طرح میں نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ کاروبار کو سنبھال لیا ہے۔ مراد کی جگہ انور کو اور ملک سلیم کو لے آیا ہوں۔ سب کچھ ویسے ہی چلتا رہنا چاہیے کیونکہ تمہارے سامنے زندگی کے دو سفر ہیں۔ ایک اپنی زندگی کا، ایک بیٹے کی زندگی... پابندی کی زندگی کا... ایک ہی بات ہے۔ تم میری بات مانو گی۔ انہوں نے کہا ٹارٹل ہو جاؤ۔ بالکل دیکھی جیسی تم مراد کے ساتھ تھیں۔ یہ ادا سی کالہاس بدل ڈالو۔ زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔ گھر سے غم کے اندھیرے کو نکال دو۔ اچھے کپڑے پہنو، میک اپ کرو، ہنسو کھیلو، خوش رہو خوش نظر آؤ۔ کیونکہ یہ میرا حکم ہے۔"

"میں داد دیتا ہوں تمہاری ہمت کی اور اس سے زیادہ سکندر شاہ کی ہمت کی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔
 "دنیا چلتی رہنی چاہیے اور ہمیں دنیا کے ساتھ نہیں چلنا تو پھر دنیا کو پھوڑ دینا چاہیے۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں روٹی۔" میں نے کہا۔
 "ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ ریشم اور انور بھی۔"
 "مراد کی ماں کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں اور جسمانی بھی، لیکن پتا ہے کل میں رنگین لباس میں پورے میک اپ کے ساتھ ان کے سامنے گئی تو کیا ہوا؟"
 "کیا ہوا؟ وہ چلانے لگیں؟"

روٹی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور مجھے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے کہا۔" مراد اٹھ گیا؟" اور میں نے ہمت کر کے جواب دیا۔ "نہیں۔" تو انہوں نے کہا۔ "پھر تو کیوں اٹھ گئی سویرے سویرے... اچھا اب اٹھ گئی ہے تو مجھے چائے لا دے۔ اور دیکھ پاپے ہیں تو وہ بھی۔ تم نے دیکھا۔ وہ ایک دم پرانے وقت میں چلی گئیں جب مراد زندہ تھا اور میں نئی نوٹی دہن تھی۔ ان کے چہرے پر ہنسنا آگئی۔ انہیں بھوک بھی تھی۔ یہ اچھا ہوانا۔ وہ ماضی میں خوش رہ سکتی ہیں تو رہیں۔ شاید اس طرح ان کی ذہنی اور جسمانی صحت بڑھتی آجائے۔"

حربے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا جی پھر آپ بتا دو کیا کرنا چاہیے؟" وہ بولا۔
 "نیچے اتار داسے اور کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ کل تک اس کو

دیسا ہی ہونا چاہیے جیسا آیا تھا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سکندر میرے ساتھ نکل آیا۔ "اتنا
 رحل اور جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "شاہ جی ایہ بندہ بہت اہم ہے۔ یہ دس
 دروازوں کی چابی ہے۔ ان پولیس والوں کا کیا جائے گا اگر
 یہ مر گیا۔ زیادہ سے زیادہ معطل ہو جائیں گے کسی امر کے
 حکم سے۔ یہاں ان کی ساری کارروائی غیر قانونی ہے۔"

وہ طنز سے بولا۔ "اور جو آج دن میں خوریزی ہوئی
 یا کل تمہارے ساتھ ہوا تھا، وہ قانونی تھا۔ دیکھو ملک سلیم ایہ
 قانون ہمارا ہے۔ ہم بتائیں یا توڑیں... میں نے سارا
 معاملہ دبا دیا۔ کل اخبار میں اسے بھی ڈاکوؤں کی کارروائی
 قرار دیا جائے گا۔"

میں اس کے ساتھ اوپر آ گیا۔ "میں سکندر شاہ نہیں
 ہوں۔"

"تم کو بتا ہے جس دن تم نے کمزوری دکھائی، دشمن
 ہر طرف سے ٹوٹ پڑیں گے تم پر... ہم ایک جنگل میں
 رہتے ہیں جہاں صرف خونخوار درندے بستے ہیں۔ یہ نیچے
 والے کیڑے مکوڑے ہیں سب۔ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ
 سکتے۔"

باہر رات تھی مگر مرادنگری چار دیواری کے اندر باہر
 روشنیوں کا راج تھا۔ ہم ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔ "میں تادشاہ
 نہیں بننا چاہتا۔"

"پھر کیا بننا چاہتے ہو؟ پہلے کیا بننا چاہتے تھے؟"
 "میں ہر تادشاہ کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔" مجھے اپنے
 لہجے کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔

"اس کے لیے تمہیں سکندر شاہ بننا ہو گا یا ملک غلام محمد
 عرف گاماتم۔ ایک نے تمہیں پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا
 تھا۔ دوسرے نے بچا لیا۔ آج تم مرادنگری میں محفوظ ہو۔ کوئی
 تمہاری طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ بیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ
 سکتا۔ یہ سب جو ایک دن تمہارا ہو گا۔ یہ رشتے محبت کے،
 ایک محفوظ مستقبل... اس کو ٹھکرا دو گے؟ سب کچھ چھوڑ کے
 چلے جاؤ گے؟ کہاں؟ اور کیوں؟"

"ابھی میں ہر سوال کا جواب نہیں دے سکتا لیکن میں
 اس نظام کو قانون کے مطابق چلا کے دکھا دوں گا۔ ضابطے
 اور اصول کے مطابق اور مجھے یقین ہے کہ انور میرا ساتھ

آنکھیں بند نہیں اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ وہاں دو
 سفاک صورت افراد بڑے سکون سے کھڑے تھے۔
 "یہ بندے بلائے ہیں میں نے تفتیش کے لیے۔"
 سکندر بولا۔

انہوں نے ہمارے لیے دیوار کے ساتھ دو کرسیاں
 رکھ دیں جو ابھی تک ان کے کام آرہی ہوں گی۔ ہم ساتھ
 ساتھ بیٹھ گئے۔ اس نے آنکھ کھول کے بھی ہمیں نہیں دیکھا۔
 میں نے پوچھا۔ "تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟"
 سینئر نظر آنے والے نے سر ہلایا۔ "جی سر، میں سی
 آئی ڈی کا انسپکٹر اسحاق ہوں اور یہ میرا ساتھی انسپل پولیس
 کا حوالدار شامل خان۔"

"کچھ بتایا بڑے... صاحب نے؟"
 اسحاق نے نفی میں سر ہلایا۔ "بڑی ڈھیٹ شے ہے
 جناب۔"

"تم تو کہتے تھے کہ تمہارے سامنے پتھر بھی بولنے
 لگتے ہیں؟"

"ایسا تو ہے جی مگر کبھی بندہ خراج بھی ہو جاتا ہے۔
 ذرا پتا چل جائے کہ کتنا دم ہے اور ابھی تو پہلا سبق ہے۔"
 "یار میں یہ سب نہیں جانتا۔ مجھے رزلٹ چاہیے۔
 بے ہوش ہے؟"

اسحاق بولا۔ "ہاں جی، ابھی ہوش میں آجائے گا
 تھوڑی دیر میں۔" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں
 خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جو سگریٹ وہ پی رہا تھا وہ
 دبے پاؤں فریب جانے کے مرید کے بڑی نازک جگہ پر لگا
 دی۔ وہ چلا کے تڑپا۔ اسحاق نے تہقہ لگا کے اسے گالی
 دے۔ "مکر کرتا ہے۔"

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ نہیں ہو
 گا۔ جان نکل سکتی ہے۔ میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل
 سکتا۔" وہ سخت اذیت میں تھا۔ ایک بھاری بھر کم پیٹ کے
 ساتھ اس کا سیدھا کھڑا ہونا بھی آسان نہ تھا۔ اٹا لکنا اس
 کے لیے سخت عذاب تھا۔ تفتیش کے ماہرین نے ہر طرح کا
 ظلم کر کے دیکھ لیا تھا۔ لیکن نتیجہ ہنوز صفر تھا۔

مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی۔ "تم جاہل
 لوگ ہو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "تشدد کے سب طریقے
 تو آزما چکے۔ مر گیا تو کیا اس کی لاش سے پوچھو گے؟"
 اسحاق نے ناگواری سے کہا۔ "سر جی! بائیس سال کا
 تجربہ ہے۔"
 "کیا فائدہ اس تجربے کا۔ یہ ایک مدی پرانے

دے گا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”خدا تمہیں کامیاب کرے۔ مجھے یہ کامیابی ایسے نہیں ملی تھی۔ تمہیں کچھ بتانا نہیں ہے۔ جو بن چکا اسے چلانا ہے۔“

کوئی گاڑی اندر آئی۔ ظاہر ہے کسی روک ٹوک کے بغیر صرف مالکان کی گاڑیاں گزر سکتی تھیں۔ یہ انور تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔ میں اور سکندر شاہ نے اسے ڈرائنگ روم میں کسی رسالے کے صفحات الٹتے دیکھا۔ ”چائے کے لیے میں نے کہہ دیا ہے۔“ وہ بولا۔

ہم اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ ”وہاں کیا ہوا؟“ سکندر بولا۔

انور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”کیا ہوتا تھا۔ جو مر گئے تھے ان کی تدفین ہو گئی۔“

”پولیس آئی ہوگی؟“

”ہاں، سب نے ایک ہی بیان دیا۔ ڈاکو آئے تھے لیکن خبری ہو گئی تھی۔ چودھری انور نے کارڈ لگا دیے تھے۔ مقابلے میں کچھ لوگ مارے گئے۔“

”اخبار والا کوئی نہیں پہنچا؟“

انور نے سر ہلایا۔ ”ایک پہنچا تھا۔ میں نے پانچ ہزار دے دیے۔ بہت چھوٹی سی خبر تھی۔ ڈسٹرکٹ جج پر۔“

”گڈ! تو سیانا بندہ ہے انور۔۔۔ اپنے اس دوست کو بھی سمجھا، جذباتی نہ ہو۔“

بات ردی کی مداخلت پر ختم ہو گئی۔ ”چائے نہیں مل سکتی۔“

انور نے اس کے لیے اور چلیے کی تہدیلی کو غور سے دیکھا۔ ”پتی ختم ہو گئی یا چینی؟“

”کھانا لگا ہوا ہے۔“ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

”اور یہ ریشم کا حکم ہے کہ چائے بعد میں دی جائے۔۔۔ چلو اٹھو۔“

انور نے ماں جی کو بھی کھانے کی میز پر دیکھ کے حیرانی کا اظہار کیا۔ گاما رستم کے گھر میں اس کی بیوی رسم و رواج کا زیادہ خیال رکھتی تھی اور منگنی کے بعد ریشم کو انور کے سامنے نہیں آنے دیتی تھی۔ یہاں روٹی اسے پہنچ لائی اور وہ میز کے مخالف کنارے پر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ مجھے شرم و حیا کے اس ڈرامے پر ہنسی آئی۔ انور کی حویلی میں یہی ریشم ہر وقت ہر جگہ انور کے ساتھ رہتی تھی۔

”مرا نہیں آیا ابھی تک؟“ سکندر کی بیوی نے کہا۔

انور چونکا لیکن روٹی نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔ ”ابھی کچھ دن لگیں گے انہیں ماں جی۔۔۔ فون آیا تھا۔“

انور نے باری باری سب کی صورتوں کو دیکھا اور سب کو خاموش دیکھ کر خود بھی خاموش رہا۔ خود مجھے یہ دکھی کر دینے والا ڈراما بہت عجیب لگ رہا تھا جس کے سارے کردار ایک جھوٹ کو بیچ بنائے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو مر گیا اسے زندہ نہیں رکھا جاسکتا۔ مگر معاملہ ایک ماں کا تھا جو اس فریب کے آسرے پر جینے کے لیے تیار تھی۔

سکندر نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔ ”انور اتم اکیلے کیوں آئے ہو آج بھی؟“

وہ مسکرایا۔ ”اس لیے کہ آج بھی میں اکیلا ہوں۔“

”کیا مجھے کہنا پڑے گا کہ بھر جاتی کے ساتھ آؤ اور اپنی امانت لے جاؤ۔“

ریشم کھانا ختم کر چکی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سکندر نے اسے ڈانٹا۔ ”بیٹھ جاؤ، یہ شرمائے کا بے مقصد ڈراما کس لیے آخر۔۔۔ اگر ہم تمہاری زندگی اور تمہارے مستقبل کی بات کرنا چاہتے ہیں تو رائے دینے کا پہلا حق تمہارا ہے۔“

میں سکندر شاہ کی زندگی سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ اس نے کامیابی کے سفر میں صرف کامیابی کو اہم سمجھا تھا۔ اخلاقیات و شرافت، جائز ناجائز اور حرام حلال کے سارے دنیاوی ضابطے غیر اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیے تھے۔ یہ آسان کام نہ تھا۔ اس نے اپنے تعلقات اور اثر رسوخ کا دائرہ پھیلا یا تھا اور راستہ روکنے والوں کو ہٹانے میں دولت، بد معاشی اور سیاست کے سارے حربے کامیابی سے استعمال کیے تھے۔ بالآخر وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے پاس آج سب کچھ تھا۔ کم یا زیادہ۔۔۔ شاید کامیابی آج کی دنیا میں شرافت کے مرد و اصولوں کو نظر انداز کیے بغیر نہیں ملتی۔

پھر اس وقت جب کامیابی کی سب سے اوپر والی سیر میز پر وہ غرور میں جتلا ہونے لگا تھا۔ دست قدرت نے سیر میز پہنچائی۔ اس سے اتنی بڑی ایسا ہار کا داربست چھین لیا اور اسے احساس ہوا کہ اس کی کامیابیوں کی کہانی تو ختم ہو گئی۔ آکے کرنے کے لیے کچھ نہیں اور اس کا فائدہ بھی نہیں۔ مگر وہ ہمت ہارتا تو زندگی ہار جاتا۔ فضا کی بلندی سے گرنے والے کی طرح اس نے مجھے اور انور کو بے حد اٹوٹ بنا دیا۔ ان رشتوں کو سہارا بنا لیا جن کو وہ بھولا ہوا تھا۔ وہ کریش ہو کے بکھر جانے سے بچ گیا۔

دغاباز

لکڑا فقیر اپنی مجروح ٹانگ فٹ پاتھ پر پھیلائے
دردناک آواز میں صدا لگا رہا تھا۔ میرا جی کو اس پر بہت
ترس آیا۔ انہوں نے دس کا نوٹ اسے حوالے ہوئے
کہا۔ ”اللہ تم پر اپنا رحم کرے... بس یہ سوچ کر اس کا
شکر ادا کرتے رہا کرو کہ اس نے تمہیں تاپنا نہیں بتایا
ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی۔“
”دنیا بڑی دغاباز ہے میم صاحب!“ فقیر نے
رندمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جب میں اندھا بنا ہوا تھا تو
لوگ مجھے جھلی سکتے اور نوٹ دے جاتے تھے، بعض
شرارتی لڑکے تو میری چادر سے اسلی سکتے بھی اٹھالے
جاتے تھے۔“

کراچی سے ولید احمد کا چٹکلا

جی لاتا تو کر لیا آپ نے۔“

وہ بھڑک اٹھا۔ ”کیا مطلب اس فضول بات کا
آخر... اب میں چادر تان کے سو جاؤں۔ اس دن کے
انتظار میں جب موت کا فرشتہ آئے اور مجھے لے جائے۔ تم
نوجوان ہو، تمہیں خیال بھی کیسے آسکتا ہے کہ جدوجہد روک
دی جائے؟ کیونکہ باقی عمر کچھ کیسے بغیر آسائش کی زندگی
گزارنے کے لیے جتنا ہے بہت ہے۔ ہڈیوں کو زنگ لگ
جائے گا تمہاری... اگر پڑے پڑے کھاتے رہو گے۔“
میں نے کہا۔ ”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔“
اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”دیکھو دنیا میں پیسا
ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو دنیا کے امیر ترین لوگ ہیں انہیں
کہاں ضرورت ہے مزید پیسے کی۔ اتنا پیسا ہے ان کے پاس
کہ وہ لوگ ہاتھوں سے لائیں تو بھی ختم نہ ہو مگر پیسے کی منزل
سے آگے ہے شہرت اور ساری دنیا کو جک کرنے کی لگن...
تمہارے پاس تو ابھی کچھ نہیں۔ میرے کام کو آگے بڑھاؤ۔
عمارتوں کی جگہ ملے بناؤ۔ شاہراہیں بناؤ۔“ وہ لیکھت چپ
ہو گیا۔

”بالکل ٹھیک، کام ہم کریں گے۔ آپ نگرانی
کریں۔ راہنمائی کریں۔ ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔
مجھے لگتا ہے آپ کو ہائی بلڈ پریشر ہے... کبھی دیکھا آپ
نے؟“

”مجھے دیکھے بغیر ہی معلوم ہے۔ اتنی جدوجہد اور
اتنے صدقات کے بعد بلڈ پریشر میں جھلا ہوتا تو میرا حق

اب مجھے یا انور کو اس راستے پر چلنے کی حاجت نہیں
تھی جس پر سکندر چلا تھا۔ ہمیں سب بنایا ملا تھا اور آگے
صرف اسے سنبھالنا تھا۔ میں نے سکندر سے بدترین حالات
میں ہمت نہ ہارنا سیکھا تھا اور ایک ایسی فراخ دلی... منطقی
سوچ اور نئے زمانے کی روشن خیالی سیکھی تھی۔ وہ ایک
پریکٹیکل آدمی تھا۔

سکندر کی آواز پر میں چونکا۔ ”ملک صاحب! کس
خواب میں چلے گئے ہو۔“

میں نے تھکت سے کہا۔ ”اس معاملے میں میری دخل
اندازی کی ضرورت نہیں تھی۔“

”کیوں ضروری نہیں تھی؟ اپنی رائے تم بھی دے
سکتے ہو؟“

”میرا تو خیال ہے کہ ہم سب کی رائے محض دخل
اندازی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم سب باہر چلے جائیں اور ان
دونوں کو فیصلہ کرنے دیں، پھر جیسا یہ کہیں...“

”یہ تو کہتا ہے کہ ابھی لے جاؤں۔“ ردی نے کہا۔
”ریشم نہیں مانتی۔“

”اگر منا سکتا ہے تو منالے ورنہ اٹھا کے لے
جائے۔“ میں نے کہا۔

”زبردستی کی کیا ضرورت ہے۔“ سکندر نے گھڑی
دیکھی۔ ”ابھی کون سی دیر ہوئی ہے۔ مولوی آجائے گا۔“

مراو کی ماں پہلے ہی چلی گئی تھی۔ ریشم بالآخر اٹھ کے
چلی گئی۔ سکندر نے مسکرا کے کہا۔ ”دیکھو، یہ مذاق کی بات
نہیں، دونوں کام اہم ہیں۔ پہلا یہ کہ تم ادھر ادھر کے
معاملات میں ٹانگ اڑانا چھوڑ دو کاروبار کی ذمہ داری
سنبھالو۔ ابھی تک تو نہیں ہوا مگر کسی نے توجہ نہ دی تو نقصان
ہوگا۔ میرے شروع کیے ہوئے پروجیکٹ چل رہے ہیں۔
مراو نگر کی کامیابی نے ہماری ساکھ بنا دی ہے۔ دوسرے
منصوبے پر کام جاری ہے۔ ملتان روڈ پر ایک کمرشل
پلازا... جس میں اوپر پرکاشی فلیٹ ہوں گے۔“

”ملتان کی گری میں فلیٹ؟“ میں نے کہا۔
”سب لگوری فلیٹ ہیں۔ ائر کنڈیشنڈ، دو بسمت
میں، ایک پارکنگ کے لیے۔ دوسرا نیچے والا پاور ہاؤس ہو
گا۔ اس عمارت کی تین منزلوں کی بجگ ہوگئی ہے۔ اوپر کے
دو بھی ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد ابھی تک میرے پاس
کچھ نہیں، دو سال میں یہ کام ختم ہوگا۔ اس سے پہلے نیا
پروجیکٹ اٹاؤنس ہونا چاہیے۔“

میں نے اس باہت شخص کو حیرانی سے دیکھا۔ ”شاہ

بھی کی اور بیگانوں نے بھی۔ یہی دیکھو کہ روٹی کے باپ نے مجھے رشتہ مانگنے پر کتنا ذلیل کیا اور پھر خود بھی ذلت اٹھائی۔ میں یہ سب چھوڑنا چاہتا ہوں مگر ایک دم نہیں چھوڑ سکتا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا، انکل۔“ انور بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔“

اس کی یہ جذباتی کیفیت نہ جانے کب تک رہتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر اچانک کیا ہوا؟ مراد کے حادثے کو ایک مہینہ ہوا۔ گزر جانے والے دن کی رات ہونے تک سکندر وہی تھا۔ یہ پشیمانی اور توبہ استغفار کا خیال اس پر اچانک کیسے غالب آگیا؟ شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرم و گناہ کا بار اور احساس بڑھتا جاتا ہے پھر اچانک فروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ جیسے تناور درخت کو دیمک اندر سے کھوکھلا کر رہتی ہے۔ دیکھنے والوں کو درخت دیا ہی لگتا ہے۔ پھر ایک آنکھ سے اسے زمیں پوس کر دیتی ہے۔ بلڈ پریشر کا زیادہ ہونا تو ایک فطری بات تھی اس عمر میں... مگر وہ ڈپریشن کی طرف جا رہا تھا۔ مزاحمت کے باوجود... یہ پچھتاوا اس کا ثبوت تھا۔

انور نے دسویں بار گھڑی دیکھ کے یہ ظاہر کیا کہ رات بہت ہو گئی ہے اور اسے جانا چاہیے۔ سکندر شاہ نے بد اخلاقی کے اس مظاہرے کو بھی اہمیت نہیں دی۔ دل کی بات کہے بغیر وہ ہمیں جانے کی اجازت دینے کے موڈ میں نہیں تھا پھر اچانک باہر شور بلند ہوا۔

سکندر شاہ کے کان کھڑے ہوئے۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”باہر سے کسی نے چٹانا شروع کیا۔“ چودھری صاحب۔

انور ایک دم اٹھا۔ اس کے پیچھے میں باہر نکلا۔ ایک گاڑو واسطے کے دروازے پر کھڑا دایلا کر رہا تھا۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ سکندر شاہ کے محافظ اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ انور کو دیکھتے ہی وہ اپنا سر پیشے لگا اور دہائی دینے لگا۔ ”او جی چودھری صاحب! جلدی چلو... بڑا ظلم ہو گیا۔ قیامت آگئی۔“

انور نے اسے ڈانٹا۔ ”سیدھی طرح بات بتا۔“

”اجی کیا بتاؤں... کیسے بتاؤں؟ ہم ٹٹ گئے۔ برہاد ہو گئے۔“

”کتنے کی طرح بھونکے جا رہا ہے۔ بولنا کیوں نہیں کیا ہوا؟“ انور دہاڑا۔

”وہ مسکرایا۔“ ”تم مجھے ٹھیک دیکھنا چاہتے ہو اور خوش... تو چارج لے لو، تمہارے آفس تمہارا انتظار کر رہے ہیں یا لیگل ایگریمنٹ کا انتظار ہے تمہیں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ انور بولا۔

”تم بھر جانی کا بھی خیال کرو... دو چار دن میں ان کی بہو کو لے جاؤ۔“

”دو چار دن میں... ابھی تو مراد کا چہلم بھی نہیں ہوا۔“ انور بولا۔

”یار! تم کیسے پڑھے لکھے جاہل ہو، چہلم سے پہلے نکاح سے کیا قیامت آجائے گی؟ کہاں ممانعت ہے اس کی؟“

انور نے کہا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے شاہ جی... لیکن لوگوں کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔“

”کون لوگ؟ یہی جو ساری عمر بھونکتے رہے اور میں انہیں دھتکارتا رہا لیکن چلو یہ عذر بھی قبول کر لیا جائے تمہارا تو ایک ہفتہ بعد یہ رسم بھی پوری ہو جائے گی اس سے پہلے تو انتظام ممکن نہیں، بھر جانی کو شاید برا لگے ابھی۔“

”وہ پرانے دفتروں کی عورت ہیں۔“ انور نے تائید کی۔ ”چہلم سے پہلے تو بات بھی نہیں کریں گی۔“

”دیکھو، یہ ذستے داری اب میں نے قبول کی ہے تو جلدی مجھے ہے۔ دو ہفتے بعد رخصتی... یہ میرا فیصلہ ہے اور میں بھر جانی سے بھی منوالوں گا۔ وہ لڑکی بہت خوار ہوئی ہے۔ اسے اب اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔“ وہ بولا۔

”اجنے پریشان نہ ہوں شاہ جی۔“

وہ ایک بار پھر بھڑک اٹھا۔ ”یہ کیا تم مجھے شاہ جی شاہ جی کہتے رہتے ہو۔ لوگوں کی طرح... میں کیا تمہارے برابر کا ہوں؟ مراد تھا تمہاری عمر کا... انکل کہتے ہوئے شرم آتی ہے؟“

میں نے شیشا کے کہا۔ ”میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔“

تھوڑی سی جھجک تھی زبردستی رشتہ جوڑنے میں... ”انور نے تائید میں سر ہلایا۔“ ”ایک رشتے سے تو انکل ہیں آپ... روٹی کے ماموں ہیں اور وہ میری تایا زاد ہے۔“

اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک جاگی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ بولا۔ ”دنیا مجھے بہت برا آدمی سمجھتی ہے انور... اور میں جانتا ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ مجھے ہمیشہ احساس تھا اس کا... اپنی نسلی کے لیے میں نے نیک کام بہت کیے مگر ان کی پلٹ نہیں کی۔ برائی کی بہت پلٹ ہوئی۔ انہوں نے

جوارس

پردا کے بغیر آگ میں گھس جاتا۔ آگ ابھی سامنے والے حصے تک تھی۔ گرد و نواح کے سارے کسان مزارع بالٹی بھر بھر کے آگ پر پانی ڈال رہے تھے لیکن ان کی کوشش لا حاصل تھی۔ عقی حصے میں باغ تھا اور اس طرف سے اندر جانا ممکن لگتا تھا۔ کچھ دیر میں پوری حویلی کا جل کے راکھ ہو جانا یقینی تھا۔ شہر بہت دور تھا جہاں سے فائر بریکڈ آسکتی تھی۔ انیس کسی نے اطلاع دی تھی اور دی جاتی تب بھی ان کی کارکردگی ہر جگہ ایسی تھی کہ وہ آئے بھی تو سب راکھ ہو جانے کے بعد۔

ہم پچھلی طرف سے اندر گھے۔ شعلوں کی حرارت سے پسینا میرے سارے وجود پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ نوکروں کی رہائش گاہ سے گزر کے میں اور انور ایک ساتھ برآمدے میں پہنچے۔ آگ اب بھی دور تھی۔ دو کمرے اس کی لپیٹ میں نہیں آئے تھے۔ ایک وہ جو بڑے چودھری صاحب کا میڈیکل یونٹ بنا ہوا تھا۔ دوسرا ساتھ والا جس میں اب ماں جی کا بسیرا تھا۔ دم تقریباً ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انور چلایا۔ "ماں جی..." مگر اندر سے جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔

ماں جی کمرے میں نہیں تھیں۔ فرش پر ان کی جائے نماز بھی ہوئی تھی۔ بیڈ کی چادر کی ہر ٹکڑی بتاتی تھی کہ وہ اس پر سو رہی تھیں۔ انور نے ہاتھ روم میں جھانکا۔ "یہاں بھی نہیں ہیں دو۔"

میں نے اسے تسلی دی۔ "وہ کل گئی ہوں گی۔"

"کل کے کہاں جائیں گی۔" اس نے بدحواسی سے کہا۔

"چل باہر دیکھتے ہیں۔ باغ میں دیکھتے ہیں۔"

انور ادھر سے ادھر دوڑتا رہا اور ماں کو پکارتا رہا۔ میں نے آگ بجھانے کی لا حاصل کوشش کرنے والوں سے باری باری پوچھا۔ ان میں سے کوئی چودھرائں کو نکال کے نہیں لے گیا تھا۔ کسی نے انہیں باہر جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اندر کے ملازم مرے یا جان بچا کے کل گئے تھے۔ دھماکے سے کتنے گارڈ جان سے گئے۔ کسی کے پاس ایک بھی سوال کا جواب نہ تھا۔

انور کی حالت غیر تھی۔ وہ دیوانہ وار ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا۔ چیخ چلا رہا تھا۔ "جاؤ دیکھو گاؤں کے ہر گھر میں دیکھو سب سے پوچھو۔"

سکندر شاہ اپنی سکیورٹی فورس کے نصف درجن افراد کے ساتھ دو گاڑیوں میں نمودار ہوا۔ اس نے انور کو دور لے

"وہ جی... حویلی... حویلی تباہ ہو گئی۔"

انور نے اسے جھنجھوڑا۔ "کیا کہتا ہے... حویلی کیسے تباہ ہو گئی؟"

وہ شخص زار و قطار آنسو بہا رہا تھا۔ "حویلی گر گئی چودھری صاحب دشمنوں نے گرا دی۔"

"کیسے گرا دی۔ حویلی کوئی ہنگی دیوار تھی کہ گرا دی؟"

انور نے کہا۔

"ہم لگا دیا چودھری صاحب بڑا دھماکا ہوا۔"

انور چیخا۔ "دھماکا؟ ماں جی تو ٹھیک ہیں؟"

"کچھ پتا نہیں جناب عالی... آپ چلو... آگ لگی ہوئی ہے اندر تک۔"

انور اپنی گاڑی کی طرف دوڑا۔ میں اس کے ساتھ

ساتھ تھا۔ میں نے ڈرائیونگ خود کی۔ انور کی ڈہنی اور اعصابی حالت خراب تھی۔ وہ بار بار پوچھتا تھا۔ "آخر کس نے کیا یہ؟" اور جواب سننے بغیر ہاتھ جوڑ کے اوپر اٹھاتا۔

"ماں جی کو بچالے میرے مولا۔"

میں نے اسے حوصلہ دیا۔ "اللہ نے چاہا تو سب

خیریت ہوگی انور۔"

آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ "ایسا کیسے ہو

سکتا ہے سلیم امیں نے ایسا کیا گناہ کیا تھا آخر... اور پھر میری ماں... اس نے تو ایک چھوٹی نہیں ماری کبھی... میں

کیا کروں گا اگر انہیں کچھ ہو گیا؟"

میں نے گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی

تھی۔ خود میرے اندر سوالات کی یلغار تھی اور ہر امکان ایک

نیا دھماکا کرتا تھا۔ بلاشبہ ماں جی کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا تھا۔

ظلم اور زیادتی انور کے باپ دادا کے زمانے سے جاری تھی

لیکن اس کا شکار ہونے والوں کے لیے وہ نہ ظلم تھا نہ زیادتی

تھی۔ اسے وہ نوشتہ تقدیر کی طرح قبول کرتے تھے۔ انور

بھی ان جیسا ہوتا تو احتجاج کوئی نہ کرتا۔ لیکن اس نے تو اپنا

سب کچھ رعایا میں تقسیم کر دیا تھا۔ مزارعوں میں ساری زمین

بانٹ دی تھی۔

شعلے مجھے دور سے ہی نظر آ گئے تھے۔ اندازہ کیا جا

سکتا تھا کہ آگ نے پوری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا

ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس دور رخ سے ایک بوڑھی

عورت کو کس نے نکالا ہوگا؟ اسے کہاں پتا چلا ہوگا کہ کیا ہوا؟

اور کیوں ہوا؟ کیا کسی کو خیال آیا ہوگا یا موقع ملا ہوگا کہ

چودھرائں کو اپنی جان پر گھیل کے بچالے۔

گاڑی روکتے ہی میں نے انور کو قایم کیا ورنہ وہ اپنی

صبح ہونے سے بہت پہلے ایس پی نے رپورٹ پیش کی۔ ”یہ بم کا دھماکا تھا سر۔“
”بم؟ وہ کہاں سے آیا؟“ الور بولا۔
”جس نے کیا وہ ساتھ لایا ہوگا۔ ایک کلو کے قریب بارود والا بم تھا۔“

الور نے کہا۔ ”کیا بم اتنی آسانی سے مل جاتے ہیں؟“

”سب ملتا ہے چودھری صاحب، افغانستان کی طرف سے بم اور کلاشنکوف ہی نہیں میٹر انک PATRIOTIC میزائل تک آرہے ہیں۔“ ایس پی بولا۔ ”مگر یہ کام کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا۔ آپ کا کوئی دشمن ہے؟“

”دشمن کس کے نہیں ہوتے۔ دشمنی پالنا ہمارا خاندانی شوق رہا ہے مگر ایسا کوئی نہیں جو ہم سے حویلی اڑا دے۔“

دھیرے دھیرے روشنی نے رات کی تاریکی پر غلبہ حاصل کیا۔ منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ قدیم و جدید کا متوازن نمونہ چودھریوں کی حویلی کی جگہ اب ایک لمبے کا بے ہنگم ڈھیر تھا۔ کھڑی رہ جانے والی دیواروں پر سیاہی یوں پھیلی ہوئی تھی جیسے زخم خوردہ لاش پر خون نظر آتا ہے۔ دروازوں، کھڑکیوں کے چوکھٹے کوئلہ بن کے بکھر گئے تھے اور ان کی جگہ خلا رہ گئے تھے۔ لمبے کے ڈھیر میں کہیں کہیں سے دھواں اٹھ کر فینا کی وسعتوں میں گم ہو رہا تھا۔ ماحول میں ایک نامانوس بوتھی جو گرم اینٹوں پر سے گزر کر آنے والی ہوا کے ساتھ محسوس ہوتی تھی۔

الور گم مسم ایک کرسی پر بیٹھا تھا جو اسے کسی لے لاکردی تھی۔ میں اور سکندر شاہ دروازے کھولے گاڑی میں بیٹھے پولیس کی سرکاری ضابطے کی رسی کا ردوائی دیکھ رہے تھے۔ اس کے سوا ہمارے کرنے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں۔ بم ڈسپوزل والوں کا کام پہلے ہی ختم ہو چکا تھا وہ اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لیے ثبوت شہادت جمع کر چکے تھے۔ پولیس نے گاؤں کے لوگوں کو لمبے سے لاشیں نکالنے پر لگا دیا تھا۔ دن نکل آنے کے بعد ایس بیو گیس بھی پھانسی گئی تھی جس میں ایک ریٹائرمنٹ کی عمر والا چار صورت ڈاکٹر تھا اور ایک موتی کالی بددماغ نرس۔ زخمی کوئی نہیں تھا۔ چار افراد دھماکے کی نذر ہوئے تھے۔ تین جل کر مرے تھے اور دو حویلی کے مسمار ہونے سے لمبے میں دب گئے تھے۔

الور کا صدمہ اور پریشانی سے پاگل نظر آنا برحق تھا۔ وہ امید اور ناامیدی کے لمبے جلتے جذبات کے ساتھ کسی

جانے میں میری مدد کی کیونکہ آگ اتنی دیر میں پوری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ دھماکا کیوں ہوا... کس قسم کا تھا... کس نے کیا... یہ سب سوالات اب بے مقصد لگتے تھے۔

”میں نے فائر بریگیڈ والوں کو بلا لیا ہے۔ پولیس بھی آ رہی ہے۔“

”کیا فائدہ... وہ ماں جی کو نہیں لاسکتے۔“ الور بولا۔
”ایسی مایوسی کی بات نہ کرو... اللہ نے چاہا تو وہ محفوظ ہوں گی۔“ سکندر شاہ نے کہا۔

اسی وقت جیسے زلزلہ سا آگیا۔ پوری حویلی بڑی آواز کے ساتھ زمیں بوس ہو گئی۔ ایک بہت بڑا آتش نشاں بہت سے چھوٹے چھوٹے بھڑکتے الاؤ بن گئے۔ دھوئیں اور گرد و غبار کا طوفان سا اٹھا اور خاموشی سی چھا گئی۔ آگ بجھانے کی بے سود کوشش کرنے والے بھی دور ایک حلقہ سا بننا کے کھڑے ہو گئے۔ آگ سے بجلی کی تمام تاریں جل چکی تھیں جو حویلی تک آتی تھیں۔ اب ہر سواند حیرا تھا بہت سے لوگ روپیٹ بھی رہے تھے کیونکہ حویلی میں کام کرنے والے ان کے پیارے بھی لاپتہ تھے۔

فائر بریگیڈ والے تقریباً ایک گھنٹے میں مسودار ہوئے جو میرے خیال میں اچھی کارکردگی تھی۔ یہاں سے شہر تک کا فاصلہ ہی یوں گھنٹے کا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا وہ اطلاع ملنے کے پندرہ منٹ کے اندر روانہ ہو گئے تھے۔ یہ سکندر شاہ کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے غیر معمولی مستعدی کے ساتھ حویلی پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ آگ کا اثر دھماپانی پڑنے سے بچنا رہتا تھا اور اس کی دہکتی سانس بھاپ کا مرغولہ بن کے اٹھتی تھی۔ پانی کا ٹینک خالی ہونے سے پہلے ہی آگ پر قابو پایا جا چکا تھا۔ تاہم گرم اینٹوں اور بھاپ کی حرارت کا اثر پانی تھا۔

جب پولیس آئی تو ان کے ساتھ دوسری گاڑی بم ڈسپوزل والوں کی تھی۔ انہوں نے بڑی بڑی سرج لائنیں میں جائے حادثہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک ایس پی کو آدمی رات کے وقت نیند چھوڑ کے آتا پڑا تھا۔ وہ سکندر شاہ... اور چودھری انور کے سامنے جمائیاں لے رہا تھا۔ بالآخر اس نے جھاڑ کھائی اور سیدھا ہو گیا۔

”تم جاؤ گھر اور سو جاؤ۔“ سکندر شاہ نے کہا۔ ”میں ڈی آئی جی صاحب سے کہتا ہوں کسی اور کو بھیج دیں۔“
”میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی شاہ جی...“ اور ماتحتوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے آگے چلا گیا۔

جواوہی

گھر سے رونے پینے کی دردناک آوازیں سنائی دیتی تھیں اور ابھی یہ سوگ کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں تھا۔ جب بالآخر سوختہ تن لاشیں واپس لائی جائیں گی تو اپنے ہی ان کو روز حساب تک کے لیے زمین کے سپرد کریں گے۔ یہاں نہ سہی وہاں تو ان بے گناہوں کے قاتل سزا پائیں گے۔ فی الحال انہیں اسی خیال کے ساتھ صبر اختیار کرنا تھا۔ سوم، دسواں، چہلم اور برسی دنیا کے کام ہیں۔ جاری رہتے ہیں۔

دوپہر ہوئی تو میں نے انور کے ساتھ زبردستی کی۔
 ”اب یہاں بیٹھ کے انتظار کس کا؟ گھر چل۔“
 ”کون سے گھر؟ میرا تو کوئی گھر نہیں رہا۔“
 ”سب گھر تیرے ہیں۔ چل اٹھ، کچھ دیر آرام کر لے۔“

وہ میرے کھینچنے سے اٹھا۔ ”سلیم! بس ماں جی کا ہٹا چل جائے۔ اس کے بعد میں حویلی پھر بتاؤں گا۔ بالکل اسی طرح جیسے بنی تھی۔ کسی کو فرق نہ محسوس ہو۔“
 ”ایسا ضرور کرنا چاہیے تجھے مگر ابھی چل۔“ میں نے اسے گاڑی میں بٹھا دیا۔

وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا لیکن پھر بھی کبھی ایسا لگا تھا جیسے وہ کھلی آنکھوں سے نہ جانے کہاں کس کو دیکھ رہا ہے۔ ماضی اور حال کے درمیان ان گنت اچھی یادوں کا جریزہ تھا۔ وہی جریزہ جس پر ہر بیٹا اپنی ماں کے ساتھ بچپن سے جوانی تک کا وقت گزار لیتا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس وقت کی یادیں خواب جیسی ہو جائیں گی۔

”آخر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں سلیم؟“ اس نے راستے میں پوچھا۔ ”کیا منانا چاہتے ہیں مجھ سے۔“
 ”یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مرید کی رہائی کا مطالبہ کریں جو اس وقت ہماری تحویل میں ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”وہ بولا۔“ ”اب تو وہی واحد ذریعہ ہے ان تک پہنچنے کا۔“

”یہ ایک بہت طاقتور مافیا تھی۔ وہ پھر اپنے قدم جماتا چاہتے ہیں یہاں۔“
 انور نے کہا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں ہوگا۔“
 ”اس زمین پر تیرا کوئی اختیار نہیں۔ روٹی اس کی مالک ہے۔“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں روٹی کو۔۔۔ وہ اپنی بڑی بہن شاہینہ جیسی نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی اس کے خلاف تھی اور اب دوبارہ اس مکر دفریب کے دھندے کو شروع کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ حالانکہ اس میں خطرات بہت

اطلاح کا منتظر تھا کہ شاید لمبے سے نکالی جانے والی کوئی لاش پاں جی کی ہو مگر دوپہر تک اس کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔ پولیس تمام لاشوں کو اوپر نیچے ایسبویلینس میں ڈال کے پوسٹ مارٹم کی رکی کارروائی پوری کرنے کے لیے لے گئی۔ اس وقت میرا دماغ گزرے وقت کی ایسی ہی وحشت ناک یادوں میں بھٹک رہا تھا جب آگ نے میرے گھر کو راکھ کیا تھا۔ اس میں میرا بھائی جل کے خاک ہوا تھا اور ایک نامعلوم عورت جو بعد میں نادر شاہ کی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ ایسبویلینس میں ڈالی جانے والی ہر لاش مجھے ویسی ہی لگتی تھی۔ ان کے چلے ہوئے جسموں کی بھیا تک بو بھی وہی تھی۔ میں ماضی اور حال کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح متحرک تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ میں پیچھے رہ جانے والے وقت میں کھڑا ہوں پھر کوئی صدا مجھے حال میں کھینچ لاتی تھی۔ میرا بھائی اور انور کی ماں بربریت اور سفاکی کا ایک جیسے نشانہ بنے تھے۔ آج انور وہ محسوس کر سکتا تھا جو اس نے مجھ سے سنا تھا۔

سکندر کے گھر سے چائے اور ناشتے کی سپلائی جاری تھی۔ اس سے زیادہ تر پولیس والے مستفید ہوتے رہے۔ میرے مجبور کرنے پر انور نے ایک کپ چائے اس وقت لی جب ایسبویلینس جا چکی تھی۔ ”ان میں تو ماں جی نہیں تھیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے دیکھا تھا۔“

”میں نے بھی دیکھا تھا۔ وہ کل گئی ہوں گی۔“
 ”یہ کیسی بے دقونی کی بات ہے۔ کتنے گھنٹے ہو گئے۔ وہ ابھی تک لوٹ کے نہیں آئیں۔ میں نے آس پاس کے علاقے میں تلاش کرنے والے نیچے تھے۔ وہ بھی ناکام واپس آ گئے۔“

میں نے انجان بن کے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا ان کے ساتھ۔۔۔ تیرا کیا خیال ہے۔“
 ”وہی جو تو کہنا نہیں چاہتا۔ جنہوں نے دھماکا کیا وہی انہیں اغوا کر کے لے گئے۔ یہ اتفاق نہیں ہے کہ میں باہر تھا۔ وہ میری نقل و حرکت پر نظر رکھے بیٹھے تھے۔“
 ”وہ کون؟“

”معلوم ہو جائے گا۔ لیکن مجھے یقین آتا جا رہا ہے کہ یہ اس مرید کے حامی اور ساتھی ہوں گے جو ہمارے قبضے میں ہے۔ ایک مارا گیا تھا لیکن دس ابھی باقی ہیں۔“
 ”شاید ایسا ہی ہے۔ ایسا ہو گا تو ان کا مطالبہ بھی بہت جلد سامنے آ جائے گا۔“

سکندر شاہ بھی ایف آئی آر کی رکی کارروائی کے لیے پولیس کے ساتھ جا چکا تھا۔ پورے گاؤں میں ماتم تھا مگر

”یار مجھے یقین تو نہیں... امید ہے۔“ میں نے کہا۔

کپڑے بدل کے انور نے میرے اصرار پر تھوڑا بہت کھایا اور میرے ہی کمرے میں سو گیا۔ سکندر شام تک قانونی معاملات کی الجھن سے غائب رہا۔ روٹی اور ریشم بھی رات بھر جاگتی رہی تھیں۔ جو بات انہیں میں نے مختصر آجائی اس کا اندازہ انہیں پہلے سے تھا یا انہوں نے کسی سے سن لی تھی۔ روٹی نے مجھے مجبور کیا کہ ”اپنی حالت ٹھیک کر دو پہلے اور پھر سو جاؤ۔“

”میری حالت کو کیا ہوا ہے؟“

اس نے مجھے پلٹ کر آئینے کے سامنے کر دیا۔ میرے بالوں میں وحول اور چہرے پر دھوکے کی کالک تھی۔ میرے چہرے پر بھی سیاہی اور مٹی کے دھبے تھے جو پسینے سے پھیل گئے تھے۔ ”دیکھ لو، تم ایسے تھے کیا؟“

اب مجھے اس کی سنی پڑی، نہادھو کے اور کپڑے بدلنے کے بعد اپنی حالت میں بہت بہتری محسوس ہوئی۔ اس وقت میں کافی پینے کے موڈ میں تھا مگر روٹی ایک گلاس میں پانی لے کر آئی۔ ”اس میں گلوکوز ہے۔ تو انائی بحال کر دے گا۔“ میں نے اس کی مان لی۔ ”اب زحمت نہ ہو تو ایک کپ کافی بنا کے لا دو، مجھے کچھ ٹھکن ہے۔“ میں لیٹ گیا۔

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”اب زحمت آپ کو نہ ہو تو آنکھیں بند کر لیں، میں نے گلوکوز میں خواب آور گولی ڈالی تھی۔“ لائٹس بجھا کے وہ باہر نکل گئی۔ کچھ ایسی ہی حرکت میں نے بھی انور کے ساتھ کی تھی ورنہ اس کو سکون کی نیند لینا مشکل ہوتا۔ لیکن مجھے دھوکے سے گولی نہیں کھلانی پڑی تھی۔ وہ مشکل سے مانتا تھا مگر پھر اس نے گولی کھالی تھی۔

مجھے شاید نہ کی یاد آگئی۔ آخر یہ بھی اسی کی بہن تھی۔ اس نے اپنی لگن سے اسپیشلسٹ ہونے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی۔ کیا روٹی نے کچھ نہیں سیکھا ہوگا؟ باپ نے چاہے نہ بتایا ہو بڑی بہن نے سکھایا ہوگا۔ میرے سامنے ایک مشکل چیلنج درپیش تھا اور میری امیدیں روٹی سے وابستہ تھیں۔ دوا کا اثر عام حالات میں چھ گھنٹے رہتا ہے لیکن اندر کی بے چینی کے باعث میں تین گھنٹے بعد جاگ گیا۔ انور کو سوتا دیکھ کے مجھے اطمینان ہوا۔ اب یہ لازمی تھا کہ انور بھی اسی گھر میں رہے۔ میں نے لڑکیوں کو تلاش کیا تو وہ ایک بیڈروم کو سیٹ کرنے میں مصروف تھیں۔ یہ مراد کا بیڈروم تھا جو مہینے بھر سے بند پڑا تھا۔

روٹی نے مجھے دیکھا تو ماتھے پر آنے والے بال سیٹے۔ ”اب یہ آپ کی آخری آرام گاہ ہوگی۔“

”ہیں۔“ ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ایک مکروہ کاروبار ختم ہو گیا، اب ہم کیوں اسے دوبارہ چلانے والوں کی خواہش کے آگے سر جھکا لیں۔“

”میں انہیں چھوڑ دوں گا نہیں، اگر میری ماں کو کچھ ہوا تو میں انہیں چن چن کر ماروں گا۔ وہ جہاں بھی ہوں گے۔ میں ان کو تلاش کروں گا۔ جو میری ماں کے ساتھ ہوا، پہلے نہ جانے کتنی ماؤں اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ تب مجھے احساس نہیں تھا۔“ انور بولتا رہا۔

انور کو ٹھکن کا احساس نہ تھا مگر ذہنی اور جسمانی دباؤ میں رات بھر جاگنا اور کھڑے رہنا انسانی قوت برداشت کی سخت ترین آزمائش تھی۔ اس نے پہلے میرے ساتھ تہ خانے میں جا کے اپنے قیدی کو دیکھا۔ تفتیش کرنے والوں کی حالت اس سے زیادہ ابتر لگتی تھی۔ ابھی تک وہ اپنے مقصد میں ناکام تھے۔ الٹا میرے حکم پر وہ زیر تفتیش ملزم کی جسمانی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اس کے زخموں پر مرہم لگا رہے تھے اور تشدد سے ہونے والے نقصانات کی تلافی کر رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ خوش نہیں تھے۔ میں نے ان کی تفتیشی صلاحیت کو چیلنج کیا تھا۔

میں نے انور پر نظر رکھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔ وہ مجرم پر حملہ کر سکتا تھا۔ اسے جان سے بھی مار سکتا تھا اگر اس کے جذبات قابو میں نہ رہتے۔ ”آؤ جی چو دھری صاحب اور ملک صاحب لو کچھ لو میں زندہ ہوں۔“ میں نے انور کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم بہت جلد افسوس کرو گے کہ میریوں نہ گئے تھے۔ ہم نے زندہ رکھا تمہیں۔“

وہ معنوی طریقے سے ہنسا۔ ”ادھو... تم تو خدائی کے دعویدار بن رہے ہو۔ زندگی اور موت پر اختیار ہے تمہارا؟“

انور نے اسپیکٹر سے پوچھا۔ ”کوئی کامیابی ہوئی؟“
”تفتیش کو آپ کیا سمجھتے ہو جی؟ کرکٹ کا کھیل شرافت سے کھیلا جانے والا؟“ اسپیکٹر پھٹ پڑا۔ ”ہم نے مردوں کو بولتے دیکھا ہے۔“
”ہم تمہیں سکھائیں گے تفتیش۔“ میں نے کہا۔ ”پھر تمہیں افسوس ہو گا کہ تم نے عمر گنوائی۔ اب مارنے کے بجائے تمہاری ڈیوٹی ہے کہ اس کو مرنے نہ دو۔“
انور میرے ساتھ اوپر آ گیا۔ ”آخر ایسا کون سا جادو ہے تیرے پاس جس پر یقین ہے تیرا؟“

جوارس

تھا۔ ”دہ بولی۔“ مذاق کی بات الگ ہے۔ یہ مذاق کا وقت نہیں۔“

میں اسے دیکھتا رہا۔ ”کیا چیز ہو تم بھی... ایسے موڈ بدل لیتی ہو... جذبات پر ریوٹ کنٹرول ہے۔“

”رکھنا پڑتا ہے سیم صاحب۔“ اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر کہا تو اس کی آنکھوں میں اداسی کے سائے گہرے ہو گئے۔ ”میرا شو ہر نہیں رہا۔ بہت محبت تھی مجھے اس سے، ساری دنیا کو ٹھکرا دیا تھا میں نے اس کے لیے... خود سے زیادہ بد قسمت مجھے کوئی عورت نظر نہیں آئی۔ وقت نے کتنی کم مہلت دی ہمیں... لیکن یہ میری قسمت تھی یا خدا کی مرضی... اب میں کیا کروں؟ ایک صورت یہ بھی کہ ساتھ ہی مر جاؤں۔“

خاموشی کے مختصر وقفے کے بعد میں نے سوال کیا۔ ”مگر تم نے ایسا نہیں کیا؟“

”ہاں، کیونکہ مراد جانے سے پہلے مجھ پر دنیا کی سب سے بڑی سب سے مقدس اور سب سے زیادہ مسرت دینے والی ذمہ داری سونپ گیا تھا۔ میں اپنے ساتھ اسے بھی ختم کر دیتی۔ پھر مراد کے ماں باپ تھے۔ جب میں نے موازنہ کیا تو اپنی بد بختی مجھے کم لگی۔ وہ میرا سہارا تھا تو ان کا بھی تھا جس کو اعتماد کے قابل بنانے کے لیے انہوں نے پچیس سال دن رات محنت کی تھی اور دعائیں مانگی تھیں۔ وہ بھی تو بے سہارا رہ گئے تھے۔“

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی حوصلہ مند ہو۔“

وہ بولتی گئی۔ ”ایک رات میں نے خواب دیکھا جو مجھے حقیقت لگا۔ مراد میرے پاس آنکے بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو میں جاگ گئی۔ اس نے کہا کہ بس رہو... میں ایک بات کہنے آیا ہوں جو میں کہنا بھول گیا تھا۔ بعد میں کہہ دیتا جب موقع ملتا۔ میرے ماں باپ میری ذمہ داری تھے۔ اب انہیں میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ جب وہ بوڑھے ہو جائیں گے تو میرا جانشین آجائے گا۔ لیکن اس وقت تک تمہیں ان کا غم بٹانا ہے۔ ورنہ وہ زندہ کیسے رہیں گے۔ وعدہ کرو یہ ذمہ داری تم نبھاؤ گی اور میں نے کہا کہ میں نبھاؤں گی۔“ وہ خاموش ہوئی اور پھر بولی۔ ”میں مراد سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہی ہوں۔ بوڑھے لوگوں کے پاس حوصلہ کم ہوتا ہے۔ یہ میں دے رہی ہوں ان کو۔“

”سکندر شاہ بڑی ہمت رکھتا ہے۔ اس نے خود کو بکھرنے اور ٹوٹنے نہیں دیا۔ اس نے خاندان کے بکھرے اکیلے لوگوں کو اکٹھا کر لیا، ایک نیا خاندان تشکیل دینے کے

اس بے موقع مذاق کو میں نے بھی پسند نہیں کیا۔ ”کیوں؟ اور کبھی تو بیڈ روم ہیں... کوئی سالور کووے دو اور اس کے ساتھ میں بھی رہ سکتا ہوں۔ ملکی کمرے میں جہاں وہ سویا ہوا ہے۔“

”یہ امور خانہ داری کے معاملات ہیں۔“

”مگر... مراد کا بیڈ روم تھا یہ... اب تک بند تھا۔“

میں نے احتجاج کیا۔

”میں اس کمرے کو آسیب زدہ رکھنا نہیں چاہتی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”تمہیں اس کے ماں باپ کے جذبات کا بھی احساس ہونا چاہیے۔“

”ان سے میں نے پہلے ہی پوچھ لیا تھا۔ ماں جی سے... اور انہوں نے کہا کہ یہ تو تم نے میرے دل کی بات

کہی۔ کمرہ آباد رہنا چاہیے۔“

میں نے اعتراض جاری رہا۔ ”اس میں انور بھی رہ سکتا تھا۔“

”نہیں رہ سکتا تھا۔“ روٹی بولی۔ ”کیونکہ ساتھ ہی میں ہوں اور ہانکل سامنے دروازہ ہے ریشم کے کمرے کا۔“

”اب تم اس کی گمرانی کرو گی... خیر...“

”کافی چاہیے تمہیں... میں لاتی ہوں دو منٹ میں۔“ اس نے پیشی بجا لی۔

میں باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ ماحول پر ایک عجیب اداس کر دینے والی دھند سی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انور کی وجہ سے ریشم اداس اور پریشان ہے لیکن یہاں بھی خواہواہ رسم و رواج کی دیوار

گھڑی گئی۔ جو اس بار خود روٹی نے گھڑی کی تھی۔ اگر اسے انور سے ملنے دیا جاتا تو کوئی قیامت نہ آ جاتی۔ اس وقت وہی سب سے زیادہ غم گساری کا حق ادا کر سکتی تھی۔ دس منٹ بعد روٹی فرے میں دو ٹکڑے رکھے نمودار ہوئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔

”ریشم کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تم نے کیوں فضول میں اپنی ٹانگ اڑا رکھی ہے سچ میں... وہ کتنا عرصہ ایک ساتھ گھومتے پھرتے رہے ہیں۔ چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا منگنی ہو گئی تو وہ غیر ہو گئے۔“

اس نے خاموشی سے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔ ”وہ انور کے ساتھ کافی پی رہی ہے۔“

”یعنی آپ نے مجرم کو دیرینہ پر چھوڑ دیا؟“

”یہ میں نے بھی کہا تھا اس سے اور یہ ضروری بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ماں جی خیریت سے لوٹ آئیں پھر ہم سب کا ہتا چلا لیں گے۔"

رات نو بجے فون آیا۔ ایک ملازمہ نے کورڈ لیس فون لا کے سکندر کو دیا۔ "ہیلو۔" کے ساتھ ہی میں نے سکندر کا رنگ بدلتا دیکھا، اس نے دو تین بار ہیلو کہا۔ "پتا نہیں کون تھا تین بار ہنسنا، بولا کچھ نہیں۔"

انور چوکنہ ہو گیا۔ "وہی لوگ ہوں گے پھر کال کریں گے نمبر دیکھ لیں۔"

سکندر اٹھ کے فون سیٹ تک گیا اور کورڈ لیس والا حصہ اس سے منسلک کر دیا۔ "اس بے وقوف نے خود ہی موقع دیا ہے۔"

سکندر نے فون کے قریب ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر رکھا اور آن کر دیا۔ اس کے دو تار فون کے اسپیکر سے ملے ہوئے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر میل سے چلتا تھا اور اب تمام گفتگو سنی بھی جاسکتی تھی اور ریکارڈر بھی ہو سکتی تھی۔ انتظار میں ہمارے اعصاب جواب دینے لگے۔ سب کی نظر گھڑی پر رہی جس کی سوئیاں دائرے میں حرکت کر رہی تھیں۔ اپنی اپنی رفتار سے۔ سکندر رفتہ رفتہ منٹ بن رہے تھے۔

انور اٹھ کے لاؤنج میں ٹہلنے لگا۔ "وہ ہمارے اعصاب توڑ رہے ہیں۔"

"لیکن اب تصدیق ہو گئی، ماں جی زندہ ہیں۔ وہ پھر بات کریں گے۔" سکندر نے کہا۔

"اور آج ہی... میں نے اس کی تائید کی۔"

ایک گھنٹا گزر گیا۔ ہم سب فون کے دونوں طرف صوفے پر خاموش بیٹھے تھے۔ دوسرے کنارے پر کھانے کی میز تھی۔ پہلے روٹی نے اور پھر ریشم نے اندر بھاٹکا اور کھانے کا پوچھا۔ سکندر نے غفلت سے کہا۔ "ابھی نہیں، بتا دیں گے۔ اوھر کوئی نہ آئے۔" اس نے دروازہ بند کر دیا۔

گھنٹی پھر بجی تو ہم سب تقریباً اچھل پڑے پھر سکندر نے آواز کو پُر سکون رکھتے ہوئے ہیلو کہا۔

جواب میں نے بھی صاف سنا۔ "کیا خیال ہے شیکے دار صاحب، بات آپ کرو گے؟"

بولنے والے کی آواز بھاری اور پُر سکون تھی۔ سکندر نے کہا۔ "کس بارے میں؟"

وہ ہنسنا۔ "اتنے بھولے مت بنو، ماں تو وہ چودھری صاحب کی ہے۔ قیمت اسی سے پوچھو۔"

"وہ تمہارے پاس ہے۔ ہم تم نے لگایا تھا؟"

"دیکھو، چالاک بننے کی ضرورت نہیں۔ تین منٹ

لیے ہیں میں ریشم اجنبی تھی اور میں باہر کا تھا۔ کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا ہمارا... لیکن اس نے بھی جو کیا اپنے لیے نہیں کیا، سب تمہارے لیے اور تمہارے مستقبل کے لیے کیا۔"

ابھی تک مجھے روٹی سے وہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا جو میرے خیال میں سب سے اہم تھی۔ سکندر شاہ آیا تو سیدھا اندر چلا گیا۔ روٹی کے ساتھ میں بھی اندر گیا۔ وہ انور کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا اسے دن بھر کی روداد سناتا تھا۔

میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ "پھر سامعین کے مرید تو آس پاس کے علاقے میں ہی زیادہ ہوں گے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"مگر وہ روپوش ہو گئے ہیں یا ان جاں نثار مریدوں کی پناہ میں ہیں جو انہیں پل پل کی خبر پہنچا رہے ہوں گے۔ میری ملاقات ایک نوجوان اور ذہین پولیس افسر سے ہوئی۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسا نہ ہو جو یہاں کے کرتا دھرتا تھے، وہ یہاں سے مایوس ہو کے الگ الگ کاروبار شروع کر دیں۔ تجربہ ہے ان کے پاس... دو چار سال میں دکان چل جاتی ہے۔"

"یہ تو اس نے ٹھیک کہا۔ شرک اور بدعت کی بیماری پھیل کے وہاں جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس نے کہا کہ میں نے سارے علاقے میں پولیس کے مخبر اس کام پر لگا دیے ہیں جیسے ہی کہیں کوئی مانگ فقیر کسی نئے علاقے میں روحانیت کا ڈرانا شروع کرے... مجھے بتائیں۔"

انور نے ناگواری سے کہا۔ "آپ لوگ کل کی باتیں کر رہے ہیں۔ آج کا دن گزر گیا، ماں جی کا کچھ پتا نہیں۔"

"اس افسر نے بڑے یقین سے کہا ہے کہ وہ رابطہ کریں گے اور بدلے میں تمہارے قیدی کی رہائی مانگیں گے۔" سکندر بولا۔

"لیکن کب؟ ان کی صحت سختی برداشت نہیں کر سکتی اور پھر صدمہ۔" وہ بے چینی سے بولا۔

سکندر بولا۔ "اللہ بہتری کرے گا۔ کیا اس بڑھے کا اس مردہ سے تعلق تھا جسے انہوں نے قبر میں لٹا دیا تھا۔"

سکندر بولا۔ "ضرور ہوگا۔ وہ بتا سکتا تھا کہ لورین یا فاطمہ کہاں ہے؟ وہ اور اس کا بھانجا جراثیم پیشہ تھے۔ بھانجے کا معلوم کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک بہت بڑے گینگ کی مشین کا بہت چھوٹا اور چلتا پرزہ تھا۔ اس سے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا۔" انور نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ "بس ایک بار



تھی۔ شاید دس منٹ میں بھی ایسی کارکردگی کا مظاہرہ ممکن نہ تھا کہ کال کا پتا لگ جائے تو قریبی تھانے کو مطلع کیا جائے اور وہاں سے پولیس فورس مستعدی دکھاتے ہوئے مجرم کو مصر دھب گنگو گرفتار کر لے۔ یہاں شہر حکم کو سنجال کے کسی تھانے وار کا اٹھنا، بیلٹ باندھنا، ماتحتوں کو حکم جاری کرنا کہ وہ اسلحہ سنجالیں اور پھر کسی سرکاری گاڑی میں سوار ہوں تو پتا چلے کہ ٹائر پنچر ہے یا گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔

مراد کی ماں کے سامنے کسی نے اپنے رویتے سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ گھر میں کوئی زلزلہ آیا ہوا ہے۔ پتا نہیں روٹی کے چلیے میں تبدیلی کے ساتھ ہی اس نے آسانی سے قبول کر لیا تھا کہ سب کچھ پہلے کی طرح ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی ذہنی حالت اتنی ناقابل اعتبار ہے۔ روٹی اور ریشم نے ہماری صورتوں پر پڑھ لیا تھا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے مگر سکندر نے پہلے ہی ان کو ڈرائنگ روم سے نکال دیا تھا۔ اب بھی کوئی ان کو شریک راز کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔

کھانے کے بعد ہم تینوں پھر اکٹھے ہوئے تو سکندر نے پوچھا۔ "بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟" "کیا کرنا چاہیے؟" انور نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ "تم کہتے ہو تو میں مرید کا بھر جانی سے تہا دلہ کر اسکتا ہوں۔ محفوظ رہتے ہوئے۔" میں نے کہا۔ "ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ تم نے سنا ہوگا کہ اس نے آخر میں کیا کہا تھا؟" انور نے سر ہلایا۔ "ہاں، باقی پھر۔"

ہیں تمہارے پاس... انور کہاں ہے؟" سکندر نے فون انور کو پکڑا دیا۔ "بتاؤ کیا چاہیے تمہیں کتنا پیسا؟" "اب حیرے پاس ہے نہیں... اور ہمیں ضرورت نہیں۔"

"پھر کیا چاہیے؟" انور نے کہا۔ "مرید اول کو رہا کر دو۔ تمہاری ماں مل جائے گی۔ اس کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ تمہاری ماں کو بھی نہیں ہوگا، باقی بعد میں۔"

فون بند ہو گیا۔ انور ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ سارا عزم سامنے آ گیا تھا۔ یہ اطلاع اہم تھی کہ ہم نے مرید اول کو پکڑ رکھا تھا۔ اپنی اپنی سیٹاری کے اعتبار سے وہ اول، دوم، سوم کہلاتے ہوں گے۔ تصدیق ہو گئی تھی کہ ماں جی زندہ ہیں مگر ان کی زندگی داؤ پر لگ چکی تھی۔ وہ جو چاہتے تھے کہ اصل ورگاہ کی جگہ زیادہ شان و شوکت والی ورگاہ بنے اور ان کا مذموم کاروبار پہلے کے مقابلے میں زیادہ چلے۔ اس بد معاشی کے اڈے کو ختم کرنے والا سکندر تھا۔ وجہ ذاتی عناد سمجھا۔ اس نے یہ کام گامرتیم کی مدد سے کیا تھا اور خرابی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ قدرتی طور پر ان کا سب سے بڑا دشمن سکندر تھا۔ دوسرا نمبر میرا تھا جس کو پھر سامنے نے اپنا جانٹھیں نامزد کر دیا لیکن میں دشمنوں سے جا ملتا۔ ان کی نظر میں ڈاکوؤں کو بلانے اور پھر کے ساتھ ان کی فیملی کا نام و نشان مٹانے والوں کے ساتھ میں نے ساز باز کی تھی۔ تیسرے نمبر پر اب روٹی آگئی تھی جس نے وہاں دوبارہ درگاہ کی تعمیر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی پشت پناہی سکندر کے ساتھ ام مب کر رہے تھے چنانچہ ہم سب گردن زدنی تھے۔

ہم نے ریکارڈنگ کئی بار سنی مگر اس کا فائدہ کچھ نہ تھا۔ بات کرنے والے نے تین منٹ دیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ہم نے اپنے فون کو ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ سے آبرو ویشن پر رکھنے کو کہا ہوگا تو معلوم ہو جائے گا کہ کال کہاں سے ہوئی تھی۔ ایسے واقعات کا حوالہ ضرور دیا جاتا تھا کہ کچھ لوگوں نے کال کرنے والوں کو بھی گنگو میں الجھایا اور اتنی دیر میں پولیس پہنچ گئی۔ عموماً وہ کسی پبلک کال آفس سے بات کر رہے ہوتے تھے۔ لی سی او بھی دوشم کے تھے۔ ایک جو دوکان داروں نے بنا رکھے تھے۔ دوسرے ٹکے کے خود کار جو سکے ڈالتے سے کلیکٹ ہو جاتے تھے۔ ہم سے بات کرنے والوں نے جو تین منٹ کی لسٹ رکھی تھی، بہت کم

”ابھی کچھ نہیں کرنا۔ میں صبح کوشش کروں گا۔ یہاں کے قانونی اور دوسرے معاملات سے تم نمٹ لینا اور اب میرا خیال ہے کہ آنے والے دن کی تیاری کے لیے ہم سب کو سو جانا چاہیے۔ کام بہت ہیں اور مشکل۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے لیے روپی نے وہ کمر مختص کر دیا تھا جو اس کا اور مراد کا مجلہ عروسی رہا ہوگا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ متصل کمرے میں ہے۔ میں نے لائٹ آف کی اور آنکھیں کھول کے نیند سے لڑتا رہا۔ مجھے اس وقت کا انتظار تھا جب گھر کی خاموشی سب کے سو جانے کی خبر دے۔ خواہ خبر غلط ہو۔ سب میری طرح نیند سے لڑ رہے ہوں۔ دروازے پر انگلی سے دستک سن کے میں چونکا۔ آواز کیے بغیر کنڈی کھول کے دیکھا تو روپی اندر آگئی۔

”تم کیا کر رہی ہو یہاں؟“

”مجھے ضروری بات کرنی تھی تم سے، ابھی... اور میں جاؤں گی نہیں خواہ تم شور مچاؤ۔ میں کافی لائی ہوں۔“ اس نے ٹرے میں رکھی ہوئی ننھی سی ستارے جیسی روشنی کو جلا دیا۔ اب میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ پریشانی میں پردے پر ابر کر کے میں پلٹا تو وہ بیڈ کے ساتھ والے صوفے پر براجمان تھی۔

”ایسی کون سی قیامت آجاتی اگر یہ بات صبح کر لی جاتی؟“ میں نے کہا۔

اس نے اوپر انگلی اٹھائی۔ ”بس اللہ کا حکم تھا کہ بات ابھی کی جائے۔ اس کے علاوہ عقل مندوں نے کہا ہے کہ آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔ یہ عقل مند بھی خوب ہیں۔ دوسرا کہتا ہے جلدی کا کام شیطان کا۔“

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنا بولتی ہو۔ خیر فرماؤ ساڑھے تین سو الفاظ میں کہ مدعا کیا ہے۔ زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔“

”میرے پاس ہے۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔ ”آج سارا دن ہم خواتین کو تم لوگوں نے دور رکھا۔ بند دروازے کے پیچھے غصے کرتے رہے۔ آخر کیوں؟“ اس نے دھپ سے نیز پر ہاتھ مارا۔

”میں اچھل پڑا۔“ کیا کرتی ہو، سن لے لگا کوئی۔“

”الحمد للہ مسماۃ رشیم جان دروازے سے کان لگائے کھڑی سب سن رہی ہیں اور عالم بالا میں ہم تینوں کے سوا کوئی نہیں۔ اب تم کہو گے کہ بہتر ہے اسے بھی اندر بلا لو۔ تو میرا خیال بھی یہی ہے۔“ اس نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے ان کے مطالبات کی لہرست میں اور کچھ بھی ہے۔“

”وہ دوبارہ درگاہ بنانا چاہتے ہیں۔ روپی اس پر تیار نہیں اور میں بھی... لیکن ماں وہ تمہاری ہے، تم جیسا کہو گے۔“

انور سے پہلے میں نے کہا۔ ”اتنی جلدی میں فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تھوڑی سی مہلت ملے تو ہو سکتا ہے سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔“

”کھل کر بتاؤ کیا سوچ رہا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”انور! فرض کرو وہ پھر کل فون کرتے ہیں۔ اگر ہم فوری جواب سے بچ جائیں۔ ایک آدھ دن کی مہلت لے لیں۔“

”انہیں شک ہو جائے گا۔“ انور بولا۔

”یار جتنی اہمیت تمہارے لیے ماں کی ہے۔ ان کے لیے مرید اول کی اتنی نہ سہی... باقی سب سے زیادہ ہے۔ تھوڑی سی مزاحمت کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے تھوڑی سی ہمت چاہیے تو بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔“

”تھوڑی سی ہمت میں بہت زیادہ رسک ہے اور ہوگا کیا ایک دو دن میں آخر؟“

سکندر نے اس کی تائیدی۔ ”انور ٹھیک کہہ رہا ہے، وہ چٹان ہے۔ ٹوٹ جائے گا بولے گا نہیں، یہ پولیس کے لوگ جو یہاں بیچے گئے، تفتیش کے باہر تھے۔ تم نے ان کو بھی روک دیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے صرف ایک دن اور ایک رات کی مہلت چاہیے۔“

”کیا کرے گا تو؟“

”ابھی نہیں بتا سکتا۔ ہو سکتا ہے کل شام تک وہ کچھ بتا دے۔“

ان دونوں کے لبوں کی تلخ طنز اور مذاق اڑاتی مسکراہٹ نے وہ کہہ دیا جو الفاظ نہیں کہہ سکتے تھے۔

”انور! مجھ پر ہمیشہ بھروسہ کیا تو نے... اور یہ اعتماد کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ اب میں جانتا ہوں کہ ناکام رہا تو تیرے سامنے ساری عمر مندہ رہوں گا۔ پھر بھی میں رسک لے رہا ہوں۔ رسک میرے لیے نہیں ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ فائدہ ہوگا۔ بس کل شام تک۔“

وہ دونوں کچھ دیر ساکت اور خاموش بیٹھے رہے۔

”چل ٹھیک ہے۔ ان خطرناک مجرموں کو ٹھکانے لگانا جہاد سے کم تو نہیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں کیا کرتا ہے؟“

پاس۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تم نے تو تک دیا تھا کہ... جیسے جموت بولا تھا میں نے اور ہم عیاشی کر رہے تھے... انور نے پچیس ہزار اسے دیے جس نے مجھے قید کر رکھا تھا۔ صبح یہ مجھے لے جاتے۔ قسمت بھی کہ میں بچ کے بھاگ آیا۔ وہ پہلوان...“

”ابھی تک اس کہانی میں پہلوان کوئی نہیں تھا؟“
روبی نے لقمہ دیا۔

”تھا... ایک ریٹائرڈ پہلوان جس کو اپنی بیٹی کی شادی کے لیے دس ہزار ملے اگر وہ قیدی کی یعنی میری ڈیڈری صبح دیتا۔ میں نے دس کے پچیس کیے اور وہ بھی بھاگ گیا اپنے بیوی بچوں سمیت... وہاں درانا کے ساتھ آنے والوں نے بڑا کشت و خون کیا۔ وہاں سکندر کے اور انور کے دق داروں نے مقابلہ کیا اور لوگ بھی مارے گئے۔ ایک بندہ اور ان میں شامل تھا۔ یہ انعام اچھا ملا۔ امید بھی کہ اس سے سب کا پتا چل جائے گا مگر اس پر کچھ اثر نہیں کرتا۔ نہ آگ نہ پانی... نہ کبھی نہ مار۔“

”تم کیا پوچھنا چاہتے تھے اس سے؟“

”دوسرے بد معاشوں کے نام اور ٹھکانے پھر باری باری سب کو اٹھا لیتے۔ شہر کی پولیس نے دو تفتیشی ماہر بھی بھیجے تھے۔ وہ بھی ناکام ہو گئے۔ کہتے تو ہیں کہ ہمیں کارروائی کرنے دو۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مر گیا تو ایک ہی ٹکڑو ہے۔“

روبی نے سوچ کے کہا۔ ”یہ وہیں دوسری زیادہ بڑی اور شاعر درگاہ بنانا چاہتے ہیں؟“

”ہاں، اور مالک تو تم ہوزمین کی مگر ہم انکار کر چکے ہیں۔“

”انور کی ماں کو اسی لیے اٹھایا گیا ہو گا۔ مجھے سب معلوم ہے۔ دباؤ ڈالنے کے لیے۔“

”ہاں، ایسا ہی ہے عزیز۔“

”اور حلی کو ہم لگا کے بھی انہوں نے ہی اڑایا ہو گا مجھے معلوم ہے۔“

”سب معلوم ہے آپ کو علامہ صاحبہ... یہ فرمائیے کہ جو آپ کی بڑی بہن شایہ کو معلوم تھا، آپ کتنا جانتی ہیں؟“

”تم شایہ سے شادی پر مجبور کر دیے گئے تھے؟ اسے جاننے نہیں تھے؟“

”یہ کیسا بے گل سوال ہے۔ تمہاری تو خبر نہیں تھی۔ وہ

ریشم دانت نکالتی کافی کے گک سمیت آئی اور بیٹھ گئی۔ ”یعنی کل تو نہیں ہوئی آپ لوگوں کی پرائیویسی میں؟“
لکھنہ کریں، میں بہری ہوں۔“

روبی نے کہا۔ ”ملک صاحب! یہ جو قربانی کا سائڈ نیچے لاکے باندھا ہے آپ نے۔ رانا کھلاتا تھا وہ... مرید کچھ نامناسب ہے۔“

”مجھے بھی اس کے بارے میں تم سے بات کرنی تھی۔“

”بعد میں کرنا۔ پہلے میری سنو۔ اس نے تمہیں کچھ بتایا؟“

”نہیں، بولتا نہیں۔“

”کتنا وقت ضائع کیا تم نے۔ میں بتا رہی۔ نام ہے اس کا رحیم یار خان سب رانا کہتے ہیں۔ یہ شہر کا نام بھی کسی بندے کے نام پر ہو گا۔ ماں باپ نے رکھا ہو گا۔ مجھے یاد ہے یہ سولہ اعشارہ سال کا تھا جب آیا تھا۔ داڑھی موچھیں بھی نہیں نکلی تھیں۔ اب تو واقعی سائڈ بن گیا ہے مگر اس وقت تھا دہلا پتلا گور اچھا۔ ابا کا خاص خدمت گار تھا۔“

وہ تو ہونا ہی تھا۔ میں کہتے کہتے رک گیا اور غالباً روبی لا علم نہیں تھی۔

”عرس کے موقع پر ڈانس کرتا تھا۔ ایسے عموں کے لگتا تھا... بال بھی لمبے تھے تو عورت لگتا پھر ترقی کرتا رہا اور اب دیکھو نمبر دن ہے۔ گویا کرتا دھرتا دوسرے گیارہ مرید اس کا حکم مانتے ہیں۔“

”وہ سب روپوش ہیں۔ ان کے بارے میں یہ نہیں جانتا۔“

”تم کو کیا پوچھنا تھا؟“

”بہت کچھ... درگاہ بد معاشی کا ڈانسی اور بد معاشی کا مقصد جنت کمانا نہیں مال کمانا تھا۔ تو مال بد معاشی کے ہر غیر قانونی ذریعے سے کمایا گیا۔ دنیا میں جو شیطانی کاروبار ہیں، سب ہوتے تھے وہاں۔ منشیات سے پردہ فردوسی تک۔“

”وہ سلسلہ تو اب ختم ہو گیا۔ کیا یہ پھر شروع کرنا چاہتے ہیں؟“ روبی نے پوچھا۔

”یہ تو فساد کی جڑ ہے۔ یہ کھلم کھلا غنڈا گردی اور بد معاشی پر اتر آئے ہیں۔ تمہیں تو اندازہ نہیں کہ رات بھر میں انور کے ساتھ حلی میں نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے باندھ کے ڈال رکھا تھا اور اگر میں قفل سے کام نہ لیتا...“

”یہ بتانا چاہتے ہیں آپ کہ قفل بھی ہے آپ کے

ہوتی ہے جو پولیس سے زیادہ سراغ رساں ادارے استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ممنوع اور خطرناک بھی ہے۔ اسے سچ کا زہر نہیں سچ کا تریاق کہتے ہیں۔ (ٹریڈ سیرم TRUTH SERUM) انجکشن لگاتے ہیں تو مجرم کی ساری ذہنی مزاحمت ختم... اس سے جو پوچھو سچ بتانے لگتا ہے۔ باہر ایک مشین بھی استعمال ہوتی ہے جو جھوٹ پکڑنے کا آلہ کہلاتی ہے۔

"تم اسے وہ انجکشن دو گے، رانا صاحب کو؟"
"اگر ملے... نہ وہ بازار میں دستیاب ہے نہ اسپتالوں میں، مسئلہ حل ہو جاتا، سب پتا چل جاتا۔"
"وہ سوچ میں ڈوبی رہی۔" پتا چل گیا تو تم کیا کرو گے؟ سب کو مار دو گے؟"
"اگر انہوں نے ہمیں مارنے کی کوشش کی... ورنہ قانون کے حوالے۔"

"قانون؟" وہ حقارت سے ہنسی۔ "جو میرا تمہارا سب کا زہر خرد ہے، غلام ہے اور ان کی کیا بات کرتے ہو۔ وہ اپنی کارروائی شروع کر چکے ہیں۔ اس حساب سے یہ تیسری واردات ہوگئی۔ پہلے تم کو اٹھوایا، پھر حویلی تباہ کی اور انور کی ماں کو لے گئے۔"

"وہ چوتھا قدم بھی اٹھا چکے ہیں۔ انہوں نے ماں جی کے بدلے میں مرید نمبر ایک کو مانگا ہے۔"
"اور انور کیا کہتا ہے؟"
"ریشم بولی۔" وہ ماں گیا ہوگا؟

میں نے کہا۔ "نہیں، ابھی تک وہ اس ارادے پر قائم ہے کہ اس بد معاشوں کے گروہ کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ ہم پہلے کوشش کریں گے ماں جی کا پتا چل جائے۔"

"سلیم! مجھے اپنے ساتھ شامل سمجھو، تم سے زیادہ میں نے دیکھی ہے ان کی بد معاشی... سب کو پکڑ لو، جن جن کو ختم کرو انہیں، وہ جہاں بھی ہوں۔ انور اور تم بھی کم ہمت نہیں۔ ضرورت پڑے گی تو میں بھی ساتھ دوں گی تمہارا... ریشم بھی دے گی۔" وہ جوش سے بولی۔

ریشم نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ وہ کم گوئی اور شاید کنفیوژن میں بھی کہ انور کا ساتھ دینے کا اعلان کیسے کرے۔

میں نے ہنس کے کہا۔ "میں رانی جھانسی اور رضیہ سلطانہ والے اس جذبے سے متاثر ہوا۔ ضرورت پڑے گی کہیں تو تمہیں بھی میدان جنگ میں لے جائیں گے، ابھی سے سکوار مت اٹھاؤ۔"

ایسی عورت تھی جو ہیلن آف ٹرائے ہوتی، فلو پٹرہ ہوتی، نور جہاں اور ایوا براؤن ہوتی۔"
"ان سب نے کہاں ملے تھے تم؟" ریشم نے ساوگی سے پوچھا۔

روبی نے کہا۔ "بہن کرو۔ پہلے زندگی میں آئی ہوں گی نورین سے پہلے۔"

"کس قدر جاہل ہو تم لوگ، بابا یہ عورتیں وہ ہیں جن کا ذکر تاریخ میں آتا ہے۔ جو حاکموں کے دل پر حکومت کرتی رہیں۔ شاہینہ کی بد قسمتی کہ اس فضول گاؤں میں جنم لیا۔ ہانی دوڑ میں ہوتی تب بھی تھلکہ چاوتی۔ بات صرف حسن کی نہیں... اس کی غیر معمولی ذہانت کی ہے۔"

روبی نے تسلیم کیا۔ "ہاں، میں تو اس کے سامنے جاہل اور احمق تھی۔ حالانکہ وہ مجھے کہتی رہتی تھی کہ روبی! دنیا میں جینے کا ڈھنگ سیکھ لے، ورنہ وہی ہوگا جو سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ ناقص العقل اور پاؤں کی جوتی پہنائے گی۔ مجھ میں جو تھوڑی بہت عقل یا ہمت ہے اسی نے سکھائی۔"

"مجھے اسی کی ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب؟ شاہینہ کی؟"

"اب وہ نہیں تو اس کی نالائق شاگرد تم کیا کر سکتی ہو؟"

"میں ایک کافی اور بنا کے لاسکتی ہوں۔ تمہاری ناک بہہ رہی ہے وہ صاف کر سکتی ہوں۔"

"نفاق میں وقت مت ضائع کرو۔" میں نے نیچے کے نیچے سے رومال نکال کے ناک صاف کی۔ "اس نے مجھے بتایا تھا کہ درگاہ پر دونوں کام ہوتے تھے۔ بیمار کرنا اور پھر علاج کرنا۔ جن اتارنے کے ساتھ جن چڑھانے کے لیے بھی دوا لیں تھیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ وہ سب دماغ کو متاثر کرنے والی دوا لیں تھیں جو عام نہیں ملتیں۔ چنانچہ، کہاں سے آجاتی تھیں۔ اب یہ مت ڈسکس کرنا مجھ سے کہ درگاہ پر ان جوان لڑکیوں یا عورتوں کے ساتھ کیا ہوتا تھا۔"

"مجھے اور ہم سب کو معلوم ہے۔ ان کا ہسٹریا دور ہو جاتا تھا۔ وہ صاحب اولاد ہو جاتی تھیں۔ ان کی شادی بھی ایک علاج تھی۔ وہ دوا لیں کیا تھیں؟ ان کے نام یاد ہیں؟"
"اس نے نفی میں سر ہلایا۔" اس کا شوق شاہینہ کو تھا۔ وہ سب جانتی تھی۔"

"تم نے مایوس کیا۔ میرا خیال تھا کہ مدیر نمبر ایک کو ان دواؤں کے زیر اثر بولنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک دوا

وہ خفا ہو گئی۔ ”تم تینوں خود کو بڑا طرم خاں اور افلاطون سمجھتے ہو، ہمارے مقابلے میں... وقت آیا تو دیکھ لیتا ہم کسی سے کم نہیں۔“

”بجا ارشاد... آپ سے سب کم ہیں مگر جو پہلا کام کہا ہے...“

اس نے مسکرا کے کہا۔ ”سمجھو ہو گیا۔“
”کیا مطلب، بیٹھے بیٹھے ہو گیا۔ نام بتاؤ دواؤں کے... اسی پر منحصر ہے میری کامیابی۔“

”نام خود دیکھ لیتا، میرا خیال ہے کہ ایک جگہ کچھ دواؤں پڑی ہیں تم جانتے ہو۔“

”میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔“ کہاں؟ اور میں کیسے جانتا ہوں؟“

”اس لیے کہ تم رہے ہو وہاں۔ مجھے معلوم ہے، اکبر کا ایک ٹھکانا تھا۔ ایک کوئی بھی الگ تھلگ غیاشی کے لیے۔“
”میرا منہ بے یقینی کی حیرت سے کھلا رہ گیا۔“ ہاں، میں نے دیکھی ہے وہ جگہ، میں رہا ہوں وہاں... محبت کا قیدی بن کے۔“

”اس جگہ کی تلاشی لو۔ آخری دنوں میں شاہینہ نے بڑا ہاتھ مارا تھا۔ ابا چلا رہے تھے کہ دواؤں کہاں گئیں، ان کا آدمی سے زیادہ اسٹاک غائب ہو گا تو انہیں پتا نہیں چلے گا۔“

”دل چاہتا ہے تمہارے ہاتھ چوم لوں۔“ میں نے جذبات کی روداد میں کہہ دیا۔
”روبی نے ہاتھ آگے کر دیے۔“ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

شرمندگی سے مجھ پر گھروں پانی پڑ گیا۔ روبی نے مجھے سوچے سمجھے بغیر بولنے کی اچھی سزا دی تھی۔ اس نے اعتماد، سادگی یا معصومیت میں یہ حرکت کی تھی لیکن مجھ میں اخلاقی جرأت نہ تھی کہ اس کا ہاتھ بھی پکڑ سکتا۔ پہلے میں نے بڑی بہن شاہینہ کا روپ دیکھا تھا جو جرأت و ذہانت میں خطرناک حد تک آگے بڑھا ہوا تھا۔ چھوٹی اس کے برعکس ہمت اور سمجھ بوجھ میں کم نہ تھی۔ لیکن اس کی ہمت کا کوئی منفی پہلو نہ تھا۔ اس نے محبت کی بھی تو کسی احساس گناہ کے بغیر اور زندگی کا جتنا بھی تھوڑا بہت سمر مراد کے ساتھ کیا تھا شریک حیات کی حیثیت سے کیا تھا۔ اب وہ اپنی ہمت سے ایک خاندان کی دونوں کوسنبھال رہی تھی۔

جب وہ چلی گئی تو اپنے پیچھے نئی پھول چھوڑ گئی۔ کو منزل دور تھی مگر نشان منزل صحیح ثابت ہوا تھا۔ میں نے ساری اس

روبی سے باندھ رکھی تھی اور کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے یہ ضرور بتا دیا تھا کہ میں نے ٹھیک سوچا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی اس جگہ سے دواؤں اٹھا لاؤں جو اکبر کا عشرت کدہ تھی اور میرا قید خانہ... اب وہ پرانی حویلی کسی کے کام نہیں آ رہی تھی تو دیران ہی پڑی ہوگی۔ دیر سے سونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں سورج طلوع ہونے کے ایک گھنٹے بعد جا گا۔ اوپر والی کھڑکی سے جھانک کے دیکھا تو سکندر اور انور ٹپکتے ہوئے کسی مسئلے پر بات کر رہے تھے۔

ابھی تک دہشت گردی کرنے والوں نے دوبارہ کال نہیں کی تھی۔ یہ مجھے سکندر نے بتایا۔ اس نے ساری رات فون کے پاس بیٹھ کر جاگنے کے بجائے اپنے بیڈروم میں سرہانے کی طرف فون رکھ لیا تھا۔ وہ سوتے جاگتے انتظار کرتا اور صبح ہو گئی۔

انور بہت پریشان تھا۔ ”معلوم نہیں رات ماں جی نے کیسے گزاری۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ان کو حوٹلی میں ہی دیکھا۔ سوائے خاندانی تقریبات کے وہ کہیں جاتی تھیں تو ابا کے ساتھ۔“

”میں نے کہا۔“ ان کی عمر زیادہ ہے لیکن ایک تو بیماری کوئی نہیں، دوسرے وہ مشکل حالات میں بھی پرسکون رہنا جانتی ہیں تو فکر نہ کر۔“
”دہ بگڑ گیا۔“ کیسی باتیں کرتا ہے تو... تیری ماں نہیں ہے نا۔“

یہ بات مجھے گالی کی طرح لگی مگر انور کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر میں بی گیا۔ ”ایک بات کی طرف سے تو اطمینان ہو گیا ہے تاکہ وہ سودا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود خیال رکھیں گے ماں جی کا، ہو سکتا ہے وہ کہیں کہ ان سے بات کرائی جا سکتی ہے۔ اگر ہم رحیم یا رخاں سے بات کرا دیں۔“
”اس میں کوئی حرج نہیں۔“ انور بولا۔

”دیکھ انور! تو نے بھی دنیا دیکھی ہے یہ انوا براے۔ تاوان ہے۔ تاوان میں وہ پیسا نہیں رحیم کو مانگ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمارے تذبذب یا تاخیری حربے ان کو شک میں ڈال دیں کہ ہم دیر اس لیے کر رہے ہیں کہ پس پردہ دوسری کارروائی جاری ہے۔ پولیس اور تمام خفیہ ادارے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ ممکن دیں گے کہ ہم نے ایسا کیا تو ماں جی کی لاش ہی ملے گی۔“
”یہ سارے ہتھکنڈے وہ ضرور آزمائیں گے۔“

انور اسی سے بولا۔
”شاید اس سے بھی زیادہ... کچھ انوا کرنے والے

ہوتی ہیں۔ تمہاری بھی ہوگی۔
 "اے ایسا گم مت مار، ہم جذباتی نہیں ہو سکتے۔ یہ بتاؤ
 استاد رحیم کو کہاں لار ہے ہو؟"
 "جہاں تم کہو اور فکر نہ کرو، ہم کسی سے مدد نہیں لے
 رہے ہیں۔ نہ پولیس سے نہ فوج سے۔"
 فون غیر متوقع طور پر بند گیا۔ وہ بالکل روایتی طریقے
 پر ڈیل کر رہے تھے۔ اگلی بار وہ آواز سنیں گے اور سنو امیں
 گئے۔ پھر ہو سکتا ہے ایک یوزمی عورت کی آہ و زاری
 سنو امیں۔ ہمارے اعصاب توڑنے کے لیے... حسب
 توقع فون کے اسکرین پر نظر آنے والا نمبر بدل گیا تھا۔ وہ
 جگہ بدل بدل کے فون کر رہے تھے۔ اگر ہم معلوم کرتے تو
 پتا چلتا کہ نمبر کسی بی سی ادا کا ہے۔
 "وہ جانتے ہیں کہ تجھے سب کا اعتماد حاصل ہے۔"
 انور کچھ دیر بعد بولا۔

"میں کوشش کروں گا کہ اس اعتماد پر پورا اتروں۔"
 میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگلی کال فوراً نہیں آئے گی۔
 ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔"
 ہم یوں گھر سے نکلے جیسے ایوان صدر سے صدر کی
 سواری نکلتی ہے۔ یہ سکندر کی احتیاط پسندی کا تقاضا تھا۔
 میں نے سب کو گیٹ سے باہر ہی روک دیا۔ ایک فور
 ویل ڈرائیو کے چار گارڈز ہماری گاڑی کے آگے چلتے
 رہے۔ میں اس کے حق میں نہیں تھا لیکن سکندر کے اصرار
 پر میں نے انہیں اجازت دے دی۔ راستہ وہی تھا جس
 پر میں ہار ہا سفر کر چکا تھا۔ وہ کوئی دونوں بھائیوں کی
 جاگیر کے درمیان کہیں واقع تھی۔

انور نے آدھے راستے میں کہا۔ "رمضان کا اور
 گاؤں والوں کا حال تو پوچھنا چاہیے۔"
 "اس کشت و خون کے قانونی معاملات سکندر شاہ سلجھا
 رہا ہے۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔
 وہ پرانی حویلی جن میں کبھی اکبر بادشاہ کی طرح
 شباب و شراب کی محفلیں سجاتا تھا آج دیران اور موٹہ جبریت
 بنی پڑی تھی۔ اس کو میرا قید خانہ بھی بنایا گیا تھا۔

انور اپنے چھوٹے بھائی کے شب و روز کا سارا احوال
 جانتا تھا اور اس کے لیے یہ جگہ نئی نہیں تھی۔ میرے تصور میں
 وہ روز و شب تھے جب شاہزادی ایک غلام سے ملنے یہاں
 آتی تھی۔ ایک رات کا خراج تو حام ہات تھی۔ ایک بار وہ دو
 دن گزار گئی تھی۔ معلوم نہیں اپنے گھر میں باپ کی نظر سے
 اوجھل ہو کے یہاں رہنے کا خطرہ وہ کیسے مول لیتی تھی اور

تشدد کر کے چہنیں سنا دیتے ہیں مگر تو فکر مت کر... آج کل
 میں کچھ اچھا ہو گا۔ اب امید پیدا ہو گئی ہے۔"
 "رات ہی رات میں کیا ہو گیا ایسا؟" انور نے
 پوچھا۔
 میں نے کہا۔ "میرے ساتھ چل... معلوم ہو جائے
 گا۔"

"جانا کہاں ہے؟" اس کی حیرانی بڑھ گئی۔
 "اکبر ایک پرانی حویلی کو عیاشی کے لیے استعمال کرتا
 تھا۔ وہیں جانا ہے۔" میں نے کہا۔
 وہ بولا۔ "کیا ہے وہاں؟"
 "راستے میں بتاؤں گا تو دیکھ لے گا۔"

سکندر اب تک خاموش تھا۔ اس نے کہا۔ "جہاں
 جاؤ، اکیلے مت جاؤ۔ مجھے کچھ قانون سے ممتا ہے اس سے
 فرصت ملے تو اپنے بندے ملبا اٹھانے پر لگاؤں۔ مشینری
 آجائے گی۔"

اس کی بات کھل ہونے سے پہلے روٹی نے دروازہ
 تھوڑا سا کھول کے چلنا شروع کیا۔ "فون..."
 ہم سب ایک ساتھ لپکے مگر ہمارے سینے تک تھکنی بند
 ہو گئی تھی۔ روٹی نے وہیں ہمارے سامنے ناشا گلواد پائے۔ ہم
 ضرورت سمجھ کے کھاتے رہے اور تھکنی کے انتظار میں نہیں
 بیٹھے رہے۔ یہ اعصابی کشیدگی کا اثر تھا کہ فون بجتا تو ہم سب
 چونک پڑے پھر انور کے اشارے پر سکندر نے ریسیور
 اٹھا لیا۔ "ہیلو، کون بول رہا ہے؟"
 اسپیکر میں آواز سنائی دی۔ "تم جانتے ہو۔" اس نے
 غرا کے کہا۔

"اچھا بولو، میں سکندر ہوں۔"
 دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تم کیوں آجاتے ہو بچ
 میں... ہر جگہ اپنی ٹھیکے داری..."
 "اچھا لو انور سے بات کرلو۔" سکندر نے ریسیور
 بڑھا دیا۔

"وہ نامعلوم کا نطفہ... ملک سلیم کہاں ہے، آئندہ
 بات اسی سے ہوگی۔"
 ریسیور میں نے لے لیا۔ "میں ملک سلیم ہوں۔"
 "دیکھ لومڑی کی اولاد... تو ہے بہت چالاک اور
 عیار... سب کو قابو کر رکھا ہے۔ مگر اس معاملے میں ہوشیاری
 دکھائی تو پینا بڑھیا کے کڑے ہی ملیں گے، ابھی تک تو آرام
 سے ہے۔"
 "اے آرام سے ہی رکھو، ماہیں تو سب کی سامجھی

اسے وہ بیگ دکھایا۔

یوریکا یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب یہی ہوتا ہے۔ میں نے پالیا۔ کہتے ہیں شہنشاہ نے کسی ستارے سونے کا تاج بنوایا تو سونے کے خالص ہونے کا پتا چلانے کی ذمہ داری ارشمیدس کو سونپی۔ اور مزاج شاہانہ کے مطابق حکم میں دونوں امکانات بیان کر دیے کہ کامیابی کا انعام اتنا ہی سونا اور تاج کی صورت میں موت۔ ارشمیدس ایسا کوئی طریقہ نہیں جانتا تھا۔ ایک دن وہ غسل کے لیے پانی کے ٹب میں اترتا تو کچھ پانی ٹب سے چھلک گیا۔ اچانک اس کے دماغ میں آنے والے خیال کے تحت اس نے پھر ٹب بھرا اور بار بار بھر کے اس میں لکڑی، لوہا، پتھر مختلف ہلکی بھاری چیزیں ڈالتا رہا۔ ہر بار ٹب سے چھلکنے والا پانی مختلف وزن کا ہوتا تھا۔ وہ ایک دم سمجھ گیا کہ اب سونے کے خالص ہونے کا پتا چل جائے گا اور اپنی اس سائنسی دریافت پر جسے آج ہم کثافت کہتے ہیں اتنا خوش ہوا کہ پڑے پہننا یاد نہ رہا۔ لوگوں نے اسے بازاروں سے محل کی طرف نکال بھاگتا دیکھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ یوریکا... یوریکا۔

واپسی کے سفر میں انور کو میں نے ان دواؤں کے بارے میں بتایا۔ ”ابھی صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ دوا میں انسان کی سوچ کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اس کی شخصیت بدل دیتی ہیں اور اس کی ذہنی مزاحمت صفر ہو جاتی ہے۔ وہ ہینا ٹائز کیے جانے والے شخص کی طرح دیہی کرتا ہے جس کا جھم ملے لیکن ہینا ٹائز کا اثر دقتی ہوتا ہے۔ ان دواؤں کا اثر رہتا ہے مجھے نہیں معلوم کتنا عرصہ۔“

”یہ سب شاہینہ نے بتایا ہوگا مگر کون سی دوا کس مقصد کے لیے اور کتنی استعمال ہوتی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ کوئی دماغ کا ماہر ڈاکٹر بتا سکتا ہے۔ وہ پاگل خانے میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور سول یا ملٹری اسٹیلی جنس اداروں میں خصوصی ٹریننگ رکھنے والا جس کو سی آئی اے کے جی بی نے ٹریننگ دی ہو۔“

”پاگل خانے سے تو پوچھا جاسکتا ہے مگر وہاں نہ ہوا تو؟ یہ نہ ہو پولیس یا ملٹری اسپتال پکڑ لے۔ یہ سخت ممنوعہ دوا ہیں۔“

”کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ خدا کرے یہ انجکشن دی ہوں۔ رتھ سیرم... سچ بلوانے کی دوا دانالے۔“ میں نے کہا۔

”تجھے یہ سوچیں کیسے؟“ اور بولا۔

”یار بڑے وقت پر سوچیں... مگر سوچنے سے کیا

کیوں پکڑی نہیں جاتی تھی۔ پرانے وقت کو میں حویلی کے اندر ایسے ہی دیکھ سکتا تھا جیسے یہ گزرے دن کی بات ہے۔ ایک بوڑھی خادمہ میری خدمت پر مامور تھی۔ مختلف کمروں میں جو کھلے ہوئے تھے عیش و عشرت کے کیا لوازمات تھے۔ میں نے کھلی ہوئی خالی اور بھری ہوئی دلائی جیتی قیمتی شراب کی بوتلوں کو ہر جگہ پایا تھا۔ شاہینہ نے بھی نہ خود پئی تھی اور نہ مجھے پلانے پر اصرار کیا تھا۔ اسے اس کی ضرورت ہی کہاں تھی۔ جو دوا وہ مجھے کھانے میں دے دیتی تھی اس کا اثر شراب سے کہیں زیادہ میرے بدن میں آگ لگاتا تھا اور ایک رات کے لیے میرا جسم اس کی خواہشات کے اشارے پر چلتا تھا۔

”یہاں کیا ہے؟“ انور نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

میں چوٹا۔ ”جس چیز کی مجھے تلاش ہے۔ اگر وہ مل گئی تو شام تک سب معلوم ہو جائے گا۔“

انور کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ مجھے مختلف کمروں میں جا کے الماریاں کھنگالتے دیکھتا رہا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں شاہینہ نے وہ سب دوا میں بعد میں یہاں سے ہٹانے دی ہوں یا کوئی اور انہیں نہ لے گیا ہو۔ وہ خطرناک دوا میں تھیں۔ انہیں عام دوا سمجھ کے استعمال کرنے والے کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ الماریوں میں اب بھی نقش تصویروں والے رسالے پڑے تھے۔ آدھے گھنٹے تک سب کچھ نکال کر دیکھ لینے کے بعد بھی مجھے مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تھا۔ میں نے کچن بھی دیکھ لیا۔ مریج سالوں کے ڈبوں میں بھی جھانک لیا۔

پھر مجھے ہاتھ روم کا خیال آیا۔ کچھ لوگ دواؤں کو جھنڈی جگہ رکھنے کے لیے فریج نہ ہونے ہاتھ روم کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ میری تلاش بار آور ہوئی۔ مجھے پرانے شیشیز اور کا سٹیکس کے ساتھ ایک کینٹ میں تقریباً ایک آٹھ انچ لمبا چار انچ چوڑا اور گہرا دیکسی نیشن کا بیگ ملا جو دیکھنے میں شیونگ کٹ لگتا تھا۔ میں نے زب کھولی تو اندر نہ ریزر تھا نہ شیونگ کریم اور آفر شیونز... اس کے اندر کچھ انجکشن تھے اور کچھ گولیاں مختلف رنگ کی۔ مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی خزانہ تلاش کرنے والوں کو اشرافیوں سے بھری تجوری مل جانے سے ہوتی۔

”یوریکا... یوریکا۔“ میں نے چلا کر کہا تو انور دوسرے کمرے سے آگیا جہاں وہ تصاویر سے دل بہلا رہا تھا۔

”یہ کیا شور ہے؟“ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ”میں نے پالیا۔ میں نے پالیا۔“ اور

وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ "کرکٹ کھیلنے کا بیس ہیں روپے کا ملتا ہے۔"

میں نے رقم گنی کر دی۔ "آج لے لیتا۔"
اس نے ٹوٹ پکڑ لیے بلکہ میرے ہاتھ سے چھین لیے۔
"بال مجھے کل مل گئی تھی۔"

میں نے کہا۔ "انہوں نے دلائی ہوگی جنہوں نے کہا ہوگا کہ مجھے قبرستان لے جاؤ، رمضان کے پاس۔"
"یہ تو کسی نے نہیں کہا تھا۔ تم نے پوچھا تو میں نے بتا دیا تھا۔"

مجھے مایوسی ہوئی۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا تھا کہ رمضان قبر میں لینا ہوا ہے؟"

"وہ تو میں چھپن چھپائی کھیل رہا تھا۔ پہلے بھی اس قبر میں چھپ جاتا تھا۔ اس دن رمضان پر کوڈ گیا تو بھاگا۔ ابا کو پتا چلا تو اس نے کہا خبردار جو پھر اُدھر گیا۔ وہ دونوں چڑی ہیں۔ قبرستان میں پڑے رہتے ہیں۔"

"دونوں کون؟" میں چونکا۔ "اس کا بھانجا اور وہ۔"
"وہ تو میرا کیا کب کا۔" بچہ خامسا ہا خبر تھا۔ "ابا نے کوئی کی بات کی تھی۔"
"کوئی کون؟"

"گلاب دین... سب گولی کہتے ہیں اور مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ بانس اٹھا کے چل پڑا۔

مجھے بیس روپے ضائع ہونے کا غم نہیں تھا۔ رمضان کا بھانجا نہ سہی گلاب دین کا لٹک ل گیا تھا۔ اس سے بعد میں پوچھا جاسکتا تھا کہ یہ کیا شوق ہے ان کا۔ وہ ضرور جانتا ہوگا رمضان کے بارے میں۔ میں واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔ مراد والی کی طرف سے گزرتے ہوئے انور نے گاڑی کا رخ خویلی کی طرف موڑ لیا۔ اب بھی وہاں دھوئیں سے کالی اینٹوں کے ڈھیر... جلے ہوئے شہتیروں اور آثارِ عبرت کے سوا کچھ نہ تھا۔ عارضی خیمہ لگائے انور کے نمک خور گارڈ کے ساتھ ایک چار پائی پر ایک پولیس مین جو خواب تھا۔ اس نے آرام کے لیے پتلون کی سیٹ ہی نہیں اوپر کے جٹن بھی ڈھیلے کر لیے تھے۔ ہڑ بڑا کے اٹھنے سے پتلون اس کے جوتوں پر گر گئی۔

انور نے گارڈ سے بات کی۔ "باقی لوگ کہاں ہیں؟"
"تین جل گئے تھے جناب عالی۔ ایک زخمی ہے۔ دن میں میری ڈیوٹی ہوتی ہے رات کو میرا بھائی آ جاتا ہے۔"

"میں نے بھی نظر رکھی ہوئی ہے جناب۔" پولیس مین

ہوتا... جب تک روٹی مجھے نہ بتاتی کہ دوا میں یہاں مل سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"فرض کر یہ وہی جادو اثر دوا میں ہیں۔ ایک سب سے اہم سوال یہ ہے کہ انہیں استعمال کون کرائے گا؟"
میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں اور کون۔"
"خواہ بندہ مر جائے؟" اس نے کہا۔

"چودھری صاحب! مجھے کوئی میڈیکل سائنس کی ڈگری نہیں لینی، کسی ڈاکٹر سے ان دو چار دواؤں کے بازارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔ اس سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ دوا میں کارآمد ہیں یا ان کی میعاد ختم ہو گئی۔ ایک چھوٹا سا مسئلہ درپیش یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر کون ہوگا اور کہاں ہوگا۔ تو جو زندہ یا بندہ... ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ ابھی آج کا پورا دن پڑا ہے ملان میں نہ ملا تو ہم لاہور جاسکتے ہیں۔"

"ایسا نہ ہو وہ میں پکڑوا دے۔"
"اب ایسے لاوارث اور گئے گزرے بھی نہیں۔ انصاف اور قانون کو خرید سکتے ہیں تو کیا ایک ڈاکٹر کو نہیں خرید سکتے۔ دنیا کے بازار میں سب برائے فروخت موجود ہے۔" تو بہت پُر امید ہے۔ چل دیکھتے ہیں۔ مجھے ماں جی کی طرف سے ڈر ہے سلیم۔"

"انہی کو بچانے کے لیے سارے جتن کر رہے ہیں۔ فکر مت کر، جتنی حفاظت ہم رانا کی کر رہے ہیں اس سے زیادہ وہ ماں جی کی کر رہے ہوں گے، ان کا مستقبل واڈ پر لگا ہوا ہے۔"

پھر آگے چل کر سے گزرتے ہوئے مجھے وہ بچہ نظر آ گیا جو مجھے قبرستان تک لے گیا تھا۔ جہاں رمضان ایک کھلی قبر میں مرا پڑا تھا۔ میں نے انور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ بچہ نہر پر پھلی پکڑنے والی ڈور کو ایک بانس کے ساتھ پانی میں لٹکائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ گھبرایا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ دن بارہ سال عمر کا خوب صورت اور بھولا بھالا بچہ تھا۔

میں نے کہا۔ "ڈرو نہیں۔ نام کیا ہے تمہارا۔"
"بادشاہ۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "بادشاہ، کبھی کوئی پھلی پکڑی؟"
اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "کل بھی دو پکڑی تھیں۔ ایک بہت چھوٹی... ایک بڑی۔"

میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ "یہ تمہیں مل سکتے ہیں اگر تم ایک بات بتاؤ۔"

نہیں کرتی مگر تعارف ہو جائے گا۔

”اور یہ جن ماہی کہاں دستیاب ہوگا؟“

اس نے ایک کاغذ کے پرزے پر ہٹا لکھ دیا۔ ”یہ باپ کی کوٹھی ہے۔ ایک کے اوپر خود رہتا ہے۔ اسی احاطے میں دوسری کسی وکیل کی ہے۔ دونوں سے اتنا کرایہ مل جاتا ہے کہ خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پھر بھی سب کچھ کرتا رہتا ہے۔ بے کار کام، صحافت، سوشل ورک، بچے بازی۔“
یہ نمونہ قابل دید ضرور تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم گلگشت میں اس کے دروازے پر کھڑے تھے۔ یہاں جدید کوفٹیاں سب بڑی تھیں۔ دو کنال اور چار کنال اور اس سے بھی زیادہ رقبہ والی۔ گیٹ بند تھا اور باہر کی سختی پر پتھل کے چمکتے حروف میں جن ماہی کے والد ماجد کا نام لکھا تھا۔ آفتاب گیلانی۔ گرد گرد ماگدا گورستان کی چھاپ ابھی تک اس پانچ ہزار سال پرانے شہر پر دیکھی جاسکتی تھی تاہم اب یہاں گیلانی، قریشی، گردیزی اور خاکوانی جیسے نام بھی شہر کی شناخت بن رہے تھے۔ کال بیل بجاتے ہی ایک سات فٹ قد کا۔۔۔ چکڑی اور ٹمٹلے کے ساتھ سوا آٹھ فٹ، خاص میاں والی کا چوکیدار کل آیا۔ وہ اتنا بدلتا تھا کہ سات فٹ کی لمبائی کے مقابلے میں اس کی چوڑائی سات انچ لگتی تھی۔ بلیشیا کی شلواریں اس کے اوپر اس کی کالی بھراری آنکھوں کے نیچے چہرے جتنی کڑک لو کدار مونچھیں مجھ بہار دکھا رہی تھیں۔

”جی حکم کرو۔“ جب وہ بولا تو اس کی آواز منجھکے خیز حد تک لرزتی ہوئی تھی یعنی موٹی پتل ہوئی رہتی تھی۔ بچ کا اتنا زیادہ فرق بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

”ہم..... جن ماہی سے ملنے آئے ہیں۔“

”جناب جن ماہی صاحب اس نے یوں دہرایا جیسے نام ہی پہلی بار سنا ہوا اور پھر غور کر کے بولا۔“ اس وقت قبرستان میں مل سکتے ہیں۔ وہ خود فوت نہیں ہوئے الحمد للہ..... کسی کو فوت کرنے..... میرا مطلب ہے دفن کرانے گئے ہیں۔“
”یہاں تو ہر قدم پر قبرستان ہے۔ پتا بتاؤ۔“ اور بولا۔

”پتا تو ہم کو بھی نہیں..... مگر جناب جن ماہی صاحب وہاں سے کھانا کھانے تشریف لائیں گے اور خاں لور کے ہوٹل جہاں دال خرائی ملتی ہے۔“
بالآخر ہم دال خرائی کے شہرہ آفاق ٹھکانے کا پتا معلوم کرنے میں کامیاب رہے اور جب وہاں پہنچے تو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ خود بھی دال خرائی کھا کے جن ماہی کے آنے کا

بیلٹ ہاتھ کے بولا۔

”کس کس پر تمہارا پ یہاں کیا کام ہے؟“ اور

نے ناگواری سے کہا۔

”وہ جی، حکم ہے تفتیش چل رہی ہے ابھی۔ کوئی متعلقہ

فریق ادھر نہ آئے۔“ کا فٹیل بولا۔

”میرے نزدیک تم خود غیر متعلقہ فریق ہو۔“ اس نے گارڈ کو کچھ اور لوگ بلانے کی ہدایت کی جو ہر طرف سے نگرائی کریں اور کوئی مشکوک آدمی نظر آئے اس پاس منڈلاتا تو اسے پکڑ لیں۔

یہ کچھ بھی نہیں تھا، محض رسمی کارروائی۔ اپنی گمشدہ جنت کی باز دید... عسکرت رفتہ کے آثار پر ایک نظر جو آب نشان عبرت بنے ہوئے تھے۔ سکندر نے کہا تھا کہ جب وقت ملے گا اس طبع کو صاف کرا دیا جائے گا پھر بھی اس کی جگہ کوئی اور عمارت لے گی۔ اس نقش کہن کے ساتھ پرانے وقتوں کے سب آثار مٹ جائیں گے۔ وقت خواب و خیال اور انسان کہانیاں ہو جائیں گے۔ یہ گاؤں تھا چنانچہ ابھی تک عمارت کی لاش کو نوچنے والے گدھے نہیں آئے تھے۔ شہر ہوتا تو راتوں رات طبع سے حویلی کا قیمتی اسباب کھود کر نکالنے والے آجاتے۔ وہ سب جو زیر استعمال تھا اندر ہی دفن تھا۔ لوگ جلی ہوئی کھڑکیاں دروازے نہ چھوڑتے اور پھر بھی کوئی لوٹس نہ لیتا تو اینٹیں تک لے جاتے مگر یہاں اس کا امکان نہ تھا۔

یہ اتفاق تھا کہ سکندر شاہ ہمیں گھر پر ہی مل گیا۔ وہ کوئی معاملہ نمٹا کے آیا تھا اور پھر ایسے ہی کسی کام سے جا رہا تھا کہ رک گیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”کل آپ لے کسی ذہین اور نوجوان پولیس افسر کا ذکر کیا تھا۔“

”آفریدی، ملتان میں ایس پی ہے۔ ذہین ہے اور بھروسے کا آدمی ہے۔ کیا کام ہے اس سے؟“

میں نے اسے کام کی نوعیت کم سے کم الفاظ میں بتائی۔ ”اگر وہ کچھ مدد کر سکے۔“

”مل کے دیکھ لو۔ قائل ہو گیا تو جو کر سکتا ہے کرے گا۔ وہ میرے ایک دوست کے بیٹے کا دوست ہے۔“

”اور دوست کا بیٹا کون ہے، کیا کرتا ہے؟“

”یہ پوچھو وہ کیا نہیں کرتا۔ ملو گے تو اندازہ ہوگا۔ ماں باپ نے لاڈ میں نام رکھ دیا تھا چائن دین... جن ماہی مشہور ہے۔ اس کے حوالے سے جاؤ گے یا اسے ساتھ لے کر تو فائدہ ہوگا حالانکہ بندہ آفریدی بھی کھرا ہے۔ سفارش کام

انتظار کریں۔ ہوئی مالک ہذا نے اپنی پلسی کے لیے سائن بورڈ پر خود اپنی تصویر بنوائی تھی یا بنائی تھی۔ کیونکہ اس تصویر میں ہال دیپ کنار جیسے ماتھے پر آئے ہوئے تھے مگر صاحب تصویر کا سر کاؤنٹر پر لگے بلب کے نیچے دوسرے بلب کی طرح روشن تھا۔ نور خاں نور کا نام اتنا غیر موزوں بھی نہیں لگتا تھا۔ پریشان میں اس خیال سے تھا کہ وہ گینڈے کے وزن کا بغیر گردن والا کہیں شاعر نہ ہو۔ شاعری کا وائرس تشویش ناک رفتار سے پھیل رہا تھا اور اس کی روک تھام کا کوئی دیکا بھی نہیں تھا۔

میں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جن مامی کی آمد ہوئی تو جیسے بگل بج گیا۔ کاؤنٹر سے پہلی صدا بلند ہوئی۔ ”اؤئے خیر ہووے جن مامی جناب، آج سواری کدھر لکل گئی تھی؟“ جس شخص کو جن مامی کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا وہ لے لیے بالوں والا دراز قد گورا اور خوب صورت نوجوان تھا جس کی مسکراہٹ روشن تھی۔ اس نے جینز کے ساتھ خاکی رنگ کا لمبا سا کرتہ پہن رکھا تھا۔ ابھی وہ نور خاں نور سے کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ میں اس کے پاس جا پہنچا۔

”میں بہت دور سے ملنے آیا تھا اور بہت دیر سے بیٹھا ہوں یہاں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے سکندر شاہ نے بھیجا ہے۔ وہ آپ کے والد آفتاب گیلانی کے دوست تھے۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”کسی حوالے کے بغیر بھی آپ آسکتے تھے۔“

وہ ہمارے ساتھ آ بیٹھا اور اس کا لچ دہیں سر دیکھا گیا۔ تعارف ابھی مختصر اور محدود رہا۔ میں نے براہ راست کہا۔ ”ایک کام میں آپ کی مدد درکار تھی۔ کام ہے ایس پی آفریدی سے۔“

وہ لٹی میں سر ہلانے لگا۔ ”سفارش تو وہ باپ کی نہ مانتے۔“

”تم سفارش نہیں، تعارف کرا دو۔ تمہاری شہرت ایک سوشل ورکر کی بھی ہے۔“

”شہرت؟“ وہ ہنسا۔ ”بدنام گروہوں کے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اس کو بہت سے لوگ کہتے ہیں پنگا لینا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ انسانی مسئلہ ہے۔“ انور بولا۔ ”کچھ لوگ میری ماں کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ میری خاندانی حویلی کو بم سے اڑا کے..... اور اب تادان مانگ رہے ہیں۔“

”بے شک یہ پولیس کیس ہے۔ میں مانتا ہوں۔ اسی علاقے کا ہے تو آفریدی کو پتا ہوگا۔“ وہ جیسے قائل ہو گیا۔

جو ادھر آدھے گھنٹے بعد ہم ایس پی آفریدی کے آفس میں تھے۔ حالات کی مدد شامل حال لگتی تھی کہ اس نے ہمیں براہ راست آفس تک پہنچا دیا۔ میں ذہنی طور پر پوری تیاری کر چکا تھا کہ مجھے اپنا کیس کیسے پیش کرنا ہے۔ آفریدی نے مراد داں والی کے چودھریوں کی حویلی کے بم سے اڑائے جانے کی خبر سنی تھی۔ ”اس سے پہلے وہاں کوئی درگاہ تباہ ہوئی تھی۔“ وہ اپنے علاقے سے باخبر تھا۔

”وہ ڈاکوؤں کا کام تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور وہاں کے مرشد انور کے بتایا تھے۔ واردات میں ان کی بیوی اور بیٹی بھی ہلاک ہوئی تھیں۔“

”میں نے سنا تھا کہ یہ کام ڈاکو کا رستم نے کیا تھا کچھ اس کے حریف کا نام لے رہے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”خرابی اس کے بعد یہ ہوئی کہ وہ مرید جو درگاہ پر دس قسم کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی دھندے کرتے تھے درگاہ کو نئے سرے سے کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ اس کی اجازت نہ انور نے دی اور نہ خاندان کی وارث باقی رہ جانے والی ایک لڑکی نے۔“

اس نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا۔ ”وہ تو دشمن ہو گئے ہوں گے؟“

”یہی بات ہے۔ انہوں نے انور کی حویلی کو بم سے اڑایا اور اس کی بوڑھی ماں کو ساتھ لے گئے۔ اب پولیس تو چلتی ہے ضابطے کے مطابق اور ابھی تک نتیجہ ہے صفر..... مگر ایک بندہ ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ جو ان کا سرغنہ تھا۔“

”اسے یہاں لے آؤ، یا ہم منگوا لیتے ہیں۔“ آفریدی نے کہا۔

”ہم سے اس کی رہائی کا سودا کیا جا رہا ہے۔ اسے چھوڑ دو تو انور کی ماں واپس آجائے گی۔ لیکن تفتیش میں اس نے کچھ نہیں اگلا حالانکہ آپ کے بھی سمجھنے کے دو پرانے تفتیش کرنے والے تھے۔“ میں نے ان دونوں کا نام بتایا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ ”پھر آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”تشدد کے بجائے اسے بڑھ سیرم دیا جائے تو وہ سچ بولنے پر مجبور ہوگا۔“

ایس پی دم بخود رہ گیا۔ ”آپ نے یہ نام سن لیا ہے کہیں سے..... پولیس ابھی اتنے ماڈرن اور سائنٹیفک طریقے استعمال نہیں کر سکتی۔“

”میں یہ جانتا چاہتا تھا کہ یہ طریقے کون استعمال کر

تے ہیں۔“

”میں نے کہا۔“

”میں نے جانتا چاہتا تھا کہ یہ طریقے کون استعمال کر

جاسوسی ڈائجسٹ

میں اس نے کچھ مریضوں پر تجربے کیے تھے۔ وہ کیا تھا غالباً ایف آر سی ایس کرنے..... وہاں کسی ریسرچ میں شریک رہا اور ایک جرنل ڈاکٹر سے اس کی دوستی ہو گئی۔ دونوں کی دلچسپی ایک ہی موضوع پر تھی۔ دماغ کی سوچ بدلنا..... جس سے دماغ کا علاج ممکن ہو۔

چن مائی نے سر ہلایا۔ ”کوئی کتاب لکھ رہا ہے وہ یا لکھ رہا تھا..... برین واشنگ پر؟“

”آپ جانتے ہیں تو ہم ان سے مل لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن آفریدی صاحب! اس ریٹائرڈ دماغ کے ڈاکٹر اور آپ کے درمیان شناسائی کا سبب کیا ہے؟“

”یہی کہانی ہے۔ پہلے جہاں ہم رہتے تھے لاہور میں..... وہاں ایک خاتون میری خالہ بنی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر انہی کا شوہر ہے۔ جب بھی ای سے ملتی ہیں تو انہی کے قصے کہتی ہیں، پانگوں میں رہتے رہتے خود پاگل ہو گئے ہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی پانگوں سے جان نہیں چھوٹی۔ اپنا نفسیاتی کلینک چلاتے ہیں۔“ آفریدی نے بتایا۔

آدمی گھٹنے میں ہم ڈاکٹر میٹشل کے گھر میں تھے۔ گھر کی حالت کوئی بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ڈرائنگ روم کا فرنیچر بھی پرانا تھا۔ پرانے وقتوں کے ایک اسپیشلسٹ کی ایسی مالی حالت غیر متوقع تھی۔ آج گل کے اسپیشلسٹ تو دولت مند مریضوں اور مہنگی دوائیں بنانے والی ملٹی میڈیسن کمپنیوں کی مدد سے لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ گھر میں کوئی نوکر بھی نہیں تھا۔ ان کی تیس چالیس سال ساتھ چلی ہوئی شریک حیات نے وردہ کھول کے ہمیں بٹھا دیا تھا جیسے پاگل خانے میں ڈاکٹر اور عملہ سب پاگل نظر آتے ہیں۔ وہ بھی مجھے کچھ ایسی ہی لگیں۔

ڈاکٹر کو دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ وہ اپنی عمر سے بہت کم چہرے مہرے اور چلیے سے بھی پرانا بوڑھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے بال بہت گھنے اور سفید تھے اور بڑے سلیقے سے پیچھے ہٹے ہوئے تھے۔ اس نے سرخ شرٹ کے ساتھ گرے پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ ہاتھ ملا کے بیٹھ گیا۔

”آپ اس مریض کو دکھانے آئے ہیں؟“ اس نے چن مائی کی طرف دیکھا۔

چن مائی مسکرایا۔ ”یہ آپ کی شہرت سن کر آئے ہیں۔ آپ برین فنکشن کنٹرول پر کوئی تحقیق کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ ہیومن لی بیویٹر کو متاثر کرنے والی دواؤں پر کسی جرنل سائنسٹ کی مدد سے مل کر ریسرچ کر رہے تھے۔“

سکتا ہے۔ انجکشن اور دوا میں میرے پاس ہیں مگر میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔“ وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ ”مگر یہ ممنوعہ دوا میں ہیں۔“

”سرکار! آپ کس کو اپریس کر رہے ہیں آخر اپنے اس دلاہتی قانون سے۔“ چن مائی بولا۔

”یہ پاکستان کا قانون ہے۔“ چن مائی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہی نا جو گورے ہٹا گئے تھے۔ جو پہلے یوز ہوتا تھا تو کالے حاکم اسے مس یوز کر رہے ہیں۔“

”چن مائی! یہاں اس وردی میں اور اس آفس میں بیٹھ کے تو میں کہہ نہیں سکتا کہ قانون کوئی نہیں، جو جی چاہے کرے۔“

”ایس پی صاحب! سارا مسئلہ وقت کا ہے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے ورنہ یہاں نہ سہی لاہور، کراچی کہیں تو ہمارے مطلب کا آدمی مل ہی جائے گا۔“ انور بولا۔

میں نے کہا۔ ”آپ کا کہنا بجا کہ ایسی دوا میں ممنوعہ ہیں۔ لیکن ایک تو لانے والا کوئی اور..... جو زندگی بھر استعمال کراتے رہے ان سے کسی نے نہیں پوچھا۔ یہ بھی نہیں بتا کہ انہوں نے کتنے بندے مار دیے، ہر دوا بنائی جاتی ہے کسی مرض سے شفا کے لیے مگر استعمال ہوتی ہے دوسروں کی جان سے کھیل کر اپنی جگہ بھرنے کے لیے..... اس درگاہ پر بھی ہوتی رہی اور خود قانون اس لا قانونیت میں شریک رہا۔“

ایس پی نے نگلی سے کہا۔ ”بتانا میرا فرض ہے۔ کیا پولیس اور کیا دوسرے محکمے مجھے سب کی لا قانونیت کا علم ہے مگر اسے میں جائز نہیں کہہ سکتا۔“

”زہر اگر تریاق کے طور پر استعمال ہو تو اجازت ہوتی ہے۔“ چن مائی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی قاتل کے منجر سے کسی مریض کو سیب کاٹ کے دیا جائے۔“

”اوکے، اوکے..... مجھے پتا ہے بحث ہوگی تو میں ہار جاؤں گا۔ لاہور کے میٹشل اسپتال میں ایک ڈاکٹر تھا جو ریٹائر ہونے کے بعد یہیں ہے ملتان میں۔“

چن مائی کے کان کھڑے ہوئے۔ ”ڈاکٹر میٹشل..... جس کا اصل نام ڈاکٹر اشفاق ہے؟“

”وہ خود میٹشل نہیں ہے۔ پاگل خانے میں رہنے کی وجہ سے نام پر گیا ہے۔ اس کو کچھ معلوم ہے۔ پاگل خانے

جواہر

انور نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہم جو بھی کر سکتے ہیں، ضرور کریں گے۔“

”تم پڑھے لکھے لوگ ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو گے کہ غیر قانونی کام سب کرتے ہیں مگر اس کی ایک قیمت لیتے ہیں جس سے یہ نہ کرتا مگر مجبوری یہ ہے کہ مجھے کم سے کم ایک بار جرمنی جانا ہے، تم لوگ میری بات سمجھ رہے ہو؟“

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”بہت اچھی طرح ڈاکٹر صاحب۔“

”میں صرف ریسرچ کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں کہ مجھے جرمنی پسند ہے اور پاکستان پسند نہیں۔ یہ تعلیم کا سلسلہ ساری عمر ختم نہیں ہوتا اور اگر میں نے کوئی مفید کام کیا۔ یہاں تو سہولت بھی نہیں، تو وہ کس کے کام آئے گا؟ صرف میرے۔۔۔ میرے کو لیگ مذاق اڑاتے تھے کہ میں تو بل پر اترے لوں گا۔ کیا یہ بری بات ہے؟ اور تو بل پر اترنے سے کیا صرف مجھے فائدہ ہوگا۔ میرے ملک کا نام روشن نہیں ہوگا۔ اس کے بعد تحقیق کے نتائج سے ساری انسانیت کو فائدہ ہوگا جو ذہنی امراض میں مبتلا ہیں۔“

شاید وہ جینکس تھا اور جینکس سب پاگل ہوتے ہیں۔ یہاں لوگ مذاق اڑاتے ہوں گے کہ پاگل خانے میں رہ کر وہ پاگل ہو گیا جیسے پاگل پن کوئی چھوٹا مرض ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا موجود ایڈیسن بچپن میں مرضی کے انڈوں پر بیٹھ گیا تھا کہ اکیس دن بعد بچہ نکل آئیں گے۔ حاضر کا سب سے بڑا سائنس دان آئن اسٹائن ایک عالمی کانفرنس کی صدارت کے لیے جا رہا تھا تو بیوی نے بہت سمجھا کے موزے اور ٹائیاں رکھے تھے لیکن وہ واپس آیا تو دونوں بیروں میں موزوں کا رنگ الگ تھا اور ٹائی منہ لکھ خیز انداز میں گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔

”تم سوچ میں پڑ گئے، زیادہ مانگ لیا میں نے؟“

میں چونکا۔ ”نہیں سر، ایسا نہیں۔ آپ ابھی چل سکتے ہیں؟“

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ”گو یا تم بندوبست کر دو گے میرے جرمنی جانے کا؟“

راستے میں وہ ہمیں بتاتا گیا۔ ”ایک بار میں جرمنی پہنچ گیا تو مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ میرے لیے سب انتظام ہو جائے گا۔ کچھ لوگ ہنستے ہیں کہ اب کیا فائدہ۔۔۔ مگر کام تو کام ہے۔ اس میں دیر بھی ہو جاتی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کام ہی چھوڑ دیا جائے۔“

”آپ نے اس وقت کوشش کیوں نہیں کی؟ جب

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”وہ ناممکن ہے یہاں۔ وہ مجھے جرمنی بلا رہا ہے ابھی میں کسی سے کچھ شیئر نہیں کر رہا ہوں۔“

ترپ کے پتے کی طرح میں نے جیب سے دوا میں نکالیں اور ڈاکٹر اشفاق کے سامنے رکھ دیں۔ اس نے پیکٹ اٹھا کے ایک ایک دوا نکالی اور اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہو چکی تھی۔ ”یہ کون استعمال کرتا ہے یا کراتا ہے؟“

”کوئی کبھی نہیں۔ اور استعمال کسی کو بھی نہیں آتا۔“

انور نے کہا۔

”پھر یہ تمہارے پاس کیسے؟“ وہ ہم سب کو دیکھتا رہا اور ان کی الگ الگ صفات بتاتا رہا۔

میں نے کہا۔ ”آپ تو ان کا استعمال جانتے ہیں؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”میری تو فیملی ہے۔ پھر یہ عام استعمال کی چیز نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میں ڈاکٹر ایکٹ اور مختصر بات کروں گا۔ یہ میرا دوست انور ہے۔ اس کی عمر سیدہ ماں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اغوا کرنے والوں کا ایک بندہ ہمارے ہاتھ لگا ہے مگر وہ کچھ بتاتا نہیں۔ پولیس کے تربیت یافتہ تفتیش کاروں نے بڑی محنت کی۔ اسے سب معلوم ہے مگر زیادہ تھوڑا ڈگری کا استعمال کیا تو وہ مر جائے گا پھر ہمارے پاس کوئی کلید نہیں رہے گا۔“

اس نے ایک انجکشن اٹھایا۔ ”تم اس سے سچ اگلوانا چاہتے ہو؟ اس کی مدد سے؟“

”ظاہر ہے۔ پولیس پر بھروسہ نہیں۔ کام جلدی کا ہے۔“

”یہ اچھا تجربہ ہوگا۔“ اس نے جیسے خود سے کہا۔

”جب وہ سچ کہے گا۔ اس کے نتائج میرے لیے اہم ہیں لیکن وہ خود کہاں ہے۔ اگر تم اسے لے آتے۔“

”یہ تکلیف آپ ہی کریں گے۔ اس کی نہیں ہم آپ کو منہ مانگی دے سکتے ہیں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”منہ مانگی؟ بات یہ ہے کہ ساری عمر مجھے صرف تنخواہ ملی۔ باقی ڈاکٹر رینار ہوتے ہیں تو اپنی پرنکٹس کرتے ہیں۔ یہاں نفسیاتی علاج کرانے کو کون آتا ہے۔ لوگ ماں باپ کو جان چھڑانے کے لیے آخری عمر میں کسی پاگل خانے کے حوالے ضرور کر آتے ہیں۔ تم میرے گھر کی حالت دیکھ رہے ہو؟ اور بھی اسپیشلسٹ دیکھے ہوں گے تم نے جو باہر سے ڈگریاں لے کر آئے۔“

جان لیتے ہیں یہ دماغ کو کہتے ہیں۔“
روبی نے متانت سے کہا۔ ”اگر دماغ ہو۔“
میں نے کہا۔ ”اسی لیے خواتین کو نہیں دیکھتے۔“
پھر ہم پروفیسر کو اندر لے گئے۔ اندر نہ سکندر شاہ تھا
اور نہ انور۔

”فون آیا کسی کا؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور چلی گئی۔ میں نے بہتر
سمجھا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر کو اس
کیس کی دیگر تفصیلات بھی مہیا کر دوں۔ وہ دلچسپی سے سنتا
رہا۔ اس کے نزدیک یہ کیس ہسٹری تھی۔ کوئی فون ریسیو
ہونے کی اطلاع نے انور کو مضطرب کر دیا تھا۔ اسی وقت
ریشم دوڑتی ہوئی آئی۔ فون کال موصول ہوئی تھی۔

فون سیٹ گزشتہ رات سے سکندر کے ہیڈ روم میں
تھا۔ انور لپکا تو ریشم سے ٹکرایا۔ جھنجھلایا۔ ”تم کہاں راستہ
رو کے کھڑی ہو۔“ اور اسے پشیمان پریشان چھوڑ کے نکل
گیا۔ کہاں کے رسم و رواج کی پابندی اور کہاں کے
جذبات۔ اس نے تو شاید یہ بھی نہیں دیکھا ہوگا کہ ٹکرائے
والی ریشم ہے۔ وہ بسورتی ہوئی لوٹ گئی۔
تھوڑی دیر بعد وہ بدحواس لونی۔ ”وہ فون انہوں
نے لے لیا ہے۔“

”کس نے؟“ میں نے پوچھا۔

”مراؤ کی ماں نے۔“ کہتی ہے مراد کا فون ہے۔ ہاتس
کر رہی ہیں معلوم نہیں کیا۔“

”انور سنبھال لے گا ماں کو۔“ میں نے کہا۔

”وہ نہیں سن رہی ہیں اس کی۔ انہوں نے کہا ہے کہ
آپ ماں جی کو زبردستی لے جائیں۔“

یہ بڑی عجیب صورت حال ہو گئی تھی۔ نہ چاہنے کے
باوجود میں گیا۔ ادھر ایک بیٹے سے پھڑکی ماں کے جذبات
کی دیوانگی تھی۔ دوسری طرف ایک خطرناک مجرم..... ان کے
درمیان کیا بات ہوگی۔ لیکن وہ بڑی متانت سے مصروف
گفتگو تھیں اور دونوں طرف سے سوال جواب ہو رہے
تھے۔

”اماں کس سے بات کر رہی ہیں؟“ میں نے
پریشان صورت انور سے پوچھا۔

”یار کچھ بتائیں، کال اسی کی تھی۔“ وہ بولا۔

”یہ کیسے معلوم ہوا؟ ریشم کو کیا پتا؟“

”یار میں نے پوچھا ہے اس سے..... اس نے کہا
کوئی مرد تھا۔ بہت بدتمیزی سے بات کر رہا تھا، وہی ہوگا۔“

آپ سر دس میں تھے؟“
”مجھے بھر دکر شیش سے ٹھنٹا نہیں آتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم
کے دھینے تھے مگر ٹیلی ہیلتھ..... دل، جگر کے امراض، زنانہ
امراض، دماغ کی کسے پر دا ہے۔ سارا ملک پاگل کہتا ہے
ایک دوسرے کو، اور میں بتاؤں رشوت نہیں لی میں نے۔“
میں نے افسوس سے اس پرانے وقتوں کے شریف
آدی کو دیکھا۔ ”آج کے زمانے کے معیار پر آپ بے
وقوف ہیں۔“

وہ اداس ہو گیا۔ ”بہوی بھی ایسا ہی سمجھتی ہے اور
بچے..... وہ تو کہتے تھے کہ ملتا ملاتا کچھ نہیں۔ ہماری بدنامی
مفت میں ہوتی ہے کہ باپ پاگل خانے میں ہے۔ ان سب
کو بڑھا لکھا کے اس قابل کر دیا میں نے کہ آج کچھ چین کی
زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر ایسے دور دور رہتے ہیں جیسے میں
سچ پاگل ہوں۔“

وہ مجھے راستے بھران دواؤں کے خواص کے بارے
میں بتاتا رہا۔ سب نہیں تو اس کا کچھ حصہ میں پہلے سے جانتا
تھا اور مجھے یہ بتانے والی کوئی ڈاکٹر نہیں ایک عام عورت تھی
جو زیادہ پڑھی لکھی تھی اور نہ کسی پاگل خانے کے طریق علاج
سے واقف مگر اس نے بہت کچھ جان لیا تھا جو عام نہیں تھا۔
میرے دماغ میں امید کی ایک کرن تھی کہ شاید نے باپ
سے سیکھا، باپ نے بھی تو کسی سے سیکھا ہی ہوگا اور وہ
پاکستان میں ایک ہی آدی نہیں ہو سکتا۔ دماغ کا معاملہ ہے تو
ڈاکٹر الگ ہوتا ہے سرجن الگ۔ ڈاکٹر مجھے ملتان میں ہی مل
گیا تھا۔ لاہور، کراچی میں بھی مل جاتے۔ یہ الگ بات ہے
کہ وہ ساتھ نہ آتے۔

مراد مگر کی طرف مڑنے والی سڑک روشن تھی۔ ڈاکٹر
نے مضامات سے اتنی دور کی کوئی آہادی نہیں دیکھی تھی۔
یہاں تو جنگلاتی رات جنگل میں منگل کا سا پیش کرتی تھی۔
ایسی چکا چوند پیدا کرنے کا ایک مقصد ہیلتھ تھا۔ سکندر شاہ کا
پہلا پروجیکٹ ایسا تھا تو اس کے بعد والا کیسا ہوگا۔ جب وہ
نئی اسٹیم اناؤنس کرے گا تو جنگل کرانے والے قطار بھی
بنائیں گے۔ یہ بلڈرز کی اسڑی ہے۔ چکا چوند پیدا کرنا۔
صرف روشنیوں سے ہی نہیں، گل و گلزار سے رنگوں اور
آسائشوں کے فریب نگاہ سے، کیا ہے جو یہاں نہیں ہے، آؤ
آؤ۔

گھاڑی مین گیٹ کے سامنے رکی تو سورج غروب
ہونے کو تھا۔ ریشم اور روبی نے دلچسپی اور تجسس کے ساتھ
پروفیسر کو دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”جیسے اللہ والے دل کا حال

جہاں وہ

وہ جذباتی عدم توازن کا شکار تھی۔ تو ذرا پیچھے تو دے تھیں۔
مضرب سے ساز..... اسے زندگی اور خوشی کے لیے بہانہ
درکار تھا۔ جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ کسی تذبذب کے بغیر
اپنی بہو کو شادی کے پکڑوں میں دیکھا تو مان لیا کہ سب کچھ
ویسا ہی ہے۔ درمیان میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور اب وہ اسی
جھوٹ کے کھیل میں خوش اور مطمئن تھی کہ مراد زندہ ہے۔
دوسری طرف سے ایک عیار دشمن کو بہانہ مل گیا تھا۔ مراد کی
ماں کون سا فون پر انور کی ماں کی آواز پہنچاتی تھی۔ شاید
دوسری طرف سے کوئی عورت دشمن کے اسکرپٹ اور
ہدایات کے مطابق بات کر رہی تھی۔ وہ انور کی ماں نہیں تھی
مگر مراد کی ماں نے مان لیا تھا۔

یہ بات سمجھ میں آنے کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا
آسان ہو گیا۔ انور نے بریکٹ سے تار الگ کر دیا۔ میں
اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مراد کی ماں اب مایوسی سے
خاموش ریسیور تھا۔ بیٹھی تھیں۔ ان کی گفتگو کا سلسلہ شاید
وہ منٹ جاری رہا تھا۔

”ماں جی کیسے ہو سکتی ہیں اتنی نارمل؟“ انور نے کہا۔
”یہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے تھا۔ تو
کہتا کہ ان سے بات کراؤ۔ اب وہ کہے گا کہ بات ہوئی تو
تھی، مجھے بھی یقین ہے کہ یہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی
گئی۔“ میں نے کہا۔

”مگر اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”کیا مطلب؟“

”وہ ماں جی سے بات کرا سکتا تھا۔ نہ چاہنے کا مسئلہ
ہے یہ یا ان کے نہ ہونے کا؟“

میں نے کہا۔ ”خواتین پریشان مت ہوں۔ اس سے
پھر بات ہوگی تو کنفرم کر لیں گے۔“

ڈاکٹر نے پچاسویں بار گھڑی دیکھی اور دسویں بار کہا
کہ دیر ہو رہی ہے۔ اسے جانا بھی ہے۔

”سوری، وہ بیچ میں دوسرا معاملہ آ گیا۔ آپ آئیں
میرے ساتھ۔“ انور نے کہا۔

میں اس کا مختصر بیگ لیے پیچھے چلا۔ باہر نکل کے ہم
سیدھے ہاتھ کی طرف اور پھر پیچھے گئے جہاں سے زینہ نیچے

تہ خانے میں جاتا تھا۔ ڈاکٹر نے قلعہ نما رہائش گاہ کے حفاظتی
انتظامات اور اس کی وسعت اور شان و شوکت کو بہت

مرعوب ہو کے دیکھا۔ میرا دماغ اس نئی الجھن میں گرفتار تھا
جو انور اور مراد کی ماں کے درمیان مکالمے سے پیدا ہو گئی

تھی۔ مراد کی ماں سے کچھ پوچھنا لا حاصل تھا۔ وہ اپنے

ریسیور اماں سے چھینا نہیں جاسکتا تھا۔ انور نے
واجبی سی کوشش کی مگر وہ ریسیور کو مضبوطی سے تھامے رہیں۔
”تو جایہاں سے..... ابھی میں بات کر رہی ہوں۔“

”اماں مہری کال مکی۔“ وہ بے بسی سے منمنایا۔ اس
صورت حال پر ہنسی بھی آتی تھی۔

اماں بیڈ کے آخری کنارے پر چلی گئی تھیں اور
انہوں نے ریسیور کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ چھینا
جھپٹی میں تار ٹوٹا یا فون..... کچھ دیر بعد میں نے گفتگو پر غور
کیا اور بھونچکا رہ گیا۔

میں نے کہا۔ ”انور! بات تیری ماں سے ہو رہی ہے۔“
سبے یقینی کے ساتھ خوشی حیرت اور اطمینان کے جذبات
انور کے چہرے پر پھیل گئے۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری طرف سے انور کی
ماں ہی جو گفتگو تھی۔ وہ ایسے بات کر رہی تھیں جیسے کال
مراد اداں والی سے مراد مگر کی گئی تھی۔ ان کے درمیان پہلے
حوالی کے رشتوں پر بات ہوتی رہی۔ دونوں طرف سے اس
پرائسوس کا اظہار کیا گیا۔ پھر بات زمانہ حال پر آ گئی کہ چلو،
جو ہوا سو ہوا۔ آکے کی بات کرو۔ بات پہنچی ریسم کی انور سے
شادی پر اوردے پایا کہ اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

صورت حال یکھت بدل گئی تھی۔ ہم بات کرتے تو
انور کی ماں کی خیریت ہی دریافت کرتے۔ اس کا ثبوت مل گیا

تھا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ ہم سے بات کرنے والے نے جب
اماں کی آواز سنی ہوگی تو اس کے دماغ نے ایک چال چلی۔

اس نے انور کی ماں اور مراد کی ماں کی بات کرا دی۔ دوسری
طرف سپویشن نہ جانے کیا ہوئی۔ ادھر تو ہمارے قبضے میں فون

ہی نہیں آیا تھا۔ سنا کی دینے والی آواز کے بارے میں سو فیصد
یقین کے ساتھ کہنا مشکل تھا کہ وہ انور کی ماں تھی۔ وہ اتنی

چر سکون کیسے ہو سکتی تھی اور بالکل نارمل طریقے سے بات کیسے
کر سکتی تھی۔ یہ کسی اجنبی جگہ پر ان کی قید کا دوسرا ون تھا۔ ان کو

اپنے گھر سے نکل کے جانا پڑا تھا۔ شاید انہیں یہ بھی علم ہو گا کہ
ان کی وہ حویلی جو خاندانی وقار کی علامت تھی، جہاں وہ

رخصت ہو کے آئی تھیں اور زندگی گزاری تھی۔ وہ تہاہ ہو چکی۔
ان کو انور کی طرف سے بھی شک کرنا چاہیے۔

ایک دم میرے ذہن نے یہ ڈراما مسترد کر دیا۔ میں
نے اس کی وضاحت انور سے بھی کر دی جو خود اب شکوک میں

جھتا تھا۔ ”یہ ان کا فراڈ ہے نہ جانے دوسری طرف کون عورت
ہے۔ وہ بریف کیے ہوئے جوابات دے رہی ہے۔“

ادھر میں سکندر کی بیوی کو پاگل تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن

عملوں کی دنیا میں زندہ تھی حقیقت سے اس کی دوری خود اس کے حق میں ہی بہتر تھی اور ہمارے لیے بھی..... لیکن اس غیر متوقع نکتہ کو نے میرے دل میں بھی بہت سے اندیشوں کو جگا دیا تھا۔ انور کے سوال کا میرے پاس بھی جواب نہ تھا کہ اس ڈرامے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

اگر خدا نخواستہ قید کی سختی..... کسی اچانک بیماری یا محض صدمے سے انور کی ماں نہ رہی تو پھر اس سب تک و دو کا حاصل کیا جو ہم کر رہے تھے؟

یہ چلی منزل کا استور دم جیسا کرا تھا۔ دیگر کمروں کے مقابلے میں کچھ چھوٹا۔ رانا فرس پر پڑا ہوا تھا اور مردہ لگتا تھا مگر وہ نیند میں تھا۔ اسپیکٹر نے لات مار کے اسے اٹھایا اور ایک گالی عادی دی۔ ”مکرمت کر.....“

وہ سوئے شیر کی طرح اٹھا اور آلتی یا لتی مار کے بیٹھ گیا۔ ”تم پر اللہ کا قہر نازل ہوگا۔ یہ جو کچھ تم کر رہے ہو۔“ وہ غرایا۔

انور نے ایک لات مار کے اسے گرا دیا۔ ”پہلے اپنی خیر منا۔“

بوٹ کی ٹھوکر اس کے گال پر لگی تھی۔ وہ کراہا اور منہ پکڑ کر خون تھوکنے لگا۔ ”مٹ گئے ہو پہلے ہی..... نام و نشان نہ رہے گا تمہارا.....“ قبر پر ٹپتپے مومیں کے۔ ”اس نے اپنے جلالی انداز میں بددعا میں دینا شروع نہیں۔“

میں نے انور کو روکا۔ پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”اچھا خاتم خود ہی کچھ سوالوں کے جواب دے دیجئے۔ اب تمہارا توڑ یہ ہنگامی کالے علم کا ماہر ہے۔“

وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔ ”اللہ والوں پر کالا جادو اثر نہیں کرتا۔ سمجھاؤ اس جو کر کو۔“

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ڈاکٹر اپنا کام شروع کرے۔ رانا تو منہ آدی تھا۔ اسے رضا کا راندہ طور پر انجکشن لگوانے کے لیے آمادہ کرنا جتنا مشکل تھا زبردستی اس کے بازو کی ایک رگ میں انجکشن کی سوئی اتارنا اس سے کہیں زیادہ دشوار تھا۔ میں نے اسپیکٹر اور اس کے مددگار کو اشارہ کیا۔ ”اسے قابو کرو، باندھ کے ڈال دو۔“

یوں لگتا تھا جیسے رانا نے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ ”خبردار جو کوئی میرے قریب آیا۔ بمسم کر دوں گا۔“

یہ وہی ڈائلاگ تھی جو اسے درگاہ کی عادت پر مبنی تھی۔ جن اتار تے وقت کبھی کسی منہ زور جن سے تو کبھی شاہ جنات سے ہر جگہ ایک سی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کے جسم میں کچھ غیر معمولی طاقت آگئی تھی کہ اس کو جکڑنے کی کوشش

کرنے والا حوالدار اور اس کا پاس بری طرح پسپا ہوئے ہیں نے ایک کے پیٹ میں لات ماری اور دوسرے کو سر سے نکر۔ وہ گالیاں بکتے اٹھے۔ اسپیکٹر اب اس کے سر پر مارنے کے لیے ڈنڈا اٹھا چکا تھا جو اس کی کلائی سے موٹا تھا۔

میں نے اسے روک دیا۔ ”دیکھو رانا اتم جانتے ہو کہ یہاں سے تم لڑ بھڑ کے نہیں نکل سکتے۔“

اس نے ایک لعرہ لگایا۔ ”کوئی نہیں بچے گا۔ سب خاک ہو جائیں گے۔“

آہستہ آہستہ دوستانہ لہجے میں بات کرتا میں اس کی طرف بڑھا۔ ”ہماری بات ہو گئی ہے۔ رات کو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔“

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ ”اللہ والوں کا مقابلہ کرتے ہو۔“

دو فٹ کا فاصلہ تھا کہ میں بجلی کی طرح اس پر ٹوٹا۔ یہ ایک ہی کھڑی پھیلی کی ضرب تھی جو اس کی پھیلتے پھیلتے گردن پر لگی۔ عرصہ دراز سے میں آؤٹ آف پریکٹس تھا لیکن کوئی سبق بھولا نہیں تھا۔ پریکٹس نہ ہونے سے وار او چھا پڑتا تو کارگر نہ ہوتا لیکن مجھے بڑی خوشی ہوئی جب تین من کا ہٹا کٹا لڑکھڑا کے زلزلے سے منہدم ہونے والی عمارت کی طرح گر گیا۔

”اب آپ اپنا کام کر سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے انجکشن نکالا۔ ”ایک بات اور..... تمام دواؤں میں ری ایکشن کا رسک ہوتا ہے۔ خطرناک دواؤں میں زیادہ ہوتا ہے۔ کسی نقصان کی ذمہ داری میری نہیں ہوگی۔“

میں نے اسے روک لیا۔ ”پہلے بتا دیں یہ ری ایکشن کیا ہو سکتا ہے؟“

”کچھ بھی، اس کا دماغ مفلوج ہو جائے۔ دس فیصد چانس ہے کہ دوا کارگر نہ ہو اور دس فیصد یہ کہ موت واقع ہو جائے۔“

میں نے انور کی طرف دیکھا تو اس نے آہستہ سے رضا مندی میں سر ہلایا۔

اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے رانا کی شیطانی طاقت کارگر ہو گئی۔ ایک دھماکا ہوا۔ مجھے اس زمین دوز کمرے کے دروہام لڑتے محسوس ہوئے۔ چھت سے چونا گرا، پھر جیسے پوری عمارت گر گئی۔

ہر معاذ ہر ایک نئے دوا کی منتظر
جواری کسی ندیسر میں اگلے ماہ بڑھے

آرزوئوں کا تصوراتی تاج محل لمحوں بھر کا محتاج ہوتا ہے... مگر حقیقت میں تراشے گئے اس محل کی تعمیر میں برسوں لگ جاتے ہیں... ایک بوڑھے شخص کی عجیب و غریب خواہش کا دردناک قصہ... وہ اپنے خاندان کا آخری فرد تھا... اور کسی صورت نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بعد اس کا خاندان بے نام و نشان رہ جائے...

عمرہ منسوبہ ہندی کی حال کہانی کا غیر متوقع انجام

تکمیل آرزو

سلیم انور



”میں اپنے خاندان کی آخری بیڑی ہوں۔“

بوڑھے فریڈی نے کہا۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فلائین کا پاجامہ اور رگمین چار خانے کا اوٹی ڈریسنگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔

کمرے کے دوسرے حصے میں اس کا خدمت گار لیری وائسن اس کا بستر درست کر رہا تھا۔

”میں وہ نایاب نسل ہوں جس کا وجود خطرے میں ہے۔“ بوڑھے فریڈی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے

جاسوسی ڈائجسٹ (195) - دسمبر 2014ء

اللہ کھڑا ہوں۔ فریڈی نے کہا۔ ”کسی محل سے اپنا نام پیدا کر جاؤں۔ دنیا میں اپنی شناخت کی کوئی نشانی چھوڑ جاؤں۔“

”نشانی؟“ میری نے بچکے کا کور بدلتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ایک زبردست دھماکا کر جاؤں اور کارنگ درتھ کا نام دنیا کے نقشے پر ثبت کر دوں جو کہ میں اب بھی کر سکتا ہوں۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں تمہیں اپنا اکلوتا وارث بنا دوں گا۔ تمہیں میرا مکان مل جائے گا، اپنے تمام بینک اکاؤنٹس تمہارے نام کر دوں گا اور اس تمام رقم سے تم اپنا نام بھی پیدا کر سکو گے۔ بس تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔“

”مدد؟“

”ہاں، میری عمر تری برس ہے۔ مجھے اپنی مدد کے لیے ایک دنگ مین چاہیے۔“

”دنگ مین؟“

”بینک کے لیے۔“

”بینک کے لیے؟“ میری نے دہرایا۔

”میرا مطلب ہے بینک لوٹنے کے لیے۔“ فریڈی نے وضاحت کی۔

”بینک لوٹنے کے لیے؟“ میری نے بچکے بیڈ پر رکھ دیا اور دم سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ”بینک لوٹنے کے لیے؟“ اس نے جبرانی سے دہرایا۔

”ہاں، بینک لوٹنے کے لیے۔ اور اپنا حوصلہ بلند رکھو، کیا سمجھ؟ میری ہمیشہ ہی سے کسی بینک کو لوٹنے کی خواہش رہی ہے۔ میں نے ہمیشہ دو ہی چیزوں کا خواب دیکھا ہے۔ ایک کسی بینک کو لوٹنے کا اور دوسرا سامنے سے آتی ہوئی کسی کار سے آنے سامنے کی ٹکر کا۔ کیا تم نے بھی اس بارے میں سوچا ہے؟“ فریڈی نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

”آنے سامنے کی ٹکر؟“ میری کے لہجے سے بدستور حیرت عیاں تھی۔

”ہاں، کیسا ہوگا جب آپ کی کار رخ موڑ کر سینٹر لائن سے دوسری جانب چلی جائے اور مخالف سمت سے آنے والی کار سے آنے سامنے کی ٹکر ہو جائے؟“

”نہیں، بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے..... اور..... اور ہم کوئی بینک نہیں لوٹ رہے..... میرا مطلب ہے کہ تم کوئی بینک نہیں لوٹ رہے۔“

”تم کس قسم کے کیئر اسسٹنٹ ہو؟“ فریڈی نے

کہا۔ ”ایک بار جب میں مر جاؤں گا تو کارنگ درتھ خاندان کا نام و نشان بھی مٹ جائے گا۔ ہمارے وجود کی نشانیوں میں صرف چند باتیات رہ جائیں گی جیسے چند تصویروں پر مرنے کے بارے میں دو ایک لوٹس اور قبر کے کتے پر تراشے ہوئے الفاظ جو وقت کے ساتھ دھندلا جائیں گے۔ بس یہی انجام ہوگا۔“

”کم آن، فریڈی۔ افسردگی کی باتیں مت کرو۔“

میری نے بستر کی چادر مہاڑتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی بیڑھی کی آخری نشانی کس طرح ہو سکتے ہو؟ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کارنگ درتھ تو موجود ہوگا۔“

”اگر کوئی موجود ہوتا تو اس سے مدد اور کیا بات ہوتی، میری! لیکن میں ہی اس خاندان کا آخری فرد باقی رہ گیا ہوں۔ تم چاہو تو فون بک میں یا انٹرنیٹ پر چیک کر سکتے ہو۔ میں ہی وہ واحد کارنگ درتھ ہوں گا جو تمہیں ان دونوں جگہوں پر ملے گا اور کیا تم جانتے ہو کہ اس حوالے سے بدترین بات کیا ہے؟“

خدمت گار میری نے ہلٹ کر استغناء نظر دے کر پوچھا فریڈی کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

”میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی خاص کام نہیں کیا۔ بس وقت کے دھارے میں بہتا رہا۔ میں نے آسان روٹ اختیار کیا اور کبھی بھی غیر ضروری ریسک نہیں لیا۔ میری تمام زندگی بے عمل اور جمود کا شکار رہی۔ البتہ کبھی کبھار کسی عورت کی توجہ حاصل کرنا چاہی بھی تو وہ مجھے جل دے کر کھل گئی۔ کوئی ایسی عورت زندگی میں نہیں آئی جو ہمارے خاندان کو آگے بڑھانے میں میری معاونت کر سکتی اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بھی سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے اپنی تمام زندگی ایک ٹیلے میں بند ہو کر گزار دی ہے۔ لیکن وہ بھی تنہا..... سب سے الگ تھلک۔ تم سمجھ رہے ہو نا کہ میرے کہنے کا کیا مطلب ہے؟“

”میری عمر اٹالیس برس ہے اور میں یہ طور کبیر اسسٹنٹ کام کر رہا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں اب بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوں؟“ میری نے کہا۔

”میں جانتا تھا کہ تم سمجھ جاؤ گے۔ تم میں اور مجھ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔“

میری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اب دست آچکا ہے کہ میں مقابلے کے لیے

کے۔

”نہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس بے چاری بچی کو دہشت میں مبتلا کرنے کا کوئی جواز نہیں بتا۔ اس میں اس بچی کا کوئی تصور نہیں کہ اس کا باپ ایک خبیث انسان ہے۔“
یہ سن کر میری نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اس کا یہ اطمینان عارضی تھا۔

فریڈی دوبارہ گویا ہوا۔ ”بہتر یہی ہوگا کہ ہم بینک لوٹنے کے کام تک ہی محدود رہیں۔“

”بینک لوٹنے کا کوئی کام نہیں ہوگا۔“ میری نے قدرے غصے سے کہا۔

”تمہارا شیئر ایک بلین ڈالر ہو چاہیے۔ میرا مال و اسباب اس کے علاوہ جب میں مر جاؤں گا۔ تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ پھر تمہیں بوڑھے لوگوں کی غلامت صاف کرنے اور ان کے سرین دھلانے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

”ایک بلین ڈالر۔“

”ایک بلین ڈالر اور اس کے علاوہ وہ تمام رقم جو میں نے بچت کی ہے۔ پھر میرے مکان کی مالیت بھی چند لاکھ ڈالر ہوگی۔“ فریڈی نے میری کولاچ دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ تم ہو گے جو بینک لوٹو گے، میں نہیں؟“

”گن میرے ہاتھ میں ہوگی۔“ فریڈی نے کہا۔

اس کی آنکھیں جوش اور جھان سے چمکنے لگی تھیں۔ یہ جگمگاہٹ برسوں بعد اس کی آنکھوں میں دیکھنے میں آئی تھی۔ ”تم میرے دنگ مین ہو گے۔۔۔۔۔ تم میری وہیل چیئر دھکیل کر بینک کے اندر لے جاؤ گے اور بینک لوٹنے کے بعد بچ نکلنے کے لیے گاڑی بھی تم ہی ڈرائیو کرو گے۔“

”وہیل چیئر دھکیل کر بینک کے اندر لے جاؤں گا؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟“ میری نے جھلاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”کوئی بھی وہیل چیئر میں بیٹھ کر بینک نہیں لوٹتا۔“

میری نے بے بسی سے کہا۔

”جب ہی تو انہیں توقع نہیں ہوگی کہ ہم بینک لوٹنے کے لیے آئے ہیں اور وہ رقم ہمارے سپرد کر دیں گے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ ہم زیادہ دور نہیں پہنچ پائیں گے اور وہ ہمیں دھریں گے۔“ فریڈی نے کہا۔

”دھریں گے؟“ میری نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”نہیں، کیونکہ میرا ایک پلان ہے۔“

”میرا خیال تھا کہ تمہارا مقصد میری درخواست کو بر لانا اور میرے آخری دنوں میں میرے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہے۔“
”میں ہر حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں، لیکن ہم کوئی بینک نہیں لوٹیں گے، فریڈی۔ تم ڈرنی لینڈ جانا چاہتے ہو، فائن۔ تم کسی فینسی ریستورنٹ میں آخری کھانا کھانا چاہتے ہو تو میں عجیب کی مدد سے تمہیں کھانا کھلانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم کسی ہوائی جہاز سے چھلانگ لگانا چاہتے ہو تو میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن کسی بینک کو لوٹنے کے معاملے میں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔“

”تم بہ خوبی جانتے ہو کہ چند گز چلنے کے بعد میرا سانس پھولنے لگتا ہے اور پھر میرے لیے مزید قدم اٹھانا دشوار ہو جاتا ہے۔ پھر بھلا میں تمہاری مدد کے بغیر کسی بینک کو کس طرح لوٹ سکتا ہوں؟ اور تمہارے علاوہ میرے پاس اور کوئی بھی نہیں ہے، جو میری مدد کر سکے، یا ہے؟“ فریڈی نے سوال کیا۔

”دیکھو، میرے بارے میں تو بھول جاؤ اور میری مدد کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔“ میری نے ہاتھ لہراستے ہوئے کہا۔

”تو پھر میں کس کی مدد مانگوں؟“

”وہی ایک بات تو بتاؤ۔“ میری نے کہا۔ ”کسی بھی صورت تم بغیر گن کے بینک کس طرح لوٹ سکتے ہو؟“
”میں اسی طرف آرہا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے ایک گن کا بھی انتظام کر دو۔“

”اف خدا یا!“ میری نے سر ہٹا لیا۔ ”تم مجھ سے یہ توقع کیوں کر رہے ہو کہ میں تمہارے لیے ایک گن حاصل کر سکتا ہوں۔ میں ایک نرسنگ ہوم میں ایک کیترا سسٹنٹ ہوں، میرا تعلق بد معاشوں کے کسی گروہ سے نہیں ہے۔“

”نام اسٹہ کے پاس ایک شاٹ گن ہے۔“ فریڈی نے اسی نرسنگ ہوم کے ایک اور باسی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

”وہ ایک الماری میں محفوظ ہے اور اس میں تالا لگا ہوتا ہے۔“ میری نے جواب دیا۔

”تم چاہو تو۔۔۔۔۔“

”نہیں۔“ میری نے تیزی سے بات کاٹ دی۔

”تو پھر اغوا کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”اغوا! کس کا اغوا؟“

”ہم اس رئیس کی بیٹی کو اغوا کر سکتے ہیں جو اس

نرسنگ ہوم کا مالک ہے پھر اس سے تادان طلب کریں

”کیسا پلان؟“

”مجھے اس بارے میں سوچنے کے لیے برسوں کا وقت مل گیا تھا، میری۔ میں نے منصوبے کی تمام تفصیلات پورے دھیان کے ساتھ طے کر لی ہیں۔ میرا جسم ضرور ناکارہ ہو چکا ہے لیکن میرے دماغ کے خلیے اب بھی درست کام کر رہے ہیں اور ان کی کارکردگی میں کسی قسم کی خالی نہیں ہے۔“

”یہ تو اپنی اپنی رائے کا معاملہ ہے۔“ میری نے کہا۔
پھر وہ بیڈ پر سے اٹھ کر آلودہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔
”دیکھو اور میری بات دھیان سے سنو۔ اگر ہم پکڑے گئے تو میں ان سے کہہ دوں گا کہ تمہیں میں نے مجبور کیا تھا۔ تمہیں گن دکھا کر دھکا دیا تھا۔“ فریڈی نے اسے راغب کرنے کی کوشش کی۔
میری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور کھڑکی سے باہر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

”تمہیں کس چیز سے محروم ہونے کا ڈر ہے؟“ فریڈی نے پوچھا۔

”اپنی آزادی سے۔“ میری نے جواب دیا۔ ”میری آزادی کا خاتمہ جیل میں ہو سکتا ہے۔“

”تم کسی جیل میں نہیں جاؤ گے۔ میں نے تم سے ابھی کہا ہے کہ اس کا نتیجہ میں خود بھگتوں کا۔ یوں بھی میری زندگی کا خاتمہ ہونے کو ہے۔ کم از کم اس طرح میں اس دنیا سے ریں ریں کرتا ہوں نہیں بلکہ دندنا ہوا رخصت ہوں گا اور میرا نام سب کی زبان پر ہوگا اور اگر ہمارا پلان کامیاب رہا تو تم نہایت امیر آدمی بن جاؤ گے۔“ فریڈی نے اسے یقین دلانا چاہا۔

میری کی نظریں بدستور کھڑکی کے باہر خلا میں جمی ہوئی تھیں۔ وہ اس پیشکش کو دل ہی دل میں تول رہا تھا۔ ایک ملین ڈالر یقینی طور پر اس کی زندگی میں یکسر تبدیلی لے آئیں گے۔ وہ تب بھی وقت کے دھارے کے ساتھ زندگی گزارے گا، لیکن یہ ایک پُر نقش زندگی ہوگی۔ دوسری جانب حالات جس رخ پر جا رہے ہیں تو وہ یونہی نابود ہو سکتا ہے اور شاید اس کے ہاتھ کچھ نہ آئے۔۔۔ یوں بھی اسے اپنی آنے والی زندگی کے درجن بھر سال تسلسل و کیمیتی کی سزا کے طور پر کسی جیل میں گزارنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

”تم آن میری۔“ فریڈی نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری ایڈونچر کی حس کہاں چلی گئی؟ کیا تم زندگی بھر ریٹائر ہونے تک ایک کیئر اسسٹنٹ ہی رہنا چاہتے ہو؟“

بے بس لوگوں کی دیکھ بھال ہی تمہارا مقصد حیات ہے؟ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال جن کے پاس کہنے کے لیے بہت کم ہوتا ہے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس میں بھی بے حد وقت لے لیتے ہیں۔“

”اور یہ منصوبہ کامیاب رہے گا؟ کیا ایسا ہی ہوگا؟“ میری نے پوچھا۔

”اس منصوبے میں غلطی کا اندیشہ ہی نہیں ہے۔“ فریڈی نے کہا۔ ”یہ فول پروف پلان ہے۔“

میری نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا اور کھڑکی سے پلٹ گیا۔

فریڈی نے استغناء سے نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے بہتر ہوگا کہ میں نام اسمتھ کے لا کر کی جابی حاصل کر لوں۔“

☆☆☆

”تم یقیناً اسے استعمال نہیں کرو گے، ٹھیک ہے نا؟“ میری نے فریڈی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

بوڑھا فریڈی دنڈا اسکرین کے پار خلا میں گھور رہا تھا۔ اس کا ہار یک ربر کے دستانے میں بند ہاتھ شاٹ گن کو تھپتھپا رہا تھا۔ میری نے گزشتہ شب اس شاٹ گن کی تالی کو آری سے کاٹ کر بارہ انچ کر دیا تھا۔

فریڈی نے اس وقت اپنا بہترین سٹے سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جو اس کے سائز سے دو تہر بڑا تھا۔ قمیص کا رنگ ہلکا پیلا تھا جو کبھی سفید ہوا کرتی تھی۔ ٹائی گہرے سبز رنگ کی تھی۔ کیپ پر جلی حروف میں فاسٹنگ آئرش نوٹر ڈیم کے الفاظ چھپے ہوئے تھے۔

”فریڈی؟“

اپنا نام پکارنے پر بوڑھے فریڈی کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ ڈرائیور کی جانب چہرہ گھماتے ہوئے بولا۔ ”کیا ہے؟“

”تم اس گن کو استعمال نہیں کرو گے۔ ٹھیک ہے نا؟“

میری نے کہا۔ ”وہ یہ بات اب تک نہ جانے کتنی مرتبہ ہر اچکا تھا۔ ساتھ ہی وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب اس نے اس بوڑھے کی اسکیم میں شمولیت کی ہائی بھری تھی۔ اسے اب بچھتاؤ اور ہاتھ۔“

”شاٹ گن لوڈ نہیں ہے، میری۔“ فریڈی نے کہا۔ میری نے مشکوک نظروں سے فریڈی کی طرف دیکھا۔

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"فریڈی اتم اس اسٹیج پر پہنچ کر اپنا پلان تبدیل نہیں کر سکتے۔"

"پلان ہمیشہ سے یہی تھا، میری۔"
"ہمیشہ سے۔" میری ایک بار پھر چکر گیا۔
"ہاں، اور اس کی تین وجہ ہیں جو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ سب سے پہلی وجہ یہ کہ اگر تم نے اپنے بکواسی پن سے بھانڈا پھوڑ دیا۔۔۔۔۔"

"بھلا میں کیوں بھانڈا پھوڑوں گا؟" میری نے فریڈی کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔
فریڈی نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دوسری وجہ یہ ہے کہ تم بینک کا جائزہ لیتے رہے ہو۔"

"میں۔۔۔ نہیں تو۔" میری نے انکار کیا۔
"مجھے معلوم ہے کہ تم بینک میں جاتے رہے ہو، لہذا انکار کرنے کی زحمت نہ کرو۔ میں نے تمہارے کوٹ کی جیب میں بینک کے کیش پوائنٹ کی رسید دیکھ لی تھی۔ ان کی سنگیورٹی فوج میں تمہارا چہرہ ہر جگہ موجود ہوگا۔"

میری نے اس مرتبہ کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
"تیسری وجہ یہ ہے کہ بینک کو فورٹ نوکس کی طرح تعمیر کیا گیا ہے۔ جس لمحے ہم اپنی گن لگائیں گے، دروازے خود بہ خود مقفل ہو جائیں گے اور دھاتی شٹر کیشیئرز کے سامنے آٹومیک نظام کے تحت آن گرہیں گے اور ہمارے اور ان کے درمیان آہنی دیواریں حاصل ہو جائیں گی۔ پھر ہم اس طرح ٹریپ ہو جائیں گے جیسے چوہا چوہے دان میں قید ہو جاتا ہے۔"

میری آنکھیں پھاڑے فریڈی کی صورت تک رہا تھا۔
"تم نے آخری مرتبہ کسی بینک ڈکیتی کے بارے میں کب سنا تھا؟" فریڈی نے پوچھا۔ "برسوں پہلے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میری بدستور خاموش تھا۔

"نہیں، اب ہمارے پاس گنے گنے مواقع رہ جاتے ہیں یا تو تم کسی بینک ملازم کی فیملی کو اغوا کر لو اور اسے کیش لوٹنے پر مجبور کرو، یا کسی بکتر بندوین کو لوٹ لوجو کیش لے جا رہی ہو، یا دیوار میں نصب اسے ٹی ایم کو کھدائی کرنے والی مشین سے اکھاڑ کر چھپت ہو جاؤ یا پھر کسی پوسٹ آفس کو لوٹ لو۔ اور ان سب کے مقابلے میں ایک عام پوسٹ۔"

جاسوسی افحاشت (199) دسمبر 2014ء

تب فریڈی نے اپنے کوٹ کی جیب کو تھپتھا دیا جو پھولی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ "کارٹوس یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ تم پریشان مت ہو۔" فریڈی نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لیے تو پریشانی کی بات اس لیے نہیں ہے کہ تم اپنی زندگی گزار چکے ہو۔" میری نے کہا۔ فکر مندی اب بھی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ "اگر معاملہ الٹ ہو گیا تو تم اس وقت تک بہت پہلے مر چکے ہو گے جب مجھے قید سے رہائی ملے گی۔"

"معاملہ الٹ ہرگز نہیں ہوگا۔" فریڈی نے پرمعزم لہجے میں کہا۔ "منصوبہ بالکل آسان ہے۔ تم مجھے وکیل چیر پر دھکیلتے ہوئے اندر لے جاؤ گے اور میں رقم طلب کروں گا پھر ہم رقم لے کر وہاں سے چھپت ہو جائیں گے۔"

"اگر انہوں نے ہمیں رقم نہیں دی تو پھر کیا ہوگا؟"

میری نے خدشے کا اظہار کیا۔
"تو یہ شاٹ گن اور کس لیے ہے؟" فریڈی نے شاٹ گن کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "شاٹ گن کے سامنے کوئی بھی انکار کی جرات نہیں کرتا۔ یوں بھی دوسروں کی رقم کے پیچھے کوئی اپنی جان داؤ پر نہیں لگاتا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

وہ اس وقت شہر کے کنارے پہنچ چکے تھے۔
میری نے کار ایک ایسی سڑک پر گھما دی جس پر شاؤنک مالز اور دیگر تجارتی مراکز تھے۔ ایک کنارے پر ایک سپر مارکیٹ تھی۔ ان سب کے سامنے کے حصے میں چند ایکٹرز پر پھیلی ہوئی پارکنگ لائٹ تھی جو تقریباً خالی دکھائی دے رہی تھی۔

"کار پوسٹ آفس کے سامنے پارک کر دو۔"

فریڈی نے ہدایات دیا۔
"بینک تو ادھر ہے۔" میری نے اشارے سے بتاتے ہوئے کہا۔

"ہم بینک نہیں لوٹیں گے۔" فریڈی نے کہا۔
"کیا؟" میری کا منہ حیرت سے کھل گیا۔
"ہم بینک نہیں لوٹیں گے۔" فریڈی نے دہرایا۔
"ہم پوسٹ آفس کو لوٹیں گے۔"

"لیکن ہماری پلاننگ تو بینک لوٹنے کی تھی۔" میری نے اپنا گال کھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ہماری پلاننگ پوسٹ آفس کو لوٹنے کی تھی۔ کار وہاں پارک کر دو۔" فریڈی نے اپنی شاٹ گن سے

آفس میں سیکورٹی کے انتظامات سب سے ناقص ہوتے ہیں۔ ”فریڈی نے بتایا۔“ جیسس کرائسٹ، فریڈی۔ ”میری اپنی نشست پر تھلا کیا۔“ اور تم نے یہ باتیں اب سے پہلے مجھے بتانا گوارا نہیں کیں؟“ ساتھ ہی وہ اپنے ڈولتے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

”لیکن اب بتا تو دی ہیں۔“ فریڈی نے میری کے جذبات کی پردا کے بغیر پرسکون لہجے میں کہا۔ میری اسے ٹھورنے لگا۔

”وینکو میری! میں تو تم پر ایک عنایت کر رہا ہوں۔ اگر ہم نے بینک لوٹنے کی کوشش کی تو وہاں سے نکلنے وقت ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوں گی۔ البتہ دوسری صورت میں جب ہم پوسٹ آفس سے نکلیں گے تو ہمارے ہاتھوں میں لوٹوں سے بھرا ہوا بیگ ہوگا۔ اب تم ہی بتاؤ لوٹوں سے بھرا بیگ بہتر رہے گا یا ہتھکڑیاں؟“ فریڈی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”نقدی کے علاوہ تمہیں میرا مکان بھی مل جائے گا اور وہ سب کچھ بھی جو میری ملکیت ہے، جب میں اوپر آسمان کی جانب روانہ ہو جاؤں گا۔“ فریڈی نے اسے لپکانے کی کوشش کی۔ ”اگر ہم نے یہ واردات درست طریقے سے میرا انجام دے دی اور اس کے بعد تم نے اپنا منہ بند رکھا تو ہم کبھی بھی پکڑے نہیں جائیں گے۔“

میری یہ سن کر نرم پڑ گیا۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم، فریڈی میں کسی قسم کا دھوکا نہیں کھانا چاہتا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوگی تو پھر کیا ہوگا؟“

”میری، میری، کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ تم بالکل بھی فکر مت کرو، میں نے تمام معاملات پر اچھی طرح سے غور کر لیا ہے۔ میں نے برسوں تک ای پوسٹ آفس سے اپنی پینشن لی ہے۔ میں اس جگہ کو اندر اور باہر سے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اس کے تعمیری خاکے، اس کے اسٹاف اور یہاں کے طریق کار سے بہ خوبی واقف ہوں۔ صبح کے ان اوقات میں یہاں پینشن کی ادائیگی اور بے روزگاروں کے الاؤنس کی مد میں کیش بھرا ہوتا ہے۔ ان کو اس وقت لوٹا اتنا آسان ہوگا جیسے کسی بچے کے ہاتھ سے کینڈی لینا۔ یہ دیکھو۔“ فریڈی نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر میری کی نظروں کے سامنے کر دیا۔

اس کاغذ پر پوسٹ آفس کے اندر کا نقشہ بنا ہوا تھا۔

یہ خاکہ خود فریڈی نے تیار کیا تھا۔

”یہ دروازہ ہے۔“ فریڈی نے کاغذ پر انگلی رکھتے ہوئے بتایا۔ ”اس کے اوپر ہائیں جانب ایک کیمرا لگا ہوا ہے۔ اندر گیشیئر کا کاؤنٹر یہاں پر ہے۔ اندر کی جانب کیمرے یہاں، یہاں اور یہاں پر لگے ہوئے ہیں۔ اس وقت جو کسٹر پوسٹ آفس میں موجود ہوں گے وہ سب کے سب میری عمر کے ہوں گے۔ بے روزگار اتنی صبح سویرے اپنا الاؤنس لینے نہیں آتے۔ ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ میری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”کم آن، اب وھیل چیئر باہر نکال لو۔ اب اس بیجان خیزی کو ضائع کرنا نہایت شرمناک بات ہوگی۔ میں اب خود کو توانا محسوس کر رہا ہوں۔ برسوں بعد یہ پہلا موقع ہے جب میں حقیقت میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں واقعی زندہ ہوں۔“ فریڈی نے پرجوش لہجے میں کہا۔

میری نے اس کے جذبات کی تائید میں سر ہلا دیا۔ اپنی خفگی، غم و غصہ کے باوجود وہ بھی حقیقت میں سمجھ رہا تھا کہ اس وقت بوڑھے فریڈی کے جذبات کیا ہیں۔

اس نے اپنی سیاہ کار کے ہڈ کو کھول دیا۔ وھیل چیئر تہ کی ہوئی ڈکی میں کھی گئی۔ اس نے وھیل چیئر باہر نکالی، اس کی تہ کھولی اور اسے چلا کر کار کے پیچ دروازے کے پاس لے گیا۔ فریڈی کار کا دروازہ پہلے ہی کھول چکا تھا۔

فریڈی اپنے ہاتھوں پر زور لگاتے ہوئے نشست پر سے اٹھا اور کار سے باہر قدم رکھ کر ہانپتے ہوئے وھیل چیئر پر دھب سے بیٹھ گیا۔

”پلیز، گمن اور بیگ مجھے تمہارے۔“ اس نے میری سے کہا۔

میری نے دونوں چیزیں کار سے نکال کر اس کے حوالے کر دیں۔

فریڈی نے اسپورٹس بیگ اپنی گود میں رکھ لیا اور شاٹ گن وھیل چیئر پر اپنے دائیں جانب رکھ دی۔

”اب اپنے اپنے ماسک پہن لیتے ہیں۔“ فریڈی نے کہا۔

میری نے مسٹر بین کار پر ماسک نکال کر فریڈی کو تھا دیا اور خود ایلوس پر پیلے کار پر ماسک اپنے چہرے پر چڑھا لیا۔

فریڈی نے اپنے چہرے کی ہار یک جلد کور بزماسک سے ڈھانپ لیا اور اپنی کیپ دوبارہ سر پر منڈھ لی۔

تکمیل آرزو

جب وہ پوسٹ آفس کے دروازے پر پہنچے تو میری نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کمرے کے لیس کو دوسری جانب موڑ دیا۔ کیمرا میں اس جگہ اوپر بائیں جانب لگا ہوا تھا جیسا کہ فریڈی نے اسے بتایا تھا۔

پھر وہ دونوں پوسٹ آفس کے اندر داخل ہو گئے۔

اس وقت بائیں کسٹمر پوسٹ آفس میں کاؤنٹر کے سامنے قطار بنائے کھڑے تھے۔ کاؤنٹر اور شیشے کی اسکرین کے پیچھے دو کیشیئر بیٹھے ہوئے تھے۔

فریڈی نے اپنی وھیل چیئر کے سائڈ میں رکھی ہوئی شاٹ گن اٹھائی اور چھج کر بولا۔ ”یہ ڈکیتی کی واردات ہے۔“ اسے یہ جملہ ادا کرتے وقت بے حد خوش محسوس ہوئی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ یہ جملہ ادا کرنے کا منتہی رہا تھا اور بچپن ہی سے اس کی یہ خواہش رہی تھی کہ اسے حقیقی زندگی میں یہ جملہ ادا کرنے کا موقع مل جائے اور آج اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بچ کسڈی ہے اور میری سن ڈانس کڈ انا مورڈ کیت جوڑی۔

ہر فرد نے اپنی توجہ اس کی جانب مبذول کر لی لیکن ان سب کا انداز لا تعلقی سا تھا۔

”اد کے، اب چلتے ہیں۔ یاد رہے کہ اندر داخل ہوتے وقت تم دروازے پر لگے ہوئے کمرے سے بچ کر گزرتا۔ پھر میری وھیل چیئر کو چلاتے ہوئے کیش کاؤنٹر پر لے جانا۔ ٹھیک ہے؟“

میری نے سر ہلا دیا۔

فریڈی نے وھیل چیئر آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ میری نے وھیل چیئر کو پیچھے کھینچتے ہوئے پھر کی ٹھوک سے کار کے پیچھے سائڈ کے دروازے کو بند کر دیا اور وھیل چیئر وھیلٹے ہوئے پوسٹ آفس کی طرف چل دیا۔ ساتھ ہی اس کا ذہن اُمید اور خوف کے ملے جلے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا ہر پڑھتا ہوا قدم اسے ایک پُر آسائش زندگی کی جانب لے جا رہا ہے یا برسوں کی قید کی سمت۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں آگے بڑھ رہا تھا۔

”یہ ان تمام کارٹنگ ورٹھس کے نام پر ہے جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔“ فریڈی نے کہا۔ وہ اپنی آواز کے ہيجان کو چھپانے میں ناکام رہا تھا۔ ”کارٹنگ ورٹھس کا بول بالا رہے۔“

”یقیناً یہ بڑھا پاگل ہو گیا ہے۔“ میری بڑبڑایا۔

سیلاب لے گیا

ریلا چاہے آلسوڈس کا ہو یا پانی کا اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے جاتا ہے..... آخری صفحات پر لہروں کی روانی منظر امام کے قلم سے

عشق ناقصام

دیسے تو اس جہان میں کچھ بھی مکمل نہیں ہے بلکہ عشق کی کمی کوئی حد نہیں ہوتی..... تاریخ کے گوش لحات کا قصہ..... ایتالی صفحات پر الیاس سیٹا پوری کا انداز

سودائے جنوں

امت مسلمہ کے خلاف میسہونی سازشوں کی تباہ کاریاں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے ایک عبرت اترداستان

ماروی

محبت کی حیرت انگیز کشش اور دشمنوں کی چالوں کو مات دینے کے لیے بنگے ہوئے مسافروں کی جگ..... محی الدین نواب کے قلم سے اگلا پڑاؤ

دسمبر 2014 کی سرداتوں کا قلم

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینسٹ

ماہنامہ

مزید

خطوط کی مثال

مختل شعر و سخن

ملک منظر جیات کی آفتاب

طاہر جاوید مغل کاشف دسمبر تاہر نعیم

سلیم انور تنویر ریاض اور ڈاکٹر شیر شہاد سیدی تحاریر

جاسوسی ڈائجسٹ 2014 - دسمبر 2014ء

جانب مبذول کر دی۔ اب اس کے احساسات میں شدت آگئی تھی۔ ناقابلِ تسخیر ہونے کا ایک جوشیلا احساس اسے اپنے خون میں دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چیخا۔ ”ہیک بھر دو۔“

تب ادھیڑ عمر کیشیئر خاتون نے شیشے کی کھڑکی کو اٹھاتے ہوئے اسپورٹس ہیک اندر کھینچ لیا اور پھر ایک چھوٹے سے پارٹیشن کے پیچھے چلی گئی۔

فریڈی نے ایک مرتبہ پھر اپنی توجہ کسٹمرز کی جانب مبذول کر لی۔ ایک عورت کے رونے کی آواز کے علاوہ دوسری آواز میری کے ہاتھ کی تھی جو زور سے زدہ انداز میں دھیل چیر کے ہینڈل کو اس طرح تھپتھا رہا تھا جیسے وہ کوئی ڈھول ہو۔

”کم آن، جلدی کرو۔“ فریڈی نے چیخ کر کہا تو اس پر خشک کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا اور آنکھوں میں پانی آ گیا۔

اتنے میں وہ کیشیئر عورت دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس نے کھڑکی سے فریڈی کا دیا ہوا ہیک اس کی جانب کھنکا دیا۔ ہیک آدھا بھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

”میں نے کہا تھا، اسے بھر دو۔“

”سب کچھ یہی ہے۔“ کیشیئر عورت نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ”بقیہ رقم ایک سیف میں بند ہے جس میں ٹائم لاک ہوا ہے۔ وہ ایک بجے سے پہلے نہیں کھلے گا۔“

”لعنت ہو۔“ میری بڑبڑایا۔

فریڈی نے جھپٹ کر ہائیکس ہاتھ سے ہیک اٹھا لیا اور اسے اپنی گود میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”کم آن، اب یہاں سے نکل چلیں۔“

لیکن میری نے کوئی حرکت نہیں کی۔

”کم آن۔“ فریڈی نے میری کو دیکھا۔

میری نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا، وہ ایک جھٹکے سے سحر سے نکل آیا۔ اس نے دھیل چیر گھما کی اور اس کا رخ بیرونی دروازے کی جانب کر دیا۔ اسے بیرونی دروازے کو کھولنے میں قدرے دشواری پیش آئی لیکن وہ بیک وقت دروازہ کھولنے اور دھیل چیر کو دروازے سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کار پارکنگ میں آ گئے۔

کار پارکنگ میں سب لوگ ڈکیتی کی اس واردات سے بے خبر دکھائی دے رہے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت معمول کے مطابق جاری تھی۔ کوئی ان کی جانب متوجہ بھی

میری کے قدم یہ منظر دیکھ کر دہشت سے وہیں جم گئے۔

”دیگر کسروں کو دیکھو۔“ فریڈی نے میری سے مخاطب ہو کر ہدایات دیں۔

تب میری تیزی سے آگے بڑھا۔

”میں نے کہا یہ ڈکیتی کی واردات ہے۔ ہر کوئی اپنی جگہ پر سکون کھڑا رہے تو کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ سب اپنا اپنا رخ دیوار کی سمت کر لیں۔“ فریڈی نے بلند آواز سے کہا۔

لیکن کسی کسٹمر نے کوئی حرکت نہیں کی۔ سب جہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔

بوڑھے فریڈی کو وقت کے لمحات ہاتھوں سے نکلنے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس کے خواب اور حقیقت ایک دوسرے میں گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔ تب وہ ایک بار پھر چیخا۔ ”کیا تم نے سنا نہیں، دیوار کی طرف منہ پھیر لو۔“

یہ سن کر دو بوڑھی خواتین پریشانی کے عالم میں دھیرے دھیرے دیوار کی سمت کھسکنے لگیں۔ باقی افراد اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔

میری نے اپنا کام مکمل کیا اور پھر پلٹ کر چیزی سے فریڈی کے پاس آ گیا۔ پھر وہ فریڈی کی دھیل چیر دھکیلا ہوا کیش کا ڈنڈر کے پاس لے گیا۔

فریڈی نے اپنی گود میں رکھا ہوا اسپورٹس ہیک کاؤنٹر کی پالش شدہ چمکدار لکڑی کی سطح پر رکھ دیا اور کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی زرد چہرے والی ادھیڑ عمر عورت سے بولا۔ ”اسے نوٹوں سے بھر دو۔“

اس ادھیڑ عمر عورت نے چند مرتبہ حیرت سے پلکیں جھپکائیں لیکن اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔

”کیا تم سن نہیں سکتیں؟ میں نے کہا کہ اس کم بخت ہیک کو نوٹوں سے بھر دو۔“ فریڈی نے بلند آواز سے کہا۔

”اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں ان پانچوں بوڑھے بندروں کے جسم گولیوں سے بھر دوں گا۔“ اس نے کسٹمرز کی جانب شاٹ گن لہرا دی۔

”م.....م..... میں.....“ ادھیڑ عمر کیشیئر ہٹکانے لگی۔ فریڈی نے شاٹ گن لوڈ کر لی۔

فریڈی نے ایک اچھتی نگاہ کسٹمرز پر ڈالی۔ وہ سب کے سب فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ ایک عورت رو بھی رہی تھی۔

فریڈی نے اپنی توجہ دوبارہ ادھیڑ عمر کیشیئر خاتون کی



میری جاگنگ کرتا ہوا کار کے پاس پہنچا۔ وہ اپنا ماسک پہلے ہی چہرے پر سے کھینچ کر اتار چکا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں پر سے ربر کے پتکے دستانے بھی کھینچ کر اتار لیے اور جھیلی کی پشت کو سہلانے لگا جہاں دیر سے جھلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس پر طاری پہچان خیزی کی کیفیت ختم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ اعصاب کو جنم جوڑنے والی کیفیت نے لے لی تھی۔

”فریڈی اتم نے تو کہا تھا کہ شاٹ گن لوڈ نہیں کرو گے۔“ میری اپنے ذہن میں کلبلا نے والی بات کو زبان پر لے آیا۔

”میں نے جھوٹ بولا تھا۔“ فریڈی نے اس انداز سے جواب دیا جیسے میری کی بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

میری کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

”کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے تھے کہ میں خالی گن لے کر وہاں جاؤں گا؟“ فریڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک مسلح ڈکیتی تھی۔ کم آن، اب کار میں بیٹھنے میں میری مدد کرو۔“

”تم کسی کو ہلاک بھی کر سکتے تھے۔“

”صرف اس صورت میں اگر کوئی مزاحمت کرتا۔ اپنے آپ کو سنبھالو، میری۔ رقم ہمارے ہاتھ آچکی ہے۔“ فریڈی نے اسپورٹس بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میری نے ایک جھٹکے سے کار کی پنجر سائڈ کا دروازہ کھولا اور دستانے اور ماسک سیٹ پر اچھال دیے۔ ”مجھے معلوم تھا کہ یہ آئیڈیا اچھا نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فریڈی کی گود میں رکھا ہوا اسپورٹس بیگ اٹھایا اور اسے کار کی فٹ ویل میں پھینکتے ہوئے بولا۔ ”اس میں کسی صورت بھی دس لاکھ ڈالر نہیں ہوں گے یا شاید ایک لاکھ ڈالر بھی نہ ہوں۔“

”کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟“ فریڈی نے وکیل چیئر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ شاٹ گن اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر وہ کار کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب ہنسنے ہوئے بڑھنے لگا۔

”یقیناً اس سے فرق پڑتا ہے۔“ میری نے فراتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وکیل چیئر کو تہ کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔

”وکیل چیئر کو چھوڑ دو، کم آن۔ اب نکل چلو۔“

فریڈی نے کھانستے ہوئے کہا۔ پھر سانس لینے کے لیے ہانپنے لگا۔

”وکیل چیئر پر نرسنگ ہوم کا نام لکھا ہوا ہے۔“ میری نے جواب دیا۔ اس دوران وہ وکیل چیئر کو فولڈ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ پھر اس نے تہ کی ہوئی وکیل چیئر ڈکی میں ڈال دی۔

اتنے میں دور کہیں سے پولیس سائرن کی آواز فضا میں کھلبلی سی مچانے لگی۔

”اگر ہم اسے یہاں چھوڑ دیں تو ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل ہی وہ وہاں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

میری نے ایک جھٹکے سے ڈکی کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر پنجر سائڈ کے دروازے کو دھکیل دیا تاکہ فریڈی آسانی سے دروازہ بند کر سکے پھر گھوم کر تیزی سے ڈرائیونگ سائڈ پر آگیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی انکیشن سوچ نکھڑا دیا۔ وہ جسمانی طور پر خود کو ہمارے محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ بیچ بچکنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایک چھوٹا سا معجزہ ہوگا۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے ایک حقیر سی رقم کی خاطر کیا ہے۔

وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو جھڑک رہا تھا کہ اس نے اپنے ذہن میں اللہ نے واسے شبہات پر پہلے دھیان دینا کیوں گوارا نہیں کیا۔ اسے چاہیے تھا کہ بوڑھے فریڈی کی افسانوی اسکیم کو ابتداء ہی میں رد کر دیتا جب اس نے یہ تجویز پیش کی تھی۔

اس کے برابر میں بیٹھا ہوا فریڈی ہوا خوری کی جدوجہد کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی سائیس

درست کرنے میں دشواری پیش آرہی ہو۔

”تم ٹھیک تو ہونا، فریڈی؟“

”ہم..... نے..... بالآخر..... کر دکھایا۔“ فریڈی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ پھر اس پر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔

”فریڈی؟“

”تم بس..... ڈرائیو کرو۔“

☆☆☆

پولیس کار تیزی سے ان کے سامنے سے گزر گئی۔ اس کا رخ پوسٹ آفس کی جانب تھا۔ اس کی لائٹیں فلش کر رہی تھیں اور سائرن بج رہا تھا۔

فریڈی اپنی نشست پر گھوم گیا اور اس وقت تک پولیس کا رکوڈ دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ میری بھی نروس زدہ انداز میں بار بار حقیقی آئینے میں دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے معدے میں شدید مروزی اٹھ رہی تھی۔

”ہم نے کر دکھایا، میری۔“ فریڈی نے دوبارہ اپنا رخ سامنے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ خوں سے جھمکار ہوا تھا۔ ”ہم نے حقیقت میں کر دکھایا۔“

”ابھی معاملہ ختم نہیں ہوا فریڈی۔“

”اس حد تک قوی بننے کی کوشش مت کرو، میری۔ ہم ٹام اسمتھ کی کار اس کے گھر واپس لے جائیں گے اور ٹیلی نمبر پلیٹیں اتار دیں گے۔ پھر کار پر سے اپنی انگلیوں کے تمام نشانات مٹا دیں گے۔ پھر ہم تمہاری کار میں وہاں سے چل پڑیں گے۔ شاٹ گن کو جھیل میں پھینک دیں گے اور گھر واپس آ جائیں گے۔ یوں سب کچھ بہ آسانی ہمارے ہاتھ آ جائے گا۔ کوئی بھی اتنا عقلمند نہیں کہ ہم تک پہنچ پائے گا۔“ فریڈی نے فخریہ لہجہ میں کہا۔

”انہیں پتا چل جائے گا۔ وہ ہمیں کھوج نکالیں گے۔“ میری نے قدرے خوف زدہ لہجہ میں کہا۔

”اور انہیں حقیقت میں کن کی تلاش ہوگی؟ سیاہ رنگ کے ٹاپ اور نیلی جینز میں ملبوس پھولے ہوئے چہرے والا ایلوں پر سیٹے اور وہیل چیئر میں بیٹھا ہوا مسٹر بین؟ پھر سڑکوں پر دوڑنے والی سفید رنگ کی فورڈ کاروں کی تعداد ہزاروں میں ہے جبکہ یہ کار اپنی اور بیجنل نمبر پلیٹوں کے ساتھ ٹام اسمتھ کے گیراج میں یہ حفاظت موجود پائی جائے گی۔ تمہیں غلت دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اسی طرح ڈرائیو کرتے رہو جیسے عام حالات میں کیا کرتے ہو۔“

”اس بیگ میں کسی طور پر ایک ملین ڈالر نہیں ہو

سکتے۔ تم نے تو کہا تھا کہ ایک ملین ڈالر ہاتھ آئیں گے اور میں نے صرف چند ہزار ڈالر کی خاطر پندرہ سے بیس سال تک کی قید کاٹنے کا خطرہ مول لے لیا ہے۔“ میری کا لہجہ بدستور شکایتی تھا۔

”میں ابھی تمہیں بتا چکا ہوں میری کہ تم جیل نہیں جاؤ گے۔ میرے مرنے کے بعد تم ہی میرے اکلوتے وارث ہو گے۔ پھر تم بے پروائی کے ساتھ اپنی بقیہ زندگی پوری عیش و عشرت کے ساتھ بسر کرتے رہنا اور تم ابھی زندہ ہو۔ میرا مطلب ہے حقیقت میں زندہ ہو۔ تم یہ بھی شکوہ نہیں کر سکتے کہ میں تمہارے ساتھ کسی قسم کا سا جھا کر رہا ہوں۔“ فریڈی نے جواب دیا۔

”مجھے تو سوزش معدہ اور توہمات کی شکایات کے سوا اور کچھ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔“

”جیسس میری! ہم نے ابھی ابھی ایک پوسٹ آفس کو لوٹا ہے۔ ہم دونوں نے۔ ہم نے جو زندگی میں ٹھکست خورہ تھے۔ ہم حقیقت میں وہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں جس کا اکثر لوگ صرف خواب ہی دیکھا کرتے ہیں۔“

”ہاں، تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“ میری نے بار مانتے ہوئے کہا۔ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بہتر یہی ہے کہ فریڈی کوئی الوقت خوش ہونے دیا جائے۔ وہ پوسٹ آفس لوٹنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ البتہ میری کی اضطراری کیفیت اسے بار بار یہ احساس دلا رہی تھی کہ دن کا خاتمہ ہونے تک وہ دونوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔

”میں تم سے کہہ رہا ہوں میری کہ تمہارے بوڑھے لوگوں کی غلاطت صاف کرنے اور ان کی خدمت کرنے کے دن اب تمام ہو گئے۔“ فریڈی نے کہا۔

”صرف اس صورت میں جب تم..... ویل تم تو جانتے ہی ہو۔ میری تو اس وقت تک تسلی نہیں ہوگی جب تک حقیقت میں یہ پتا نہیں چل جاتا کہ دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد ہمارے ہاتھ کیا لگا ہے اور اس بیگ کے اندر کتنی رقم ہے؟“ میری نے کہا۔

”اس کے اندر تمہارے گمان سے کہیں زیادہ رقم موجود ہے۔“ فریڈی نے جواب دیا اور فٹ ویل پر سے اسپورٹس بیگ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے بیگ کی دپ کھولی اور بیگ کے اندر جھانکا۔ پھر لوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اسے میری کے چہرے کے مقابل لہراتے ہوئے بولا۔ ”یہ پچاس کے سو لوٹ ہیں۔ یعنی پانچ ہزار۔ پورے پانچ ہزار اور اس بیگ کے اندر ایسے پچاس ہنڈل اور ہیں۔“

تحمیل آرزو

چوسنے لگا جن میں جلن ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں نشستوں کے درمیان پھٹے ہوئے ٹولوں کی گزریوں پر جمی ہوئی تھیں۔
”فریڈی؟“

بوڑھے فریڈی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میری نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ پھر فریڈی نے اپنی نگاہوں کا رخ کار کی ونڈ اسکرین کی جانب پھیر دیا جو سرخ رنگ کے چھینٹوں سے آلودہ ہو چکی تھی۔

ان کی کار اب لہراتی ہوئی سڑک کی درمیانی پٹی پر چل رہی تھی۔ سامنے سے ایک تیز رفتار ٹرک آرہا تھا۔ کار کے درمیان صرف چند میٹر کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

اس روز یہ دوسرا موقع تھا جب فریڈی خود کو مکمل طور پر چاق و چوبند اور توانا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا ایک اور خواب حقیقت کا روپ دھارنے جا رہا تھا۔ بیچانی کیفیت سے اس کے بدن میں سسنی سی دوڑنے لگی۔ اسے اس طرح اپنے انجام کی توقع تو نہیں تھی لیکن اب اسے اپنی منزل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی پوری زندگی اس لمحے کا منتظر رہا تھا۔ اس نے کار لنگ درتھ خاندان کا نام دنیا کے نقشے پر ثبت کرنے اور تمام اہم اخبارات کی سرخیوں کی زینت بننے کے لیے زندگی بھر انتظار کیا تھا۔

ادھر سامنے سے آنے والے ٹرک کا ہارن قنبلی انداز میں پوری شدت کے ساتھ بچے جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے پیچھے بھی اچانک لگائے جانے والے بریک کے دباؤ سے جھپٹ رہے تھے۔

”فریڈی؟“ میری کی خوف و دہشت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ میری کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سینے کو خاردار خاروں میں جکڑ دیا گیا ہو۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے جیل لے کر کیوں نہ جانا پڑے۔ جیل میں زندہ رہنا بہتر تھا۔ وہ جیل میں کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن کاٹ لے گا۔

”سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، میری۔“ فریڈی نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور خود آگے کی جانب جھک گیا تاکہ اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کے خاتمے کے لیے موت کو سینے سے لگا سکے۔

اب تصادم ناگزیر تھا۔

ایک زوردار دھماکا ہوا اور.....!

یہ کتنی رقم ہوئی؟ پانچ لاکھ۔“

”دو لاکھ پچاس ہزار۔“ میری نے حساب لگاتے ہوئے کہا۔

”کیسی رقم چاہتے تھے دو لاکھ.....“ یہ کہتے ہوئے فریڈی دہرا ہو گیا اور اس پر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔

”تم ٹھیک تو ہوتا فریڈی؟“ میری نے ایک ہاتھ سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

فریڈی نے ہاتھ لہراتے ہوئے اسے پرے رہنے کا اشارہ کیا۔ ”میں..... میں..... بالکل ٹھیک ہوں..... جیسے ا“

”کیا میں کار روک کر تمہارے لیے پانی کی بوتل لاؤں؟“ میری نے کار کی رفتار روک دینی کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ گاڈ! نہیں، ہم..... ہم پانچ منٹ میں..... ٹام اسمتھ کے گھر پہنچ جائیں گے۔“

”کیا تم یقین سے کہہ رہے ہو؟“

”خدا کے لیے، میری! مجھ سے مادرانہ رویے سے کام مت لو۔“ فریڈی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”میں اب بھی تمہارا کیئر اسسٹنٹ ہوں، فریڈی! ہو سکتا ہے کہ وہاں اپنی حد سے آگے بڑھ گیا ہوں لیکن اس کے باوجود بھی تمہاری دیکھ بھال میرے فرائض میں شامل ہے۔“ میری نے کار کی رفتار دوبارہ نارمل کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن زیادہ دنوں تک نہیں، میری۔“ فریڈی نے اپنی نم آنکھوں کو پوچھتے ہوئے کہا۔ پھر بیگ میں سے مزید چند گڈیاں نکال کر میری کے سامنے لہرانے لگا اور بولا۔
”زیادہ دنوں تک نہیں۔“

اتنے میں ہلکی سے پھنکارنے کی سی آواز ابھری۔ پھر دوسرے لمحے فریڈی کے ہاتھوں میں موجود ٹولوں کی گڈیوں میں سے ایک گڈی پھٹ پڑی۔ ساتھ ہی سرخ رنگ کی ڈالی کے دھارے پھوٹ نکلے۔

فریڈی نے ٹولوں کے بنڈل سپیک ویبے۔ دھماکا خیز مواد کی حدت سے اس کی انگلیوں میں جلن ہو رہی تھی۔

”لعنت ہو۔“ میری بڑبڑایا۔ ساتھ ہی ڈالی سے بھرے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے اپنی آنکھیں ذرات اور گڈوں سے پُر محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے اپنے سینے میں خوف و دہشت کی ایک لہری اٹھتی محسوس ہونے لگی۔

”انہوں نے ٹولوں کے درمیان کوئی دھماکا خیز شے رکھی ہوئی تھی۔“ فریڈی نے کہا۔ ساتھ ہی اپنی انگلیاں

خون آشام

کاشف زبیر

ماورائی مخلوق کے وجود سے انکار ممکن نہیں... مگر نظروں سے اوجھل رہنے والی ان مخلوقات کے ذکر سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں... موبوم سٹیوں اور پراسرار ماحول کی پروردہ سنسنی خیز تحیر انگیز کہانی... اس کے دونوں کردار ایک جان دو قالب تھے... اچانک ہی ان کے درمیان ایک خون آشام درندہ داخل ہو گیا۔

دو دوستوں کی طویل رفاقت میں رخسار انداز ہونے والے ناقابل یقین معاملات

باپ کی ساری توجہ اس پر مرکوز رہتی تھی۔ کامیابی کے بعد ہمارے والد صاحبان نے گھر بھی برابر بنوائے تھے۔ اس زمانے میں ڈیفنس نہ بنایا آباد ہوا تھا۔ پلاٹ بہت سستے تھے اور چھ سو گز کے یہ دونوں پلاٹ ساتھ تھے۔ انہوں نے ان پر ہنکے بھی تقریباً ایک جیسے ڈیزائن کے بنوائے۔

جب ہم نے ہوش سنبھالا تو گھر میں آسائش کی ہر شے تھی۔ کبھی کوئی کمی نہیں دیکھی۔ ہم نے اعلیٰ درجے کے اسکولوں اور پھر یونیورسٹیز میں تعلیم حاصل کی۔ مرزا جمال نے انجینئرنگ کا انتخاب کیا اور رسول انجینئر بن کر اپنی فرم کھول لی۔ میں نے فارسی کا انتخاب کیا اور ایم فارسی کر کے ایک دواؤں کی کمپنی میں ملازمت کی اور پھر اپنی کمپنی کھول لی۔ اب میں باہر سے دوائیں منگوا کر انہیں ری پکنگ کے بعد مقامی مارکیٹ میں فروخت کرتا ہوں۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے بزنس میں کامیاب ہیں۔ مزے کی بات ہے عام بزنس مین کی طرح ہمیں صبح سے شام تک سر بھی کھپانا نہیں پڑتا ہے۔ عام طور سے ہم دس بجے تک روانہ ہوتے ہیں اور شام پانچ بجے تک داپس آچکے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے پاس ایک دوسرے کے لیے بہت وقت ہوتا ہے۔

مرزا جمال کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اصل میں اس نے ایک لڑکی کو پسند کیا تھا مگر بد قسمتی سے لڑکی نے اسے پسند نہیں کیا اور ماں باپ کے دباؤ پر پہلے تو مان گئی مگر اچانک ہی اس نے کورٹ میرج کر کے نہ صرف جمال اور

مرزا جمال بیگ کا خیال تھا کہ وہ ڈریکولا بن رہا ہے۔ ڈریکولا یعنی دیسپائر کے ہارے میں سب ہی جانتے ہیں۔ بڑے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، بچے ضرور جانتے ہیں کیونکہ ہالی ووڈ میں اس کردار پر ہر سال کئی کئی فلمیں بنتی ہیں اور وہ تمام فلمیں ہمارے ہاں شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ ناظرین میں اکثر بچے ہوتے ہیں جو دیکھتے بھی ہیں اور پھر ڈر ڈر کر ماں باپ کی زندگی حرام کرتے ہیں۔ اس کا تجربہ میرے چچا زاد بھائی اور اس کی بیوی کو خوب ہو رہا ہے۔ ان کے دونوں بیٹے ہارر فلموں کے دیوانے ہیں۔ ساتھ ہی ڈرتے بھی ہیں۔ رات کو کمرے کے ساتھ موجود ہاتھ روم تک بھی جانا ہوتا تھا ماں باپ میں سے کسی کو ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ بڑے برخوردار مغرب کے بعد لان میں نہیں جاتے اور ان سے چھوٹے اگر سایہ بھی دیکھ لیں تو سارا گھر سر پراٹھا لیتے ہیں۔ مگر آفرین ہے ماں باپ پر جو بچوں کے شوق میں ذرا بھی حائل ہوتے ہوں۔

بات ہو رہی تھی مرزا جمال کی جو میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم نے ایک ہی اسکول میں پڑھا۔ ہمارے باپ آپس میں بزنس پارٹنر تھے۔ دونوں وکیل تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آنے کے بعد انہوں نے وکالت شروع کی اور ایک ساتھ کامیابی کی منزلیں طے کیں۔ اتفاق سے میں اور جمال ماں باپ کے اکلوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میری ایک بہن بھی ہے۔ جمال اس سے بھی محروم ہے۔ مگر اسے خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ اکلوتا ہونے پر خوش تھا کہ ماں

دالے دن کریم خان کی چھٹی ہوتی ہے اور ہم کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔ صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے دو ملازمائیں ہیں جو باری باری دونوں گھروں میں کام کرتی ہیں۔ وہ برسوں سے کام کرتی آرہی ہیں اس لیے ان پر اعتماد ہے اور جب ہم نہیں ہوتے تب بھی وہ پورے گھر میں جہاں چاہیں آ جاسکتی ہیں۔ ڈرائیورز کی ہمیں ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ خود ڈرائیونگ کرتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی مرزا کے وہم کی۔ میں اسے وہم ہی کہوں گا کیونکہ بچپن سے میں نے مرزا کو سخت قسم کا وہم اور وہم پر کامل یقین کرنے والا شخص پایا تھا۔ ویسے تو اسے ایک وہم یہ بھی تھا کہ میرے بغیر اس کی زندگی ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کے لیے انسان کی اہمیت ہوتی ہے مگر ناگزیر کوئی نہیں ہوتا۔ انسان ماں باپ، بہن بھائی اور حتیٰ کہ بیوی بچوں سے محروم ہونے کے باوجود بھی زندہ رہتا ہے۔ مگر اس نے اس وہم کی بھی تردید نہیں کی۔ کیونکہ خود مجھے بھی یہی وہم تھا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے یاد ہے مرزا کو بچپن میں جو پہلا وہم ہوا وہ یہ تھا کہ اس کی ایک ٹانگ غائب ہوگئی ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ سائیکل چلاتے ہوئے گرا اور اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی۔ ڈاکٹر نے

اس کے گھردالوں بلکہ اپنے گھردالوں کو بھی مشہور کر دیا تھا۔ مرزا جمال کو یہ شاک ایسا لگا کہ اس نے ساری عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماں باپ روپیٹ کر ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے اور مرزا جمال آج بھی چالیس سال کی عمر میں کنوا رہا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری شادی ہوئی تھی اور ایک بیٹی بھی ہوئی لیکن پھر ہم میاں بیوی میں اُن اُن ہو گئی۔ زویا مجھ سے کہیں زیادہ دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اس نے بلا تکلف طلاق مانگ لی اور میرے انکار پر عدالت سے خلع لے لیا۔ بیٹی بھی اسی کے پاس ہے اس لیے میں اپنے بچکے میں اکیلا ہوں۔ والد صاحب بھی دو سال پہلے گزر گئے تھے۔ دیکھا جائے تو اب میں اور مرزا ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ ہماری بیشتر شایاں اور چھٹی کے دن ساتھ گزرتے ہیں۔ وہ میرے ہاں آ جاتا ہے یا میں اس کے ہاں چلا جاتا ہوں۔

ہمارے لوگ بھی مشترک ہیں۔ میرا مالی مرزا کے لان کی دیکھ بھال کرتا ہے اور مرزا کا باورچی کریم خان میرے لیے بھی کھانا بناتا ہے۔ وہ پہلے میرا ناشتا بناتا ہے اور پھر جا کر مرزا کا ناشتا بناتا ہے۔ سچ ہم اپنے اپنے آفس میں کرتے ہیں اور ڈنر باری باری ایک جگہ کیا جاتا ہے۔ اتوار



© 2013 PAK SOCIETY.COM

آئے۔ یوں مرزا کو یقین آ گیا کہ حادثہ کسی طرف سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اس نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا شروع کیا۔ مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا کیونکہ ایک وہم اس کی جان چھوڑتا تھا تو فوراً ہی کوئی دوسرا وہم اس کے سر پر سوار ہو جاتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ ہم بڑے ہوئے اس کی شادی نہ ہو سکی۔ میری ہوگئی مگر انجام کار میں بھی اکیلا رہ گیا اور اب ہم ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزار رہے تھے۔ تازہ ترین وہم یوں ہوا کہ مرزا جو واحد کام میرے بغیر کرتا تھا وہ رات کی داک تھی۔ میں کابل نہیں ہوں مگر رات کے کھانے کے بعد داک کے خیال سے مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔

مرزا داک کے لیے نزدیکی پارک تک جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی علاقے کا قبرستان بھی تھا۔ شروع میں یہاں اتنی قبریں نہیں تھیں مگر اب یہ خاصاً آباد ہو گیا ہے۔ ویسے تو پارک بہت خوب صورت اور ہرا بھرا ہے لیکن شام کے وقت یہاں سناٹا چھا جاتا ہے اور وجہ صاف ظاہر ہے۔ مرزا کو یہی سناٹا پسند ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے روزانہ ڈنر کے بعد آدھے گھنٹے کی داک کے لیے جاتا ہے۔

میں ڈنر کے بعد ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتا ہوں۔ ٹاک شو یا کوئی اور پرائم ٹائم شو دیکھتا ہوں۔ مرزا کی دایسی پر ہم چائے اور کافی سے مشغول کرتے ہیں۔ مجھے کافی پسند ہے اور مرزا کو چائے۔ کریم خان یہ آخری کام کر کے چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم اس وقت تک گپ شپ کرتے جب تک نیند نہیں آنے لگتی۔ اتفاق سے اس دن میرے ہاں ڈنر تھا۔ کریم خان گھر جانے کے لیے کچھ بے تاب تھا۔ وہ مرزا کی کوٹھی میں سرورٹ روم میں رہتا تھا اور ان دنوں گاؤں سے اس کی بیوی آئی ہوئی تھی اس لیے میں اس کی بے تابی کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ جیسے ہی من گیسٹ کھلنے کی آواز آئی اس نے مجھ سے کہا۔ ”صاحب چائے کافی لے آؤں۔“

میں نے ذرا الجھ کر شیشے کے پار دیکھا تو مجھے مرزا حیرت زدگی کے ساتھ آٹا دکھائی دیا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”لے آؤ۔“

کریم خان کے بکن کی طرف جاتے ہی مرزا لاؤنج میں داخل ہوا۔ میں چونکا کیونکہ مرزا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اندر داخل ہونے کے بعد ایک بار پلٹ کر دیکھا اور پھر میری طرف آیا۔ میں نے پوچھا۔ ”خیر تو ہے، کہیں پھر کسی نے پیچھا تو نہیں شروع کر دیا۔“

اس کے شور شرابے سے گھبرا کر اسے سن کرنے والا انجکشن لگا دیا۔ اس کے بعد ورد تو ختم ہو گیا مگر مرزا نے اس بات پر واویلا کیا کہ اس کی ٹانگ غائب ہوگئی ہے۔ حالانکہ ٹانگ سامنے بھی مگر مرزا کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب اس کی ٹانگ موجود ہے تو محسوس کیوں نہیں ہو رہی اور وہ یہ وضاحت ماننے کو بھی تیار نہیں تھا کہ انجکشن نے اسے سن کر دیا ہے۔

اس سارے قصے کے دوران میں میرا ہنس ہنس کر بڑا حال تھا اور مرزا اس بات پر مجھ سے باقاعدہ خفا ہو گیا۔ دو دن اس نے مجھ سے بات نہیں کی۔ ٹانگ کا سن ہونا تو بارہ تیرہ گھنٹے بعد ختم ہو گیا مگر مرزا کو بہت عرصے تک یہ وہم رہا اور وہ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے اپنی ٹانگ چیک کرتا تھا کہ وہ موجود ہے یا نہیں۔ دوسرا یادگار وہم اسے آغاز جوانی میں ہوا جب ہم میٹرک میں تھے اور ہمارے کلاس فیلوز سامنے موجود گورنر اسکول سے نکلنے والی لڑکیوں کا پیچھا کرتے تھے۔ مرزا کو یہ وہم ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا کرتا ہے۔ یہ سن کر میں اس بار بھی ہنسا تو اس نے حلقی سے کہا۔ ”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”یار تم کیا کوئی لڑکی ہو جس کا پیچھا کیا جائے۔“
”تو کیا صرف لڑکیوں کا پیچھا کیا جاتا ہے؟“
”میں نے تو کسی کو کسی لڑکے کا پیچھا کرتے نہیں دیکھا۔“

مگر مرزا کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ بہت عرصے تک وہ راہ چلتے چوتنگ کر پیچھے دیکھتا رہتا اور کئی بار تو اس نے اپنے طور پر کسی کورنگے ہاتھوں پکڑا بھی تھا۔ وہ مجھ سے کہتا۔ ”دیکھ یار، یہ بندہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔“

مگر وہ بندہ عام طور سے اپنی راہ کا مسافر نکلتا تھا۔ ہم کالج میں آگئے اور اب ہم گاڑی میں آتے جاتے تھے۔ میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور پاپا نے مجھے کار دلا دی تھی۔ اب گاڑی میں سفر کے دوران اسے نیا وہم یہ لاحق ہوا کہ رائٹ سائڈ سے آنے والی گاڑی کے تصادم میں وہ مارا جائے گا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ایسا شاذ ہی ہوتا ہے مگر جو بات ایک بار مرزا کے دماغ میں بیٹھ جاتی وہ اتنی آسانی سے نہیں نکلتی۔ اس نے فرنٹ سیٹ کے بجائے پچھلی نشست پر بیٹھنا شروع کر دیا اور وہ بھی میری دالی سمت میں۔

یہ وہم یوں ختم ہوا کہ ایک دن میں نے اپنی طرف سے کار معمولی رفتار سے ایک درخت سے ٹکرا دی۔ اس حادثے میں کار پر ڈینٹ پڑ گئے مگر ہم دونوں کو معمولی زخم

خون آشام

میں ہنسا۔ ”اللہ کو مانو مرزا۔ انسان کے جھلا ایسے دانت ہوتے ہیں؟“

مرزا نے ایک بار پھر میرے کان میں گھس کر کہا۔ ”وہ انسان نہیں تھا مگر انسان جیسا تھا۔“

مرزا دو بار مجھ سے چکا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کانپ رہا ہے اور اس کا جسم بالکل سرد ہو رہا تھا۔ ”انسان جیسا تھا... کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ ڈریکولا تھا۔“

میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑا۔ ”لگتا ہے تم نے بھی ہارر سوویز دیکھنا شروع کر دی ہیں۔“

”میں مذاق نہیں کر رہا، سچ کہہ رہا ہوں۔“

”یار اول تو اس قسم کے فرضی کردار صرف کہانیوں اور فلموں میں ملتے ہیں۔ دوسرے ڈریکولا مقامی کردار نہیں ہے۔ اگر تم جڑیل، سرکے یا کسی ایک آنکھ والے جن کی بات کرتے تو میں غور بھی کرتا مگر ڈریکولا... لاجول ولا...“

”تم ایک منٹ کے لیے میری بات سن لو۔“

”ضرور لیکن چائے پیتے ہوئے۔“ میں نے اس کا گگ اسے تھمایا اور اپنا گگ اٹھالیا۔ مرزا نے بڑا سا گھونٹ لیا اور بولا۔

”میں داک کر رہا تھا، تم نے داک ٹریک دیکھا ہے؟“

”ہاں پارک کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔“

”میں اسی پر چل رہا تھا۔ دوسرے چکر میں جب قبرستان والی دیوار کے پاس سے گزرا تو مجھے جھاڑیوں میں سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ مگر میں نے توجہ نہیں دی میں سمجھا کوئی بلی جھاڑیوں میں گھسی ہوئی ہے۔ مرزا کہہ رہا تھا۔“ جب میں دوسرے راؤنڈ میں وہاں پہنچا تو مجھے لگا کہ جھاڑیوں میں موجود چیز خاصی بڑی ہے اور وہ مسلسل حرکت کر رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے توجہ نہیں دی۔“

”اب تم اسے کتا سمجھو گے؟“ میں نے لقمہ دیا۔

”بالکل میں کتا ہی سمجھا تھا۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”تم جانتے ہو میں پارک کے پانچ چکر لگاتا ہوں۔ چوتھے چکر میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ چیز میرے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں چل رہی ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے، جھاڑیاں بہت گھنی ہیں اور ان میں آرام سے چلنا ممکن نہیں ہے۔“ میں نے اعتراض کیا۔

مرزا نے میرے برابر میں بیٹھ کر اور مجھ سے کسی قدر چپک کر میرے کان میں تقریباً گھس کر کہا۔ ”خان مجھے کسی نے کاٹ لیا ہے۔“

میرا نام انیس الدین خان ہے اور مرزا مجھے خان کہتا ہے جیسے میں اسے مرزا کہتا ہوں۔ میں نے ذرا پیچھے ہو کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”کاٹ لیا ہے؟“

اس نے زور سے سر ہلایا۔ ”ہاں میری گردن کے پیچھے کاٹ لیا ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں اس سے گردن دکھانے کی فرمائش کرتا کریم خان ٹرے لیے لاؤنج میں آیا۔ اسے دیکھتے ہی مرزا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ناک کی سیدھ میں گھورنے لگا۔ کریم خان نے ٹرے رکھی اور اس سے پہلے کہ وہ اجازت طلب کرتا مرزا نے کہا۔ ”تم اب جاؤ۔“

”شکریہ صاحب۔“ اس نے خوش ہو کر کہا اور باہر کی طرف لپکا۔

میں نے گھنڈی سانس لی۔ ”بیوی بھی کیا چیز ہے، وہ تب بھی سکون نہیں ہے اور نہ ہوتی بھی آدمی بے چین رہتا ہے۔“

”بیوی کو گولی مارو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اول تو میری بیٹی چھوٹی ہے اور اسے ماں کی ضرورت ہے دوسرے اب وہ میری بیوی نہیں رہی۔“

”پارہ اقامت کرو۔“ وہ پُر دھشت لہجے میں بولا۔ ”مجھے سچ سچ کسی چیز نے کاٹا ہے۔“

میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”کہاں کاٹا ہے؟“

مرزا نے گول گتے والی لی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے پیچھے سے گلا گھچ کر نیچے کیا اور بولا۔ ”دیکھو۔“

اس کی گردن پر ہاتھیں شانے سے ذرا اوپر دو سوراخ لہا نشانات تھے اور ان سے ہلکا سا خون نکل کر جم گیا تھا۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”ہاں دو معمولی سے زخم ہیں لیکن اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟“

”بات ہے، مجھے کسی چیز نے کاٹا ہے۔“

”وہاں اکثر چگاڈوں الٹی رہتی ہیں، کسی چگاڈوں نے کاٹ لیا ہوگا۔ یہ کوئی اتنی زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔ ہاں کل تم ڈاکٹر کو دکھالینا۔ ممکن ہے کوئی ٹریٹ منٹ کرنا ہو۔“

”چگاڈوں نے نہیں کاٹا ہے۔“ اس نے انکار کیا۔ ”مجھے کسی انسان نے کاٹا ہے۔“

”اس پر تو مجھے بھی حیرت ہوئی۔ ان میں سے کئی جھاڑیاں کانٹے دار ہیں اور اگر کوئی ان میں گھسے تو تم اس کا حشر سوچ سکتے ہو۔ مگر اس کے باوجود جھاڑیوں میں جو چیز بھی وہ تقریباً میری رفتار سے چل رہی تھی۔ حالانکہ میں خاصی تیز واک کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے اس کے بعد کیا ہوا؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”اب مجھے ذرا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ میں آخری چکر میں جب قبرستان والی دیوار تک پہنچا تو وہ بھی میرے ساتھ تقریباً بھاگنے لگا۔ جب اسکوائر کے کونے تک پہنچ کر میں مڑا تو مجھے لگا جیسے جھاڑیوں سے نکل کر کوئی بیولا مجھ پر چھٹا ہو۔ اس نے میری گردن پر منہ مارنا چاہا مگر میں تیزی میں آگے نکل گیا اور صرف اس کے دانت میری گردن کے پچھلے حصے کو چھو سکے۔ اس کے بعد میں نے بھاگنا شروع کیا تو مجھے ہوش نہیں رہا اور جب حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو تمہارے گھر کے گیٹ پر پایا۔“

”جب تم آخری چکر میں قبرستان والی دیوار کے ساتھ چل رہے تھے کیا تب بھی جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز آرہی تھی؟“

”نہیں، اس چکر میں کوئی آواز نہیں آئی کیونکہ وہ آخری حصے میں جھاڑیوں میں دیک کر بیٹھا ہوا تھا۔“

”تم نے جھپٹنے والے کو واضح دیکھا؟“

”نہیں، وہ پیچھے سے آیا تھا اور اس طرف تاریکی بھی تھی۔“

”پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ کون تھا؟“

”میں نے بیولا محسوس کیا تھا اور اس کی غراہٹ سنی تھی، ایک بار نہیں بلکہ جب میں بچ کر بھاگا تب بھی عقب سے اس کی غراہٹ سنائی دی تھی جیسے شکار ہاتھ سے نکلنے پر مایوس ہو۔“

”تم نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا؟“

”اگر اس وقت مجھے ایک بار پلٹ کر دیکھنے کے عوض امریکا کی صدارت بھی مل رہی ہوتی تو میں انکار کر دیتا۔“

میں نے کافی کا خالی گم میز پر رکھا اور انگلیوں پر گننے لگا۔ ”تم نے کسی کو دیکھا نہیں، پھر پلٹ کر نہیں دیکھا، تیسرے جھپٹنے والے نے صرف دانتوں کا استعمال کیوں کیا جبکہ اس کے ہاتھ بھی ہونے چاہئیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تمہارے پیچھے کیوں نہیں آیا؟“

”میں نہیں جانتا۔“ مرزا نے نفی میں سر ہلایا۔

”تب وہ چگاڑ ہی ہوگی کیونکہ وہ پُر پھیلا کر جھپٹتی ہے اور صرف دانتوں کا استعمال کرتی ہے۔ اس کا سائز شاید بڑا ہوگا اس لیے تمہیں لگا کہ کوئی آدمی جھپٹا ہے۔ اس کے دانت تمہیں لگے اور اس کے بعد تم بھاگ کھڑے ہوئے۔“

چگاڑ کا دوار خالی گیا اور ممکن ہے وہ غرائی بھی ہو۔ وہ تمہیں پکڑ نہیں سکتی تھی اور نہ تمہارے پیچھے آسکتی تھی۔“ میں نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔ مگر مرزا کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس سے متفق نہیں تھا۔

”اگر وہ چگاڑ تھی تو جھاڑیوں میں کیسے چل رہی تھی؟“

”ممکن ہے جھاڑیوں میں سچ سچ کوئی کتا یا بڑی بلی ہو۔ وہاں جو ہے بکثرت ہوتے ہیں، ان کے چکر میں بلیاں بھی آتی ہیں۔ چگاڑ کے حملے کا اس چیز سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم دو الگ چیزوں کو ملا کر پیش کر رہے ہو۔“

اپنا کلمہ رد کیے جانے پر مرزا کسی قدر جھنجھلا گیا۔ ”تم ہمیشہ میری بات کی مخالفت کرتے ہو۔“

”اگر وہ بات معقولیت سے دور ہو اور تمہارے دھمکوں میں شامل ہو تو۔“ میں نے کہا۔ ”تم خود سوچو کہ آج نکت مغرب میں کوئی اصل ڈریکولا سامنے آیا۔ جس شخص کو اصل میں ڈریکولا کہا جاتا ہے وہ صرف ایک ظالم جاگیردار تھا اور اس کے لغوی معنی ہیں شیطان کا بیٹا۔ اب بتاؤ اس میں خون پینے کی روایت کہاں سے آگئی؟“

”وہ تو ہے بھی۔“ مرزا نے کہا۔ ”تب ہی اس پر اتنا لکھا گیا ہے، سوویزیٹی ہیں۔“

”صرف اس لیے کہ یہ ایک دلچسپ ہارر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایک منٹ روک میں تمہارے زخم صاف کرتا ہوں، کہیں انفیکشن نہ ہو جائے۔ کل تم لازمی ڈاکٹر کو دکھا لیتا۔“

لیکن جب میں اپنا میڈیکل بکس لے کر آیا تو مرزا جا چکا تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس بار مرزا کو وہم نہیں ہوا تھا، اسے سچ سچ کسی چیز نے کاٹا تھا مگر وہ چیز ڈریکولا نہیں ہو سکتی تھی جیسا کہ مرزا کا خیال تھا۔ ہو سکتا ہے وہ چگاڑ یا اسی قبیل کا کوئی اڑنے والا پرندہ یا کبوتر ہو جس نے مرزا کو کاٹا ہو۔ اگلے دن کریم خان ناشتا بنانے آیا تو اس نے بتایا۔ ”صاحب ابھی سو رہے ہیں، ہم نے جگا یا مگر وہ اٹھے نہیں۔“

”شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

خون آشام

ہے تو ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھا رہے؟

یہ ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس نے ایک آنکھ کھل سے نکال کر کہا جو خاصی سرخ ہو رہی تھی۔

”امتحانہ باتیں مت کرو مرزا۔“ میں کرسی سے اٹھ کر پاس بیٹھ گیا۔ ”بیماری کا علاج ڈاکٹر کا نہیں تو کیا کسی ملکینک کا مسئلہ ہوتا ہے۔ میں ڈاکٹر کو کال کر رہا ہوں۔“

مرزا نے مجھے موبائل نکالتے دیکھا تو جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا سلیپنگ سوٹ بالکل خشک تھا جبکہ اسے پسینے ہونا چاہیے تھا اور اس کے کھلے بازو پر رونگٹے یوں گھڑے تھے جیسے اسے بچ بچ سردی لگ رہی ہو۔ ادھر میرا پسینا بہنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نہیں ڈاکٹر کو کال مت کرو، میرا خیال ہے میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”یہ تو تمہارا خیال ہے اگر ایسا نہ ہوتا؟“

”جب تم ڈاکٹر کو کال کرو گے لیکن پلیر، ابھی مجھے مت چھیڑو۔“ اس نے کہا اور دوبارہ کھل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

”ادکے۔“ میں نے کہا۔ ”میں کل تک دیکھوں گا۔ یہ بتاؤ تم نے کچھ کھایا ہے۔“

”میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میں نے کل رات کے بعد سے کچھ نہیں کھایا۔“

یہ بات ناقابل یقین تھی کہ مرزا تقریباً چوبیس گھنٹے سے بھوکا تھا۔ وہ بھوک کا کچا تھا اور کھانے میں ذرا تاخیر اسے مشکل سے برداشت ہوتی تھی۔ اگر کسی شادی کی تقریب میں کھانے میں دیر ہو جائے تو مرزا کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ اس نے چوبیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا اور یہ قول اس کے چونکہ اسے بھوک بھی نہیں تھی تو معاملہ واقعی تشویشناک تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم کچھ کھاؤ، دودھ ہی پی لو۔“

”میں کچھ نہیں کھا سکتا۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے کھانے کے خیال سے ابکالی آرہی ہے۔“

مجھے خیال آیا کہ میں ڈاکٹر رضوان سے بات کر رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ مسئلہ اتنا بڑا نہ ہو جتنا میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن جب میں اٹھنے لگا تو مرزا نے کہا۔ ”خان تم یہ بات کسی سے نہیں کہو گے۔“

”کون سی بات؟“ میں نے انجان بن کر کہا۔

”یہی میری کیفیت والی تم ڈاکٹر رضوان کو بھی کال نہیں کرو گے۔“

”میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔“ ٹھیک ہے میں کسی

”تم دیکھتے رہنا اگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر کو بلا لینا اور مجھے بھی کال کرنا۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“ کریم خان نے کہا۔ ”میں خیال رکھوں گا۔“

میں دفتر گیا۔ وہاں مصروفیات میں الجھا تو ذہن میں مرزا کا خیال نہیں آیا۔ شام کو ذرا فرصت ملی تو اسے کال کر رہا تھا کہ ایک پارٹی کی کال آگئی اور پھر اس سے بزنس کی گفتگو میں ایسا پھنسا کہ گھر روانہ ہوتے ہوئے بھی سات بج گئے۔ میرا دفتر ڈیفنس سے نزدیک ایک انڈسٹریل ایریا میں تھا۔ جہاں میرے دفتر کے ساتھ ہی چھوٹا ساری پینٹنگ اور پینٹنگ پلانٹ تھا۔ اگرچہ میرے پاس ادویات سازی کا لائسنس بھی تھا مگر فی الحال میں نے اس شعبے میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ میرا پینٹنگ اور ری پینٹنگ کا صاف ستھرا کام اچھا خاصا چل رہا تھا کیونکہ اب لوگوں میں باہر کی دواؤں استعمال کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہ مہنگی لیکن معیاری ہوتی ہیں۔ گھر آتے آتے مجھے ساڑھے سات بج گئے تھے۔ گرمی کے دن تھے اور سورج ابھی غروب ہوا تھا۔ اس کی روشنی کسی قدر ہاتی تھی۔ میں گاڑی سے اتر کر مرزا کے گھر کا رخ کیا جہاں کریم خان پریشان سا موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”صاحب کچھ کریں، صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”تم نے ڈاکٹر کو کال کی تھی؟“ میں نے مرزا کے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، انہوں نے منع کر دیا۔ میں نے پھر کہا تو ڈانٹ کر کمرے سے نکال دیا اب کھل اوڑھے لیٹے ہیں۔“

میں رک گیا۔ ”اسے سی اتنا تیز کیوں کیا ہے جب طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟“

”صاحب اسے سی کہاں چل رہا ہے، صاحب نے پتکھا بھی بند کر دیا کہ سردی لگ رہی ہے۔“

میں اب فکر مند ہو گیا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے مرزا نے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کریم خان نے سمجھ لیا اور بولا۔ ”صاحب کہہ رہے ہیں دفع ہو جاؤ۔“

”مرزا یہ میں ہوں۔“ میں نے بلند آواز سے کہا۔

اس بار اس نے کچھ نہیں کہا اس لیے میں اندر آ گیا۔ اسے سی اور پتکھا بند ہونے سے کمر اخاصا گرم ہو رہا تھا۔

”دروازہ بند کر دو۔“ اس نے کہا۔

”مرزا کیا بات ہے اگر تمہاری طبیعت زیادہ خراب

سے نہیں کہوں گا لیکن کل صبح تک اس کے بعد تم مجھے نہیں روک سکو گے۔"

میں گھر آیا تب بھی میری تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد میں پھر مرزا کو دیکھنے گیا تو اس کی وہی کیفیت تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہی بڑے کام میں صبح کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے اب کچھ نہیں ہو سکتا اس نے میری رات رکنے کی پشیمانی بھی مسترد کر دی۔

"تم فکر مت کرو، مجھے لگ رہا ہے کہ میں صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

مجھے قطعی امید نہیں تھی لیکن جب میں صبح ناشتا کرتے ہی مرزا کے پاس آیا تو اسے ڈاکٹرنگ ٹیبل پر چائے کے ساتھ اخبار دیکھتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔ "اب کیا حال ہے؟"

"تم دیکھ رہے ہو۔" وہ مسکرایا۔ "اب سردی بھی نہیں لگ رہی ہے اور میں خود کو بالکل چاق و چوبند محسوس کر رہا ہوں۔"

"تم نے ناشتا کیا؟"

"ہاں۔۔۔" اس نے کسی قدر ہچکچا کر کہا۔ "تم دفتر جا رہے ہو؟"

"ہاں، تم جاؤ گے؟"

"بالکل کھل بھی نہیں جاسکا تھا، کچھ اہم کام ہیں۔"

"کیا خیال ہے ڈنر کسی اچھی جگہ کریں۔ آج مجھے دیر ہوگی، میں براہ راست آ جاؤں گا۔"

مرزا نے سر ہلایا اور اپنے پسندیدہ سی فوڈ ریسٹوران کا نام لیا۔ "یہاں چلتے ہیں۔"

"ڈن، میں سات بجے تک پہنچ جاؤں گا، دیر کی تو اپنی پسند کی ٹیبل مشکل سے ملے گی۔"

مرزا کو ٹھیک ٹھاک دیکھ کر میں نے سکون محسوس کیا اور زیادہ اچھی بات یہ تھی کہ اس نے پرسوں رات وانے والے قے پر بات نہیں کی تھی۔ میں واپس آیا اور تیار ہو کر دفتر روانہ ہو گیا۔ آج بھی دفتر میں مصروفیت زیادہ تھی۔ جب میں ریسٹوران پہنچا تو مرزا آچکا تھا اور اس نے میز حاصل کر لی تھی۔ یہ دوسرے فلور پر سمندر کے بالکل سامنے تھی۔ شیشے کے پار ساحل پر لگی تیز روشنیوں میں سمندر کی لہریں دور تک واضح دکھائی دیتی تھیں اور یہاں بیٹھ کر ڈنر کرنے کا مزہ دو بالا ہو جاتا تھا۔ مرزا کو جیسے پسند تھے اور مجھے چھلی۔ ہم نے اپنی اپنی پسند کی ڈشز کا آرڈر کیا۔ مرزا نے بے تابانہ سے ہاتھ ملے۔ "مجھے آج ایسی بھوک لگ رہی ہے جس کا

اس سے پہلے تجربہ نہیں ہوا۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"تم یقین کرو گے میں پونے سات بجے کا یہاں بیٹھا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں ہنسا۔ "مجھے معلوم ہے تم بھوک کے کچھ ہو۔"

جیسے ہی ڈشز آئیں مرزا کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے نہایت تیزی سے اپنی ڈش ختم کی۔ یہ سادہ چاول کے ساتھ جینے کے اور سر کے کی ڈش تھی۔ جو اسے بہت پسند تھی۔ مرزا بہت خوش نظر آ رہا تھا مگر اس کے بعد جو ہوا، وہ خاصا خوفناک تھا اور اس نے نہ صرف میرا بلکہ وہاں موجود کئی افراد کا کھانا حرام کر دیا تھا۔ مرزا نے اچانک منہ پر ہاتھ رکھا اور پھر تیزی سے اٹھا تھا کہ اس کے منہ سے قے کی بو چھاڑ ہوئی۔ جو نہ صرف فرش پر بلکہ پاس موجود ایک میز تک گئی جس پر ایک جوڑا کھانے میں مصروف تھا۔ عورت نے ہذیبی انداز میں چیخ ماری اور مرد پھر کر اٹھا تھا مگر وہ مرزا کو کیا کہتا جو الٹیاں کر کے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ میں بہ مشکل اسے پکڑ کر ریسٹوران کے واش روم تک لایا مگر وہاں تک آتے ہوئے وہ اپنا معدہ مکمل طور پر صاف کر چکا تھا۔ منہ دھو کر اور کلیاں کر کے اسے کچھ اطمینان ہوا۔ مگر اس کا لباس خراب ہو گیا تھا اور ویسے بھی اس نے وہاں جو کیا تھا اس کے بعد ٹھہرنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے بل ادا کیا اور اسے باہر لے آیا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی سرد ہوا نے اس کے حواس بحال کیے تو اس نے مجھ سے معذرت کی۔

"معاف کرنا یار، میں نے تیرا کھانا بھی حرام کر دیا۔"

"کوئی بات نہیں لیکن یہ کیا تھا، کیا کھانے میں کوئی مسئلہ تھا؟"

"نہیں کھانا بالکل ٹھیک اور بہت اچھا تھا۔ میں کھا کر بہت اچھا محسوس کر رہا تھا مگر اچانک مجھے معدے پر بوجھ محسوس ہوا اور پھر میں کسی طرح بھی قے روک نہیں سکا۔"

"تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔"

"نہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔ "اب مجھے اور یقین ہو گیا ہے کہ یہ مسئلہ ڈاکٹر کے بس کا نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے مجھے کچھ کھائے ہوئے آج دو دن ہو گئے ہیں اور ابھی جو میں نے کھا یا وہ تو سب ہی نکل گیا۔"

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمہاری طبیعت خراب

ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

"اس کے برعکس میں خود کو بالکل فٹ اور ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے تردید کی۔ "مجھے ڈرامہ کمروری محسوس نہیں ہو رہی ہے۔"

"ایسا کیسے ممکن ہے، ایک آدمی دو دن کچھ نہ کھائے اور وہ خود کو بالکل ٹھیک محسوس کرے؟"

"اسی بات سے تو مجھے یقین ہو گیا ہے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "کہ مجھے کسی ڈریکولہ نے کاٹا ہے اور میں ڈریکولہ بن رہا ہوں۔"

میں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ "واقعی..." کیا تم خون کی پیاس محسوس کر رہے ہو؟"

اس نے ہچکچا کر کہا۔ "نہیں، مجھے تو اس خیال سے گھن آرہی ہے۔ لیکن اس کی اور کیا وجہ پیش کی جاسکتی ہے؟"

"تم بیمار ہو۔" میں نے کہا۔ "جب تک تم ڈاکٹر کو نہیں دکھاؤ گے، پتا کیسے چلے گا کہ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ میں بتا چکا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا اور ہم واپس گھر کی طرف آئے مگر میں نے اپنی کار قبرستان والے پارک کے ساتھ روکی۔ مرزا نے بھی اپنی کار وہیں روک لی۔

"یہاں کیوں رکے ہو؟"

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں اندر نہیں جاؤں گا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"دیکھو مرزا اگر تمہاری بات درست ہے اور تمہیں کسی ڈریکولہ نے کاٹا ہے تو تمہیں اب ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تم ان کی برادری میں شامل ہو گئے ہو اور دوسری صورت میں..."

"مجھے تمہارا خوف ہے۔" مرزا نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "کہیں تمہارے ساتھ بھی ایسی کوئی بات نہ ہو جائے۔"

"میں ان چیزوں کو نہیں مانتا۔"

"مانتا تو میں بھی نہیں ہوں لیکن..."

مرزا کی بات پوری ہونے سے پہلے میں اسے سمجھ کر پارک کے اندر لے گیا اور اس طرف بڑھا جہاں بہ قول مرزا گے اسے کسی نے کاٹا تھا۔ اس جگہ جھاڑیاں قبرستان کے بڑھ جانے والے درختوں سے مل رہی تھیں اور یہاں خاصی

تاریکی تھی۔ میں نے مرزا کی جگہ خود کو کھڑا کر کے عقب میں دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے سوائے تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اتفاق سے پارک کی ردشیاں بھی یہاں سے خاصے فاصلے پر تھیں اور سامنے کی طرف بھی یہ جگہ خاصی نرم تاریک لگ رہی تھی۔ میں نے مرزا سے کہا۔ "مجھے یہاں پیچھے کچھ نظر نہیں آ رہا تو تم نے کیسے دیکھ لیا؟"

"بس میں نے دیکھ لیا۔" اس نے غصے سے کہا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔

"ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔"

"میں کہیں نہیں جا رہا۔" اس نے کہا اور کار کا دروازہ زور سے کھولا تو وہ اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ میں اور مرزا دونوں دم بہ خود رہ گئے۔ اس کے پاس جاپان اسمبلڈ لکڑی کار تھی اور اس کی باؤی اور تمام چیزیں بہت مضبوط تھیں مگر دروازہ یوں اس کے ہاتھ میں آ گیا جیسے گتے کا بنا ہو اور مرزا نے وزنی دروازہ یوں اٹھایا ہوا تھا جیسے وہ سچ سج گتے کا ہو۔ پھر اچانک اس نے دروازہ دور پھینک دیا۔ میں اس کی طرف لپکا۔

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ "پتا نہیں کیسے یہ دروازہ اکھڑ گیا۔"

"کسی وجہ سے کمزور ہو گیا ہو گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "بعض اوقات ایسے فالٹ آ جاتے ہیں۔"

"شاید۔" اس نے بے یقینی سے کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی وضاحت سے میں خود بھی مطمئن نہیں تھا۔ اگر دروازے میں کوئی مسئلہ تھا تب بھی وہ اس طرح سے الگ ہو کر ہاتھ میں نہیں آ سکتا اور مرزا نے اسے بہت آرام سے اٹھایا ہوا تھا۔ پھر اس نے اسے فٹ ہاتھ پر پھینک دیا۔

جب میں اسے اٹھا کر گاڑی کے ہڈ پر رکھ رہا تھا تو مجھے پتا چلا کہ یہ خاصا وزنی تھا اور میں نے مشکل سے اٹھایا تھا۔ مرزا گھر روانہ ہو گیا۔ جب میں نے اپنے پورچ میں کار روکی تو وہ اندر جا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اس کے پاس پہنچا تو وہ شکر سالانچ میں موجود تھا۔ کریم خان ہمیں دیکھ کر کافی اور چائے لے آیا۔ میں نے مرزا کی طرف دیکھا۔

"تم چائے تو پی رہے ہو۔"

"ہاں، میں کل سے پانی بھی پی رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "دو بار کوئلہ ڈرنک بھی پی ہے لیکن جب دودھ پیتا تو پھر وہی ہوا تھا۔"

"الٹی میں نکل گیا؟"

جاسوسی ڈائجسٹ 213 دسمبر 2014ء

ہے اور اس کی ہاتھوں سے نہ صرف دودھ دانت لٹکے ہوئے تھے بلکہ ان سے خون بھی ٹپک رہا تھا اور جیسے ہی وہ میری طرف لپکا میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے لاجول پڑھی کہ مرزا نے میرا بھی دماغ خراب کر دیا تھا تبھی مجھے ایسا خواب دکھائی دیا۔ صبح میں جاگا تو سر میں درد تھا مگر آج بھی آفس جانا لازمی تھا اس لیے تیار ہو کر چلا گیا۔ راستے میں کال کر کے مرزا کی خیریت پوچھی تو اس نے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں اور خود کو فٹ محسوس کر رہا ہوں۔"

"میں شام کو جلد آنے کی کوشش کروں گا۔"

"فی الحال تو میں بھی دفتر کے لیے تیار ہو رہا ہوں۔"

مرزا نے کہا۔ "شاید مجھے بھی دیر ہو جائے۔"

لیکن اس دن مجھے دفتر میں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ میں ساڑھے نو بجے دفتر سے نکل رہا تھا کہ مرزا کی کال آئی۔ "تم کہاں ہو اب تک آئے نہیں۔"

مرزا کے لہجے میں اضطراب تھا۔ "کیوں کیا ہوا، خیریت تو ہے؟"

"ہاں سب خیریت ہے لیکن میرے ساتھ کچھ عجیب ہو رہا ہے، تم آؤ تو میں بتاؤں گا۔"

میں ہر ممکن تیزی سے گھر پہنچا پھر مرزا کے گھر میں داخل ہوا تو وہ مجھے باہر ہی لان میں ٹھہتا ہوا مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی سرگوشی میں بولا۔ "آج میں داک کے لیے پارک گیا تھا۔"

"تو پھر؟" میں نے کسی قدر مزاحیہ انداز میں کہا۔ "اس ہار کوئی چیز مل گئی یا پھر کسی ڈریکولا سے ملاقات ہو گئی۔"

"خان مذاق مت کر۔" اس نے کہا۔ "تمہیں پتا ہے میں پارک کے چار چکر لگاتا ہوں لیکن آج میں نے دس منٹ میں دس چکر لگ لیے۔"

میں سنجیدہ ہو گیا۔ "یعنی ایک منٹ میں ایک چکر؟"

"بالکل۔"

"یہ تو خاصی تیز رفتار ہے۔" میں نے کہا۔

"مزے کی بات سنو، میں تو بجے پارک میں داخل ہوا۔ داک کے آغاز سے پہلے میں ہمیشہ گھڑی دیکھتا ہوں اور ہر چکر مکمل ہونے کے بعد بھی گھڑی دیکھتا ہوں۔ پہلے پانچ چکر میں نے ذرا کم رفتار سے کوئی آٹھ منٹ میں مکمل کیے اور اس کے بعد آخری پانچ چکر بہت تیزی سے مکمل کیے۔"

"یعنی دو منٹ میں پانچ چکر؟" اب میرے لیے

اس نے سر ہلایا۔ "میرے ساتھ کچھ غلط ہو رہا ہے۔"

"اس کا پتا تو ڈاکٹر سے چیک آپ یا ٹیسٹ سے ہی چلے گا۔" میں نے کہا۔ "اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔"

"فی الحال میرا ڈاکٹر کے پاس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور نہ ہی میں اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے انکار کیا۔ "بلکہ میں اپنے اندر ایسی توانائی محسوس کر رہا ہوں جو اس سے پہلے میں نے بھی محسوس نہیں کی۔"

"خدا کے لیے یار۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں ڈریکولا کے موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور ویسے بھی آج کل نئی نئی بیماریاں وجود میں آرہی ہیں۔ ممکن ہے یہ بھی اسی قسم کی کوئی چیز ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے آج تک کسی ایسی بیماری کا نہیں سنا جس میں انسان خود کو چاق و چوبند محسوس کرے۔"

"دیکھو دوا میں میری فیلڈ ہیں اور میں جانتا ہوں کہ بعض کیمیکلز اور اسٹرائیڈز ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو وقتی طور پر بہت چاق و چوبند اور توانا کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے دور رس نتائج بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ اکثر کھلاڑی اچھی کارکردگی کے لیے انہیں استعمال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس قسم کے کیمیکلز اور اسٹرائیڈز کو غیر قانونی قرار دیا ہے اور کوئی کھلاڑی انہیں استعمال کرتے ہوئے پکڑا جائے تو اسے جیل کر دیا جاتا ہے۔ اس کا اعزاز چمن جاتا ہے۔"

"میں کھلاڑی نہیں ہوں اور تمہارے خیال میں مجھے جس چیز نے کاٹا اس نے مجھے ایسا کوئی کیمیکل یا اسٹرائیڈ انجیکٹ کر دیا؟" مرزا کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"یہ کوئی دائرل انجیکشن بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ "تم اپنا چیک اپ کرو، اس سے پہلے کہ معاملہ ڈاکٹروں کے ہاتھ سے بھی نکل جائے۔"

"اوکے، میں کل تک دیکھتا ہوں، اگر مجھ سے کچھ کھایا نہیں گیا اور میں نے کمزوری محسوس کی تو میں ڈاکٹر کے پاس ضرور چلوں گا۔"

"کل تک؟" میں نے انگلی بلند کر کے اسے دارنگ دی۔ "اس کے بعد میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا؟"

"ڈن ہے۔" وہ مان گیا۔

میری یہ رات بہت بے چین گزری۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ مرزا میرے بیڈروم کی کھڑکی سے اندر آیا

خون آشام

میں نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔
”گنگا بات ہے، مجھے اب تک یقین نہیں آیا ہے۔“
اس نے کہا۔

”تم نے پرسوں سے کچھ نہیں کھا پیا ہے؟“
”نہیں اور آج صبح سے پانی بھی نہیں پیا ہے۔“ اس
نے بتایا۔ ”اب تم کیا کہتے ہو؟“
”کس بارے میں؟“

”یہی کہ میں ڈریکولابن رہا ہوں۔“
”میں کہہ چکا ہوں یہ سب بکو اس ہے۔“ میں نے
جواب دیا لیکن گنگا بات ہے میرے جسم میں ایک سروسی لہر
دوڑ گئی تھی۔ مرزا نے میری طرف دیکھا۔
”تم سمجھتے ہو کہ میں صرف تیز دوڑ سکتا ہوں۔“
”تو کیا کچھ اور بھی کر سکتے ہو؟“

”ہاں، آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے کہا اور سڑک
سے اتر کر پتھر لے ساحل کی طرف آیا اور ایک دزنی پتھر
جس کا وزن کم سے کم ایک من ہوگا اس کی طرف اشارہ کیا۔
”کیا میں اسے اٹھا سکتا ہوں؟“
”بہت مشکل سے؟“

اس نے جھک کر آرام سے پتھر اٹھا لیا اور یہی نہیں
بلکہ اسے سمندر کی طرف اچھال دیا۔ پتھر کم سے کم دس گز
آگے پانی میں جا گرا۔ یہ واقعی ناممکن تھا۔ مرزا نے ایک اور
زیادہ بڑا پتھر اٹھا لیا اور اسے بھی پانی میں پھینک دیا۔ مجھے لگا
جیسے میری عقل خبط ہو کر رہ گئی ہے۔ میرا دوست کیا بن گیا تھا
اور اس وقت میرے سامنے کیا کر رہا تھا۔ واپسی پر ہم
دونوں چپ اور سوچوں میں گم تھے۔ میں نے پچھلے کے
سامنے گاڑی روکی تو مرزا بغیر کچھ کہے اتر کر اندر چلا گیا اور
میں اپنے پچھلے میں آ گیا۔ بہت عرصے بعد ہمارا ساتھ ڈنر کا
معمول ٹوٹ گیا جبکہ ہم دونوں ہی گھروں میں تھے۔ مرزا کو
کچھ کھانا نہیں تھا۔ کریم خان نے میرے لیے ڈنر بنایا۔ وہ
کچھ سہا ہوا تھا، جب وہ میرے لیے کافی بنا کر لایا تو اس نے
مجھ سے کہا۔ ”صاحب کچھ گڑ بڑ ہے۔“
”کیسی گڑ بڑ؟“

”صاحب کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ کل رات میں اپنے
کو اڑنے سے لکھتا تو انہیں لان میں کھڑے دیکھا اور ان کی
آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے اندھیرے میں بیلیوں کی
چمکتی ہیں، پر صاحب اس وقت لان میں روشنی تھی۔ میں تو
ڈر کر داہیں کوارٹر میں چلا گیا۔“

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کریم خان اور تمہیں

یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا۔“ اس کا مطلب ہے تم نے ڈیڑھ
کلومیٹر کا فاصلہ دو منٹ میں طے کر لیا۔“

واک دے تین سو میٹر طویل تھا اور اس کے پانچ
چکر پندرہ سو میٹر بنتے ہیں یعنی ڈیڑھ کلومیٹر۔ مرزا نے
یقین دلایا۔ ”یہ بالکل سچ ہے۔“

”یہ ناممکن ہے، سو میٹر کا عالمی ریکارڈ دس سیکنڈ سے
ذرا کم ہے۔ جو چھتیس کلومیٹر فی گھنٹا بتا ہے اور تم کہہ رہے
ہو کہ تم نے پینتالیس کلومیٹر کی رفتار سے یہ فاصلہ طے کیا۔“
”بالکل یہ میرے جوتوں کا حال دیکھو۔“ اس نے
اپنے جوتوں کے تلے دکھائے جن کی حالت بری تھی اور وہ
بری طرح کھس گئے تھے۔ ”ان کا یہ حال آخری دو منٹ میں
ہوا ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“
”ابھی پتا چل جائے گا۔“ اس نے میرا بازو پکڑا۔
”ہم سی دیو کی سڑک پر چل رہے ہیں۔“

وہ میرے ساتھ باہر آیا اور کار میں ہم سی دیو کی طرف
روانہ ہوئے پھر اس کے آخری حصے میں آئے جہاں سڑک
تقریباً ویران تھی۔ مرزا نے جوتے اتار دیے اور مجھ سے
کہا۔ ”میں سڑک پر دوڑ رہا ہوں، تم کار چلاتے ہوئے
اسپیڈ میٹر پر نظر رکھو۔“

”ٹھیک ہے لیکن یہ سب مجھے احمقانہ لگ رہا ہے۔“
”تم کر دو۔“ اس نے کہا اور نیچے اتر گیا۔ وہ میرے

برابر میں آیا اور ایک دو تین کہتے ہی دوڑ پڑا۔ میں نے کار
آگے بڑھائی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ شروع میں
اس کی رفتار کم رہی۔ میٹر کی سوئی دس پر تھی لیکن رفتہ رفتہ رفتار
بڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد رفتار تیس کلومیٹر فی گھنٹا ہوئی اور مرزا
میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ میں نے رفتار آگے بڑھائی
اور تیس کلومیٹر پر پہنچ کر پیچھے دیکھا تو مرزا بس ذرا دور تھا اور
وہ جلد دوبارہ میرے ساتھ آ گیا۔ چالیس کی رفتار پر بھی وہ
ساتھ رہا اور پھر رفتہ رفتہ آگے نکلنے لگا۔ یہ قطعی ناقابل یقین
تھا کہ کوئی انسان اس رفتار سے دوڑ سکتا ہو۔ مگر میں اپنی
آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اب مزید تصدیق کی ضرورت نہیں
تھی۔ اس نے اپنا دعویٰ ثابت کر دیا تھا۔ میں نے ہارن دیا
اور کار روکنے لگا۔ مرزا بھی رک گیا اور جب میں اتر کر اس
کے پاس آیا تو وہ قطعی نارمل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سانس معمول
کے مطابق تھا۔ میں نے جھک کر اس کے پچھلے پاؤں دیکھے تو
وہ بھی ٹھیک لگے ورنہ کچھ دیر پہلے مضبوط ترین جو گرز کا کیا
حال ہوا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر گہری سانس لی۔ ”اگر

وہم ہوا ہوگا باروشنی اس زاویے سے آرہی ہوگی کہ ہمیں اس کی آنکھیں چمکتی ہوئی لگیں۔

”اللہ جانے صاحب۔“

کریم خان نے مجھے صبح کا ناشتا بنا کر دیا اور چلا گیا۔ ابھی میں ناشتا کر رہا تھا کہ وہ دوڑا آیا۔ اس نے بوکھلائے انداز میں کہا۔ ”صاحب کو کچھ ہو گیا ہے، جلدی چلیں۔“ میں اس کے ساتھ بھاگا۔ مرزا اپنے بیڈ روم میں تھا اور اس کا چوکیدار باہر سہا کھڑا تھا۔ اندر سے اسکی آواز آرہی تھی جیسے کوئی درندہ کراہ رہا ہو۔ میں اندر داخل ہوا تو مرزا بستر پر ٹپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ یوں سرخ تھا جیسے پورا چہرہ آبلہ زدہ ہو گیا ہو اور اس کے ہاتھوں پر بھی سرخ آبلے سے پڑے تھے۔ میں لپک کر اس کے پاس آیا۔ ”مرزا یہ کیا ہوا؟“

”پتا نہیں۔“ وہ غرانے کے انداز میں بولا۔ وہ کسی درندے کی طرح پُر شور انداز میں ہانپ رہا تھا۔ ”میں بس باہر نکلا تھا کہ مجھے لگا جیسے میرا جسم جل رہا ہے۔“

”تم پر کوئی چیز گری؟“

”نہیں، میں بس دھوپ میں گیا تھا۔“

میں غور سے اس کے زخم دیکھ رہا تھا اور ڈاکٹر کو کال کرنے کا سوچ رہا تھا کہ رک گیا کیونکہ اس کے چھالے کم ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھوں کے چھالے غائب ہو گئے اور جلد ویسے ہی ہوار ہو گئی اب مرزا کراہ نہیں رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور وہ عجیب سے انداز میں منہ کھولے ہانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے چھالے بھی بہت مدھم ہو گئے مگر وہ مکمل ختم نہیں ہوئے تھے۔ مرزا نے میرا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ”تم نے دیکھا؟ ذرا سی دیر کے لیے دھوپ میں جانے سے میرا کیا حشر ہوا؟“

”مرزا تم بیمار ہو اور ہمیں علاج کی ضرورت ہے۔“

”میں نہیں۔“

”میں کہیں نہیں جاؤں گا اب میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے کہا۔ واقعی اس کے چہرے کے چھالے بھی غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ جیسے مردہ ہو جانے والی سفید کھال رہ گئی تھی۔ مرزا نے چہرہ رگڑا تو وہ بھی اتر گئی۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر سہا کھال لیا۔

”تب اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے شانے جھٹکے۔ ”ممکن ہے

بس نے مجھے کاٹا ہے وہی اسے ٹھیک کر سکے۔“

”لیکن ہم اسے کہاں تلاش کریں؟“

مرزا میری طرف جھکا۔ ”قبرستان میں۔“

”قبرستان میں کہاں؟“ میں نے سوال کیا۔

اس رات تقریباً گیارہ بجے ہم قبرستان میں تھے۔ ہمیں پارک سے گھوم کر جانا پڑا تھا۔ یہ قبرستان پوش آبادی میں ہے اس لیے الٹی سیدھی سرگرمیوں کا مرکز بھی نہیں ہے یعنی یہاں نہ چری موالی پائے جاتے ہیں اور نہ جرائم پیشہ جو مال حرام یہاں لا کر چھپائیں۔ قبرستان کا رکھوالا اور گورکن ایک ہی خاندان پر مشتمل تھا جو نزدیک ہی چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا رات کے وقت وہ بھی اپنے گھر میں سو رہا تھا۔ میں اور مرزا ایک درخت کے نیچے موجود تھے اور سامنے قبرستان کا غیر آباد حصہ تھا جہاں جنگل سا لگ آیا تھا۔ میں نے مرزا سے پوچھا۔ ”یہاں کب تک کھڑے رہیں گے؟“

”جب تک وہ سامنے نہیں آ جاتا۔“

”سوال یہ ہے کہ وہ سامنے کیوں آئے گا۔ ویسے اس

تاریکی میں وہ نظر کیسے آئے گا؟“

”مجھے نظر آرہا ہے۔“ مرزا نے کہا اور میں نے غور کیا تو واقعی اس کی آنکھیں ہلکی کی طرح چمک رہی تھیں۔

”مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا۔“

”شش خاموش رہو۔“

”مرزا اگر تمہیں نظر آرہا ہے تو لازمی بات ہے اسے بھی نظر آرہا ہوگا جس نے تمہیں کاٹا تھا تو اس کا مطلب ہے وہ ہمیں اس درخت تلے دیکھ سکتا ہے۔“

”یہ تم نے ٹھیک کہا۔“ مرزا بولا اور مجھے سمجھ کر ایک قبر کے بڑے سے کتبے کی آڑ میں لے آیا۔ ”وہ یہاں ہمیں نہیں دیکھ سکتا۔“

مگر مفروضہ ”وہ“ بارہ بجے بھی نہیں آیا۔ میں نے مرزا سے کہا۔ ”یار ہمیں واپس جانا چاہیے، کسی نے یہاں دیکھ لیا تو کیا سوچے گا آخر ہماری عزت ہے علاقے میں۔“

مگر مرزا نے جواب نہیں دیا۔ وہ نیچے جھکا ہوا تھا اور کچھ عجیب سے انداز میں خرخرانے جیسی آواز نکال رہا تھا۔ اچانک وہ زمین پر گر گیا اور ہاتھ پاؤں سیکڑ کر کانپنے لگا۔ میں نے اسے اٹھالے کی کوشش کی۔ ”مرزا کیا ہوا ہے، ہوش کرو۔“

مگر اسے ہوش نہیں تھا۔ بہ مشکل میں نے اسے سمجھ کر

خون! سلام

اور مرزا کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ آرام سے بچھے آگیا اور اس نے میرے ہاتھ پر بھی منہ مارنے کی کوشش کی مگر میں اس سے پہلے اسے بستر پر پیٹک چکا تھا۔ وہ گرا اور وہیں پڑے پڑے ہانپنے اور غرائے لگا۔ اس کا چہرہ حیوانیت کے تاثرات لیے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر رضوان ہانپتے کانپتے ہوئے اٹھے اور اپنا ہنگ اٹھاتے ہوئے بولے۔

”یہ پاگل ہو گیا ہے، اسے کسی نفسیاتی اسپتال لے جاؤ، اسے بند کر کے رکھنا ہوگا۔ یہ انسانوں میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب یہ بیمار ہے۔“

”ہاں لیکن دماغی طور پر بیمار ہے۔ اسے نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔“

”لیکن اس کی حالت دیکھیں، کیا نفسیاتی مریض کی یہ حالت ہوتی ہے؟“ میں نے کہا لیکن ڈاکٹر رضوان نے سنا ہی نہیں اور بکتے بکتے دہاں سے رخصت ہو گئے۔ میں نے مرزا کی طرف دیکھا اور سر ہٹا م لیا۔ وہ ایک بار پھر مدہوشی والی کیفیت میں چلا گیا تھا۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ میرا دوست تھا۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ کیسے ٹھیک ہوتا؟ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے کریم خان کو بلایا اور اس سے کہا۔ ”دیکھو صاحب کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تم بیڈروم کولاک کرو اور جب تک میں نہ آؤں، تم کسی صورت دروازہ نہیں کھولو گے۔ سمجھ گئے؟“

”جی صاحب۔“ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں روانہ ہو گیا۔ میری واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی اور کریم خان پہرے داری کر رہا تھا۔ میں نے اسے رخصت کر کے پہلے بنگلے کے سارے دروازے اندر سے بند کیے اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ مرزا کے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ وہ بستر کے بجائے نیچے قالین پر سکتا ہوا تھا۔ میرے اندر آتے ہی وہ چونکا اور اس نے بے تابانی سے منہ اوپر کر کے کچھ سونگھا۔ میں نے شاہر سے پلاسٹک بوتل نکالی اور اس کی اوپری ٹکلی کھول کر اسے مرزا کے منہ سے لگا دیا۔ اس نے جانوروں کی طرح منہ مارا اور پھر کسی بچے کی طرح ٹکلی چوسنے لگا جس سے خون نکل کر اس کے منہ میں جا رہا تھا۔ یہ ٹکلی میں ایک ہلڈ بینک سے خرید کر لایا تھا۔ تقریباً ایک لیٹر کی ٹکلی مرزا نے دیکھتے ہی دیکھتے خالی کر دی تھی۔ جب ٹکلی خالی ہو گئی تب بھی وہ اس میں سے خون کھینچنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ اس کی حالت میں واضح تہدیلی آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں پیروں کا کھنچاؤ ختم ہو گیا تھا

سیدھا کیا اور گھسیٹ کر قبرستان کے پاس گھڑی کار کی طرف لے جانے لگا۔ اچانک مجھے لگا جیسے پاس ہی کہیں کوئی خشک مٹی چٹنی ہو۔ میں نے چونک کر دیکھا مگر نیم تاریکی میں جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اس کے باوجود میرے اندر ایک خوف سا آیا اور میں مرزا کو زیادہ تیزی سے گھسیٹ کر لے جانے لگا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے مرزا کو کار کی تھپی نشست پر لٹایا اور ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا۔ کار اسٹارٹ کر کے میں آگے بڑھنے والا تھا تب میں نے قبرستان کے دروازے کے پاس ایک بیو لے کی جھلک دیکھی۔ اس کے بعد میں نے کار دوڑا دی۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور میں بڑی مشکل سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ مرزا کے بنگلے پر پہنچ کر میں نے چوکیدار کو بلایا اور اس کی مدد سے مرزا کو اندر لے گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر چوکیدار خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مرزا کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھلی ہوئی اور بری طرح اکڑی ہوئی تھیں۔ وہ رہ رہ کر لرز رہا تھا۔ ٹاک اوپر چڑھ گئی تھی اور منہ آگے نکل آیا تھا۔

”صاحب یہ کیا ہوا صاحب کو؟“ چوکیدار بولا۔

”تم باہر جاؤ اور کسی کو ایک لفظ نہیں کہو گے۔“ میں نے کہا۔ چوکیدار چلا گیا۔ میں نے تشویش سے مرزا کو دیکھا۔ وہ اس وقت بھی سکتا سمٹ کر لیٹا ہوا تھا، اس نے دونوں پاؤں پیٹ سے لگا لیے تھے۔ اس وقت وہ انسان سے زیادہ جانور لگ رہا تھا۔ اس کے منہ سے خرخرانے اور کبھی کبھی غرائے کی آوازیں قطعی انسانی نہیں تھیں۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے ڈاکٹر رضوان کو کال کی اور ان سے مرزا کے بنگلے تک آنے کی درخواست کی۔۔۔۔۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مرزا کو اسپتال لے جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ خود مرزا کے حق میں خراب نکل سکتا تھا۔ ڈاکٹر رضوان آدھے گھنٹے میں آ گئے اور میں انہیں اندر لے گیا۔ میں نے مرزا کو دکھانے سے پہلے انہیں لفظوں میں اس کی حالت بتا دی تھی۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ وہ تشویش سے بولے۔ میں باہر ہی رک گیا اور وہ اندر چلے گئے۔ میں باہر ٹھہرا رہا۔ چند منٹ بعد اچانک اندر سے شور اور غرائے کی آوازیں آئیں۔ میں اندر کی طرف لپکا تو میں نے دیکھا کہ مرزا نے ڈاکٹر رضوان کو نیچے گرا رکھا ہے اور منہ مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر رضوان نے اس کو گردن سے پکڑ رکھا تھا اور خود کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں لپک کر ان کے پاس آیا

میں تھا۔ وہ انہیں نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ اچانک وہ پلٹا اور ہاتھ روم کی طرف لپکا۔ میں اس کے پیچھے آیا تو وہ واش بیسن پر جھکا ہوا ابکیاں لے رہا تھا مگر اس کے پیٹ سے کچھ نہیں نکلا۔ وہ بس ابکیاں ہی لیتا رہا۔ پھر اس نے پانی پیا اور وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ”اس کا مطلب ہے میری خوراک بس خون ہے؟“

”شاید اور اسی کمی کی وجہ سے تمہاری یہ حالت ہوئی۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے ایک چائیں لیا تھا کہ شاید تمہاری حالت سدھر جائے اور تم ہوش میں آ کر اپنے بارے میں فیصلہ کر سکو۔“

”کیسا فیصلہ؟“

”یہی کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے؟... تمہیں اسی طرح زندگی گزارنی ہے یا اسپتال جا کر اپنا علاج کرانا ہے۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

”اسپتال جانے کا مطلب سمجھتے ہو؟“

”ہاں جو بات صرف میں اور تم جانتے ہیں وہ سب جان جائیں گے اور ممکن ہے خصوصی کیس کی حیثیت سے تمہارا ملک گیر شہرہ ہو جائے۔ بات میڈیا تک پہنچی تو پھر سارا ملک جان جائے گا۔“

مرزا نے پریشان ہو کر کہا۔ ”ممکن ہے مجھے پکڑ کر بند کر دیا جائے جیسا کہ ڈاکٹر رضوان نے کہا ہے۔“

”میرے ذہن میں بھی یہی خیال تھا۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اس کا مطلب ہے تمہیں کچھ عرصے بعد پھر خون درکار ہو گا اور اس صورت میں بھی بات بھی نہ بھی تو محل جائے گی۔“

”تم نے خون کہاں سے حاصل کیا؟“

”بلڈ بینک سے رقم دے کر۔“

”تو کیا ہم اسی طرح خون حاصل نہیں کر سکتے؟“ اس نے پوچھا۔

”مرزا تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو، کیا تم عام انسانوں سے کٹ کر زندگی گزارنا چاہتے ہو؟“

”نہیں۔“

”تب اس بارے میں سوچو، میں بھی سوچتا ہوں، ہم مل کر کوئی راہ نکالتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں چلوں گا، مجھے آرام کی ضرورت ہے۔“

”اور میں خود کو بالکل فٹ محسوس کر رہا ہوں۔“

اس کی وجہ تھی اور میں گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس بار مرزا کا وہم درست ثابت ہوا تو وہ ڈر کیولا بن گیا

اور اس نے خرخراتا اور غرانا بند کر دیا تھا۔ میں نے تھیلی وہیں چھوڑی اور باہر آ کر دروازے کو لاک کر دیا۔

میں دروازے کے سامنے ہی کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اور پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو مرزا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ کہہ رہا تھا۔ ”دروازہ کھولو، اسے کس نے بند کیا ہے؟“

میں نے دروازہ کھولا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ”اب تم کیسے ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے اس طرح سے بند کیوں کیا اور وہ بھی میرے ہی گھر میں؟“ مرزا نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت ٹھیک لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نارمل ہو گئے تھے۔

”تم ٹھیک نہیں تھے، کیا تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟“

”کیا یاد نہیں ہے؟“

”تم میرے ساتھ قبرستان گئے تھے۔“

”ہاں یہ تو یاد ہے۔“

”اس کے بعد کیا یاد ہے؟“

اس نے اپنی پیشانی رگڑی۔ ”بس مجھے یہ یاد ہے کہ ہم ایک قبر کے کتبے کی آڑ میں بیٹھے تھے۔“

”وہیں تمہیں دورہ پڑا اور تمہاری حالت غیر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے میں تمہیں گھر تک لایا۔ تم بالکل آجے میں نہیں تھے۔ میں نے ڈاکٹر رضوان کو کال کی اور وہ تمہیں دیکھنے آئے۔“

”پھر... پھر کیا ہوا، انہوں نے کیا کہا؟“ مرزا بے تاب سے بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ اس نے ڈاکٹر رضوان پر حملہ کیا اور انہیں کانٹے کی کوشش کرتا رہا، میں نے اسے قابو کیا تو اس نے مجھے بھی کانٹے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر رضوان غصے میں چلے گئے۔ اس کے بعد اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ تمہیں قید کر دیا جائے۔

”تم نے مجھے قید کیا لیکن یہ کیا ہے؟“ مرزا نے خون کی خالی تھیلی مجھے دکھائی۔ ”اس میں خون تھا۔“

”ہاں اور وہ میں نے تمہیں پلا دیا۔“ میں نے اقرار کیا۔ ”اسی وجہ سے تم ٹھیک حالت میں نظر آ رہے ہو۔“

مرزا چند لمحے مجھے دم بہ خود نظروں سے دیکھتا رہا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

جواب میں میں نے اسے اپنے اسمارٹ فون سے لی ہوئی اس کی تصاویر دکھائیں جن میں وہ دیوانگی کی حالت

خون آشام

بھی نہیں کر سکوں گا۔“

میں نے ایک بار پھر اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اسے اسپتال جانا چاہیے۔ ”دیکھو یہاں ایسے اسپتال ہیں جو اپنے مریضوں کے معاملات ہر قیمت پر خفیہ رکھتے ہیں۔ ہم انہیں منہ بالکا معاوضہ دے سکتے ہیں۔“

”نہیں میں رسک نہیں لے سکتا۔ تم سوچو کہ اگر یہ بات کھل گئی تو قانون ایک طرف، پہلے لوگ ہی مجھے مار ڈالیں گے۔ ویسے بھی ہماری پبلک میں تشدد کا رجحان بڑھ رہا ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ایسے معاملات میں لوگ اجتماعی تشدد پر اتر آتے تھے اور ان کا مقابلہ ریاست نہیں کر سکتی، ہماری تو کوئی اوقات ہی نہیں تھی۔ تب اس کا یہی حل تھا کہ معاملات کو جوں کا توں چلنے دیا جائے جب تک کہ کوئی حتمی حل سمجھ میں نہ آجائے۔ ہم نے طے کیا کہ دیکھیں گے کہ مرزا کتنے دن خون کے بغیر رہ سکتا ہے اور اس کے بعد اس کے لیے خون کا بندوبست کیا جائے گا۔ ایک ہفتہ وہ ٹھیک رہا اور پھر اس کی حالت خراب ہونے لگی اور بارہ گھنٹے کے اندر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر چاندوروں جیسی حالت میں آ گیا تھا۔ میں اس کے لیے خون کی بوتل لے آیا اور اسے اپنے وجود میں اتار کر وہ دوبارہ بارہ گھنٹے میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ مرزا کا کوئی دوست اور کوئی ایسا قریبی رشتہ دار نہیں تھا جس سے وہ روٹین میں ملتا ہو۔ چند دور پرے کے رشتے دار تھے جن سے سالوں میں کہیں جا کر کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی تھی۔

اس لیے رشتے داروں کی فکر نہیں تھی۔ پاس پڑوس میں بھی بس سلام دعا تھی اور یہاں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ اس لیے پڑوسیوں کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ مرزا کے بزنس کا مسئلہ تھا، شروع میں اس نے چلانے کی کوشش کی مگر اس کا تو سارا کام ہی دن کا تھا اور دن میں وہ باہر نکل نہیں سکتا تھا اس لیے مجبوراً اسے اپنی فرم اور بزنس فروخت کرنا پڑا۔ کیونکہ اس کی گڈول اچھی تھی اس لیے اسے اچھی قیمت مل گئی۔ یہ رقم اس نے گلسٹڈ ہیڈ کوارٹر سے اسے اچھی آمدنی ملنے لگی جو اس کے گزارے کے لیے کافی تھی۔ اسے اب سوائے خون کے اور کسی چیز کی فکر یا ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ خون کا اسٹاک جمع کر لے مگر میں نے مخالفت کی۔ ”نہیں اس طرح تم شاید عادی ہو جاؤ جیسے نشے کے عادی ہوتے ہیں اور پھر تمہارے

تھا۔ اگرچہ ان معنوں میں نہیں جس طرح فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ نیکیلے دانتوں اور ماورائی قوتوں کا حامل ایک ایسا کردار جو چمکاؤ بن کر ہوا میں اڑتا ہے اور دیواروں سے گزر جاتا ہے۔ مرزا میں بھی تہذیبیاں آئی تھیں۔ وہ طاقت ور ہو گیا تھا اور تیزی سے دوڑ سکتا تھا۔ مگر اس کی زندگی کا دارو مدار خون پر رہ گیا تھا۔ جب اسے خون نہیں ملا تو اس کی حالت دیکھنے والی تھی اور جب اسے خون مل گیا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ صبح میں اٹھا تو خلاف توقع کریم غائب تھا۔ میں نے اپنے چوکیدار سے پوچھا تو اس نے لاطینی ظاہر کی۔ میں مرزا کے بنگلے پر آیا تو اس کا چوکیدار غائب تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور مرزا لالہ رنج میں موجود تھا مگر اس نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کیے ہوئے تھے جن سے دھوپ اندر آ سکتی تھی۔

”کریم خان کہاں ہے؟“

”میں نے اس کی چھٹی کر دی۔“ مرزا نے

جواب دیا۔

”اور چوکیدار؟“

”اسے بھی نکال دیا۔ اب مجھے ان کی ضرورت

نہیں ہے۔“

”کیوں ضرورت نہیں ہے؟“

”سمجھا کرو، یار میں ڈریگولا بن گیا ہوں اس لیے اب مجھے نہ تو عام زندگی گزارنی ہے اور نہ ہی مجھے عام آدمیوں جیسے لوازمات کی ضرورت ہے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے مرزا۔“ میں نے خفگی سے کہا۔ ”تم ایک عام انسان ہو۔“

”تب بتاؤ میں صرف خون پی کر ہی کیوں ٹھیک رہتا ہوں؟“

”اس کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے، ممکن ہے تمہارے نظام ہضم میں کوئی ایسی تہذیبی آئی ہو جس کی وجہ سے تم عام خوراک کھانے سے قاصر ہو گئے ہو۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو صرف مخصوص خوراک کھا کر ہی زندہ رہتے ہیں۔“

”لیکن ان میں سے کوئی خون پر زندہ نہیں رہتا ہو گا۔“

”مرزا یار، ہم ساری دنیا کیا، اپنے علاقے میں رہنے والوں کے بارے میں نہیں جانتے ہیں کہ کون کیا کھاتا ہے۔“

”میں دن میں باہر نہیں جا سکتا اس لیے اب میں کام

سے سلج تھے۔ انہوں نے ہم سے پرس اور موبائل کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا کہ ہم دے رہے ہیں مگر مرزا کا موڈ کچھ اور تھا۔ اس نے اچانک ایک لڑکے کو بازو سے پکڑا اور گھما کر سمندر کی طرف اچھال دیا۔ وہ ایک طویل چنچ کے ساتھ پانی میں جا گرا۔ دوسرے لڑکے نے عقب سے مرزا کے سر پر بہت قوت سے ڈنڈا مارا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کھوپڑی چنچ گئی ہوگی مگر مرزا آرام سے کھڑا رہا۔ اس نے دوسرے لڑکے کا بھی وہی حشر کیا تو تیسرے نے خود دوڑ لگا دی۔ گھر آکر میں نے مرزا کے سر کا معائنہ کیا تو اس پر چوٹ کا معمولی سا نشان بھی نہیں تھا۔ یہ وار کسی عام آدمی کے سر پر لگا ہوتا تو اس کی کھوپڑی ٹوٹ جاتی۔

شروع میں مرزا ہفتے میں ایک بار خون پی کر سیٹ رہتا تھا مگر رفتہ رفتہ اس کی طلب بڑھنے لگی اور اب اسے ہر پانچ دن بعد ایک لیٹر خون درکار ہوتا تھا ورنہ اس کی حالت خراب ہونے لگتی تھی۔ میں اور مرزا دونوں فکر مند ہو گئے۔ مجھے فکر یہ تھی کہ یہ سلسلہ کہاں تک بڑھے گا اور مرزا کو فکر تھی کہ کہیں خون کی سپلائی رک نہ جائے۔ اس نے ایک بار پھر اصرار کیا کہ وہ خون اسٹور کر کے رکھ لیتا ہے۔ اس کے کہنے پر میں اس بار دو تھیلیاں لے آیا مگر جب اس نے پانچ دن بعد دوسری تھیلی کھولی تو اس میں موجود خون خراب ہو گیا تھا کیونکہ وہ بلڈ بینک میں مخصوص درجہ حرارت پر رکھا جاتا ہے۔ فریج کا درجہ حرارت اس سے الگ تھا اس لیے خون خراب ہو گیا۔ مرزا کی حالت اب خراب ہو رہی تھی اس لیے مجھے ایمرجنسی میں بھاگنا پڑا اور جب میں گھر سے نکلا تو مرزا ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر جانور والی حالت میں آ گیا تھا۔

بد قسمتی سے میں جو گروپ کہتا وہاں سے انکار سننے کو ملتا۔ میں کئی بلڈ بینکوں میں گیا اور بالآخر پانچویں بینک میں کام بنا۔ میں خون لے کر واپس آ رہا تھا کہ تیز رفتاری میں گاڑی پر قابو نہ رکھ سکا ایک موٹر گاڑی نے اسے میں ڈرارنگ سائنڈ پر گیا اور سامنے سے آتے مینی ٹرک نے میری کار کو ٹکرایا۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ میں لمحے میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد میں اسپتال میں دو دن بے ہوش پڑا اور اس دوران میں میرے دو آپریشن ہوئے۔ خوش قسمتی سے میرے دفتر والے آگئے اور انہوں نے مجھے سرکاری سے ایک اچھے جی اسپتال میں منتقل کیا جہاں میرا علاج ہوا۔ تیسرے دن مجھے ہوش آیا اور سب سے پہلے مجھے مرزا کا خیال آیا کہ اس کا کیا ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر سے یہ سن کر میں اور

خون کی طلب بڑھتی جائے۔ تم فکر مت کرو، میں تمہیں جب ضرورت ہوگی خون لا دوں گا۔

یہ کام میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا کیونکہ میں سماجی خدمت بھی کرتا تھا اور مرزا کے لیے خون لانے سے پہلے بھی میں نے کئی بار غریب مریضوں کو خون خرید کر فراہم کیا تھا۔ اس لیے مختلف بلڈ بینکوں سے میری جان پہچان تھی اور میں اگر مہینے یا ڈیڑھ مہینے بعد کسی بینک سے خون خریدتا تو کوئی مجھ پر شک نہیں کرتا۔ میں کرتا یہ تھا کہ ایسے گروپ کا خون مائیکل جو آسانی سے مل جائے۔ ورنہ ایسے گروپ بھی تھے جو پورے شہر میں بھی مشکل سے ملتے تھے۔ مرزا کو گروپ سے کوئی مطلب نہیں تھا اسے صرف خون درکار ہوتا تھا۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ اگر ہم کسی جانور کا خون لڑائی کریں اور مرزا وہ پی سکے تو اسے مہیا کرنا زیادہ آسان ہو گا۔ مرزا تیار ہو گیا اور میں کچھ مرغیاں لے کر آیا مگر انہیں ذبح کر کے ان کا خون نکالنے میں جو ہڑبونگ مچی اور گندگی ہوئی مرزا نے ایسا خون پینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”یار خان، وہی ٹھیک ہے۔ صاف ستھرا بوتل میں بھرا ہوا۔“

انسانی خون مہنگا ملتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ مہینے میں مرزا تقریباً بیس ہزار کا خون پی جاتا تھا مگر رقم اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ بزنس ختم ہونے کے بعد بھی اس کی آمدنی لاکھوں میں تھی۔ اس کے علاوہ اس کے اخراجات بھی کم ہوئے تھے کیونکہ چوکیدار اور باورچی کو نکال دیا تھا، ان کی تنخواہوں کی بچت اور اس نے گھر میں مچن ختم کر دیا تھا یہ بچت الگ تھی۔ اس نے ڈاک پر جانا چھوڑ دیا تھا۔ دن بھر آرام کرتا یا بی بی وی اور موویز دیکھتا اور شام کو میرے پاس آ جاتا۔ میں نے ایک عورت کو کھانا بنانے کے لیے رکھ لیا تھا۔ وہ ناشتا بناتی اور رات کا کھانا تیار کرتی تھی۔ یہ کام وہ میری آمد سے پہلے کر کے چلی جاتی اور میں کھانا گرم کر کے کھا لیتا تھا۔ کھانے کے دوران میں مرزا مجھ سے گپ شپ کرتا۔ کبھی کبھی وہ اس ہو جاتا اور وہ وقت یاد کرتا جب ہم مل کر کھاتے تھے۔

کھانے کے بعد ہم کبھی کبھی باہر چلے جاتے۔ مرزا ضرورت کی چیزیں شام کے بعد ہی لیتا تھا۔ شاپنگ نہیں کرنی ہوتی تو ہم ہوا خوری کے لیے سی ویو چلے جاتے تھے۔ ایک بار ہم ریت پر ننگے پاؤں ٹہل رہے تھے کہ اچانک چند لاشوں نے ہمیں ٹھہر لیا۔ وہ چھوٹے ڈنڈوں اور چا تو دس

خون آشام

تھا کہ کوئی مجھے یہاں دیکھ نہ لے اور پتا نہیں کیا سمجھے۔ میں ایک درخت کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میری نظر جھاڑیوں پر مرکوز تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ بارہ بجے کے قریب مجھے لگا کہ جھاڑیوں میں کوئی چل رہا ہے۔ میں چوکنہ ہو گیا۔ اندر موجود چیز کے چلنے سے جھاڑیاں ہل رہی تھیں۔ مگر کچھ دیر بعد یہ حرکت رک گئی۔ میں نے ہمت کر کے پھر مرزا کو آواز دی اور ذرا دھیمے لہجے میں وقفے وقفے سے اسے پکارنے لگا۔ اچانک مجھے لگا کہ کوئی جھاڑیوں سے نکل کر تیزی سے قبروں کے درمیان گیا ہو۔ نیم تاریکی میں بس ایک نکیر سی دکھائی دی اور وہ چیز قبروں کے درمیان غائب ہو گئی۔ میں اس طرف بڑھا اور پھر مرزا کو پکارنے لگا۔ اچانک قبروں کے درمیان سے ایک بیولا بلند ہوا۔ اس نے سر سے پاؤں تک خود کو جیسے کسی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ پھر وہ میری طرف آنے لگا۔

”مرزا... یہ تم ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے دھیمی لیکن گوجتی آواز میں کہا تو میری ہمت جواب دے گئی اور میں پلٹ کر بھاگا۔ وہ میرے پیچھے چھینا اور عین اس وقت جب میں قبرستان سے نکلنے والا تھا وہ مجھ تک پہنچ گیا مگر وہ مجھے پکڑ نہیں سکا کیونکہ عین اسی لمحے کسی نے غرا کر اس پر چھلانگ لگائی اور وہ دونوں کھتم گئے اور جانوروں کی طرح لڑنے لگے۔ میں نے رک کر دیکھا۔ دوسرا فرو صرف ایک پھٹ جانے والے پاجامے میں تھا۔ اس کا اوپر کی جسم عریاں تھا اور وہ سیاہ پوش بیولے سے چٹا ہوا تھا۔ وہ اسے گرائے ہوئے تھا اور پھر اس نے مڑ کر مجھ سے غرائی آواز میں کہا۔

”خان... بھاگ۔“

وہ مرزا تھا اور میری جان بچانے کے لیے اس بیولے سے بھڑ گیا تھا۔ میں بھاگا اور مجھے ہوش نہیں کہ میں گھر کیسے پہنچا۔ میری طبیعت خراب ہو گئی اور مجھے ایک بار پھر اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں میں تین دن رہا۔ اب اس واقعے کو کئی برس ہو گئے ہیں۔ میں اسی جگہ رہتا ہوں لیکن اس کے بعد میں بھی قبرستان یا اس سے متصل پارک کی طرف بھی نہیں گیا۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ اس طرف جاؤں۔ شاید مرزا مجھے نظر آئے مگر جب دوسرے بیولے کا خیال آتا ہے تو میں اپنا ارادہ ترک کر دیتا ہوں۔

پریشان ہو گیا کہ مجھے دو دن بعد ہوش آیا ہے۔ میں نے بہ مشکل اس سے کال کی اجازت لی اور مرزا کو کال کی مگر وہ نہ تو موبائل پر اور نہ ہی گھر کے نمبر پر کال ریسیو کر رہا تھا۔ وہ کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے ہوش کہاں ہوگا کہ وہ کال ریسیو کرتا۔

خوش قسمتی سے مجھے کوئی میجر فریکر نہیں ہوا تھا۔ ہسپتالوں پر چوٹ آئی تھی اور اصل میں سر پر چوٹ آئی تھی اور خون جمنے سے بچانے کے لیے ڈاکٹرز نے دوا پریشن کیے۔ بہر حال دس دن بعد مجھے اسپتال سے فارغ کروایا گیا۔ اس دوران میں، میں نے کئی بار مرزا سے رابطے کی کوشش کی اور ہر بار ناکام رہا۔ میں کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ مرزا کے گھر جا کر دیکھ لے۔ مجھے ایسولینس نے گھر تک چھوڑا۔ دفتر کے لوگ میرے ساتھ آئے تھے۔ پھر گھر میں ملازم بھی تھے اس لیے میں جلدی مرزا کی طرف نہیں جاسکا۔ چونکہ ار آزر وہ تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ”ہم کو افسوس ہے مرزا صیب آپ کو دیکھنے نہیں آیا۔“

”وہ بیمار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے وہ تم کو نظر آیا؟“

”نہیں صیب۔“ چونکہ ار نے نئی میں سر ہلایا۔ جیسے ہی میرے آس پاس سے لوگ بٹے، میں اسٹک کا سہارا لے کر مرزا کے گھر پہنچا اور اندر داخل ہوتے ہی لاؤنج کے کھلے دروازے نے ساری کہانی سنائی۔ بیڈ روم کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا اور مرزا غائب تھا۔ گھر مٹی سے اٹا ہوا تھا اور اس دوران میں یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ مرزا کہاں گیا ہوگا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہاں جاتا۔ یہ ہمت آنے میں مزید تین دن لگے۔ پٹیاں اتر گئی تھیں اور ڈاکٹرز نے مجھے فٹ قرار دے دیا تھا۔ میں نے رات کے کھانے کے بعد قبرستان کا رخ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ مرزا اسی طرف گیا ہوگا۔ قبرستان کا بڑا حصہ جو ابھی قبروں سے خالی تھا وہاں بہت کھنی جھاڑیاں آگ آئی تھیں اور ان میں چھپنے کی بہت جگہیں تھیں۔ رات کے نو بجے وہاں سناٹا تھا اور خود میرا بھی دل خوف کی وجہ سے تیز دھڑک رہا تھا۔ میں قبروں کو پار کر کے جھاڑیوں کے پاس آیا اور مرزا کو آواز دی۔

”جمال... جمال کہاں ہو تم؟“

پتا نہیں وہ کج کج آواز تھی یا میرا وہم تھا۔ مجھے لگا جھاڑیوں میں کوئی بہت ہلکے سے غرایا ہو۔ میں نے پھر آواز دی مگر اس بار کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے یہ ڈر بھی

جاسوسی ڈائجسٹ

چوک

مسیر اقبال

معمولی سی چوک پہاڑ جیسی مصیبت کا سبب بن جاتی ہے...
ایک وفا شعار... فرمانبردار رفیق کار کی عملی کارروائی...
اس نے فیصلہ کن گھڑی کو کھو جا... تولا اور پالیا... آخری پل
میں پلٹ جانے والی ہولناک بازی۔

مغرب سے برآمد مختصر سی کڑوی کیسلی تحریر

مارگریٹ نے اپنے شوہر کے پولیس اسٹیشن
ریوالور کی ٹال اس کی داہنی کٹہی پر رکھ دی اور دباؤ ڈالتے
ہوئے ٹریگر دیا دیا۔

فائر کی گونج اس کی توقع سے بڑھ کر تھی۔ دھماکے کے
نتیجے میں اس کی کھوپڑی کے پرچے اڑ گئے اور تکیہ خون میں
ترتیر ہونے لگا۔

یہ نظارہ دیکھ کر مارگریٹ بوکھلا سی گئی اور ریوالور اس
کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

دھماکے کی گونج سے اس کے کان ابھی تک جھنجھٹا
رہے تھے۔ پھر اپنی سوچی ہوئی آنکھوں اور اپنے شوہر کی مار



WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیٹ سے سُن رخساروں نے اپنی بے بسی کا احساس دلایا تو وہ جیسے چوہک گئی۔ ”تم کتیا کی اولاد! وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

پھر اس نے جھک کر ریوالتور اٹھالیا۔ اس کا دایاں ہاتھ اور ریوالتور کی نال خون میں تر تھے۔ ”کاش تم نشے میں بے سدھ پڑے رہنے کے بجائے ہوش میں ہوتے۔ مجھے تمہارے بیدار ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ تب تمہاری پتلون گندی ہو جاتی جب تم دیکھتے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے جا رہی ہوں۔“

مارگریٹ نے ہاتھ روم کے سینک میں اپنے خون آلودہ ہاتھ دھوئے اور ریوالتور کے دستے کو گیلیے تو لیے سے اچھی طرح صاف کیا۔ پھر ایک چھوٹے سے تولیے کی مدد سے اس نے ریوالتور اٹھالیا تاکہ اس پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت نہ ہونے پائیں۔

وہ واپس بیڈ روم میں پہنچی اور ریوالتور اپنے شوہر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس کی انگلیاں ٹریگز کی کرپ پر جما دیں۔ پھر تولیے سے اپنے ہاتھ اور بازو کو ڈھانپتے ہوئے اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ اوپر اٹھایا اور ریوالتور کا رخ کمرے کی مخالف سمت کرتے ہوئے اس کی انگلی سے ٹریگر دبا دیا۔

اب تمہاری انگلیوں پر بارود کے ذرات اور جھلنے کے نشانات آچکے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اس صورت حال کی وضاحت تم کس طرح کر دے گے، گھماڑ آدمی اکوٹی بھی نہیں بتا سکے گا کہ کون سا فائر پہلے کیا گیا تھا۔ اب آئندہ تم بھی میرے ساتھ مار پیٹ نہیں کر سکو گے۔ مجھے تمہارے ظلم و ستم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل چکی ہے۔“

پھر وہ دوبارہ ہاتھ روم میں پہنچی اور سینک پر صابن اور صابن کی مدد سے اپنے ہاتھ خوب اچھی طرح رگڑ کر صاف کر لیے اور کسی قسم کے خون یا بارود کے ذرات باقی نہیں رہنے دیے۔

اب وہ چھوٹا سا فرشی قالین طحکانے لگانا باقی رہ گیا تھا جس پر خون کے کوٹھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے وہ فرشی قالین لپیٹ دیا اور اسے اٹھا کر چھل منول کے پوائنڈر روم میں لے گئی۔ اس نے وہ قالین فائر بکس میں جمبوک دیا۔

جب اسے یقین آ گیا کہ وہ فرشی قالین مکمل طور پر جل کر راکھ ہو چکا ہے تو وہ دوبارہ اوپر اپنے بیڈ روم میں آگئی

قیمت

مرزا جی نے امریکا کی سیر کے لیے ایک بہت پرانی اور خستہ حال گاڑی خرید لی، کئی ہفتوں تک وہ اس میں سیر سہانے کرتے رہے پھر گاڑی نے انہیں مسلسل تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اسے بیچنے کی بہتری کوششیں کیں لیکن کوئی خریدنے پر تیار نہیں ہوا۔

ایک روز وہ اسی کار میں مصافقات کی طرف نکل گئے۔ کچھ دیر میں ٹول پلازا آ گیا۔ انہوں نے بمشکل اپنی گاڑی کھڑکی کے پاس روکی۔

”دس ڈالر۔“ کھڑکی والا اونچی آواز میں بولا۔

”منظور!“ مرزا جی گاڑی سے کود گئے۔“ یہ

تمہاری ہوگی، نکالو دس ڈالر۔“

گلزار قاطر، پشاور سے

اور کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی پرانی کرنسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک پولیس کار اپنی روشنیاں فلش کرتی ہوئی اس کے مکان کے سامنے فٹ پاتھ کے کنارے آ کر رک گئی۔

مارگریٹ نے پلٹ کر ایک اچھتی نگاہ بیلڈ پر ڈالی جہاں اس کے شوہر کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ لاش کو دیکھ کر اسے ایک قلبی اطمینان محسوس ہوا۔

لیکن پھر دوسرے لمحے اس کا یہ اطمینان پارہ پارہ ہو گیا۔ وہ ایک ایسی ہولناک حقیقت تھی جس کا احساس اسے اب ہوا تھا۔

باہر سیرھیوں پر دوڑتی جوتوں کی دھمک سنائی دینے لگی جو تیزی سے نزدیک آرہی تھی۔

مارگریٹ بے بسی سے اپنے ہونٹ چبانے لگی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک بمیا تک فلطینی کا ارتکاب کر بیٹھی تھی۔

اس کی نظر میں اپنے شوہر کے دانے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالتور پر مرکوز تھیں جبکہ اس کا شوہر پیدا ہوئی کھبا تھا۔ دروازے پر دستک کی آواز کے ساتھ ہی اس کے اعصاب شل ہوتے چلے گئے۔

دھوکے باز

سکندر علیم

کسی دانش مند کا کہنا ہے کہ ہر خرابی کا مداوا موجود ہے... حماقت کا نہیں... کسی ضدی احمق کو نصیحت کرنا یا کسی غبی کو سمجھانا ایسا ہی ہے جیسے پانی پر نقش بٹانا... ایک نوجوان کی ناتجربہ کاری کی روداد... جو اپنی دانست میں کیے گئے فیصلوں کو مسئلے کا بہترین حل سمجھتا تھا... دھوکے اور فریب کاری کا انوکھا منصوبہ...

ہوں اور میری ہر روز یہی کوشش ہوتی ہے کہ صبح سویرے بھاگ بھاگ تیار ہو کر دفتر کا رخ کروں تاکہ میرا مستقبل محفوظ رہے۔

اگر پولیس چارلس کو ابھی تک تلاش نہیں کر سکی تو یہ میری ناکامی تھی کیونکہ یہ کیس میرے ہی سپرو کیا گیا تھا۔ تین روز قبل چارلس کی ماں آسمانے لو گیارہ پر فون کر کے اطلاع دی تھی کہ اس کا بیٹا بستر سے غائب ہے اور اس کی جگہ وہاں سے ایک کاغذ ملا ہے جس میں اسے تاون کی کال کا انتظار کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ میں نے اس کیس پر کافی کام کیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کے باوجود مجھ سے کہا گیا کہ کوشش جاری رکھوں۔ دراصل مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جنہیں ٹیم کا نام دیا گیا اور یہ ٹیمیں پورے شہر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈیوٹی ٹیم میں رکھا گیا تھا اور میرا دفتر شہر کے وسط میں واقع بالکن اسٹریٹ پر تھا۔ اسی عمارت میں ڈپارٹمنٹ کا مرکزی دفتر بھی تھا اور شاید اسی لیے تمام ہائی پروفائل کیس میرے سپرو کیے جاتے تھے۔

دفتر پہنچا تو میز پر ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ ”چیف سے فوراً ملو۔“ میں نے ٹاکی کی ناٹ درست کی اور دل ہی دل میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے لفٹ میں سوار ہو گیا۔ سیکریٹری نے بتایا کہ چیف ٹام ملاجی میرا ہی انتظار کر رہا ہے۔ میں نے دھڑکتے دل کے

اُس روز بھی معمول کے مطابق میری آنکھ دیر سے کھلی۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس وقت مجھے دفتر میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے آپ کو باس کی خوں خوار نظروں کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا۔ آنے والی گھڑی کو ٹالنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اس لیے بھاگ بھاگ شاوولیا اور ناشا کے بغیر ہی دفتر کی طرف دوڑ لگا دی۔ راستے میں گاڑی روک کر ایک اسٹور سے برگر اور کوک کی بوتل لی اور گاڑی چلاتے ہوئے اس ناشتے سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ریڈیو آن کیا تو اس پر وہی خبر چل رہی تھی جس کے بارے میں پہلے سے ہی بہت کچھ جانتا تھا۔ چارلس البرٹینی گزشتہ تین روز سے غائب تھا اور پولیس کو ابھی تک اسے تلاش کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

آکے بڑھنے سے پہلے میں اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام ایم یو اے یوٹ رائٹ ہے لیکن دوست اور دفتر کے ساتھی مجھے یو اے کہہ کر پکارتے ہیں۔ میری عمر پچاس سال ہے۔ تین مرتبہ طلاق ہو چکی ہے۔ بچہ کوئی نہیں۔ مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ میں سرائے رساں کے طور پر کام کرتا ہوں۔ مجھے ملازمت کرتے ہوئے چھبیس سال ہو گئے ہیں۔ حیرت ہے کہ ابھی تک مجھے نوکری سے نہیں نکالا گیا حالانکہ اپنی عادتوں کی وجہ سے میرا ایک دن بھی ملازمت پر رہنا ممکن نہ تھا۔ بہر حال اب جیسے جیسے پینشن کا وقت قریب آ رہا ہے، میں سنجیدہ ہوتا جا رہا

ساتھ دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ کچھ کاغذات پر دستخط کر رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ”ہوائے اندر آ جاؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ چند منٹوں بعد اسے فراغت نصیب ہوئی تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ادہ میرے خدا! یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔“

”شاید تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ البرٹنی خاندان اس شہر کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کا میئر، آسٹا کا سیکنڈ کزن ہے اور اسے اس بات پر گہری تشویش ہے کہ چارلس ابھی تک لا پتا ہے۔“

میں خاموش رہا۔ اسے کیا بتاتا کہ ایک تنہا آدمی کی رات کس طرح گزرتی ہے۔ اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ”نی وی کی خبروں میں البرٹنی کے معاملے کو کافی اچھا لا جا رہا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ہماری اس معاملے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔“

”اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے خاندان کے ہر فرد اور ان کے دوستوں سے بات کی ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی چارلس سے کوئی شکایت نہیں ہے اور کسی نے بھی اخبارات کو فون کر کے اس واقعے کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ ہم نے البرٹنی کی رہائش گاہ کے فون ٹیپ کرنا شروع کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے وہاں ایک شخص کو جو بیس گھنٹے کے لیے تعینات کر دیا ہے تاکہ وہ صورت حال پر نظر رکھ سکے۔ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں میں؟“

”ہاں، ہمیں ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس لڑکے کو نصف شب کے قریب بستر سے سمجھ کر لے جایا گیا۔ میں نے ہر اس جگہ سے معلومات حاصل کیں جہاں وہ اس شب سے پہلے گیا تھا۔ تقریباً سبھی لوگ جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر چکے ہیں۔ کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں ملا کہ وہ ریاست کی حدود سے باہر چلا گیا ہے۔ گوکہ ہم

”میں ان تمام اقدامات سے واقف ہوں اور اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔“ ملاجی نے کہا۔ مجھے آسٹا کی فون کال



موصول ہوئی ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ تھوڑی سی سگی ہے۔ وہ تم پر کافی براہم ہو رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اس کا یہ بھی خیال ہے کہ تم اور تمہاری ٹیم جو کچھ کر سکتی تھی، وہ کر چکی۔ اس نے اب کسی اور کی مدد لینے کا فیصلہ کیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی سے باہر سڑک کا نظارہ کرنے لگا پھر پلٹ کر بولا۔ ”ہمارے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس نے کارپیٹر سے اس کیس کو دیکھنے کے لیے کہا ہے۔“

”نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ ہے۔“ ملاجی نے کہا۔

”اس کے ساتھ کام کرنے سے بہتر ہے کہ میں ریٹائرمنٹ لے لوں۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”تم اس کے ساتھ کام نہیں کرو گے؟“ ملاجی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم دونوں کو آپس میں ملنے کا موقع بھی نہ ملے۔ اسے اپنے طور پر کام کرنے دو۔“

”تم ابھی طرح جانتے ہو ہاں کہ اگر ایک بار اس نے آستھا کو اپنے فکشنے میں جکڑ لیا تو اس کا کہا ہوا پتھر کی لکیر ثابت ہوگا۔ اگر اس نے کوئی تجویز بھی دی تو وہ میرے لیے حکم کا درجہ ہوگی، جبکہ وہ ایک ناکارہ شخص ہے اور محض اپنی قسمت سے کھارہا ہے۔“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس نے کبھی کسی کام کا کریڈٹ نہیں لیا۔“

”وہ شہرت نہیں بلکہ پیسوں کے لیے کام کرتا ہے اور انتہائی درجے کا ناقابل برداشت شخص ہے۔ صرف وہی کیوں؟ کیا اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کی خدمات حاصل نہیں کی جاسکتیں؟“

”تم معاملات کو مشکل بنا رہے ہو بوائے۔“ میلاجی نے کہا۔ ”میں تم پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتا لیکن ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ میں تمہیں اس کیس سے الگ نہیں کر رہا بلکہ تم اب بھی مرکزی سراغ رساں کے طور پر کام کرو گے لیکن چاہے تم اسے پسند کرو یا نہیں کارپیٹر اس کیس کا حصہ بنے جا رہا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم جھیل والسن پر واقع اس کے گھر جاؤ اور اس کے ساتھ مل کر کام کرو۔“

جھیل والسن شہر سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر تھی۔ یہاں امرا کے مکانات تھے اور ان کی قیمتیں پانچ لاکھ ڈالرز سے شروع ہوتی تھیں اور وہی شخص ان مکانوں کو

خرید سکتا تھا جس کا معاوضہ سات ہندسوں میں ہو۔ کارپیٹر بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ میں نے ڈرائیوے کے سامنے گاڑی کھڑی کر کے اس کے عالی شان مکان پر نگاہ ڈالی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا رقبہ کم از کم نو ہزار مربع فٹ تھا۔ یقیناً اس میں پانچ کمرے اور کئی باتھ روم ہوں گے۔ گیرج کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مجھے وہاں سفید رنگ کی مرسیڈیز نظر آرہی تھی۔ اس کے مقابلے میں مجھے اپنی تین سال پرانی امبالا بہت حقیر لگی تاہم میں اسی پر مطمئن اور قانع تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی اور کئی منٹ بعد کارپیٹر نے دروازہ کھولا۔ اس وقت بھی وہ کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود دوبارہ باتوں میں مشغول ہو گیا۔ اس کا قد تقریباً ساڑھے پانچ فٹ تھا اور اس نے سفید پتلون کے ساتھ کاشن کی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ کی انگلیوں میں چھ انگوٹھیاں نظر آرہی تھیں۔ کافی دیر بعد اس کی گفتگو ختم ہوئی تو وہ میری طرف متوجہ ہوا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”سراغ رساں بوٹ رائٹ اتم سے مل کر خوشی ہوئی، کیسے ہو؟“

”کیا تم نہیں جانتے؟“ میں نے جل کر کہا۔

”سچ تو یہ ہے کہ بہت کچھ جانتا ہوں۔ تم بہت زیادہ ڈرنک کرتے اور کھانے کا خیال نہیں کرتے ہو۔ تمہاری نیند بھی پوری نہیں ہو رہی اور اپنا بہت سادہ وقت دفتر میں گزارتے ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ کسی نفسیات داں کو بھی اس نتیجے تک پہنچنے میں دماغ سے سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“

”حقیقت یہ ہے کہ میں نے بھی اپنے دماغ پر زور نہیں ڈالا۔“ تمہاری آنکھیں سب کچھ بتا رہی ہیں۔ میں تمہارے پسینے سے الکحل کی بو سونگھ سکتا ہوں۔ بہت زیادہ پینے والے شاید ہی مجھے ڈھنگ سے کھانا کھاتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ بہت کچھ اس اخبار نے بیان کر دیا ہے۔“ اس نے ٹیلی گراف کا تازہ شمارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں چارلس کے بارے میں لکھا ہے، واقعی صورت حال بہت پیچیدہ ہو گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری تھوڑی بہت مدد کر سکوں گا۔“

”ہاں، مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو لیکن اس کے لیے تمہیں ہر حال میں مداخلت کرنا ہوگی۔“

دھوکے باز

نے شادی نہیں کی تھی۔ لہذا وہ کبھی بگ ہاؤس چھوڑ کر نہیں گیا۔ اس مکان کو جانے والی چوتھائی میل لمبی سڑک پر مختلف چینلز کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، میں نے ایک دو شاسا چہروں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گھر کے سامنے پہنچے ہوئے دائرہ نما کار پارک کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ کسی وقت بھی مکان میں داخل ہو سکتا ہوں جب میں نے دروازے پر دستک دی تو وہاں مجھے اپنے ایک معاون سراغ رساں اسکاٹ بیکنز کا چہرہ نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ تھوڑا سا حیران ہوا اور بولا۔ ”معاف کرنا، میں سمجھ رہا تھا کہ تم دو گھنٹے بعد آؤ گے۔“

”مچالی نے ایک نیا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ سزا البرٹنی کہاں ہیں؟“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آسٹن البرٹنی نے پارلر کا فرانسسی دروازہ کھولا اور میرے سامنے آگئی۔ اس نے ایک لمبا سا لبادہ پہن رکھا تھا جو اس کے پیروں تک آ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال داغ دیا۔ ”کیا تم کوئی خبر لے کر آئے ہو؟“

میں نے لمبی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے سزا البرٹنی، فی الحال میرے پاس کوئی نئی خبر نہیں ہے۔ میں صرف سراغ رساں بیکنز سے یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ انہوں نے والوں نے کوئی فون تو نہیں کیا۔“

”نہیں۔“ بیگز اس نے مختصر جواب دیا۔ ”اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“ آسٹن نے پوچھا۔ میں اسے سچ نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ تادان کے لیے فون آنے میں جتنی تاخیر ہو رہی تھی، اتنا ہی چارلس کی زندگی کے لیے خطرات بڑھتے جا رہے تھے۔ ”ہمیں فی الحال مبر سے کام لینا ہوگا۔“ میں نے اس کا ہاتھ چھتپاتے ہوئے کہا۔

”میں اس کے لیے مسلسل دعا میں مانگ رہی ہوں۔“ وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”میری خدا سے یہی التجا ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں کوئی اشارہ یا چھوٹی سی اطلاع مل جائے تاکہ ہم اپنے پیارے بیٹے کو واپس لا سکیں۔“

”ہم اسے واپس لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ ”تم ٹھیک ہوئی معلوم ہو رہی ہو۔ شاید تھوڑی دیر سونے سے بہتر محسوس کر سکو۔“ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کروں گی۔“

”واقعی تم بہت ہوشیار ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کبھی دخل اندازی کے بارے میں نہیں سوچتا اگر آسٹن براہ راست مجھ سے رابطہ نہ کرتی۔“

”اور میرا خیال ہے کہ اس نے ہمیں پولیس کی مدد کرنے کے عوض ہماری معاوضے کی پیشکش کی ہوگی۔“ ”وہ عورت بہت فیاض ہے۔“ وہ مجھے مشروب کا گلاس پکڑاتے ہوئے بولا۔

”تمہاری ٹیلی فون سرورس کیسی جا رہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت اچھی۔ میں نے چھ ماہ پہلے یہ سرورس شروع کی تھی۔ میں نے اس کے لیے کوئی اشتہار نہیں دیا اور نہ ہی کسی قسم کی پبلسٹی کی۔ صرف دو یا تین باقاعدہ گاہکوں کو اپنا پرائیویٹ نمبر دے دیا تھا اور انہوں نے ہی اپنے جاننے والوں میں اس کا تذکرہ کر کے میرے کام کو پھیلا دیا۔“ ”تمہاری فیس کتنی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تم ٹیلی فون پر مشورہ دینے کا کافی منٹ کتنا معاوضہ لیتے ہو؟“

”مجھے شرم آتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔ ”کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے چارلس کے کیس پر بات کر سکتے ہیں؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اب تک تم نے کیا معلوم کیا؟“

میں نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ تمام متعلقہ افراد جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر چکے ہیں اور نہ ہی ابھی تک کسی نے تادان کے لیے فون کیا۔“

”یہ سب کچھ مجھے آسٹن نے پہلے ہی بتا دیا ہے۔“ ”ٹھیک ہے اگر تم اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر یہ بتا دو کہ چارلس کو کس نے اغوا کیا ہے تو میں اسے گرفتار کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”یہ کام اس طرح نہیں ہوگا۔ مجھے البرٹنی ہاؤس جانا ہوگا تاکہ تجھے اشارے تلاش کر سکوں۔“ پھر اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”میں ابھی نہیں جاسکتا کیونکہ کوئی شخص مجھ سے اپنے کسی معاملے میں مشورہ کرنے آ رہا ہے۔ کیوں تا میں نہیں وہاں پانچ بجے کے قریب مل جاؤں۔“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔ البرٹنی کا احاطہ مورگن کے جنوب میں دس ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ دراصل اس خاندان کے کسی فرد نے بھی یہاں سے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سب یہیں رہتے رہے۔ اس خاندان کی چار نسلیں چھ مکانات پر قابض تھیں۔ چارلس

جاسوسی ڈائجسٹ

واپس گھر چلی گئی۔

وہ اپنا ہونٹ چباتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی جواب میں اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر ہم دونوں نے ہی ایک ساتھ زوردار قہقہہ لگایا۔ بہت دنوں بعد میرے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

”میں سزا البرٹینی سے پوچھوں گا اگر اس نے مجھے اس معاملے پر تم سے بات کرنے کی اجازت دے دی تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“

وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی کار پیٹر کے آنے میں دیر تھی۔ اس لیے میں نے اس وقت کو کسی تعمیری کام کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دیر بعد میں مکن میں داخل ہوا جہاں میری ملاقات چارلس کے باپ یعنی البرٹینی سے ہوئی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: ”کچھ پینا چاہو گے؟“ اور یہ کہہ کر اس نے خود ہی میرے لیے گلاس بھر دیا۔

”میں نے چارلس کے تمام دوستوں سے بات کی ہے۔ کم از کم وہ جنہیں میں تلاش کر سکا اور ان سب نے جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر دی ہے۔ اسی طرح میں نے خاندان کے تمام لوگوں سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ سب بے تصور معلوم ہوتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ چارلس کو اغوا کرنے والا کوئی باہر کا شخص ہے۔“

”ممکن ہے۔ زیادہ تر اغوا کے کیسز میں اجنبی ملوث ہوتے ہیں اور ان کا مقصد پیسا کمانا ہوتا ہے۔“

”اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟“ ٹینی نے پوچھا۔

”بہت سی باتیں ممکن ہیں۔ اسی لیے میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ گزشتہ کئی ہفتوں سے چارلس کیس لگ رہا تھا؟“

”تمہارا مطلب ہے غائب ہونے سے پہلے۔ کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ البتہ وہ خاموش رہنے لگا تھا جب سے اسے وہ حادثہ پیش آیا۔“

”حادثہ؟“

”اسے کار ریس کا شوق تھا اور وہ تیز رفتاری سے کار چلاتا پسند کرتا تھا۔ وہ گزشتہ موسم خزاں میں ہونے والی ریس میں ایک اسپورٹس کار چلا رہا تھا کہ کار کوچ طرح کنٹرول نہ کر سکا۔ اس نے کئی تھکا بازیاں کھائیں اور بالآخر کار سے گر پڑا۔“

”کیا اسے کوئی گہری جوت آئی تھی؟“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور میں بھی کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے باہر آ گیا جہاں میرا سامنا لیلا اوٹیکس سے ہوا۔ وہ مقامی نواز محفل پر کرائم رپورٹر تھی۔ اس نے مددہ سلا ہوا لینن کاسوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے میرے پاس آتے ہی کہا: ”برائے! تم مجھے ایک منٹ دے سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے کیرا مین کو اشارہ کیا جس نے اپنے کندھوں پر ویڈیو ریکارڈر لگا دیا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا: ”تصویریں نہیں بنیں گی۔ میں تم سے پس منظر میں رہ کر بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ایک ہفتے کے دوران میں ٹی وی پر بہت زیادہ لپچکا ہوں۔“

وہ تھوڑا سا جھکی اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی: ”تم جانتے ہو کہ میں کسی اخبار میں کام نہیں کرتی اور ٹی وی پر خبر چلانے کے لیے اس کی ویڈیو بنانا ضروری ہے۔“

”تمہیں انٹرویو چاہیے یا نہیں؟“ میں نے سختی سے کہا۔

میری بات سن کر وہ ڈر گئی اور اس نے کمرے میں کودھاں سے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”نہا ہے کہ آستھانے کسی ماہر کی خدمات حاصل کی ہیں جو اس کیس کی تحقیقات میں مدد کرے گا؟“

”یہ مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ کی پالیسی نہیں ہے کہ وہ باہر کے کسی آدمی کو تحقیقات میں شامل کرے۔ ہم سے کسی نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا۔“

”یہ میرا سوال نہیں تھا۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ کیا کار پیٹر اس اغوا کے کیس پر کام کر رہا ہے؟“

”ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔“

”میں تمہیں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ اس کا ہماری تحقیقات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارا سوال یہ ہے کہ کیا آستھانے کار پیٹر کی خدمات حاصل کی ہیں تو یہ سوال بھی اسی سے پوچھو۔“

”میں کوشش کر چکی ہوں۔“

”پھر اس نے کیا کہا؟“

”کچھ نہیں، اس نے مجھے ایک جیسٹری پکڑائی اور

دھوکے باز

ہدایت کی ہے۔“ میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
”بہت خوب، کیا تم مجھے اس اغوا کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟“

”نہیں، ابھی تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق تین دن پہلے جب آستان صبح ساڑھے سات بجے کے قریب چارلس کے کمرے میں گئی تو اسے بستر پر اپنے بیٹے کے بجائے ایک خط ملا جو چارلس ہی کی تحریر تھی اور اس میں لکھا تھا کہ وہ جلد ہی فیملی سے رابطہ کرے گا۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ خط وہاں کیسے پہنچا؟“
”اگر اسے اغوا کیا گیا ہے تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ خط اغوا کنندہ نے وہاں چھوڑا ہوگا۔“

”یعنی اسے اس کے کمرے سے اغوا کیا گیا؟“

”یہ آستھا کا خیال تھا۔“

”کیا میں وہ کمرہ دیکھ سکتا ہوں؟“

”ضرور۔“

میں اسے دوسری منزل پر لے گیا جہاں میرے معاون اسکاٹ بیگز نے چارلس کے کمرے کے دروازے کے سامنے پیلا ٹیپ باندھ دیا۔ میں نے اسے ہٹا کر دروازہ کھولا، کار پیٹر کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے کمرے کی لمبائی سترہ اور چوڑائی پندرہ فٹ تھی۔ اندرونی دیوار کے ساتھ ایک بڑے سائز کا بستر تھا جبکہ دوسری دیوار کے ساتھ ایک بڑی ٹی ٹیوٹری بی ہوئی تھی۔

”کیا کسی نے کمرے کی صفائی کی تھی؟“ کار پیٹر نے پوچھا۔

”نہیں، کسی چیز کو نہیں چھیڑا گیا۔“

کار پیٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے کے وسط میں چلا گیا۔ اس نے دلوں ہاتھ پشت پر باندھے اور ایک چھوٹے دائرے کی شکل میں چکر لگانے لگا۔

”کوئی اشارہ ملا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ چکر لگانے لگا۔ ایک منٹ بعد وہ رک کر بولا۔

”ہاتھ روم اس طرف ہے؟“ اس نے دائیں جانب کی دیوار میں ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہاتھ روم میں چلا گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اب اس نے اپنے ہاتھ پشت پر سے ہٹا لیے تھے اور ہاتھ روم کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر دیوار میں لگا ہوا دواؤں کا کیبنٹ کھولا اور اس کا غور

”ہاں اس کے سر میں چوٹ لگی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا اور ابھی تک اس کا یہی حال ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اس کی یادداشت کبھی واپس نہیں آ سکے گی، تاہم آستھا کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی۔ وہ مسلسل چارلس کو اکساتی رہی اور اسے یاد دلانے کی کوشش کرتی رہی۔ جیسے وہ کہیں کوئی چیز رکھ کر بھول گیا ہو، کبھی کبھی تو اس عورت کی باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں۔“

پانچ بجے کے قریب کار پیٹر کی آمد ہوئی۔ وہ جیسے ہی کار سے باہر آیا تو وہاں موجود صحافیوں اور کیمرامین نے اسے گھیر کر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ کیا پولیس نے اس کیس میں معاونت کے لیے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔ کار پیٹر نے دلوں ہاتھ اٹھا کر مجمع کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں یہاں صرف اس فیملی کے دوست کی حیثیت میں آیا ہوں۔ سزا البرغینی نے اس مشکل وقت میں سہارا دینے کے لیے مجھے بلایا ہے۔ آپ پولیس کی تحقیقات کے بارے میں سراغ رساں بوٹ رائٹ سے سوالات کر سکتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ ہلایا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجمع میں سے کسی نے بہ آواز بلند میرا نام لے کر پکارا لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور پانچ منٹ بعد میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ کار پیٹر بغلی کمرے میں آستھا کا ہاتھ تھامے اسے تسلی دے رہا تھا۔ ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ڈیئر، بوٹ رائٹ کا شمار بہترین سراغ رسانوں میں ہوتا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اسے تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔“

”ایکسپیکو زنی، سزا البرغینی۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کار پیٹر سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”ہاں کیوں نہیں؟“ وہ یہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ میں کار پیٹر کو لے کر پارک میں آ گیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیا میں تم سے کچھ سوالات کر سکتا ہوں؟ مجھے اس کیس کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہے جو اخبارات میں شائع ہوا ہے۔“
”چیف نے مجھے ہر حال میں تم سے تعاون کرنے کی

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ "آستھانے مجھے اس بارے میں کئی روز پہلے بتایا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا اور ڈاکٹر نے اس کے لیے دوا میں تجویز کی تھی۔ جب میں نے اس کی دواؤں کا کیسٹ دیکھا تو وہاں مجھے کوئی دوا نظر نہیں آئی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ چارلس اپنے ساتھ دوا میں بھی لے گیا؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کمرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور بولا۔ "نی الحال یہی اشارے مل رہے ہیں آؤ، اس کے گھر والوں سے بات کرتے ہیں۔" میں نے آستھا اور نمینی کوفون کر دیا کہ وہ پارلر میں ہمارے ساتھ گفتگو میں شریک ہو جائیں۔ آستھانے کمرے میں داخل ہوتے ہی کار بیئر سے پوچھا۔ "تم ہمیں کوئی نئی بات بتا سکتے ہو؟"

"ابھی میں اس پر کام کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک یہ معلوم نہ کر لوں کہ چارلس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔"

"اودہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" آستھا بولی۔ "کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں؟"

"کیا گھر میں کوئی ایسی چیز ہے جو چارلس کے لیے بڑی اہم ہو۔ کوئی ایسی چیز جو طویل عرصے سے اس کے پاس ہو؟"

"مثلاً کپڑے وغیرہ؟" نمینی نے پوچھا۔ "کوئی جیولری۔" کار بیئر نے کہا۔ "کوئی ایسی چیز جو وہ بیشتر وقت پہنتا ہو۔"

"ایک منٹ، میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر آستھا چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک دھوپ کا چشمہ تھا۔ اس نے بتایا۔ "چارلس ہر جگہ یہ لگا کر جایا کرتا تھا۔ اس کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا۔ اس کے بعد سے ہی اسے دھوپ میں نکلنے سے تکلیف ہوتی تھی۔"

میں نے کار بیئر کی طرف دیکھا۔ جواب میں اس نے بھی مجھ پر ایک نظر ڈالی جس سے اندازہ ہو گیا کہ ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور وہ یہ کہ اگر چارلس اپنی مرضی سے گیا تھا تو وہ یہ چشمہ کیوں لے کر نہیں گیا۔

کار بیئر نے جلدی سے وہ چشمہ ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔ "براہ کرم کھڑکی کا پردہ برابر کر دیں۔ باہر سے آنے والی روشنی کی وجہ سے میری توجہ منتشر ہو رہی ہے۔"

سے جائزہ لینے کے بعد دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ پھر وہ سیدھا کھڑکی کی طرف گیا اور اس کے دونوں دروازے کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

"کھڑکی کے نیچے قدموں کے نشانات نظر نہیں آرہے۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں، کسی قسم کی گڑبڑ کے آثار نہیں دکھائی دیے۔" مجھے بھی یہی امید تھی۔

"لگتا ہے کہ تم پہلے سے ایک نظریہ قائم کر کے یہاں آئے ہو؟" میں نے چہیتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"بالکل ایسا ہی ہے اور مجھے شبہ ہے کہ تم بھی پہلے سے ہی ان خطوط پر سوچ رہے ہو۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ چارلس کو اس کمرے سے لے جایا گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم صحیح سوچ رہے ہو۔ کھڑکیاں اپنی جگہ سے نہیں ہل رہی ہیں اور کھڑکی کے نیچے گھاس پر بھی کوئی نشان نہیں ہے اور جس رات چارلس غائب ہوا تو مرکزی دروازہ بھی نہیں کھولا گیا۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ایک روز پہلے معمول کے مطابق الارم کو آٹھ بجے پر سیٹ کیا گیا تھا اور جب دوسری صبح آستھا کو وہ خط ملا تو اس وقت بھی الارم آن تھا۔"

"اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چارلس اس رات کمرے ہی میں نہ ہو؟" کار بیئر نے خیال ظاہر کیا۔

"اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ خط وہاں کیسے پہنچا؟" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "اب ہم بستر کا جائزہ لیتے ہیں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ اغوا کرنے والا، اپنے شکار کو سوتے سے اٹھانے اور اسے ساتھ لے جانے سے پہلے بستر ٹھیک کرنے کا موقع دے، تم دیکھ رہے ہو کہ اس پر ایک فلکن بھی نہیں ہے جیسے اسے استعمال ہی نہ کیا گیا ہو پھر یہاں جوتے بھی نظر آرہے ہیں۔"

میں نے نیچے جھک کر دیکھا۔ بستر کے نیچے جوتوں کا ایک جوڑا موجود تھا۔ "میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے چارلس کو سوتے سے اٹھایا اور اسے الماری تک جانے کی مہلت دی تاکہ وہ وہاں سے جوتوں کا ایک جوڑا نکال لے جبکہ بستر کے نیچے بھی جوتے رکھے ہوئے تھے۔"

"تمہارا کہنا درست ہے۔" کار بیئر بولا۔ "تمہیں اس کے سر کی چوٹ کے بارے میں علم ہے؟"

اس کے سر کی چوٹ کے بارے میں علم ہے؟

اس کے سر کی چوٹ کے بارے میں علم ہے؟

اس کے سر کی چوٹ کے بارے میں علم ہے؟

دھوکے باز

نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ چارلس کو اس رات زبردستی نہیں لے جایا گیا۔ البتہ یہ معاہدہ عمل طلب ہے کہ وہ تحریر وہاں کس نے رکھی۔

”یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟“ مینی نے کہا۔

”پہلی بات تو یہ کہ وہ اپنے بستر پر نہیں سویا جو بالکل تیار حالت میں تھا اور اس پر ایک ٹکڑی بھی نہیں تھی۔ دوسرا نکتہ کہ تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں اور اس رات.... الارم بھی نہیں بجا جس کا مطلب ہے کہ باہر سے کوئی شخص اندر نہیں آیا۔ تیسری بات، اس کے بستر کے نیچے جوتوں کا ایک جوڑا ملا ہے اگر اسے کمرے سے اغوا کیا جاتا تو یہ جوتے اس کے پیروں میں ہونے چاہیے تھے۔ چوتھی بات، اس کے کینٹ سے دوا کی غائب ہیں اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کوئی معمول کا اغوا نہیں تھا اگر چارلس غائب ہے تو اس میں کوئی فائدہ ہے۔ ہوا یا نہیں لیکن یہ طے ہے کہ اسے اغوا نہیں کیا گیا۔“

آستھا اور مینی نے مڑ کر کارپیٹر کی طرف دیکھا۔ ان کے تاثرات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اسے چھپ زبانی کے لیے مورد الزام ٹھہراتا چاہ رہے تھے یا انہیں امید تھی کہ وہ کوئی ایسا ثبوت پیش کرے جس کے ذریعے اس پر ان کا اعتماد بحال ہو سکے۔ کارپیٹر ابھی تک ٹرانس کی کیفیت میں تھا۔ اس نے سامنے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کچھ خفیہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں معلوم نہیں۔“

پھر وہ کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پارلر سے باہر نکل گیا۔ ”یہ کیا کر رہا ہے؟“ مینی نے پوچھا۔

”چیل قدی۔“ مینی نے کہا اور کارپیٹر کے پیچھے چل دیا۔ وہ کچن کو جانے والی راہداری پر جا رہا تھا اور آہستہ آہستہ چشمے کو دائیں بائیں گھما رہا تھا۔ آستھا اور مینی بھی میرے پیچھے چلے آئے۔ کارپیٹر کچن کے دروازے پر جا کر رک گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

”یہاں بہت کمزور اشارے مل رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

پھر وہ راہداری میں آگیا۔ پارلر کے بالقابل لائبریری تھی۔ وہ ایک لمبے کے لیے دونوں کمروں کے درمیان کھڑا چشمے کو مختلف سمت میں گھماتا رہا پھر لائبریری کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”یہاں زیادہ مضبوط اشارے مل رہے ہیں۔“

ہم اس کے پیچھے لائبریری میں چلے گئے۔ یہ ایک

مینی نے آگے بڑھ کر پردے کھینچ دیے۔ اب کمرے میں برائے نام روشنی تھی۔ کارپیٹر نے بہ آواز بلند کہا۔

”میں کوئی ڈراما نہیں کر رہا۔ البتہ اس طرح مجھے اشاروں کو محسوس کرنے میں آسانی رہے گی۔ میں سب لوگوں سے یہی کہوں گا کہ وہ بالکل خاموش رہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی پہلی پرچہ رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور سانس لینے کے سوا کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ”میں اس چشمے کے ذریعے چارلس کی موجودگی محسوس کر سکتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ بہت ہی متحرک شخص ہے۔“

”وہ ہمیشہ سے ہی مضبوط ذہن کا بچہ تھا۔“ آستھا نے کہا۔

کارپیٹر نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور دوبارہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ”میں حال ہی میں ہونے والی گڑبڑ کو بھی محسوس کر رہا ہوں۔“

میں نے آنکھیں گھما کر اسے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ کارپیٹر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”معاملات ایسے نہیں جو کہ نظر آ رہے ہیں۔ ہم بہت سی باتوں کے بارے میں نہیں جانتے۔ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ چارلس کو اس کی مرضی کے خلاف لے جایا گیا ہے۔“

”کیا؟“ مینی حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”پلیز۔“ کارپیٹر بولا۔ ”ایک منٹ رک جاؤ۔ ہاں، میں یہ بات زیادہ شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی کشیدگی محض ہمارا وہم ہے۔ ہم صحیح سمت میں نہیں دیکھ رہے اور اسی لیے ہمارا فیصلہ مبہم ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”بس اتنا ہی کافی ہے۔“

”مسٹر بوٹ وائٹ۔“ آستھا چلاتے ہوئے بولی۔

”وہ کچھ بتانے والا تھا۔“

”وہ جنہیں کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ درحقیقت اس نے ابھی

تک کوئی بھی محسوس بات نہیں کی۔“

کارپیٹر بالکل خاموش رہا۔ اسے بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آستھا اس کا دفاع کرنے کے

لیے کافی ہے۔

”معاف کرنا۔“ وہ بولی۔ ”تم اس کیس پر تین دن

سے کام کر رہے ہو۔ اب تک تم نے کیا معلوم کیا؟“

”تمہارے چشمے دینے سے پہلے میں اور کارپیٹر اس

پانچ فٹ اونچا تھا لیکن مجھے روفٹ کے فاصلے پر وہ سڑکیاں صاف نظر آرہی تھیں جو الماری اور راہداری کے نیچے جارہی تھیں۔ اگر میں اندر چلا جاتا تو کچے فرش پر میرے قدموں کے نشانات بھی بن جاتے۔

"سب لوگ لائبریری سے باہر چلے جائیں۔" میں نے کہا۔ "میری نظر میں یہ بھی جائے وقوعہ ہے اور مجھے اس کا معائنہ کرنے کے لیے لیب ریزی کے لوگوں کو بلانا ہوگا۔"

میں گھر کے باہر پورچ میں کھڑا ان لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان کا ٹرک پہنچ گیا۔ پہلے ہم نے کچھ چیزوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے وضاحت کی۔ "ہم نے لائبریری کی دیوار کے پیچھے ایک خفیہ جگہ تلاش کی ہے اور وہاں تازہ قدموں کے نشانات ہیں۔ میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

میں نے انہیں وہ جگہ دکھائی اور بتایا کہ کس طرح یہ تختہ دریافت ہوا۔ اس کے بعد میں نے انہیں وہیں چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنا کام کر سکیں اور خود پارک میں واپس آگیا۔ آستھا وہاں صدمے کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی اور ٹینی اس کی دل جوئی کر رہا تھا۔

آستھا نے کار پیئر کو ٹیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "یہاں آکر مجھے اشارے ملنے لگے۔ یہ بات میرے دہم وگمان میں بھی نہ تھی... صرف میرے تصور نے رہنمائی کی۔"

"کتنی حیرت انگیز بات ہے۔" آستھا نے کہا۔ "قدرت نے تمہیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔"

"اس معاملے میں دخل اندازی کرنا پسند نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم سے چند سوالات کرنا ضروری ہیں۔ مسز البرٹینی کیا تمہیں پہلے سے اس تختے یا خفیہ خانے کے بارے میں معلوم نہیں تھا؟"

"نہیں۔" مجھے یہاں رہتے ہوئے صرف تیس سال ہوئے ہیں۔ البتہ میرے شوہر نے ساری زندگی یہیں گزاری ہے۔"

"میرے لیے بھی یہ ایک خبر ہے۔" ٹینی نے کہا۔ "میں یہیں پلا بڑھا لیکن کسی نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔"

"اس کا مطلب یہ کہ تمہارے بیٹے کو بھی اس کا علم نہیں ہوگا۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ اسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔" ٹینی

بہت بڑا کرا تھا اور غالباً اس کا رقبہ تین سو مربع فٹ ہوگا۔ اس کے وسط میں ایک بڑا سا فالوس لٹک رہا تھا اور فرش سے چھت تک دیواروں کے ساتھ بک شیف بنے ہوئے تھے جن میں ایک ہزار یا اس سے بھی زیادہ کتابیں ہوں گی۔"

"ہاں۔" کار پیئر نے کہا۔ "وہ یہیں ہے۔" "کیا؟" میں نے پوچھا۔ "مگر بڑی بنیاد۔"

اس نے چشمہ مجھے پکڑا دیا اور اپنے ہاتھ اس طرح پھیلا دیے جیسے کوئی دعا مانگ رہا ہو۔ پھر وہ اس اندرونی دیوار کی طرف بڑھا جو لائبریری کو کچن سے الگ کرتی تھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آگے پیچھے ہلانے لگا پھر بولا۔

"یہاں سب سے زیادہ توانا اشارے مل رہے ہیں۔ کیا تمہارے پاس کوئی تاریخ ہے بوائے؟"

میرے پاس تاریخ نہیں تھی لیکن ٹینی نے اسے کچن سے لاکر تاریخ پکڑا دی۔ اس نے دیواروں اور چھت پر روشنی ڈالی اور اسے وہ چیز نظر آگئی جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نے اخروٹ کے تختے کے درمیان ایک جگہ کو دبایا تو وہ نمایاں ہو گئی کسی نے وہاں اس مہارت سے تختہ لگا یا تھا کہ غور سے دیکھنے پر بھی نظر نہ آتا۔ کار پیئر نے اپنی انگلی سوراخ میں ڈالی اور اسے دائیں بائیں تھمانے لگا۔ تختہ ایک طرف سے ہٹ گیا اور اندر مٹی کی تہ نظر آنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟" ٹینی چلا یا۔

"اوہ میرے خدا۔" آستھا بولی۔

میں آگے بڑھا اور کار پیئر کے ہاتھ سے تاریخ لیچ ہوئے بولا۔ "مجھے تو یہ کوئی راستہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے سوراخ میں روشنی ڈالتے ہوئے کہا پھر آہستہ آہستہ تختے کو اندر کی جانب تھماتا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اتنی جگہ بن گئی کہ کوئی شخص جھک کر اندر جاسکے۔ میں نے ان لوگوں کو ہدایت کی کہ ابھی کوئی شخص اندر جانے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے بعد میں لائبریری سے باہر راہداری میں آگیا۔ مجھے ہال کے وسط میں ایک الماری نظر آئی۔ اسے کھول کر دیکھا تو اس میں صفائی کا سامان رکھا ہوا تھا۔ یہ الماری دو سے تین فٹ گہری تھی اور اس کا فاصلہ لائبریری کے دروازے سے اتنا ہی تھا جتنا کہ لائبریری کی اندرونی دیوار کا۔

میں دوبارہ اس خفیہ خانے کی طرف گیا اور اس میں اپنا سر ڈال دیا تاکہ اندر کی جگہ دیکھ سکوں۔ وہ ظلاً چار سے

ہیں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ تہ خانہ تک جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔

”ہمارے یہاں کوئی تہ خانہ نہیں ہے۔“ مثنیٰ نے کہا۔

”ممکن ہے کہ تمہیں اس کا پتا نہ ہو۔“ میں نے کہا۔

”تم ایک گھنٹا پہلے تک اس جمیئر کے بارے میں بھی نہیں جانتے تھے۔“

”یہ سڑھیاں کہیں بھی جاری ہوں۔“ کار پیٹر نے کہا۔

”ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ تہ خانہ دادا نے کسی خاص مقصد کے لیے یہ سڑھیاں بنوائی تھیں۔“

”تم جانتے ہو۔“ مثنیٰ نے کہا۔ ”داوا جان سبھی کسی کو بتائے بغیر گھر سے باہر جانا چاہتے ہوں گے۔“

میرے ڈیڑی کا کہنا ہے کہ وہ عورتوں کے رسیا تھے۔

”ادہ میرے خدا میں یہ سب سننے کے لیے یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔“ آستھانے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

میں بھی تازہ ہوا میں سانس لینے کی غرض سے باہر گیا تو رپورٹروں نے مجھے گھیر لیا۔

”مثنیٰ ان کی سربراہی کر رہی تھی۔ میں نے انہیں ہوال کرنے کا موقع دینے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا۔“

”نی الحال میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہم نے مکان کے اندر معلومات کا ایک نیا ذریعہ دریافت کیا ہے۔ ابھی تک انوائکنڈہ نے رابطہ نہیں کیا ہے لیکن ہم اس نئے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور بس۔ اس سے زیادہ بتانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“

”کیا اس ذریعے کو دریافت کرنے میں کار پیٹر کا کوئی کردار ہے؟“ مثنیٰ نے پوچھا۔

”نی الحال میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ بہتر ہوگا کہ آپ لوگ کچھ کھانے کے لیے قریبی ریستوران میں چلے جائیں، ممکن ہے کہ تھوڑی دیر بعد میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے کوئی نئی بات ہو۔“

وہ مجھ سے مختلف سوالات کرتے رہے لیکن میں نے کسی کا بھی جواب نہیں دیا۔ مجبوراً انہیں مایوس ہو کر جانا پڑا۔

مجھے شدت سے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن میرے ڈاکٹر نے دو سال پہلے سگریٹ چھڑوا دی تھی اور اب میں دوبارہ اس راستے پر نہیں چلنا چاہتا تھا چنانچہ میں پوریج کی ریڈنگ پر جھک کر گھرے سانس لینے لگا۔ اچانک میری نظر کار پیٹر کی کار پر گئی اور مجھے اس کی پچھلی سیٹ پر کوئی

نے کہا۔

”یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔“ میں نے کہا۔

”کار پیٹر کا کہنا ہے کہ اس نے چارلس کے چشمے سے اشارے وصول کیے اور ان کی مدد سے وہ لائبریری تک پہنچ گیا۔ اگر چارلس پہلے کبھی اس جمیئر میں نہیں گیا تو اس چشمے سے کس طرح اشارے مل سکتے تھے؟“

میری بات سن کر سب نے کار پیٹر کی طرف دیکھا لیکن وہ بالکل پرسکون نظر آ رہا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ یہ سنسنی خیزی کہاں سے آگئی۔ کسی بھی گھر میں تصادم کے ذرائع ہو سکتے ہیں۔ گھر جتنا پرانا ہوگا، اس میں اتنے ہی زیادہ تنازعات ہوں گے اور ہر تنازعہ ناخوش گوار تاثر پیش کرتا ہے۔“

مجھ سے نہ رہا گیا اور میں چلا تے ہوئے بولا۔

”مگر اب بس کرو۔“

”مستر بوائے۔“ آستھانے ناگواری کے انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ کار پیٹر دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

”سراغ رساں یوٹ رائٹ کا شبہ بالکل جائز ہے۔ وہ ایک اچھے پولیس مین کی طرح حقائق اور اعداد و شمار کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ چارلس کے چشمے سے کچھ معلوم کر سکوں گا لیکن اس قفل کے دوران میں کسی اور جانب چلا گیا اور اس کے نتیجے میں یہ خفیہ خانہ ہاتھ آ گیا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے خیال میں یہ خفیہ کمر کس کام کے لیے استعمال ہوتا ہوگا؟“ کار پیٹر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ لائبریری میں بیٹھے لوگوں کی جاسوسی کی جائے یا گھر سے چوری چھپے جانے کے لیے اسے استعمال کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مکان کا نقشہ تمہارے دادا کی مرضی سے بنا ہوگا مسٹر البرمینی۔“

”یہ درست ہے۔“

”اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ کسی کے علم میں لائے بغیر اس خفیہ کمرے کو استعمال کرنا چاہتا ہوگا۔“

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس جمیئر میں واقع سڑھیاں کہاں جاتی

”بہت خوب۔“ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر میری نظر ایک دوسرے دروازے پر پڑ گئی۔
”شاید یہ باہر جانے کا راستہ ہے۔“
”مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں بھی پہلی بار یہاں آیا ہوں، آؤ دیکھتے ہیں۔“

یوئلز نے اسے دھکا دیا تو وہ ایک چنچ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی گرم ہوا کا جھونکا آیا اور ہم نے سورج کی روشنی میں ایک بے ہوش شخص کو فرش پر لیٹے دیکھا۔ وہ چارلس البرٹینی تھا اور کارپیٹر اس پر جھکا ہوا تھا۔
”اس کی نبض چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بچ جانے گا۔“

میں نے دو مرتبہ پلکیں جھپکائیں اور بولا۔
”کارپیٹر! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“
”تمہارا انتظار۔“ اس نے کہا۔ ”میں بیرونی دروازے سے اندر آیا تھا۔“
”اب یہ مت کہنا کہ تمہیں یہاں بھی کوئی اشارہ ملا تھا۔“

”مجھے معلوم تھا کہ تم سے یہیں ملاقات ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ پہلے ہم ایسویکیس بلا لیں۔ چارلس کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔“

ایک گھنٹے بعد چارلس کو اسپتال بھیج دیا گیا اور ہم سب دوبارہ لائبریری میں بیٹھ گئے۔ آستیا مکسل رد رہی تھی اور رومال سے آنسو صاف کرتی جا رہی تھی۔ ”میں تمہارا کمن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔“ اس نے کارپیٹر سے کہا اور مجھے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔

”ہم بہت خوش قسمت ہیں۔“ کارپیٹر نے اسے بتایا۔ ”یہ میرا اندازہ ہے کہ چارلس سرنگ میں داخل ہوا تو اسے دماغی دورہ پڑا، اور وہ چلا کر گر گیا۔ اس کا سر زمین سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ درمیان میں وقفے وقفے سے وہ ہوش میں آتا رہا لیکن پھر بے ہوشی غالب آجاتی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اسے گہری چوٹ آئی ہے لیکن وہ بچ جائے گا۔“

”ایک منٹ میری بات سنو۔“ میں نے دخل در معنولات کرتے ہوئے کہا۔
”یقیناً۔“ وہ مسز البرٹینی سے معذرت کر کے میرے ساتھ باہر آ گیا اور بولا۔ ”تم کچھ پوچھنا چاہ رہے ہو؟“
”تمہیں تو نفسیاتی ماہر ہونا چاہیے تھا۔“ میں نے چوکر کہا۔

چیز رکھی ہوئی نظر آئی۔ میں کار کے قریب پہنچا اور اندر جھانکا۔ وہاں رول سیا ہوا ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔

☆☆☆

کئی منٹ بعد مجھے لیبارٹری والوں نے اندر بلایا۔ ہیڈ میکنین کا نام بواٹلز تھا اور وہ اپنے کام میں کافی تیز واقع ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”ہم نے ہیروڈ کے نشان محفوظ کر لیے ہیں۔ اس لیے اب تم اندر جا سکتے ہو لیکن اس میں اندر ایک اور عراب ہے۔ آؤ میں تمہیں کھاتا ہوں۔“

وہ مجھے ایک خفیہ دروازے سے اندر لے گیا اور مجھے ٹارجت حمادی۔ ہم سیزمیں سے اتر کر نیچے گئے۔ اس کی تہ میں ایک عراب نما سرنگ تھی جس کے چاروں طرف اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ اس میں سے بمشکل دو آدمی بیک وقت گزر سکتے تھے۔ سرنگ کی چھت میں بجلی کے بلب لگے ہوئے تھے جن میں سے زیادہ تر نا کارہ ہو چکے تھے۔

”میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کچھ بلب جنگ عظیم دوم کے زمانے کے ہیں۔“ بواٹلز بولا۔ ”یہ سرنگ حالیہ دنوں میں زیادہ استعمال نہیں ہوئی۔ ہم نے پہلی بار یہاں سے گزرتے ہوئے زیادہ تر مگڑی کے جالے صاف کر دیے تھے۔ یہ دیکھو۔“

”یہ تو قدموں کے نشان ہیں اور بالکل تازہ معلوم ہو رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

میں اس کے ساتھ آ کے بڑھتا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس راستے کی لمبائی دو سے تین سو فٹ تھی، سرنگ کے اختتام پر ایک مضبوط لکڑی کا دروازہ لگا ہوا تھا جس میں لوہے کی بھاری کٹڈی نصب تھی اور اس کے ساتھ ہی اینٹوں کے فرش پر ایک پرانا تالا پڑا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کو ہلکا سے دھکا دیا تو وہ ایک چرچاہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

”یہ اسپرنگ ہاؤس ہے۔“ اس نے ٹارج کے ذریعے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میری ماں ایک فارم پر پہلی بڑھی تھی اور میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ ان کمروں کا فرش ٹھنڈا ہوتا ہے اور اس کے لیے بیس فٹ گہرائی میں پانی کا تالاب بنایا جاتا ہے۔ لوگ ان کمروں کو ریفریجریٹر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ دادی کھن بنا کر اسپرنگ ہاؤس میں ہی رکھا کرتی تھیں تاکہ وہ خراب نہ ہونے پائے۔“

دھوکے باز

وہاں سے کسی بھی گزشتہ میں رسالہ



جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ گزشتہ

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ (بشمول رجسٹرڈ اک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ اک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بہرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: خمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیر III یکمیشن ڈینس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگ روڈ، کراچی

فون: 35895313 فکس: 35802551

”بالکل وہ تو میں ہوں لیکن پہلے تم اسے پڑھ لو۔ یہ مجھے سرنگ میں چارلس کے پاس سے ملا تھا۔“
اس نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جس پر رسالوں سے الفاظ کاٹ کر ایک پیغام ترتیب دیا گیا۔ میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس میں پانچ لاکھ ڈالر کی ادائیگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ورنہ وہ چارلس کو زندہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ گویا اغوا ہونے کا ڈراما اس نے خود ہی رچایا تھا۔

”یہ بات مجھے مع ہی معلوم ہو گئی تھی جب تم میرے پاس آئے تھے اور میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے کسی کو ملاقات کا وقت دے رکھا ہے۔ وہ شخص بارکر کاؤنٹی میں رہتا ہے اور اس کی گزراوقات کھیلوں پر شرطیں لگا کر ہوتی ہے۔“

”دوسرے الفاظ میں ہم اسے بلی کہہ سکتے ہیں۔“
”میرا بھی مطلب تھا، اس کے علاوہ بھی میرے کچھ لوگوں سے تعلقات ہیں جن تک تمہاری رسائی نہیں۔ ان میں ایک نوجوان عورت بھی ہے جس کے ساتھ چارلس چند ماہ پہلے تک ڈیننگ کرتا رہا ہے۔ اس نے مجھے چارلس کے بارے میں چند تکلیف دہ باتیں بتائیں۔ یہ سچی بھی اس کا شواہد تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ چارلس کو ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے کیونکہ وہ کئی مرتبہ شرطیں ہار چکا ہے۔“

”لیکن پانچ لاکھ ڈالر تو بہت بڑی رقم ہے۔“
”اس شخص کے لیے یہ کچھ بھی نہیں لیکن وہ اپنے باپ سے یہ رقم نہیں مانگ سکتا تھا۔ اسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس سچی نے مجھے بتایا کہ چارلس کئی دنوں سے بہت پریشان تھا اور سرکی چوٹ کی وجہ سے اس کی قوت فیصلہ متاثر ہو چکی تھی۔ اپنے اغوا کا ڈراما اس کی ایک مثال ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ سرنگ کے دروازے میں اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔“

”جہیں اس کا تالا زمین پر پڑا ہوا تھا۔“
”جبکہ باہر جانے والا دروازہ باہر سے قفل تھا۔ شاید چارلس کو یہ بات معلوم نہیں تھی یا اپنی ذہنی کیفیت کے زیر اثر وہ اسے بھول گیا۔ بہر حال اس نے وہ تحریر بستر پر چھوڑی اور لائبریری کی دیوار میں لگا ہوا تختہ ہٹا کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ سرنگ کے راستے باہر نکل جائے گا۔ وہ پہلے ہی اس مجرمانہ فعل کی وجہ سے شدید دباؤ کا شکار تھا اور اسی وجہ سے اس کے دماغ پر زور پڑا، اور

نہیں کہ آستھا اور مٹی کتنے متاثر نظر آ رہے تھے۔ اب میں جاؤں؟“

”اتنی تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے منہ سے سنا چاہتا ہوں۔ اعتراف کر لو کہ تم دھوکے باز ہو۔ اس سرنگ کے بارے میں جاننے کے باوجود تم نے اشاروں کا ٹانگہ رچایا اور ظاہر کیا کہ تمہارے علاوہ کوئی بھی وہ سب کچھ محسوس نہیں کر سکتا اور صرف تم ہی یہ معجزہ دکھا سکتے ہو۔ اس طرح تم نے آستھا سے بھاری فیس وصول کرنے کا جواز پیدا کر لیا۔“

”تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں ہمیشہ جزئیات پر دھیان دیتا ہوں جنہیں عام طور پر پولیس اور سراغ رساں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر میں جکی سے نہ ملتا تو ہم کبھی بھی چارلس کے خود ساختہ ڈراسے کے بارے میں نہ جان پاتے۔ اس کے بعد میرے لیے ریکارڈ آفس جانا ضروری ہو گیا تھا اور وہاں سے حاصل کردہ نقشے سے ہی مجھے اس محل کا سراغ ملا۔ تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے اس کیس کو حل کرنے میں تمہاری مدد کی اور اس کا سہرا تمہارے سر ہی جائے گا۔ مجھے تو صرف اپنی فیس سے غرض ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے کار کا دروازہ بند کیا اور انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تم پر... تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح میری کار کو رکی کی تعریف کرو گے کہ کس طرح میں نے وہ غصیہ راستہ تلاش کیا۔“

میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا البتہ دل ہی دل میں اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی وہ بہت شاطر اور ذہین انسان ہے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کا فن ابھی طرح جانتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اتنی معمولی سی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ ضروری نہیں، چارلس کو انوکھا کیا گیا ہے۔ وہ خود بھی کہیں غائب ہو سکتا ہے اگر اس پہلو پر غور کر لیتا تو چارلس تک پہنچنا آسان ہو جاتا لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ میں پیشہ ورانہ مجبوری کے تحت کار پیٹر کی تعریف نہیں کر سکتا لیکن دل ہی دل میں اس کا شکر گزار ہوں۔ وہ پیشہ ور سراغ رساں نہیں لیکن اپنی نام نہاد روحانی طاقت کے بل بوتے پر معجزہ دکھانا جانتا ہے۔



وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ اسپرنگ ہاؤس کے باہر تین دن تک پڑا رہا اگر اندر ہوتا تو اس کا بچنا مشکل تھا۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم نے چارلس کو سرنگ میں تلاش کر لیا ہے اور تم کس طرح بیرونی دروازے تک پہنچے؟“

”اس کے لیے تھوڑا سا دماغ استعمال کرنا پڑا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اس سرنگ کو کہیں نہ کہیں ختم ہونا تھا اور مجھے امید تھی کہ اس کے اختتام پر باہر نکلنے کا دروازہ بھی ہوگا۔ چنانچہ میں ایک لمبا چکر کاٹ کر مکان کے عقبی حصے میں پہنچا۔ وہاں مجھے دروازے پر باہر کی طرف سے ایک تالا لگا ہوا نظر آیا جس کا مطلب تھا کہ چارلس ابھی تک اندر ہے چنانچہ میں نے وہ تالا توڑ دیا اور تمہارے پہنچنے سے چند سیکنڈ پہلے اندر داخل ہو گیا۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ آستھا تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔ ”میں تو یہ سوچ کر کانپ جاتی ہوں کہ اگر تمہیں نہ بلاتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ تم نے مصیبت کی گھڑی میں ہماری بہت زیادہ مدد کی ہے۔“

اس نے آستھا کا ہاتھ چھتھپایا اور گاڑی کی طرف چل دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ اس نے گاڑی میں سوار ہو کر پچھلی سیٹ پر نظر ڈالی اور تھوڑا سا پریشان نظر آنے لگا۔

”تمہیں اس کی تلاش ہے؟“ میں نے وہ کاغذ لہراتے ہوئے کہا جو اس کی گاڑی کی سیٹ سے اٹھایا تھا۔

”ہاں۔“ وہ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے وہ کاغذ اس کے حوالے کیا اور بولا۔ ”تم بہت شاطر انسان ہو۔ مجھے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کوئی کلاسٹ تم سے ملے آ رہا ہے جبکہ تمہیں صرف جکی سے ملنے اور ریکارڈ آفس جانے کے لیے وقت درکار تھا جہاں سے تم نے ہگ ہاؤس کے نقشے کی کاپی حاصل کی۔“

”تم نے یہ بھی دیکھ لیا؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”تم کب سمجھتے ہو ممکن ہے کہ مٹی اور آستھا کو غصیہ قتل اور جیمبر کا علم نہ ہو لیکن نقشے میں ان کی موجودگی ظاہر کی گئی ہے۔“

”اسی لیے میں نے اس کا نوٹس لیا۔“

”اور وہ اشاروں والی کہانی کیا تھی؟“

”یہ سب کاروباری ہتھکنڈے ہیں۔ تم نے دیکھا

سنگ زن

اے آر بھٹی

تکون... دوستوں کی ہو... یا دشمنوں کی... کوئی نہ کوئی لختہ ضرور کھڑا کرتی ہے... تین ایسے ہی افراد کا دوستانہ... لوگ ان کی دوستی کو رشک و حسد کی نظر سے دیکھتے تھے... محبت کرنے والوں کی خواہش تھی کہ وہ اس تکون کا حصہ بن جائے... حسد اور جلن کا شکار چاہتے تھے کہ یہ زنجیر ٹوٹ جائے... خیر خواہ ناکام اور دشمن اپنی سازش میں کامیاب ٹھہرے... شش و پنج اور کشمکش کو گھٹائی اور تشنگی کو بڑھاتی تحریر کے اسرار و رموز...

وجود زن سے روٹھا ہونے والے قہقہے کا غنی شاخسانہ



حارث بیگ ابھی غسل کر کے واش روم سے نکلا ہی تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جسم پر صرف ایک تولیا لپیٹ رکھا تھا۔ فون قریب ہی رکھا تھا، اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سے اس کے اسسٹنٹ تیمور کی گھبراہٹ ہوئی آواز ابھری۔

”س... مر... ایک بری خبر ہے۔“

”فضول بکو اس... آگے بولو۔“ حارث ہونٹ سکیڑ کر بیزاری سے بولا۔ وہ اپنے اس نوآموز اسسٹنٹ سے

جاسوسی ڈائجسٹ - (237) - دسمبر 2014ء

لوہک اسپاٹ کہلاتا تھا۔ رات گئے تک خوش فکر جوڑے ساحلی ریت پر چلتے یا پھر سمندر کی جلتے ہوئی موجوں کے شور سے ڈرا دور چلے پتھروں پر بیٹھ کر محبت کی پیشگیس بڑھاتے یا پھر مستقبل کے بارے میں سہانے منصوبے بناتے تھے۔ یہاں چند ماڈرن طرز کے اوپن انڈر ایسٹورنٹ بھی تھے۔

انسپکٹر حارث جائے داروات پر پہنچا۔ وہاں پولیس کی ایک پرانے ماڈل کی جیب بھی کھڑی تھی۔ صبح کا وقت تھا لوگ کم ہی تھے مگر لاش کے قریب زیادہ تر وہ لوگ جمع تھے جن کا تعلق یا تو ریسنورنٹ سے تھا یا پھر وہ لوگ جن کی پڑھکھوہ رہائش گاہیں ساحل سمندر کے قریب واقع تھیں اور وہ صبح فیزی کے لیے وہاں آتے رہتے تھے۔

حارث کا اسسٹنٹ تیمور اپنے دیبلے تنکے وجود کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی کھڑا تھا اور تیمور اپنا لمبوترامنہ گویا اس شخص کے کان میں کھسائے اس کا سر کھانے کے انداز میں ہاتھیں کر رہا تھا جبکہ وہ شخص بے چارہ بری طرح بیزار اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم پر دیشروں والی مخصوص وردی تھی۔

انسپکٹر حارث کی جیب پر نظر پڑتے ہی تیمور نے اپنے ساتھ کھڑے اس دیشر کو بازو سے پکڑا اور تیمیزی کے ساتھ جیب سے اترتے حارث کی طرف بڑھا جیسے اس نے قاتل کو پکڑ لیا ہو۔

”سر! یہی ہے وہ شخص۔“ تیمور نے قریب پہنچ کر سلیوٹ کرنے کے بعد پرجوش لہجے میں کہا تو بے اختیار انسپکٹر حارث کے منہ سے نکلا۔ ”کون... قاتل؟“

”نہیں سر۔“ تیمور جلدی سے ہونٹوں کی طرح بولا۔ ”یہ گل فٹاں ریسنورنٹ کا دیشر مرلی دھر ہے۔ لاش نے اسے دریافت کیا تھا۔۔۔ مہم۔۔۔ میرا مطلب ہے لاش کو سب سے پہلے اسی نے دریافت کیا تھا۔“ اس کی بات سن کر انسپکٹر حارث نے پرنشونت نظروں سے اپنے اسسٹنٹ کو گھورا اور جھڑکنے کے انداز میں بولا۔

”اس کا بازو چھوڑو۔“ اور تیمور نے اس طرح جلدی سے دیشر مرلی کا بازو چھوڑا جیسے تھوڑی دیر مزید پکڑے رکھتا تو اسے کرنٹ لگ جاتا۔

انسپکٹر حارث نے دیشر مرلی سے کہا۔ ”تم ابھی ذرا ادھر ہی رکو۔“ اس کے بعد وہ تیمور کے ساتھ لاش کی طرف بڑھ گیا۔ لاش کے تین اطراف قریباً بیس فٹ کے فاصلے سے سرخ رین کی حد بندی کر دی گئی تھی۔ جس کے باہر مذکورہ لوگ براساں پیرے لیے کھڑے آپس میں چہ میگوئیوں

مضہ عاجز تھا۔ ”سر جی... ساؤتھ سی کے مقام پر ایک نوجوان کی لاش ملی ہے۔“

”تم نے چاروں کونوں کی حد بندی کروادی ہے؟“ انسپکٹر حارث ہلکے سے تھکسانہ لہجے میں پوچھا۔ ”جی سر، لاش کے گرد تین کونوں کی میں نے حد بندی کروادی ہے۔“

”تین کونوں کی؟“ انسپکٹر حارث الجھ گیا۔ ”جی سر۔“ دوسری جانب سے تیمور نے کہا۔ ”چوتھی سمت ممکن نہ تھا، اس طرف سمندر ہے۔“

”ایڈیٹ۔“ حارث نے دانت چوس کر اسے ڈپٹا۔ ”میں ابھی وہاں پہنچتا ہوں، تم وہیں رہو۔“ اس نے ریسیور کرپٹل پر رکھا اور جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔

صبح کے سات بجے کا وقت تھا۔ وہ ویسے بھی ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس اطلاع کے بعد اس کی تیاری میں ڈرائیزی آگئی تھی۔ ناشا کرنے کا اب وقت نہ تھا۔ تاہم وہ صرف ایک کپ چائے اور ایک عدد دوس پر ہی اکتفا کرنے کی غرض سے مگن میں داخل ہوا جہاں اس کا فریجی مائل خانہ ماں جو اپنے آپ کو مٹا بھائی ایم بی بی ایف (میٹرک بار ہارٹل) کہلاتا پسند کرتا تھا، وہ ابھی ناشتے کی تیاری میں مصروف تھا۔ تاہم اس کے ہاتھ میں رول کیے ہوئے موٹے پرائیمر میں ڈبل ہاف فرائی انڈا ہوا ہوا تھا اور ناشا بنانے کے ساتھ ساتھ وہ موٹے رول کا ہائٹ معدے میں اتارنے میں مصروف تھا۔

صاحب کی اچانک مگن میں دراندازی اسے ایک آنکھ نہ بھائی کیونکہ صاحب کو ناشا دینے سے پہلے خود ناشتے پر ہاتھ صاف کرنے کا جرم پکڑا گیا تھا۔ وہ جھینپ کر بولا۔ ”وہ... صاحب جی... دراصل مجھے بھوک لگی تھی، سو چاہا پھلکا منہ بھی مارتا چلوں۔“

”ضرور۔“ انسپکٹر حارث نے کہا پھر فلاسک میں رکھی چائے کو کپ میں انڈیا ٹوسٹر سے ہلکا سا ہوا ٹوسٹ نکالا اور جلدی جلدی اسے ختم کر کے مگن سے باہر نکلا۔

اس کے عقب میں مٹا بھائی ایم بی بی ایف ”صاحب جی... صاحب جی!“ پکارتا ہوا الپکا مگر تب تک انسپکٹر حارث باہر نکل کر اپنی جیب پر سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کر کے جا چکا تھا۔

☆☆☆

ساؤتھ سی ساحل سمندر کا وہ حصہ تھا جو عام فہم میں

جاسوسی ڈائجسٹ ستمبر 2014ء

استعمال ہوتا بہر طور ان دونوں باتوں پر زیادہ اگھار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ایک تیسرا اندازہ بھی ذہن میں آتا تھا کہ دو دوستوں کے درمیان اچانک کسی بات پر تلخ کلامی ہوگئی ہو۔ باوجود اس کے ایک انجمن یہ تھی کہ یہاں زیادہ تر پہلو ہی آیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کوئی لڑکی اپنے محبوب کو قتل نہیں کر سکتی تھی۔ چوتھا خیال جو سب سے آخر میں اسپیکٹر حارث کے ذہن میں ابھرا تھا جو حقیقی اندازوں کے قریب ترین بھی معلوم ہوتا تھا کہ شاید بد نصیب مقتول اپنی محبوبہ کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا اور رقیب نما قاتل وہاں آن پہنچا ہو۔ یہ سب وہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے ہاتھ پتھر لگا جو اس نے مقتول کو دے مارا۔ یوں اشتعال انگیزی کا یہ تماشا خون رنگ لڑکے کا محبوب کی جان لینے پر منتج ہوا ہو۔

اسپیکٹر حارث نے اپنے تمام تر اندازوں کا نچوڑ یہ نکالا کہ اس نوجوان کے قتل کی ٹھوس اور عینی گواہ شاید وہ لڑکی تھی جو مقتول کی یقیناً محبوبہ تھی، اگر اس تک پہنچا جاسکے تو یہ کیس چکی ججاتے ہی حل ہو سکتا تھا یا پھر سرے سے یہ سارا چکر عاشقی معشوقی کا ہی نہ ہو۔

مباہوی کے اس شہر خرابہ کی کھلندری فضاؤں میں ایسے کیسز عام بھی تھیں۔ لوگ اسپاٹ ہونے کی وجہ سے علاقہ ساؤتھ سی میں لڑکی کے معاملے میں آن دی اسپاٹ جھلڑے اور مارا ماری بسا اوقات قتل تک جا پہنچتی تھی۔

”سرجی! یہ قتل کس نے کیا ہے؟“ قریب کافی دیر سے خاموش کھڑے ہو... اسسٹنٹ تیمور نے سوال کر ڈالا یا پھر اس نے اپنے قابل الفسر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ خیالوں کے کھوڑے دوڑاتا قاتل تک جا پہنچا ہے بہر حال اس کے سوال پر اسپیکٹر حارث ایک گہری سانس خارج کرتا اٹھ کھڑا ہوا اور تیمور کے اس احقانہ سوال پر بڑے سکون سے بولا۔

”اس کا قتل کسی انسان نے کیا ہے؟“

”اچھا سر۔“ تیمور تو صنفی لہجے میں بولا۔ ”واہ سرجی! آپ تو سمجھو قاتل تک پہنچ ہی گئے۔“

”ہاں... بس ذرا اسے تلاش کرنے کی دیر ہے۔“ حارث نے اس بار اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں پکڑے پتھر کو ایک انگلی اور انگوٹھے کے ملاپ سے تھام کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے تھکسانہ انداز میں مزید بولا۔

میں مصروف تھے۔ چوتھی سست شور مچاتی موجیں ساحل پر سر پہنچ رہی تھیں۔ اسپیکٹر حارث لاش کے قریب پہنچا اور اس کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ بہ غور لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔

لاش... سکیلے پتھروں کے قریب ریت پر پڑی تھی۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان کی لاش تھی۔ جس نے شوخی شرٹ اور ٹائٹ نیلی جینز پہن رکھی تھی۔ رنگ گورا تھا۔ اس کی پیشانی اور گتھی کے قریب خون بہہ کر جم چکا تھا اور کیلی ریت میں جذب ہو کر سیاہ نظر آنے لگا تھا۔

حارث اس بد نصیب نوجوان مقتول کی عمر کا اندازہ بیس بائیس کے درمیان ہی لگا سکا تھا پھر اس نے اپنی جیب سے دستا نکل کر اپنے ہاتھوں پر چڑھائے اور بہت قریب سے وہ زخم کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔

زخم گہرا تھا اور کسی کند یا سخت کیلی شے کے وار کا نتیجہ تھا کیونکہ زخم کا سائز انڈیڈ شپ مخروطی تھا۔ حارث کے ذہن میں فوراً کسی بڑے اور کیلیے پتھر کا خیال ابھرا پھر جلد ہی اس کی متلاشی نظروں نے لاش کے قریب ایک بڑا سا کھیل پتھر دیکھ لیا۔

اسے اٹھا کر حارث بہ غور اس کا معائنہ کرنے لگا تو اس کی باریک بین نظروں نے پتھروں کی کھردری سطح پر جھے ہوئے سیاہی مائل خون کا وہاں دیکھ لیا تھا گویا آگ لگ چکی ہوئے وقوعہ پر پڑا ہوا تھا۔

یوں حارث کے مطابق قتل کا یہ کیس حل ہوا ہی چاہتا تھا تاہم یہ سوچنے کے بعد ایک اور بات بھی اس کی نگاہ میں تھی جو اس کے تجربے پر مبنی تھی کہ جو کیس جس قدر آسان معلوم ہوتا ہے بعد میں وہ اسی قدر مشکل اور بسا اوقات ناممکن حد تک لائیجھل بھی ثابت ہوتا تھا۔

اسپیکٹر حارث نے سوچا بعض ایک پتھر کے دار سے نوجوان نہیں مر سکتا تاہم یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ پتھر کی ضرب شدید سے نوجوان بے ہوش ہو کے گر پڑا اور ساری رات گہرے زخم سے خون رستے رہنے کے باعث اس کی موت واقع ہوگئی ہو۔ تاہم اس نے فوری طور پر نووا اندازے قائم کر لیے تھے۔

پہلا یہ کہ بد نصیب نوجوان کا قتل رات یا دھلی شام کے وقت ہوا تھا۔ دوسرا یہ کہ اس قتل میں سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا دخل کم ہی نظر آتا تھا بلکہ یہ کسی فوری اشتعال کے باعث نامعلوم قاتل کے ہاتھ جو لگا اسے بروئے کار لاتے ہوئے اس نے قتل کر ڈالا۔ یہ صورت دیگر فحش یا پستول کا

”حیرت ہے اتنے بڑے ریسورٹ کے مالک نے کوڑا پھینکنے کے لیے ایک سوپر تک نہیں رکھا اور یہ گندا کام ویٹروں سے لیا جاتا ہے جو گاؤں کو کھانا پینے کی چیزیں بھی سر دہاتے ہیں۔“

”جناب! بات دراصل یہ ہے کہ آج صبح سوپر اچانک پھینک کر گیا تھا اس لیے مجبوراً میں نے ہاتھوں میں گلوڑ چڑھا کے یہ کام سرانجام دیا تھا۔“

”نو جوان مقتول کی لاش سے ملنے والے کالج کارڈ کے مطابق اس کا نام مدثر تھا۔ کیا تم نے مقتول مدثر کو پہلے بھی وہاں دیکھا تھا۔ ایسے نو جوان تو اکثر آتے جاتے رہتے ہوں گے؟“

”جی جناب! بالکل... قتل سے پہلے مقتول مدثر کو میں نے ایک شخص کے ساتھ اپنے ریسورٹ میں دیکھا تھا اور اکثر دیکھا کرتا تھا۔“ اس کے جواب پر حارث کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ اس نے پوچھا۔ ”قتل سے کتنی دیر پہلے تم نے اسے اپنے ریسورٹ میں دیکھا تھا؟“

”شام کے کوئی ساڑھے سات بجے کا وقت ہوگا۔“

”اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی تھا؟“ حارث نے پُرسوج انداز میں تسلی چاہی۔

”جی جناب! میں نے آپ کو بتایا کہ اس کے ہمراہ ایک شخص تھا۔“

”میرا مطلب ہے... وہ دونوں ہی تھے یا کوئی تیسرا بھی تھا؟ کوئی لڑکی یا کوئی اور...؟“

”کوئی نہیں تھا وہاں ان دونوں کے سوا۔“

”دونوں کی گفتگو کا انداز دوستانہ تھا؟“

”کچھ ایسا لگتا تو نہیں تھا، وہ کسی کسمیر اور سنجیدہ موضوع پر باتیں کرتے محسوس ہو رہے تھے۔“

”کتنی دیر بیٹھے تھے وہ دونوں؟“

”زیادہ تو نہیں، میرا خیال ہے کوئی پندرہ بیس منٹ ہی بیٹھے ہوں گے۔ مقتول مدثر کو وہاں سے اٹھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ بار بار باتوں کے دوران میں اپنی رست وراج پر نظر بھی ڈالتا جا رہا تھا۔ شاید اس نے وہاں سے اٹھ کر کہیں اور جانا تھا یا پھر اسے کسی کے آنے کا انتظار تھا۔“

”کیا دوسرا شخص مقتول مدثر کا ہم عمر تھا؟“

”جی جناب۔“ مرلی دھر نے اثبات میں جواب دیا۔

”یہ بتاؤ، دونوں ایک ساتھ ریسورٹ سے نکلے تھے یا الگ الگ...؟“

”اسے نہایت احتیاط کے ساتھ صاف تھیلی میں ڈال دو، کہیں میں اسے تمہاری خالی کھوپڑی تک زحمت نہ دے دوں اور پھر مجھے یقیناً تمہاری کھوپڑی جینے سے کہیں زیادہ اس پتھر کے ٹوٹنے کا افسوس ہوگا۔“

تیمور نے احمقوں کی طرح آنکھیں پٹپٹا کر پتھر لیا اور فوراً ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال دیا۔ اسے اب لیبارٹری، تجزیے کے لیے بھیجنا تھا۔

لاش کے لباس سے مقتول نو جوان کا پاؤں ساڑے پرس اور ایک رومال برآمد ہوا تھا۔ پرس میں پیسوں کے علاوہ ایک مقامی کالج کا کارڈ بھی تھا۔ لاش کو پوسٹ مارٹم اور اس کے ورثا کی تلاش وغیرہ کا حکم صادر کرنے کے بعد حارث اپنی جیب میں پولیس اسٹیشن پہنچا۔ اس کے ہمراہ گل نشان ریسورٹ کا ویٹر مرلی دھر بھی تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ وہاں پہنچتے ہی حارث نے لاش دریافت کرنے والے ویٹر سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

”مرلی دھر۔“

”باپ کا نام؟“

”بھئی دھر۔“

”کام؟“

”ویٹر ہوں۔“

”کہاں اور کون سے ریسورٹ میں؟“

”ساؤتھ سی میں، گل نشان ریسورٹ۔“

”لاش صبح کتنے بجے تم نے دیکھی تھی؟ سوچ کے صبح وقت بتانا؟“ یہ سوال کر کے حارث نے اپنی نظریں مرلی دھر کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا تاہم سوالوں کے جوابات پوری روانی اور اطمینان کے ساتھ دے رہا تھا۔

”صبح ساڑھے چھ بجے۔“

”میرے اندازے کے مطابق جس جگہ تم نے اس نو جوان کی لاش دیکھی تھی وہ تمہارے گل نشان ریسورٹ سے تقریباً ساٹھ گز کی دوری پر موجود تھی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اپنے ریسورٹ سے نکل کر تم اتنی دور تک صبح ساڑھے چھ بجے کون سے گاہک کو سر دہاتے کے لیے وہاں گئے تھے؟“

”میں نے کسی گاہک کا ذکر تو نہیں کیا جناب۔“

”پھر... تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“

”میں ریسورٹ کا کچھ کوڑا اس طرف پھینکنے جا رہا تھا تو میری نظر لاش پر پڑی۔“

"جناب! آپ کی بات بالکل سچ ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں واقعی ایک جگہ بیٹھ کر دونوں کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا تھا۔" اس کے اس عجیب جواب پر حارث کی پیشانی پر سلونیں پڑ گئیں۔

مرلی دھرنے نے بات آگے بڑھائی۔ "مجھے ایسا کوئی شوق نہیں اور نہ ہمارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے مگر یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت گا کہوں کا رٹش ایک تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ دوسرے یہ کہ میں کاؤنٹر کے قریب اسٹول پر بیٹھا ایک برگر کھانے میں مصروف تھا۔ ان دونوں کی میز سرورنگ کاؤنٹر کے قریب تھی اور غیر ارادی طور پر میری نظریں جانے کیوں بار بار ان کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ کیونکہ ہاتھوں کے درمیان دونوں میں سے کوئی ایک چمچ کراہنے لگا تھا۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ مرلی دھر... تم نے ایک اچھے اور ذمے دار شہری کا فرض نبھاتے ہوئے ہم سے بھرپور تعاون کیا۔" انسپکٹر حارث نے میز سے اٹھ کر توصیفی انداز میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "تم اب جاسکتے ہو لیکن تمہاری ضرورت قانون کو دوبارہ پڑھ سکتی ہے۔"

"میں ہر دم حاضر ہوں جناب۔"

"گڈ... تم جاسکتے ہو۔ ہمارا آدمی تمہیں چھوڑ آئے گا۔" یہ کہہ کر حارث نے گھنٹی بجائے اور دلی کو اندر بلایا اور مرلی دھر کو ان کے ساتھ کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد حارث اپنے آئینہ لائیکھ عمل پر غور کرنے لگا۔

☆☆☆

انسپکٹر حارث ہیگ خفیہ پولیس کرائم اینڈ انویسٹیشن کیشن برانچ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہوشیار اور ذہین ہونے کے علاوہ دیانت دار اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ مجرم چاہے کتنا ہی خطرناک یا بااثر کیوں نہ ہو وہ اسے بالآخر کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لیتا تھا۔ وہ ایک قابل آدمی تھا۔ اس سلسلے میں اس کا طریقہ کار ان عام روایتی پولیس آفیسروں سے بالکل مختلف ہوتا تھا جو عموماً پولیس کی وردی پہن کر رعب اور دبدبے کے ساتھ مجرموں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اور شاید اس رعب و دبدبے کے باعث مجرم بہ آسانی خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر چھپ جایا کرتے تھے اور پھر چھپ کر کیس کے داخلی دفتر ہونے کا انتظار کرتے تھے۔

انسپکٹر حارث پینتیس سالہ ایک جوان اور خوبصورت تھا۔ دراز قد، چوڑے شانے، رنگ گندی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

"پہلے وہ شخص رخصت ہوا تھا جو مقتول کے ساتھ تھا پھر اس کے خورزی دیر بعد مقتول مدثر بھی اٹھ کر چلا گیا تھا۔"

"کیا تم... بتا سکتے ہو کہ دونوں ریسٹورنٹ سے الگ الگ نکلنے کے بعد کس سمت گئے تھے؟ میرا مطلب ہے سمندر کی طرف یا پھر پارکنگ ایریا کی طرف؟"

"سوری سر! یہ میں نے غور نہیں کیا تھا۔" مرلی دھر نے جواب دیا۔

انسپکٹر حارث اس کے چہرے پر اپنی تیز نظریں مرکوز کیے ہوئے کرسی سے اٹھا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیاہ رول کو بائیں ہاتھ کی پتیلی پر مارتا ہوا مرلی دھر کی کرسی کے قریب آ کے میز پر تک کے بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔

"دیکھو مرلی دھر! پولیس سب سے پہلے اس شخص پر شبہ کرتی ہے جو لاش کو دریافت کرتا ہے لہذا اچھی طرح سوچ لو۔ تم سے کوئی اہم بات بتانا تو نہیں رہ گئی۔ جو بعد میں پتا چلے اور تم پر ہمارے شک کا دائرہ مزید تنگ ہو جائے۔"

"بالکل نہیں جناب! میں نے کوئی بات دانستہ یا نادانستہ نہیں چھپائی ہے۔ پورے اعتماد سے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔" مرلی دھر بولا۔

انسپکٹر حارث ہیگ نے دل ہی دل میں کہا۔ "تمہارا یہی اعتماد اور اطمینان ہے جو مجھے سب سے زیادہ شے میں جتلا کر رہا ہے۔ بہر حال..." وہ اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے مشکوک انداز میں بولا۔ "اب ذرا ایک آخری اور اہم بات بتاؤ۔"

"جی جناب... پوچھیں۔"

"آخر تم نے ان دونوں کی حرکات و سکنات کے بارے میں اس قدر تفصیل سے کس طرح جان لیا جبکہ ایک عام اندازے کے مطابق ریسٹورنٹ میں کافی رش ہوتا ہے اور دیر گاہکوں کو سرد کرنے کے لیے ادھر ادھر دوڑ رہے ہوتے ہیں۔ تم اتنے قاریغ تھے کہ ایک جگہ بیٹھ کر ان دونوں پر اپنی نظریں جمائے رہے؟"

یہ آخری سوال پوچھتے وقت انسپکٹر حارث کو پورا یقین تھا کہ اگر اس کے دل میں کوئی چور ہوگا تو وہ ایک لمحے کے لیے ضرور گڑبڑا جائے گا۔ یہ صورت دیکر وہ اس دیر کو شک کی کسوٹی سے بری الذمہ قرار دے دیتا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

ویٹر مرلی دھر نے بڑے آرام سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

اسپیکٹر حارث ان سب کا تہ دل سے شکر یہ ادا کر کے اشوک کو ساتھ لیے ویڈیو رورڈ انہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اشوک پر ایک سو بار پھر گھبراہٹ طاری ہوئے لگی کیونکہ اس سے پہلے اس نے بھی ایسے حالات کا سامنا نہیں کیا تھا۔ جس کی عمر میں بائیس سال کے درمیان تھی۔ رنگ سالو لا تھا اور وہ دبلا چٹا تھا۔

حارث نے اس کے لیے پہلے ایک عدد کولڈ ریک منگوائی اور پھر اسے ذرا جوش دلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”دیکھو اشوک اب قول تمہارے مٹر تمہارا نہ صرف

کلاس فیلو تھا بلکہ ایک اچھا دوست بھی تھا اور وہ اپنے بد نصیب باپ کا واحد سہارا بھی تھا۔ کیا تم اور تمہارے دیگر کالج کے ساتھی نہیں چاہیں گے کہ بے رحم قاتل پکڑا جائے جس نے یہ بھانک جرم کیا؟“

اشوک فوراً جوش سے بولا۔ ”کیوں نہیں جناب ایہ تو ہم سب ساتھی چاہیں گے کہ جس کسی نے بھی یہ ظلم کیا ہے وہ تفتہ دار تک ضرور پہنچے۔ مٹر ہم سب کا اچھا دوست تھا۔ سب کی عزت کرتا تھا۔“

”شاہاش“ حارث نے توصیفی انداز سے کہا۔ ”اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ مٹر کی کسی لڑکی سے دوستی تھی؟ یعنی اس کی کوئی گرل فرینڈ وغیرہ؟“

جواباً اشوک نے کولڈ ریک کے چند گھونٹ بھرے پھر بولا۔ ”جی ہاں غزالہ سے اس کی دوستی تھی۔“

”غزالہ؟“

”جی... یہ کلاس فیلو ہے۔“

”کوئی محبت وغیرہ کا پتہ یا پھر ایسے ہی دوستی تھی؟“

”محبت وغیرہ کے بارے میں تو ہم میں سے کسی کو کچھ اندازہ نہیں کیونکہ وہ دونوں کی دوست تھی۔“

”دونوں کی دوست تھی؟ دوسرا کون تھا؟“

”کھلیل۔“

”کھلیل...؟“

”جی مٹر، کھلیل اور غزالہ تینوں کی آپس میں بڑی گہری دوستی تھی جو یا پورے کالج میں ان تینوں کی یہ محکم مشہور تھی۔“

”یہ بتاؤ، مٹر کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی تھی یا کسی کے ساتھ اس کا حال ہی میں کوئی جھگڑا یا مار کھائی ہوئی ہو؟“

”چھوٹے سولے جھگڑے یا تلخ کلامی کسی نہ کسی کے ساتھ ہوئی جابجا کرتی تھی لیکن ایسی خطرناک قسم کی دشمنی تو میرا خیال ہے اس کی کسی کے ساتھ نہیں تھی کہ اس بے

وہ غیر شادی شدہ تھا۔ دنیا میں اس کا سوائے ایک بہن کے اور کوئی نہ تھا۔ حنا اس کی بڑی بہن تھی وہ شادی شدہ تھی۔ اس کے دو بچے تھے وہ اپنے شوہر خضر حیات کے ساتھ احمد آباد میں رہتی تھی اس کا شوہر خضر حیات چائے کی ایک بڑی کھیتی میں اچھے مہدے پر قائم تھا۔ کبھی کبھار حارث بہن اور اپنے شریر بھائی، بھائی سے ملنے کے لیے احمد آباد چلا جایا کرتا تھا۔ حنا کو اپنے چہیتے چھوٹے بھائی کی شادی کی فکر لاحق رہتی تھی جبکہ حارث ہمیشہ اس موضوع کو تار تار ہوتا تھا۔

☆☆☆

مقتول مٹر، اقبال احمد خان کی اکلوتی اولاد تھی اور ایک بد نصیب باپ کے لیے جو ان بیٹے کی موت کا صدمہ کم نہیں ہوتا... اس کا باپ اقبال احمد ایک سرکاری دفتر میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھا۔ دونوں باپ بیٹا سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ اب اکلوتے بیٹے کی جواں مرگ نے اقبال احمد کو غم سے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بے چارہ پہلے ہی عارضہ قلب کا مریض تھا اور اب اسپتال میں داخل ہو گیا تھا۔

اسپیکٹر حارث نے اپنے لائحہ عمل کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے کالج کا رخ کیا جہاں مقتول مٹر پیر تعلیم تھا۔ کالج کے پرنسپل راجندر گوپال سے اس نے ملاقات کی۔ اس جاگہ اطلاع پر پرنسپل کو ذہنی جھٹکا لگا بہر طور اس نے حارث کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

اس کے بعد حارث کے اہلکار پرنسپل نے مقتول کے چند قریبی کلاس فیلوز کو اپنے آفس میں طلب کیا۔ انہیں بھی جب اپنے دوست کی جاگہ ملاکت کا پتا چلا تو وہ بہت دبی نظر آنے لگے۔ ان سے مختصر گفتگو کے دوران اسپیکٹر حارث کو اندازہ ہو گیا کہ ان میں اشوک کمار نامی ایک اسٹوڈنٹ مقتول مٹر کے ذاتی حالات کے بارے میں کچھ زیادہ ہی معلومات رکھتا تھا۔ حارث نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کر ڈالی۔

اشوک گھبرا سا گیا اور پرنسپل صاحب کی طرف دیکھنے لگا مگر پرنسپل راجندر گوپال نے اسے تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ اسپیکٹر حارث صاحب صرف ضابطے کی کارروائی کے طور پر مقتول مٹر کے بارے میں کچھ تفصیل پوچھنا چاہتے ہیں۔ پھر اسپیکٹر حارث کے دوستانہ اور مہربان رویے سے بھی اشوک نے حوصلہ پکڑا اور اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔

موقع پر غزالہ کے ساتھ غیر اخلاقی حرکت کرنے کی کوشش کرنی چاہی تو غزالہ نے اس کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی کر ڈالی۔ سنیل بھی پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا جب تک مدثر اور نکیل، غزالہ کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں اس کی دال نہیں گل سکتی۔ یوں اس نے یہ ظاہر غزالہ کی جانب سے اپنی توجہ ہٹائی اور مدثر اور نکیل کو رام کرنے کی سعی میں مصروف ہو گیا۔

"غالباً غزالہ کے معاملے میں نکیل اور مدثر کے درمیان پہلے ہی سے کسی سرد جنگ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ممکن ہے اس میں بھی کسی سازش کا دخل ہو کیونکہ ان کی ٹکڑم سے بہت سے کلاس میٹ حسد بھی کرتے تھے، بہر حال... ادھر سازشی ذہن کے مالک سنیل کو بھی ان کے بیچ گل کھلانے کا موقع مل گیا اور بالآخر مدثر اور نکیل کے درمیان پہلی بار باقاعدہ توکار، تلخ کلامی ہوتے دیکھی گئی۔

"اس کے بعد ایک دن تو حد ہو گئی، مدثر اور نکیل کے درمیان ٹھیک ٹھاک ہاتھ پائی بھی ہو گئی۔ غزالہ ان دونوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کر کے بیچ بچاؤ کر داتی رہی اور اس ضمن میں اسے کہتے سنا گیا کہ اس میں تصور نکیل کا تھا۔

"حتیٰ کہ ایک روز نکیل کو غزالہ سے نہایت غصے اور زہریلے لہجے میں یہ کہتے بھی سنا گیا کہ: "غزالہ! تم دعا باز ہو، دوپٹی عورت ہو۔ تم مدثر کی جموٹی محبت میں گرفتار ہو چکی ہو اس لیے اب بہتر یہی ہے کہ میں تم دونوں کے بیچ سے ہٹ جاؤں۔"

"یوں ان کی یہ پرانی دوستی اور ٹکڑم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ اس کے بعد سے مدثر اور غزالہ اکثر ساتھ دیکھے جانے لگے۔ سنیل بھی شاید ایک حد تک اپنی سازش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ دور دور سے تماشا دیکھا کرتا مگر وہ.... غزالہ کے ہاتھوں اپنی بے عزتی نہیں بھولا تھا۔ اب وہ مدثر اور غزالہ کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش میں تھا کہ معلوم ہوا مدثر کا قتل ہو گیا۔"

اسپیکٹر حادثہ بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا پھر اس نے پوچھا۔ "مگر ان سب باتوں کے باوجود ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ سنیل تو چلو کسی حد تک اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس کی غزالہ سے دوستی کا خواب تو پھر بھی پورا نہ ہو سکا تو کیا وہ چپ ہو کر بیٹھا رہا تھا؟"

"جی نہیں۔" اشوک نے نفی میں سر ہلایا۔ "سنیل نے غزالہ سے دوستی کرنے یا اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کو

چارے کو قتل ہی کر دیا جاتا۔"

"کبھی اس کا اسپنہ گھرے دوست نکیل کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

اسپیکٹر حادثہ کے سوال پر وہ چند ثانیے کچھ سوچتا رہا پھر قدرے صراحت میں جا کر بتانا شروع کیا۔

"مدثر، نکیل اور غزالہ کی ٹکڑم پورے کالج میں مشہور تھی۔ تینوں میں بہت گہری دوستی تھی، اس قدر کہ وہ اپنی اس ٹکڑم میں کسی چوتھے کو شامل کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ تینوں کالج سے باہر بھی اکٹھے ہی گھوما پھرا کرتے تھے۔

غزالہ ایک بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی البتہ نکیل اور مدثر دونوں کا تعلق متوسط طبقے سے تھا بلکہ ان میں نکیل کہیں زیادہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا مگر باوجود اس کے تینوں میں بڑی گاڑمی چھنتی تھی۔ ہم ان تینوں کی دوستی کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ آخر غزالہ مدثر اور نکیل میں سے کسی ایک کو ضرور دل سے پسند کرتی ہوگی۔ اس کا جھکاؤ آخر دونوں میں سے کسی ایک کی طرف تو ضرور ہوگا جس کے بارے میں وہ سنجیدہ ہو۔ اس بات پر ہم کالج کے دوستوں میں باقاعدہ شرطیں لگا کر تی نہیں مگر کچھ پتانہ چل سکا۔ تاہم پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ بات ضرور ظاہر ہونا شروع ہو گئی کہ غزالہ کا زیادہ جھکاؤ مدثر کی طرف تھا پھر اس دوران بات مزید دل کر تب سامنے آئی جب ان تینوں کی دوستی میں ایک چوتھے شخص نے دراڑ ڈالنا شروع کر دی۔" وہ اتنا بتا کر ذرا رکا۔

اسپیکٹر حادثہ نہ غور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ چوتھے شخص کے ذکر پر وہ چونکا لیکن کچھ بولا نہیں۔

اشوک نے کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل میز پر رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اس چوتھے شخص کا نام سنیل تھا۔ پورا کالج جانتا تھا کہ سنیل کس قماش کا آدمی ہے۔ یہ اس کی دوستی اپنے جیسے ہی چند ادبаш لو جوانوں کے ساتھ تھی۔ وہ مدثر، نکیل اور غزالہ کی ٹکڑم میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ غزالہ کی وجہ سے اس ٹکڑم میں شامل ہونا چاہتا ہے ورنہ اسے مدثر یا نکیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"غزالہ اگرچہ... ایک بڑے گھرانے کی بولڈ لڑکی تھی لیکن وہ ایک حد میں رہنے کی عادی تھی۔ اسے آج تک کسی نے کالج میں نازیبا حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھا مگر بد طبیعت سنیل اس کی آزاد خیالی کو دیکھتے ہوئے اسے دوسری قسم کی لڑکی سمجھا تھا۔ جب سنیل کو غزالہ سمیت تینوں نے گھاس نہ ڈالی تو وہ اپنی اصلیت پر اتر آیا۔ اس نے ایک

”میں بے تصور ہوں انسپکٹر صاحب... میں بھلا اتنا بڑا جرم کس طرح کر سکتا ہوں۔“ دورانِ تفتیش تکلیل نے پریشان ہو کر انسپکٹر حارث بیگ سے کہا۔

”کیوں... تم کیوں اتنا بڑا جرم نہیں کر سکتے؟ تم پر کوئی پابندی ہے؟“ غریب کھڑے اسسٹنٹ تیسور نے اس کی طرف گھور کے کہا۔ بے چارہ تکلیل اس کی عجیب بات پر گڑبڑا سا گیا۔ تب حارث نے تیسور کو کھاجانے والی نظروں سے دیکھ کر بری طرح جھڑکا۔

”شت آپ بغیر سوچے سمجھے... بول پڑتے ہو، تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟“

اس پر تیسور خفیف ہو کے بولا۔ ”سوری سر! یہ کم بخت بڑے اعتماد سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ آپ ذرا غور کر کے دیکھیں اس کے جملے پر... میں بھلا اتنا بڑا جرم کیسے کر سکتا ہوں۔ اب سر آپ ہی بتائیے بھلا اتنا بڑا دعویٰ پہلے سے کوئی کر سکتا ہے؟“

”آئی سے شت آپ۔“ اس کی فضول بات پر حارث نے دھاڑ کر کہا اور دبلا چلتا تیسور باریک تار کی طرح جھنجھنا کر رہ گیا۔ اس کے بعد حارث، تکلیل کی طرف متوجہ ہوا۔

”ہر مجرم بھی راگ الا پتا ہے اس لیے یہ فضول بکواس چھوڑو مجھے بتاؤ کہ تم اس شام کل فشاں ریسٹورنٹ میں مدثر سے ملنے کیوں گئے تھے؟“

اس سوال پر وہ کچھ فکر مند نظر آنے لگا پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ”یہ درست ہے انسپکٹر صاحب کہ میں اس شام مدثر سے ملا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ میری وہ ملاقات مدثر سے بالکل اتفاقی تھی۔ ہم دونوں کے بچہ یہ ملاقات پہلے سے طے شدہ نہیں تھی۔“

”تم اپنے بارے میں بتاؤ، وہاں تمہا کیا کرنے گئے تھے؟“

”غزالہ نے جب سے میری محبت کر ٹھکرایا تھا، میں اکثر تنہا ہی سمندر کے کنارے ٹپٹنے چلا جایا کرتا تھا۔“ یہ بتاتے ہوئے تکلیل کی آنکھوں میں غم کی شام سی اتر آئی۔ حارث کی عقابی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”میں غزالہ سے سچی محبت کرتا تھا جبکہ وہ مدثر کو پسند کرتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مدثر اس کے ساتھ فلرٹ کر رہا تھا۔ میں مدثر کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ غزالہ کے معاملے میں کس حد تک سنجیدہ تھا۔“

”شت آپ مجنوں کی اولاد۔“ انسپکٹر حارث نے

شاید اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا لیکن وہ اس بات سے بھی پراسید تھا کہ وہ تکلیل کو ان دونوں سے متفر کرنے کے بعد بہ آسانی مدثر کو بھی ایک دن غزالہ سے دور کر دے گا لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تب سنیل، مدثر کے خلاف جارحانہ رویے پر اتر آیا۔ ایک روز دونوں کے درمیان اس بات پر لڑائی بھی ہوئی۔ سنیل نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر مدثر کی پہنائی کردادی۔ معاملہ پرنسپل صاحب تک پہنچا تو انہوں نے سنیل کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی۔

”آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو کالج سے تمہارا نام خارج کر دیا جائے گا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ غزالہ کے معاملے میں تکلیل اور سنیل کی مدثر کے ساتھ اکثر جھڑپ ہوتی رہتی تھی؟“ انسپکٹر حارث نے کسی خیال کے تحت کہا۔

”بالکل جناب بلکہ یہ تو اب تقریباً روز کا ہی معمول بن کر رہ گیا تھا۔ گویا اب مدثر کو بیک وقت تکلیل اور سنیل دونوں ہی کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔“ اشوک نے بتایا۔

”ہوں۔“ حارث نے پرسوج ہنکاری بھری۔

اسے اب قتل کے محرک کا کافی حد تک اندازہ تو ہو چکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ مدثر کے قتل میں تکلیل اور سنیل دونوں کا ہی ہاتھ محسوس ہوتا تھا جبکہ کل فشاں ریسٹورنٹ کا ویٹر مرلی دھر کے اس بیان کے مطابق وقوعے سے پہلے یعنی شام کے آخری پہر مقتول مدثر کو آخری بار اس کے دیرینہ رقیب تکلیل کے ساتھ بھی دیکھا گیا تھا۔ اب پتا نہیں، وہ تکلیل تھا یا سنیل، حارث کو شبہ تھا کہ وہ تکلیل ہی ہو گا جسے آخری بار مقتول مدثر کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔

حارث فوراً حرکت میں آیا، تکلیل اور سنیل دونوں کو شک کی بنا پر گرفتار کر کے لاک اپ کر دیا اور جب کل فشاں ریسٹورنٹ کے ویٹر مرلی دھر کے سامنے دونوں کی شناختی پریڈ کروائی گئی تو مرلی نے فوراً تکلیل کو پہچان کر لیا۔

”یہی وہ شخص تھا جو وقوعے سے پہلے کل فشاں ریسٹورنٹ میں مدثر کے ساتھ آخری بار دیکھا گیا تھا اور پھر مدثر کا قتل ہو گیا تھا۔ تکلیل سے مقتول مدثر کی آخری ملاقات اور پھر مدثر کے قتل کا درمیانی وقفہ لگ بھگ چالیس سے پچاس منٹ تھا۔“ تب حارث نے تکلیل اور سنیل کی تصاویر اتروانے کے بعد سنیل کو رہا کر دیا لیکن تکلیل کو مدثر کے قتل کے الزام میں شک کی بنیاد پر باقاعدہ گرفتار کر لیا۔

☆☆☆

سنگ زن

وچڑموت جریان خون تھا۔ پھر لگنے سے متزلزل مڈر
ہے ہوش ہو گیا تھا۔ زخم کھرا ہونے اور رگ پھٹ جانے سے
اور مسلسل بے ہوشی کی حالت میں خون بہتا رہا جس کی وجہ
سے بے ہوشی کا دورانیہ طویل ہوا جو بالآخر بد نصیب مڈر کی
موت کا سبب بنا۔

اسپیکٹر حادثہ کو ٹھیکل پر یقین کی حد تک شبہ تھا کہ یہ قتل
ضرور اس نے ہی طیش کے عالم میں کیا تھا پھر گل فشاں
ریسٹورنٹ کے ڈیٹر مرلی دھر کا بیان ٹھیکل اگرچہ مڈر سے ملنے
کے بعد ریسٹورنٹ سے چلا گیا تھا مگر حادثہ کو اس بات کا سو
نقص یقین تھا کہ مڈر سے ملنے کے بعد وہاں سے گیا نہیں ہوگا
بلکہ وہ مڈر کی ٹوہ میں رہا چونکہ مڈر کو وہاں غزالہ کا انتظار تھا
لہذا غزالہ کے آنے کے بعد مڈر اور غزالہ ساحل سمندر کی
طرف چہل قدمی کی نیت سے چل پڑے ہوں گے اور ٹھیکل
ان دونوں کے تعاقب میں وقوع والی جگہ تک جا پہنچا ہوگا اور
وہیں عاشق نامراد نے الفاظ دیگر رقیب و سیاہ ٹھیکل، مڈر اور
غزالہ کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر غصے سے رقابت کی آگ میں جل
اٹھا ہوگا اور پھر وہیں ٹھیکل اور مڈر میں ہاتھ پائی ہوئی ہوگی
جس کے نتیجے میں ٹھیکل کے ہاتھ وہ کیلا پتھر آگیا جو اس نے
بے دریغ مڈر کی پیشانی پر بڑے زور سے دے مارا۔

یہ ساری باتیں سوچنے کے ساتھ حادثہ ایک اور
سوال پر غور کرنے لگا کہ اس کے اندازے کے مطابق اگر
غزالہ بھی ملے شدہ پروگرام کے تحت اپنے محبوب مڈر کے
ساتھ تھی تو پھر کیا وجہ تھی کہ غزالہ نے اپنے دم توڑتے محبوب
مڈر کی مدد یا اس کی جان بچانے کے لیے فوری طور پر کوئی
قدم نہ اٹھایا، وہ اسے کسی قریبی اسپتال لے جاسکتی تھی یا پھر
ہوسکتا ہے کہ ٹھیکل نے جوش میں آکر غزالہ کو بھی موت کے
گھاٹ اتارنا چاہا ہو مگر غزالہ خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی
ہوگی۔

اسپیکٹر حادثہ بیگ کے لیے اب غزالہ سے ملاقات
کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا چنانچہ وہ تنہا اور سادہ وردی میں
غزالہ کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا جس کا پتا اس نے
ٹھیکل سے حاصل کر لیا تھا۔

غزالہ کا ندی گاڑڈن کے ایک پوش علاقے میں اپنے
باپ عادل ترمذی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا باپ کپڑے کا
ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ علاوہ ازیں وہ چائے کے باغات کا
مالک بھی تھا۔ وہ کاروباری دنیا میں سیٹھ عادل مراد ترمذی
کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔
سیٹھ عادل مراد کی مالیشان کوشی کے گیٹ پر ایک

طیش میں آکر اسے جہز کا اور ساتھ ہی اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا
سیاہ ردل اس کی ٹھوڑی پر چھو کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور بولا۔
”تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟ مجھے تمہاری ناکام عشقیہ کہانی
سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے میرا سوال گول کرنے کی
کوشش مت کرو۔ میرے سوال کا جواب دو سیدھی طرح کہ
تم بدھ کی شام مڈر کے قتل سے محض نصف گھنٹا پہلے تنہا ٹونگ
اسپاٹ پر کیا کر رہے تھے اور گل فشاں ریسٹورنٹ میں مڈر
سے ملاقات تم نے کس مقصد کے تحت کی تھی؟“ ٹھیکل بری
طرح بوکھلا گیا۔ اسے اسپیکٹر حادثہ بیگ سے اس قدر تیزی
اور تندگی کی توقع نہیں تھی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں اسپیکٹر صاحب! میں وہاں
ویسے ہی اپنے دل کی اداسی دور کرنے گیا تھا کہ مڈر پر نگاہ
پڑ گئی۔ وہ تنہا تھا مگر اس کی غزالہ سے ملاقات ملے تھی۔ وہ
وہاں پہنچنے والی تھی، میں مڈر سے ملا اور اسے سمجھانے کی
کوشش کرنے لگا کہ وہ غزالہ کو دھوکا نہ دے۔ وہ بہت
حساس لڑکی ہے اور...“

”تو تم ایسے نہیں مالو گے؟“ بالآخر اسپیکٹر حادثہ نے
اس کی بات کاٹ کر تہدید کی لہجہ میں کہا۔

”میری بات پر یقین کریں اسپیکٹر صاحب۔“ ٹھیکل
نے اس بار اپنے لہجہ میں استحکام پیدا کرنے کی کوشش
کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارا“ حادثہ نے اس کی بات پر توجہ دے بغیر
اپنے اسٹنٹ کو پکارا۔

”ہیں سر۔“ وہ یکدم سیلیوٹ مار کر موڈ بانہ بولا۔
”اس کی ذرا مہمان خانے میں لے جا کر تواضع
کرو۔ اس وقت تک جب تک یہ اپنے منہ سے سچ نہ اگل
دے۔“ اسپیکٹر حادثہ نے ٹھیکل کی طرف گھورتے ہوئے
ذانت میں کرشمہ ساز انداز میں کہا۔

تھم سنتے ہی تیمور ایک دم الٹ ہو گیا اور ٹھیکل کی
گردن تاحے ہوئے سخت لہجہ میں بولا۔ ”چل اوئے عاشق
نامراد! اگے لگ۔“ ٹھیکل اپنی بے گناہی پر دوا دیا چاٹا رہا،
تیمور اسے گھسیٹتے ہوئے کمرے سے لے گیا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آچکی تھی۔ اس کے علاوہ
لیبارٹری سے خون جے ہوئے پتھر کی جو تجزیاتی رپورٹ اس
کے سامنے تھی اس کے مطابق اس پتھر کی ضرب سے ہی مڈر
کا خون ہوا تھا۔ اس پر لگا خون مڈر کا ہی تھا جبکہ فنگر پرنٹس
کی رپورٹ غیر تسلی بخش تھی۔

ہائیں برس کے قریب لگایا تھا۔ وہ خاصی پُرکشش، اسارت اور میں اتج ہی نظر آرہی تھی۔ بال بوائے کٹ تھے، رنگت شہابی اور جلد شفاف تھی مگر اس وقت اس کا چہرہ ستا ہوا اور مغموم نظر آرہا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی تو حادثہ احتراماً کھڑا ہونے لگا مگر غزالہ نے سلام کر کے اسے بیٹھے رہنے کا کہا۔

"شکریہ۔" حادثہ سننے اس کی طرف دیکھ کر خوش اخلاقی سے کہا پھر تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔
"آپ غزالہ ہیں؟"

"جی۔" غزالہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے کہا اور اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گئی۔ "آپ کیا لینا پسند کریں گے؟"

"جی کچھ نہیں، شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں، میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔" حادثہ نے پہلو بدل کر کہا پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مڈر کو تو آپ جانتی ہی ہوں گی آپ کا کلاس میٹ تھا وہ۔"

"جی۔"

"یقیناً اس کے قتل کی بھی اطلاع آپ کو ہوگی؟"

"جی ہاں۔"

"میں غزالہ! مجھے مڈر کے قتل کا بے حد افسوس ہے، یقیناً آپ کے لیے بھی گہرے دکھ اور رنج کی بات ہوگی۔ میں آپ کے غم کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ قاتل تک پہنچنے کے لیے میں آپ سے چند ضروری سوالات کرنا چاہوں گا۔"

حادثہ بولا۔

"جی کیجیے۔" غزالہ کی آواز مغموم تھی۔ مڈر کے ذکر پر اس کا چہرہ شدید غم میں ڈوبا نظر آنے لگا۔ تاہم وہ کچھ پریشان بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"تو سب والے روز... یعنی بدھ کی شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان ساؤتھ سی کے مقام پر کیا آپ کی متول مڈر سے ملاقات طے تھی؟"

"جی ہاں۔" غزالہ نے حادثہ کی توقع کے عین مطابق اثبات میں جواب دیا۔

"میں آپ کو پہلے یہ بتا دوں کہ یہاں آنے سے پہلے میں کالج بھی گیا تھا اور وہیں سے آپ کے اور مڈر کے کچھ کلاس فیلوز کی زبانی مجھے آپ کے اور مڈر کے درمیان دوستی کا علم ہوا۔ خیر... یہ تو برسمل تذکرہ تھا۔ آپ یہ بتائیں کہ

ہاوردی گمن مین موجود تھا۔ حادثہ نے اپنا آئی ڈی کارڈ دکھا کر تعارف کروایا تو وہ فوراً مرحوب ہو گیا تاہم اس نے بتایا کہ سیٹھ صاحب آج کل کاروباری دوسے پر بنگلور گئے ہوئے ہیں البتہ ان کی بیٹی غزالہ اندر موجود ہے لیکن اس کی طبیعت ناساز ہے۔

حادثہ نے گمن مین کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے خامے گھبر لہجے میں کہا۔ "مجھے درحقیقت سیٹھ عادل کی بیٹی غزالہ سے کل کی ایک واردات کے سلسلے میں ملنا ہے۔ کیا ان کی طبیعت اتنی خراب ہے کہ وہ بات بھی نہیں کر سکتیں؟"

گمن مین کا ماتھا ٹھکا۔ "قتل کی واردات... مگر بی بی جی کا اس سے کیا تعلق؟" وہ پریشان سا ہو گیا۔

حادثہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں جو نو جوان اس واردات میں قتل ہوا ہے اسے غزالہ بی بی بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں مقتول نو جوان کے بارے میں کچھ تفصیل ورکار ہے وہی پوچھنے آیا ہوں۔"

"اچھا یہ بات ہے۔" گمن مین کی پریشانی ذرا کم ہوئی پھر اس نے گیٹ پر سکے اثر کام پر اندر غزالہ سے رابطہ کیا۔ اسے ساری بات بتائی پھر "بہت بہتر بی بی جی۔" کہہ کر وہ فارغ ہوا اور حادثہ کے لیے بگلی دروازہ کھول دیا۔

حادثہ اندر داخل ہو گیا۔ گمن مین اس کے ہمراہ تھا۔ ایک ہنستہ روش پر چلتے ہوئے وہ گمن مین وسیع و عریض خوب صورت لان میں اسے لے آیا۔ جہاں چند فولڈنگ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس نے حادثہ کو نہایت احترام سے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر خود گیٹ کی طرف واپس لوٹ گیا۔

سہ پہر کے چارج رہے تھے، فضا خوشگوار تھی۔ لان میں لگے خوش رنگ گل بوٹوں اور کیاریوں کی سوندھی سوندھی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ لان کے چاروں طرف ناریل کے درختوں کی قطار تھی۔ لان کے وسط میں بیڈ منشن کے لیے ایک نیٹ لگا نظر آرہا تھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ پورچ میں ایک نئے ماڈل کی چیمانی کار کھڑی تھی چند ملازم اسے دکھائی دیے۔

حادثہ ابھی ان چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ کونسی کے خوب صورت وسطی عمرانی دروازے سے ایک خوش جمال لڑکی نمودار ہوئی۔ حادثہ نے اس کی عمر کا اندازہ بیس،

سنگ زن

نہ تھا کہ میں نے کھیل کو نظر انداز کر رکھا تھا، وہ بھی ایک انہما انسان ہے۔ میرے اس کے ساتھ صرف دو ساندہ مراسم تھے لیکن اس کی مرضی کچھ اور تھی۔

"میں نے سنا ہے کہ کھیل تمہیں اکثر یہ سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ مدثر تمہارے ساتھ کچھ محبت نہیں کرتا اور تم سے محض قلرٹ کر رہا ہے۔" معا حارث کو کھیل سے کی گئی نفیث کے دوران اس کی یہ بات یاد آگئی تھی۔

انسپلر حارث کے اس سوال پر غزالہ کے چہرے پر پہلے ایک عجیب سا تاثر ابھرا اور پھر وہ کئی سے بولی۔

اس طے شدہ ملاقات کے مطابق آپ مدثر سے ملی تھیں؟ یعنی ساؤتھ ہی کے لوگ اسپاٹ ایر یا پر؟

"طے شدہ ملاقات کے مطابق میں اس سے ساؤتھ ہی ملاقات کرنے پہنچی ضرور تھی مگر مدثر سے میری ملاقات نہ ہو پائی تھی۔" غزالہ کی آواز میں رقت زدہ ارتعاش تھا۔

حارث اس کی خلاف توقع بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ الجھ کر بولا۔ "یعنی آپ کی کل شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان سرے سے مقنول مدثر کے ساتھ ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی؟"

"جی ہاں، جب میں وہاں پہنچی تو مجھے مدثر کہیں نظر نہ آیا.... پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ شاید میں وہاں جلدی آ پہنچی ہوں مگر کافی انتظار کے باوجود جب مدثر مجھے نظر نہ آیا تو میں اس سے ملے بغیر ہی واپس گھر لوٹ آئی تھی۔"

غزالہ نے جواب دیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے لٹو پیپر سے آنکھوں میں اترنے والی نمی کو پونچھنے لگی۔ انسپلر حارث چند ثانیے اپنے ہونٹ بھیجنے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

"ایک ذاتی سوال کروں گا کہ اپنی کسی ذاتی دلچسپی کے لیے انہیں بلکہ اس کیس کو حل کرنے اور اصل قاتل تک پہنچنے کے لیے۔ اگر آپ ماسٹرنڈ نہ کریں تو...؟"

"آپ پوچھیے۔"

"جیسا کہ میں بتا چکا ہوں... میں یہاں آنے سے پہلے آپ کے کالج بھی گیا تھا اور وہاں سے معلوم ہوا تھا کہ مدثر اور آپ کے بیچ محبت کا رشتہ بھی تھا۔ کیا یہ بات درست ہے؟"

"جی ہاں۔" غزالہ نے سر جھکا کے ہمیشہ کی طرح مختصر جواب دیا۔

"اور یقیناً وہ بھی آپ سے محبت کرتا ہوگا؟"

"جی۔"

"کھیل اور سنیل کا... درمیان میں کیا معاملہ تھا؟" حارث نے پوچھا۔

اس سوال پر غزالہ کے غمناک چہرے پر نفرت کا تاثر ابھرا۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔ "سنیل ایک بدتماش اور لوفنر آدمی ہے۔ کھیل اور مدثر کو اس نے ہی آپس میں لڑوا دیا تھا۔ میں اگرچہ کھیل کو سمجھانے کی کوشش کرتی تھی مگر کھیل کو جانے کیوں مدثر سے نفرت سی ہو گئی تھی اس کی وجہ یقیناً وہ رقابت تھی جو مدثر کے لیے وہ اپنے دل میں رکھتا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ کھیل بھی مجھ سے محبت کا دم بھرتا تھا لیکن میری انڈراسینڈنگ مدثر کے ساتھ تھی۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ ایک سال کا رجسٹرڈ پتہ
- ☆ شہر و علاقہ کا نام
- ☆ ممکن ہو تو سال کا PTCL سے فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نثار عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگرمیت

63 نمبر 11 سینس ہاؤس انٹرنیشنل منیجرمنٹ رزلٹس

جسٹس ڈی جی ایم ایم ایم ایم ایم ایم ایم ایم ایم ایم

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

”ایسا وہ جوش رقابت میں کہتا تھا۔“

جیسا بڑا قدم وہ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ وہ میرا اچھا اور قریبی دوست رہ چکا ہے۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

”لیکن میں نے سنا ہے اس کی اکثر اور باقاعدہ مدثر کے ساتھ ہاتھ پائی بھی ہوتی رہی ہے۔“

”یہ درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ مدثر کا قتل کرنا چاہتا ہو۔“

”دیکھیے محترمہ غزالہ صاحبہ، یہ قتل اشتعال انگیزی کا نتیجہ ہے۔ مشتعل ہونے کی صورت میں اتنا بڑا قدم اٹھایا جاسکتا ہے جبکہ مدثر اور شکیل کے درمیان اچھی خاصی ہاتھ پائی پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔ ممکن ہے بدھ کی شام بھی دونوں کے درمیان ایک بار پھر ہاتھ پائی ہوئی ہو اور آپ بھی وہاں موجود ہوں پھر اس اشتعال انگیزی میں شکیل کے ہاتھ کیلا پتھر آگیا جو اس نے مدثر کی پیشانی پر دے مارا۔ حیرت ہے آپ اپنے محبوب کے ممکنہ قاتل کو کیوں سزا سے بچانا چاہ رہی ہیں؟“

”اس لیے کہ یہ قتل شکیل نے نہیں کیا۔“ غزالہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

حارث نے حیرت زدہ لمحے میں اس سے پوچھا۔

”آپ اس قدر یقین سے یہ بات کیسے کہہ سکتی ہیں؟ اس کا مطلب ہے آپ کو معلوم ہے کہ مدثر کا اصل قاتل کون ہے؟“

غزالہ بری طرح گڑبڑا گئی۔ اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر حارث نے کہا۔

”دیکھیے غزالہ صاحبہ! مجھے لگتا ہے آپ کچھ چھپا رہی ہیں جبکہ میرے اندازے کے مطابق آپ قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں اور بدھ کی شام آپ کی ملاقات بھی مقتول مدثر سے ہوئی ہوگی ایسا کیسے ممکن ہے کہ مدثر اور آپ کے درمیان ملاقات کا وقت طے ہو اور آپ دونوں نہ مل سکے... جبکہ یہ قول شکیل آپ دونوں کے بیچ ملاقات کا وقت مدثر کے قتل سے دس منٹ پہلے کا طے تھا اور کبھی آپ دونوں ایک مرتبہ بھی لیٹ نہیں ہوئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آخر وہ کیا وجہ ہے جس کی بنا پر آپ...“

حارث کی بات ادھوری رہ گئی۔ غزالہ نے درمیان ہی میں اسے لوک دیا۔ ”انسپکٹر صاحب! محض اپنے اندازوں پر نہ چلیں جو زیادہ تر غلط بھی ثابت ہوتے ہیں۔ میں پولیس والوں کو جانتی ہوں انہیں ہر ایک پر شبہ کرنے کی بیماری ہی ہوتی ہے۔ ان کا بس چلے تو وہ اپنے گھر والوں پر

حارث نے ہولے سے اپنے سر کو تھپی جھنش دی پھر بولا۔ ”شاید آپ کے علم میں یہ بات نہیں ہوگی کہ جب مدثر اس روز شام کو سادھ کی پر آپ کا انتظار کر رہا تھا، اس سے تھوڑی دیر پہلے شکیل کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جسے وہ محض اتفاقیہ ملاقات کا نام دیتا ہے۔“

انسپکٹر حارث کی بات سن کر غزالہ چونک کر اس کا چہرہ سنکنے لگی۔ اس کی دلکش آنکھیں ہنوز اشکبار تھیں۔

”جی... اس شبہ کی بنیاد پر شکیل کو مدثر کے قتل کے متوقع جرم میں گرفتار کیا جا چکا ہے۔ تاحال تفتیش جاری ہے۔“ حارث نے انکشاف کیا۔

غزالہ کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سے تاثرات ابھرنے لگے۔ حارث کو ان تاثرات کی وجہ کا اندازہ نہ ہو سکا کیونکہ وہ تو یہ توقع کیے بیٹھا تھا کہ شکیل کی گرفتاری پر وہ طمانیت یا خوشی جیسے جذبات یا تاثرات کا اظہار کرے گی۔

”آپ... کچھ پریشان سی ہو گئیں، کیا آپ کو شکیل کی گرفتاری پر دکھ ہوا؟“

”پپ... پتا نہیں؟ قتل شکیل نے کیا بھی ہے کہ نہیں چونکہ وہ میرا اچھا دوست رہ چکا ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ وہ جوش رقابت میں آکر اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔“ غزالہ نے کہا۔

حارث کو تھوڑی حیرت ہوئی تاہم اس نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ”کیا آپ کو شکیل پر ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ وہ مدثر کا قاتل ہو سکتا ہے؟“

”میرے لیے ابھی ایسا کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔“ وہ عجیب سے گوگو لچے میں بولی۔ ”لیکن... مجھے نہیں لگتا کہ وہ قتل جیسا اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔“

حارث بدستور اس کی طرف ہنستے ہوئے اپنی بھویں سکینہ کر بوا۔ ”تو پھر آپ کے خیال میں یہ قتل کس نے کیا ہوگا؟ آپ کو کس پر شبہ ہے؟“

”میں ابھی اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“

”سینل کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ سینل کے

ذکر پر غزالہ کے تاثرات بدسلے پھر بولی۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتی بجز اس کے کہ میرا دل و دماغ

ماؤف ہو رہا ہے۔“ ایک ذرا توقف کے بعد اس نے موضوع بدل کر انسپکٹر حارث کی طرف دیکھ کر کہا۔

”انسپکٹر صاحب! باقی یہ بات میں کافی حد تک یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ مدثر کا قتل بہر حال شکیل نہیں کر سکتا بلکہ قتل

بریات

ایک آئرش معلم لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ ”شراب نوشی بہت بڑی عادت ہے۔ نشے میں دھت ہو کر آدمی اپنی بیوی سے لڑنے لگتا ہے، بچوں کو مارتا ہے، پڑوسیوں سے جھگڑنے لگتا ہے، فحش کلائی پر اتر آتا ہے، اپنے مالک مکان پر گولی چلا دیتا ہے اور سب سے بڑی عادت یہ ہے کہ نشے کی وجہ سے نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔“

بھی شبہ کرنے لگیں۔ آپ باقاعدہ عملی طور پر لکھتیش کریں اور قاتل کو گرفتار کر لیں۔“ غزالہ کے طنزیہ انداز پر انسپکٹر حارث اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر سپاٹ نظریں مرکوز کرتے ہوئے سرمراتے لہجے میں بولا۔
”میں مدثر کے اصل قاتل شکیل احمد ولد توفیق احمد کو گرفتار کر چکا ہوں۔“
”وہ قاتل نہیں ہے۔“ غزالہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
حارث نے اس کا شکریہ ادا کیا اور لوٹ آیا۔

☆☆☆

اس کے برعکس وہ فوری اشتعال کا رد عمل نظر آتا تھا تو پھر یہ کیا ماجرا تھا؟ کوئی نیا معاملہ تھا؟ اسی قسم کے ان گنت سوالات کے بھنور میں ڈوبتا ابھرتا وہ ایک درخت کے عقب میں کھڑا ہوا اور سیٹیل پر نظریں جمادیں۔ جواب غزالہ کے گھر کے گیٹ پر کھڑا گارڈ سے باتیں کر رہا تھا اور پھر گارڈ نے لنگی دروازہ کھول کے اسے اندر جانے کی اجازت بھی دے دی۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی حارث نے سنیل کو دوبارہ گیٹ سے برآمد ہوتے دیکھا۔

حارث یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مدثر کا قتل شکیل اور سنیل دونوں میں سے کسی ایک نے تو ضرور کیا ہوگا یا پھر دونوں کی مقبول مدثر کے ساتھ ہاتھ پائی ہوئی ہوگی۔ مدثر تھا اور وہ دو پھر سنیل یا شکیل کے ہاتھ وہ کھیلنا پتھر لگ گیا اور اس نے سخت طیش میں آکر وہ مدثر کے سر پر دے مارا جو اس کی پیشانی پر لگا اور بعد میں اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

چونکہ یہ ساری کارروائی غزالہ نے خوف زدہ آنکھوں سے دیکھی ہوئی اس طرح وہ دونوں قاتلوں کی چشم دید گواہ بھی ہو سکتی تھی لہذا بعد میں شکیل اور سنیل نے غزالہ کو اپنا منہ بند رکھنے کے لیے دھمکیاں دی ہوں گی یا پھر دھمکیوں اور مدثر کے قتل والا معاملہ صرف سنیل تک ہی محدود ہو ورنہ غزالہ شکیل کی رہائی کے سلسلے میں اس کی سفارش کیوں کرتی؟

اس نے دیکھا اب سنیل... خراماں خراماں لا ابالی انداز میں سیٹی بجاتا ہوا ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے یکسر بے خبر کہ ایک قریبی درخت کے پیچھے کھڑا سادہ وردی میں موجود انسپکٹر حارث بے غور اسے دیکھ رہا ہے۔

حارث کی پیشانی پر سلونیں ابھرائی تھیں۔ وہ شش و پنج میں جھٹا تھا کہ آیا اسی وقت دوبارہ غزالہ کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اس سے مل کر سنیل کی آمد کے بارے میں

انسپکٹر حارث نے دانستہ شکیل کو مدثر کا قاتل ٹھہرانے کی کوشش کی تھی۔ ایسا اس نے غزالہ کا عدم تعاون اور اس کی شکیل میں دلچسپی کو قانون کی گرفت سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ حارث کو بار بار یہی بات کھٹک رہی تھی کہ غزالہ آخر شکیل کو کیوں بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔
اس کا مطلب صاف تھا کہ غزالہ کو اصل قاتل کے بارے میں علم تھا۔ وہ مدثر کے قتل کے سلسلے میں کچھ بلکہ بہت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

حارث، غزالہ سے رخصت ہو کے اس کی عالیشان رہائش گاہ کے گیٹ سے نکلا اور جیب اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ابھی وہ اس راستے پر تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے سے آتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ اس کا رخ غزالہ کی رہائش گاہ کی طرف تھا جبکہ انسپکٹر حارث بیک اس شخص کو دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔

وہ سنیل تھا... اسے غزالہ کی رہائش گاہ کی طرف کا رخ کرتے دیکھ کر انسپکٹر حارث کو سخت اچھٹا ہوا تھا۔

پہلا سوال اسے یہاں دیکھ کر حارث کے ذہن میں یہ ابھرا تھا کہ... کیا یہ غزالہ سے ملنے آیا ہے لیکن کیوں... غزالہ تو اس سے سخت نفرت کرتی تھی؟ یہ قول اشوک کار، وہ اس کا چہرہ تک دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی اور اب حالت یہ تھی کہ سنیل اس کی رہائش گاہ تک آن پہنچا تھا لیکن کیا اس میں غزالہ کی مرضی کا بھی دخل تھا؟ یقیناً ایسی ہی بات ہوگی۔ ورنہ سنیل کیا یہ نہیں جانتا تھا کہ غزالہ کو اس کی صورت تک دیکھنا پسند نہ تھی تو بھلا اپنی رہائش گاہ پر اسے کیوں گوارا کرتی؟
ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔

حارث کو اب سنیل پر شبہ ہونے لگا تھا کہ ضرور کسی نہ کسی طرح مدثر کے قتل میں ملوث تھا مگر ابھی یہ سمجھی کہ مدثر کے قتل کا منظر نامہ کسی طرح سے بھی پہلے سے سوچا بھی اسیکیم یا منصوبہ بندی کا شاخصانہ نظر نہیں آتا تھا۔

سے دیکھا پھر اپنی جیب سے پانچ سوکانوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ ”یہ تمہارا قانون سے تعاون کرنے کا انعام ہے، رکھ لو۔“ مگر مرلی دھرا انکار کرنے لگا لیکن حارث نے اسے اس کا حق دار قرار دیتے ہوئے وہ نوٹ اسے زبردستی تمہا دیا۔ وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

قریب کھڑے تیمور نے ذرا کسمسما کے حارث سے کہا۔ ”سرجی آپ نے محض ایک معمولی سے ڈھکن کے عوض اس ویٹر کو پانچ سوکانوٹ تمہا دیا۔“

اس کی احمقانہ بات سن کر حارث نے غصے سے گھور کے اسے دیکھا اور وادانت پیش کر بولا۔ ”جو کام تمہیں کرنا چاہیے تھا، وہ اس ویٹر نے کر دکھایا۔ جی چاہتا ہے کہ اسے تمہاری جگہ رکھ لوں اور تمہیں بیراگری کرنے کی جگہ پر چھوڑ آؤں۔“

”لہلہ... لیکن سرجی آپ مجھے حکم تو کرتے ہیں ایسے ایک سو ایک ڈھکن سمیٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کر کے ہزاروں روپے کے انعام کا مستحق قرار پاتا۔ مرلی تو بے وقوف نکلا جو محض ایک ڈھکن اٹھا لیا۔“

”ہاں تم اگر ایک سو ایک ڈھکن لاتے تو انعام کے طور پر تمہیں میں ایک سو ایک جوتے انعام کے طور پر مارتا... بے وقوف یہ ڈھکن جائے وقوعہ کے قریب پڑا ملا ہے، تم اگر تھوڑی کوشش کرتے اور اپنی موٹی عقل استعمال کر کے گرد و پیش کا باریک بینی سے جائزہ لیتے تو یہ تمہیں بھی پڑا نظر آسکتا تھا۔ میرا خیال ہے تم اس نوکری کے اہل نہیں ہو، تمہارا ہندو بست مجھے کرنا پڑے گا۔“

”سس... سرجی ایسا ظلم مت کیجیے گا۔ میرے بڑے بڑے بچے ہیں۔“ وہ گھٹکیا کر بولا۔

حارث الجھ کر بولا۔ ”بڑے بڑے بچے؟“

”جی سرجی میری لڑکیں میں ہی شادی ہو گئی تھی جب مجھ پر نئی نئی جوانی آئی تھی۔ اب ماشاء اللہ میرے بچے جوان ہو گئے ہیں۔“ وہ شرما کے بولا۔

حارث کا منہ پھاڑ کے قہقہہ لگانے کو جی چاہا، اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ہنسی روکنے کی خاطر وہ تیزی سے کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

☆☆☆

حارث پوری رفتار سے جیب دوڑا رہا تھا مگر اس کا ذہن اس سے زیادہ رفتار کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ

استفسار کرے یا پھر یہ کام کسی اور وقت کے لیے اٹھار کے اور سنیل کے تعاقب میں روانہ ہو جائے۔

ابھی وہ اسی ادھیڑ بین میں تھا کہ اچانک اس کے قریب کھڑی اس کی جیب میں نصب پولیس ریڈیو کی مخصوص بپ کی آواز ابھرنے لگی وہ تیزی سے جیب کی طرف لپکا۔

وائرلیس سیٹ جیب کے اسٹیرنگ ویمیل کے ساتھ ہی نصب تھا۔ حارث نے..... ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ کھڑے کھڑے وائرلیس سیٹ کا ماؤتھ پیس اٹھا کر... اپنے منہ کے قریب کر لیا اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا مٹن پیش کر کے بولا۔

”ہیلو انسپکٹر حارث اسپیکنگ، اوور۔“

”ہیلو سر... آپ کہاں ہیں؟ اوور۔“ دوسری جانب سے اس کے اسسٹنٹ تیمور کی آواز ابھری۔

”آگے بات کرو، اوور۔“ حارث نے وادانت پیش کر حکمانہ انداز میں کہا۔

”سرجی وہ مکمل نشان ریسنورنٹ کا ویٹر مرلی دھرا آیا ہے اور آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے، اوور۔“

”اچھا ٹھیک ہے، اسے بٹھائے رکھو میں پندرہ منٹ کے اندر پہنچتا ہوں، اوور اینڈ آل۔“ یہ کہہ کر حارث نے بات ختم کر دی اور پھر جیب میں سوار ہو کے سیدھے ہیڈ کوارٹر پہنچا تو مرلی دھرا کو بے چینی سے اپنا خنجر پایا۔

رسمی کلمات کے بعد مرلی نے اپنی جیب سے ایک گول پلاسٹک کی ڈھکن نمائے نکال کر انسپکٹر حارث کی طرف بڑھائی اور بولا۔ ”سر مجھے آج ہی اس مقام سے گیلے پتھروں کے قریب یہ پڑا ہوا ملا تھا جہاں مدثر نامی نوجوان کا قتل ہوا تھا اس کے بینک پر ایک نام بھی درج ہے چونکہ یہ وقوعے کی جگہ پڑا تھا، یہ سوچ کر میں نے اٹھا لیا شاید آپ کے کام کی چیز ہو۔“

حارث نے بھنویں سکیز کر اس کیپ نمائے کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ وہ کسی مووی کینزے کا ٹینس پرفٹ ہونے والا حفاظتی کیپ لگتا تھا پھر جب اس اس کی بیک پر نظر ڈالی تو بری طرح چونک پڑا۔

وہاں سنیل بسکینا کا نام درج تھا۔ یہ جانا پہچانا نام تھا جسے پڑھ کر حارث کی رگوں میں یلکھت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس نے سوچا کیا یہ اس سنیل کا پورا نام تھا جس پر کلپل کے بعد مدثر کو قتل کرنے کا شبہ تھا؟

”تمہارے تعاون کا شکریہ، مرلی دھرا۔“

انسپکٹر حارث بیگ نے اس کی طرف توسیفی نظروں

حال تک پہنچ گیا ہو۔۔۔ اب اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

جیب کو مسلسل نصف گھنٹے تک دوڑاتے رہنے کے بعد وہ ایک متوسط طبع کے رہائشی علاقے میں داخل ہوا۔ وہاں اسے سنیل سکسینا کا گھر ڈھونڈنے میں ذرا بھی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس کا پتا وہ ٹھیکل سے حاصل کر چکا تھا۔ باقی رہی سہی کسر محلے والوں نے پوری کر دی۔ کسی شیطان کی طرح وہ وہاں مشہور تھا۔

گھر کی حالت خستہ تھی مگر وہ کشادہ تھا اور ایک منزلہ تھا۔ پتا چلا اس کا باپ دھوبی تھا، ماں بھی یہی کام کرتی تھی۔ دونوں میاں بیوی کا یہ جدی پشتی پیشہ تھا۔ دونوں اس وقت دھوبی گھاٹ پر تھے، اوپری منزل پر سنیل سے ملاقات ہو گئی۔ وہ وہاں اکیلا تھا۔

حادثہ... تیمور کو باہر ہی نیچے چوکس کھڑا رہنے کا حکم دے کر خود اس بیرونی زینے سے اوپر جا پہنچا۔ دروازے پر دستک دی تو کوئی جواب نہ ملا۔ دوسری بار دستک دی تو اندر سے کڑکراتی آواز ابھری۔

”کون ہے... دھیرج ذرا... اوئے دروازہ توڑ ڈالے گا۔ کالیا ہے نا؟“

حادثہ ان رہنما کس پر اندر ہی اندر کڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھلا۔ سامنے سنیل کھڑا تھا۔ انسپکٹر حادثہ کو دیکھ کر اس کا دماغ جھک سے اڑ گیا۔ حادثہ اپنے ہونٹ بھیج کر اسے گردن سے دبوچے دھکیلتا ہوا اندر لے آیا تو ذرا ٹھٹکا۔ ایک طرف بڑی خوب صورت نازنین کھڑی تھی۔ اس کے نفاست سے تہ کیے بالوں میں ڈیل گھیر والا ہیئر بینڈ تھا... وہ جس میز کے قریب چیئر پر بیٹھی تھی، اس کی سطح پر دو پائے (Dice) پڑے تھے۔

لوکی بازاری معلوم ہوتی تھی۔ وہ یک دم سراپہ سی نظر آنے لگی۔ ادھر انسپکٹر حادثہ نے اپنی بیلٹ سے جھوٹی ہوئی ہتھکڑی نکال کر سنیل کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف موڑ کے اسے پہنا دی۔

”یہ... یہ... کیا لفظ ہے، انسپکٹر صاحب؟ اکھا مہائی جانے ہے اپن کو۔ ایک دم شریف انسان ہے اپن۔ آج تک کوئی لفظ انگریزی نہ کہ یہ کیا پولیس گردی؟“ وہ گھبرا گیا۔

حادثہ نے اسے گھر کا۔ ”بکواس بند کرو اپنی زبان کو ذرا تالا لگائے رکھو۔“ یہ کہہ کر حادثہ نے اسے ہتھکڑی لگی حالت میں ایک قریب دھری کرسی پر بیٹھنے کے انداز میں

بٹھا دیا۔ اسے وہیں بیٹھ رہنے کا حکم دے کر اس کے کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ اس کام میں وہ ماہر اور تجربہ کار تھا۔ پل کے پل اس کے ہاتھ میں وہ مودی کیمرا آ گیا جس کے لینس پر کیپ نہ تھا۔

”یہ مودی کیمرا تمہارا ہی ہے ناں؟“ حادثہ کیمرا اس کے چہرے کے سامنے لا کر بولا۔

”اپن کا ہی ہے باپ۔ آپ کو پسند ہے تو رکھ لو اکھا مہائی جانتا اپن کو ایک دم سختی ہے دل کا۔“ وہ ایک بار پھر اپنے مخصوص فلی لہجے میں بولا۔

حادثہ نے اگلا سوال کیا۔ ”اس کے لینس کا کیپ کدھر ہے؟“

”وہ تو کھو گیا ہے پر دوسرا مل جائے گا۔“

”کہاں کھو گیا؟“

”پتا نہیں باپ۔“

انسپکٹر حادثہ نے اسے زہریلی مسکراہٹ سے گھورا پھر اپنی جیب سے کیپ نکال کر اس کو دکھایا اور بولا۔ ”پہنچا تو اسے، یہی ہے اس کا ڈھکن؟ اس پر تمہارا پورا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ سنیل سکسینا۔“

”بالکل یہی ہے باپ۔ اپن کا ڈھکن... پر... وہ کچھ کہتے کہتے رکھا، اس کے چہرے پر اب نظر اور پریشانی کے تاثرات ابھرے۔ حادثہ نے بڑے آرام سے وہ کیپ مودی کیمرے پر چڑھایا تو وہ اس پر بالکل فٹ آ گیا۔ حادثہ کے ہونٹوں پر قاتمانہ مسکراہٹ ابھری۔ اس نے زہر خند نظروں سے گھبراہٹ میں جتلا سنیل کی طرف دیکھا پھر بولا۔

”اب کیا کہتے ہو؟“

”بب... بالکل یہی ہے باپ۔“ وہ بولا۔

پھر حادثہ قریب آیا۔ کیمرا اس کی ہر اسان نظروں کے سامنے لہرا کے انکشاف کرنے والے لہجے میں بولا۔

”جانتے ہو مجھے تمہارا یہ کیپ کہاں سے ملا ہے؟“

”پپ... پتا نہیں... مجھے کیا معلوم؟“ وہ کچھ ٹھٹکنے کے انداز میں بولا۔

حادثہ نے بڑے سلسنی خیر لہجے میں بتایا۔ ”یہ کیپ مجھے اس جگہ سے ملا ہے جہاں مدثر کا قتل ہوا تھا اور اب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ تم نے اور ٹھیکل نے کس طرح سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت مدثر پر حملہ کر کے اسے کیوں قتل کیا تھا؟“

”باپ! اپن نے یہ قتل نہیں کیا۔ اپن کو تو ساحل سمندر

چہرے پر رسید کر دیا اور تیمور جس تیزی کے ساتھ اوپر آیا تھا۔ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ بغیر زینے کے نیچے آ رہا۔ سنیل کے منہ میں کیسٹ ولی ہوئی تھی دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے مگر وہ اپنی ٹانگوں سے خوب کام لے رہا تھا۔ وہ جکڑ بند ہونے کے باوجود چھلوا دیا ثابت ہوا۔ وہ محلے کی گلیوں کی بھول بھلیوں میں غائب ہو گیا اور سیدھا ایک لوہار کی بھٹی پر جا پہنچا۔ سب سے پہلے اپنی ہتھکڑیاں کنوا میں پھر کیسٹ کو جیب میں ڈالا اور غائب ہو گیا۔

حادثہ محلے کی آڑی ترچھی بے ترتیب گلیوں میں ٹانگ ٹوئیاں مارتا رہ گیا۔ اول جلول ساتیور اس کے عقب میں تھا۔ دونوں ایک بندگی میں آکر رک گئے اور بری طرح ہانپنے لگے۔

”بد بخت! تمہیں جو میں نے طوطے کی طرح رٹایا تھا کہ نیچے چوکس کھڑے رہنا مگر مجرم بندھی ہوئی حالت میں تمہاری ٹانگ کے نیچے سے نکل گیا اور تم اوپر آسمان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ اس کا تعاقب کیوں نہیں کیا؟“ حادثہ نے غصیلے لہجے میں تیمور کو جھاڑا۔ تیمور مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

”سرمجی! میں تو آپ کی چیخ سن کر ہی پریشان ہو گیا تھا۔ میں سمجھا کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے اس لیے میں اوپر آپ کے پاس پہنچا مگر آپ نے ایک ہی پھڑ مار کے مجھے دوبارہ نیچے پہنچا دیا۔“

”میرا بس چلتا تو میں تمہیں دوسرا پھڑ مار کر جہنم میں پہنچا دیتا۔“ حادثہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر کہا اور تیمور آنکھیں پٹپٹا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اسپیکٹر حادثہ اس روز کی ناکامی کے باعث سارا دن جھٹایا ہوا رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی ناقص کارکردگی پر خود بھی بہت شرمسار ہو رہا تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ ایک شخص جس کے دونوں ہاتھ پشت کی جانب آہنی ہتھکڑیوں سے بندھے ہوئے تھے وہ نہ صرف فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا بلکہ اپنے ساتھ اہم ترین ثبوت بھی لے اڑا تھا جس سے مڈر مڈر کیس بس حل ہوا ہی چاہتا تھا۔

حادثہ کے پاس فی الوقت عقل کے گھوڑے دوڑانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ اب یہ بات تو طے ہو چکی تھی کہ سنیل نے اپنی آنکھوں کے سامنے مڈر کا قتل ہوتے دیکھا تھا مگر

میں ڈوبتے سورج کا مودی بنانے کا شوق ہے۔“ سنیل کے جواب پر اچانک اسپیکٹر حادثہ بیگ کے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا۔

اس کمرے کے اندر موجود کیسٹ کو چیک کیا اور پھر مودی کمرے کی مائیکرو ریکارڈنگ اسکرین کھول کر کیسٹ کو پلے کر دیا۔ مودی کمرے کی ریکارڈنگ اسکرین روشن ہو گئی اور ایک منظر ابھرا۔ اس منظر میں حادثہ نے مقتول مڈر کو دیکھا اور بری طرح ٹھنک گیا۔ منظر جائے واردات کا ہی تھا۔ ابھی وہ بہ مشکل اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ اچانک سنیل نے کرسی سے اٹھ کر بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود حادثہ کو زبردست ٹھوکر رسید کر دی۔

یہ حملہ حادثہ کے لیے نہ صرف اچانک تھا بلکہ خاصا زوردار بھی تھا۔ جس کا نتیجہ میں حادثہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔

ہینڈ کی کیم مودی کمرے اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور پختہ فرش پر گرنے سے اس کے کچھ حصے کھل کر بکھرے۔ اندر سے ایک کیسٹ بھی اچھل کر باہر آ گئی جسے سنیل نے کمال پھرتی سے گھنٹوں کے بل جھک کر اپنے منہ میں وہ کیسٹ دبائی اور اٹھ کر رخ بستہ ہاتھوں سمیت دروازے کی طرف دوڑا اور چشم زدن میں باہر نکل گیا۔ لڑکی ہراساں ہو کر ایک کونے میں جا دبئی۔

ادھر اسپیکٹر حادثہ کا سرو دیوار سے ٹکرانے کے باعث بری طرح جھنجھٹا گیا تھا۔ چند ثانیوں تک اس کی آنکھوں کے سامنے کالے دائرے ناچتے رہے۔ دو چار بار اپنے سر کو جھٹکے دے کر پیٹائی اور حواس بحال کرنے کے بعد وہ بھی دروازے کی طرف سنیل کے تعاقب میں لپکا جبکہ سنیل چکر دار چوبلی سیزھیوں کو ایک ہی چکر میں پھلانگ کر گرتا پڑتا گلی میں جا پہنچا جہاں تیمور کھڑا تھا مگر اس کی اس طرف پشت تھی۔

اوپر سے اسپیکٹر حادثہ نے طلق کے بل چیخ کر تیمور کو خبردار کیا تو خیالوں میں کھویا ہوا تیمور یکدم بدکا پھر اپنے صاحب کو اوپر دیکھ کر وہ بجائے زمین پر لوٹ لگا کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے سنیل کو پکڑنے کے چکر دار زینے چڑھنے لگا۔ ادھر سنیل اڑن چھو ہوا ادھر تیمور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زینے طے کرتا اوپر پہنچا اور حادثہ کے سامنے گویا ناک سے ناک ملا کر اٹھن ٹھن ہو کر بولا۔

”ختم کریں سر۔“

حادثہ نے ہونٹ بھیجنے کر ایک زوردار پھڑ اس کے

دروازے پر کھڑے ہو کر اس کے شمال جنوبا پھیلے ہوئے
موتے وجود کو گھورتے ہوئے دباڑ کے کہا تو بے چارے متنا
بھائی کے ہاتھ سے بھاری بھر کم اسٹیل کا کفگیر چھوٹ کر کھڑکی
سے باہر جا گرا۔

ایک ٹن کی آواز ابھری پھر دوسری ٹن کی آواز آئی،
تیسری بار ہائے کے ساتھ ہی باہر نیچے گلی میں شور مچ گیا۔
متنا بھائی کا چہرہ توفیق ہوا ہی تھا ساتھ میں حارث بھی
پریشان ہو گیا۔ دانت پیس کر بولا۔

”ابے گوشت کے پہاڑ! پھاڑ دیا نا کسی کا سر، بد بخت
تو تو اندر جائے گا ہی... ساتھ میں میری بھی پٹی اتروائے
گا۔ اب چپ رہنا اور قاتل کفگیر کی وراثت سے صاف کر
جانا، سمجھا؟“

”میں اپنے کفگیر سے دست بردار نہیں ہو سکتا صاحب
جی۔“ متنا بھائی نے اعلان کیا۔ ”وہ میرا ذاتی اور خاندانی
کفگیر تھا، میری اماں کی ساس کی بہو کی خالہ اور اس کی بہن
کے جہیز کا... نا درو نا یاب اور کیا اب بھی۔“

”ابھی تو تیرے اس لمبے چوڑے شجرہ نسب والے
کفگیر نے نیچے گلی میں کسی کو مضروب کر دیا ہے، اس کا کیا
ہوگا؟“ حارث نے اسے گھور کر ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کسی نے
باہر سے زور زور سے دروازہ بھانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی
کفگیر پھینکے والے کا شجرہ نسب بھی کھٹکلا جانے لگا۔

”ابے او کفگیر کی اولاد سنبھلا نہیں تھا تو اتنا بڑا رکھنے کی
کیا ضرورت تھی؟ جو ہاتھ سے پھسل گیا۔“ کوئی باہر حلق پھاڑ
کے چلا رہا تھا۔ حارث پریشان ہو گیا۔ قصور ان کا ہی تھا، وہ
کیا کر سکتا تھا۔ باہر دروازہ دھڑ دھڑانے کے ساتھ مسلسل
آواز دی جا رہی تھی۔

”ابے او... میری بیوی کا سر کھول دیا تو نے میری
زوجہ کو کچھ ہو گیا تو دو بھروالوں کا تجھ سے۔“

”صاحب جی! آپ پریشان نہ ہوں میں جا کر دیکھتا
ہوں۔ دو بھروائے گا مجھے کئی پانی کی بالٹیاں ہیں یہاں ہم
ایک کو ترسے ہوئے ہیں۔“ متنا بھائی نے کہا، آستین
چڑھائیں اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھولا تو ایک مخمنی شے لڑکتی ہوئی متنا بھائی
کے اسپرنگ جیسے وجود سے ٹکرائی اور اسی طرح لڑکتی ہوئی
واپس سڑک پر جا پڑی۔ سامنے کچھ لوگ جنازہ جھکی شے
کے گرد کھڑے فاتحہ پڑھتے محسوس ہوئے۔ وہ کوئی عورت تھی
جس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور متنا بھائی کا کفگیر اس کے
قریب پڑا نظر آ رہا تھا۔ لڑکتی ہوئی مخمنی شے دوبارہ ابھی تو

اس کی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ فلم کا پورا منظر نہ دیکھ پایا تھا کہ
اچانک غلاب توقع سنیل نے اس پر حملہ کر دیا اور مدثر قتل
کیس کا اہم ثبوت لے اڑا۔

حارث نے اندازہ لگایا کہ یقیناً مدثر کے قتل میں کلکیل
کے ساتھ سنیل بھی شامل رہا ہوگا مگر دوسرے لمحے وہ یہ خیال
اپنے ذہن سے جھٹک دیتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سنیل کو بھلا
مدثر کے قتل کی وڈیو بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ منظر میں وہ
ابھی صرف مدثر کو ہی دیکھ پایا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سنیل
اگر اس قتل میں شامل نہ تھا تو بھی یہ طے تھا کہ سنیل ایک طرح
سے مدثر کے قتل کا ایک یحییٰ گواہ ضرور تھا۔ حارث کی نظر میں
یہ معاملہ اب سنسنی خیز اور سمجیر ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے بڑھ کر
پُر اسراریت میں ایک لمحے کو یہ کیس سلجھتا ہوا محسوس ہوتا تو
دوسری طرف الجھنے ہی لگتا تھا۔

حارث کو اب جلد از جلد سنیل کو گرفت میں لینا تھا۔
حارث کی نظر میں سنیل کی گرفتاری میں ہی مدثر کے قتل کا
راز چھپا تھا چنانچہ سنیل کی تلاش کے سلسلے میں حارث نے
پہلا کام یہ کیا کہ اس کے گھر کے قریب خفیہ مقام پر دروسادہ
وردی والے پولیس اہلکار متعین کر دیے۔ جیسے ہی سنیل اپنے
گھر کا رخ کرتا، وہ اسے فوراً دھڑکتے سین اسی طرح حارث
نے غزالہ کے گھر کی بھی خفیہ نگرانی کے لیے تیمور کو تعینات
کر دیا۔ اب حارث کو یقین تھا کہ سنیل اس کی رہائش گاہ کا
بھی رخ کر سکتا تھا۔

یہ سارے انتظامات کرنے کے بعد وہ اب غزالہ
سے ایک اور ملاقات کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے وہ اپنے
اپارٹمنٹ پہنچا اسے سخت بھوک لگی تھی۔ موٹا خانساں متنا
بھائی ایم بی بی ایف اس وقت ایک بڑا سا کفگیر ہاتھ میں
تھامے کچن کی کھڑکی کے سامنے والے اپارٹمنٹ کی کھڑکی
میں کھڑی ایک صحت مند سانوئی سلونی پڑوسن کو گھورنے میں
مصروف تھا۔

وہ پڑوسن کچن کی گری یا پھر متنا بھائی ایم بی بی ایف کی
نظروں کی گری سے پسینے میں جھکی ہوئی تھی اور کانٹھا واری
طرز کی کس کر بندھی ہوئی ساڑی میں اس کا صحت مند بھرا
بھرا سلونا وجود متنا بھائی ایم بی بی ایف کو بے اختیار گنگنانے
پر مجبور کر رہا تھا۔ بالآخر متنا بھائی کے حلق سے ہل جیسی
ڈگر اہٹ بلند ہوئی اور وہ کسی فلم کا ایک گیت گنگنانے لگا۔

تو چیز بڑی ہے مست مست
تو چیز بڑی ہے مست مست
”ابے او مینے بھر کے راشن۔“ حارث نے کچن کے

سنگ و ن

”تو پھر کھانا بھی بند۔“ متا بھائی نے بھی اعلان کر ڈالا۔

”تیرا جیل گھاٹ میں تہا دلہ کرنے والا ہوں میں۔“ حارث نے بانسا پھینکا اور متا بھائی کے غبارے سے ساری ہوا نکل گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جیل گھاٹ میں نوکری کرنے والے اس جیسے باورچی کی وہاں کیا درگت بنتی تھی۔ وہ گھگھیا کر بولا۔ ”یہ... ظلم مت کرنا صاحب جی مجھے منظور ہے آپ کی بات۔“

”ہرگز نہیں، تو بہت منہ چڑھا ہو گیا ہے، بہت برداشت کر لیے میں نے تیرے خڑے۔“

”صاحب جی، آپ نے میرا نمک کھایا ہے۔“

”کیا...؟“ حارث نے اسے گھورا۔

”مم... میرا مطلب ہے میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔“ متا بھائی یکدم گڑبڑا کر بولا۔

”اب گولی کھا۔“ حارث نے گہرے تنگ کی طرح کہا اور اپنا سرکاری پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ متا بھائی بھاگ کر مچن میں جا گھسا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ حارث کو ہنسی آگئی مگر دوسرے ہی لمحے وہ دھاڑ کے بولا۔

”نورا کھانا لگا مجھے سخت بھوک لگی ہے ایک ضروری کام سے مجھے جلدی جانا ہے۔“

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد کھانا کھا کے حارث اپنی جیب میں روانہ ہو چکا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد اس کی جیب غزالہ کے گھر کے سامنے رکی۔ ایک گاڑی وہاں کھڑا تھا۔ حارث اس پار دروی میں آیا تھا۔ وہ جیب سے اتر آیا تھا کہ اچانک ٹکٹ کھلا اور لمبی سی سفید کار برآمد ہوئی۔ یہ نئے ماڈل کی فیٹ تھی اندر صرف ایک شخص براجمان تھا اور وہی کارڈ رائیو کمرہ تھا۔ اس کا چہرہ لمبوتر اور کلین شیو تھا، چہرے پر سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ حارث نے عقابانی نظروں سے اس کی عمر کا اندازہ پینتالیس پچاس کے درمیان لگایا۔ وہ کار گیٹ سے برآمد ہونے کے بعد آگے نکل گئی۔ حارث نے اس شخص کے بارے میں سوچا کہ یہ غزالہ کا باپ عادل ترمذی ہو سکتا ہے مگر گاڑی سے نکلنے کے بعد اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

”غزالہ بی بی تو اندر نہیں ہیں مگر ان کے والد سیٹھ صاحب اندر موجود ہیں لیکن وہ اس وقت کسی سے مل نہیں سکتے۔“ گاڑی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ شاید صاحب کی اندر موجودگی کے باعث وہ اب سرد مہری پر اتر آیا تھا اگرچہ اسپیکر حارث کو سیٹھ عادل سے نہیں ملنا تھا بہ صورت دیگر وہ

متا بھائی نے دیکھا، وہ ایک پتلے ہار جیسا دبلہ شخص تھا۔ قد بھی گھٹا سا تھا، بہت ہی غصے میں نظر آ رہا تھا۔

وہ دوبارہ تیزی کے ساتھ متا بھائی کی طرف بڑھا۔ اس بار اس نے متا بھائی کے ہلٹے وجود سے ٹکرانے سے مکمل پرہیز کیا تھا۔ مہادا پھر اسے فٹ بال کی طرح سڑک پر نہ لڑھکتا پڑ جائے۔ اس نے شعلہ بار نظروں سے متا بھائی کو گھورا پھر آستین چڑھا کے باریک آواز میں بولا۔

”کفگیر تو نے اوپر سے پھینکا تھا؟“

”ہٹ پرے۔“ متا بھائی نے جھڑکا۔ مختصر الوجود شخص تھوڑا لڑھکا۔ متا بھائی بڑے آرام سے آگے بڑھے۔ سڑک پر سے کفگیر اٹھایا، بڑے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرا اور دعا سیے لہجے میں بولا۔

”شکر ہے خدا کا ٹیڑھا نہیں ہوا۔“

”ٹیڑھا تو میں تجھے کر دوں گا۔“ منحنی سا آدی طیش سے بولا۔ ”تجھے اپنے دو ٹکے کے کفگیر کی پڑی ہے ایک انسان کے بھیجے کی پروا نہیں۔“

”میرا کفگیر انسانوں کے بھیجے تلنے کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔“ متا بھائی نے بڑے آرام سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

”میں تجھے دیکھ لوں گا، بہت اکر تا ہے تو ایک بولیس افسر کا باورچی ہو کر۔“ منحنی شخص نے آنکھیں اور آستینیں چڑھا کر کہا۔

”آجادیکھ لے مجھے اچھی طرح سے۔“ متا بھائی کسی بدست کی طرح اس کی جانب گھوما، کفگیر اس کے ہاتھ میں تھا۔ منحنی وجود والے نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا پھر بولا۔

”دیکھ لیا۔“

”اب جاتا ہے یہاں سے یا بھونک مار کر رخصت کروں؟“ متا بھائی نے یہ کہہ کر ایک لمبی سانس کھینچی تو اس کے دونوں کال غبارے کی طرح پھول گئے۔ منحنی سے وجود والا شخص ڈر کے اس سے دور کھڑا ہو کر بے بسی سے اپنے دانت کچکچائے لگا۔

اس اثنا میں اندر سے اسپیکر حارث نمودار ہوا، اس نے ڈانٹ کر متا بھائی کو اندر جانے کا حکم دیا پھر اس منحنی سے وجود والے شخص سے معذرت کی اور اسے اچھی خاصی رقم دے کر زخمی بیوی سمیت ایک رشتے میں رخصت کر دیا۔ اندر آ کر حارث نے متا بھائی سے صاف لہجے میں کہا۔

”تیرے دو ماہ کی تنخواہ کٹ گئی اس طرح سے۔“

اس گاڑی کی اگڑوں نکال سکتا تھا تاہم اس نے پوچھا۔
 ”کیا بتا سکتے ہو غزالہ بی بی اس وقت کہاں گئی ہوئی
 ہیں اور کب تک لوٹیں گی؟“
 ”کچھ نہیں کہا جاسکتا، وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔“
 گاڑی نے بدستور سرد مہر سے جواب دیا۔

انسپکٹر حارث پلٹا اور اپنی جیب میں سوار ہو کر
 اسٹیزنگ کو پکڑے چند ثانیے کچھ سوچتا رہا پھر جیب اسٹارٹ
 کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ وہاں سے سیدھا ہیڈ کوارٹر پہنچا تو
 اسے معلوم ہوا کہ کوئی خاتون اس سے ملنا چاہتی ہیں۔ اس
 اطلاع پر وہ چونکا اور یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ اس سے
 ملاقات کے لیے آنے والی خاتون غزالہ کے سوا اور کوئی نہیں
 ہو سکتی... بہر طور اس نے اس خاتون کو اندر بھیجنے کا حکم دیا۔
 آنے والی غزالہ نہیں تھی۔ وہ اس سے زیادہ پُرکشش
 تھی مگر اپنے لباس اور وضع قطع سے ایک اوسط درجے کے
 گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ حارث
 بہ فور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کچھ... آزرہ بھی دکھائی
 دے رہی تھی۔

”جی محترمہ... تشریف رکھیں۔“ حارث نے اپنے
 سامنے دالی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ لڑکی سلام اور
 شکریہ کہنے کے بعد کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی اداس آنکھوں
 کے گرد حلقے ابھر آئے تھے۔ وہ جانے کتنی دیر روتی رہی
 تھی۔

”جی محترمہ... آپ کا نام؟ مزید یہ کہ میں آپ کی کیا
 خدمت کر سکتا ہوں؟“ حارث نے بدستور خوش اخلاقی کا
 مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس کے آنے کا مقصد بھی
 دریافت کیا۔

لڑکی نے جب ہولے سے کہنا شروع کیا تو اس کا گلا
 قدرے رندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے نام سے بات کا آغاز
 کیا اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”میرا نام ستارہ ہے اور میں صرف یہ پوچھنے یہاں
 آئی ہوں کہ کیا مدثر کے قاتل کا سراغ لگ سکا؟“ اس کی
 بات پر حارث چونک گیا۔ وہ ایک بار پھر اپنی بھویں
 سیکڑے اس کے چہرے کا بہ فور جائزہ لینے کے دوران
 جواب دینے کے بجائے مستفسر ہوا۔

”مقتول مدثر کی آپ کیا لگتی ہیں؟“

حارث کے سوال نے شاید ستارہ نامی دل نواز لڑکی کا
 کوئی زخم ہرا کر دیا تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں کی اداسی کا
 کرب سوا ہوتا محسوس ہونے لگا پھر رنجیدہ لہجے میں ہولے

سے اپنا سر جھکائے بولی۔
 ”میرا مدثر سے گہرا قلبی تعلق تھا۔“
 یہ جواب سن کر حارث بیگ نے تصدیق طلب انداز
 میں پوچھا۔ ”گویا آپ اس سے... میرا مطلب ہے مقتول
 مدثر سے محبت کرتی تھیں؟“
 ”جی ہاں۔“

”کیا وہ بھی آپ سے محبت کرتا تھا؟“
 ”جی ہاں، ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔“
 ستارہ نے دھکی اور حسرت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

انسپکٹر حارث اس کے جواب پر بری طرح چکرا گیا۔
 کیس سلجھتے سلجھتے مزید الجھ گیا تھا کیونکہ حارث کی مستند
 معلومات کے مطابق غزالہ مقتول مدثر سے محبت کرتی تھی اور
 مقتول مدثر بھی غزالہ سے محبت کرتا تھا جبکہ اب یہ ستارہ نامی
 لڑکی بھی مدثر سے محبت کی دعویٰ کرتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ
 بات بھی پورے یقین سے کہہ رہی تھی کہ مقتول مدثر بھی اس
 سے محبت کرتا تھا۔

اس نے مزید تسلی کی خاطر پوچھا۔ ”کیا مدثر سے آپ
 کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں؟“

”ظاہر ہم دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے
 تھے اس لیے ملتے رہتے تھے بلکہ شادی بھی کرنے والے
 تھے۔“ ستارہ نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا، وہ
 اب روہانسی ہو رہی تھی۔

انسپکٹر حارث کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ
 مقتول مدثر سے محبت کرنے کی بیک وقت دو دعویٰ ار کہاں
 سے پیدا ہو گئیں مگر کچھ ذہن لڑانے کے بعد اسے ستارہ پر
 شبہ ہوا کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ مدثر سے اصل محبت کی
 دعویٰ غزالہ ہی تھی جس کی تصدیق ان دونوں کے کلاس فیلوز
 کر چکے تھے۔ ان میں اشوک کمار کا بیان سرفہرست تھا پھر
 شکیل نے بھی کہا تھا کہ غزالہ واقعی مدثر سے محبت کرتی تھی۔
 شکیل کا خیال ذہن میں آتے ہی حارث کے ذہن میں روشنی
 کا ایک جھماکا ہوا گرفتاری کے بعد دوران تفتیش حارث کو
 یاد تھا کہ شکیل نے مقتول مدثر سے اپنے ذاتی جھگڑے یا
 چھٹلش کی اہم وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ یعنی مدثر، غزالہ کے ساتھ
 قہرٹ یعنی محبت کے نام پر اسے دھوکا دے رہا تھا یعنی شکیل
 کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ مدثر درحقیقت غزالہ سے نہیں کسی
 اور لڑکی سے محبت کرتا تھا تو کیا وہ دوسری لڑکی یہی ستارہ ہی
 تھی۔ جواب اس کے سامنے نہیں نکلیں صورت بنائے بیٹھی اپنے
 محبوب کے قاتل کی گرفتاری کے بارے میں استفسار کر رہی

تھی۔

انسپکٹر حارث چند ٹائیے ہونٹ بھیجنے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "ستارہ صاحبہ، کیا آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ..."

"انسپکٹر صاحب! آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" معاً ستارہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

حارث بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "مقتول مدثر کے قتل کے شیعے میں، میں نے شکیل احمد خان اور سنیل سکسینا نامی دو افراد کو گرفتار کیا تھا مگر ابھی تفتیش جاری ہے۔"

"قاتل کی جلد از جلد گرفتاری سے متعلق کوئی امید ہے؟"

"ہاں... کافی حد تک ہم پر امید ہیں۔ مدثر کے اصل قاتلوں تک جلد پہنچ جائیں گے۔"

"قاتلوں...؟" وہ الجھی سی مٹی اور وضاحت طلب لگا ہوں سے حارث کی طرف دیکھنے لگی۔

حارث اس کے سوالیہ انداز اور سوالیہ لگا ہوں کا مطلب سمجھ کر بولا۔ "ہاں ستارہ بی بی، شواہد و حالات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مدثر کے قتل میں شاید ایک سے زائد افراد ملوث ہیں۔"

"کیا مدثر کی خطرناک لوگوں کے ساتھ پہلے سے کوئی دشمنی چل رہی تھی اور یہ اسی دشمنی کا شاخسانہ ہے؟"

"ابھی تک یہ بات ظاہر نہیں ہوئی ہے تاہم آپ اپنا پتا وغیرہ بتا دیں تاکہ جیسے ہی مدثر کے اصل قاتلوں کو گرفتار کر لیا جائے تو آپ کو مطلع کیا جاسکے۔" انسپکٹر حارث نے دانستہ ایسا کہا تھا مگر ستارہ نے اپنے گھر کا پتا نہیں بتایا البتہ اس پر انجیوٹ کمپنی کا نام ضرور بتا دیا جہاں وہ ایک معمولی پوسٹ پر نوکری کرتی تھی۔

"آپ کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے ابھی تھوڑی دیر پہلے؟" ستارہ نے اسے یاد دلایا۔

حارث ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ مقتول مدثر کا چکر آپ کے علاوہ کسی اور لڑکی کے ساتھ بھی چل رہا تھا جو اس کی کلاس فیلو تھی اور اس کا نام غزالہ ہے؟"

حارث کی کھوجی نظروں نے فوراً اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرتے محسوس کیا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ جانتی ہے مگر ستارہ نے

دھیرے سے نفی میں جواب دیا۔

"نہیں، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی مگر مجھے مدثر کی محبت پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ مجھے کبھی بھی دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔"

"یہ آپ کا خیال ہے مگر بعض چشم دید گواہوں کے مطابق..."

"میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا انسپکٹر صاحب۔ میں اب آپ سے اس امید کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ آپ بہت جلد مجھے مدثر کے اصل قاتلوں کی گرفتاری سے متعلق خوش خبری سنائیں گے۔" ستارہ نے اس کی بات کاٹ کر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر حارث نے اس کے چہرے پر سپاٹ سی نظریں مرکوز کرتے ہوئے اپنے سر کو دھیرے سے اٹھائی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ ستارہ کے رخصت ہونے کے بعد وہ خاصی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ ایک نئے کردار کی آمد پر وہ خاصا الجھ گیا تھا۔

اچانک فون کی کھنٹی بجی۔ اس نے فوراً ریسیور اٹھا کر کان سے لگا یا اور ہیلو کہا۔

دوسری جانب سے اس کے اسسٹنٹ تیمور کی پرجوش آواز ابھری۔ "سر! سنیل کو میں نے ٹریس کر لیا ہے۔"

"گڈ۔" حارث نے بے اختیار توصیفی لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "تفصیل بتاؤ؟"

"سر وہ اس وقت سیٹھ عادل ترمذی کی کونٹری کے گیٹ کے اندر داخل ہو رہا ہے اور خاصا عجلت میں ہے۔"

"گڈ! تم وہیں چوکس کھڑے رہو اور بدستور اس پر نظر رکھنا، میں بھی وہاں پہنچتا ہوں۔"

"جیسا آپ کا حکم سر۔" تیمور نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ حارث نے رابطہ منقطع کر دیا۔ ریسیور کریڈل پر بچی اور تیزی کے ساتھ اپنی کیپ سنبھالنا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جیب کو تیز رفتاری سے دوڑائے جا رہا تھا۔ اس کا رخ گاندھی گارڈن کی طرف تھا۔ جہاں سیٹھ عادل ترمذی (غزالہ) کی رہائش گاہ تھی۔ جیب میں اس وقت اس کے ہمراہ پانچ پولیس مین بھی موجود تھے۔ جب وہ گاندھی گارڈن پہنچا تو اسے اپنی جیب کے وائرلیس پر تیمور کی کال موصول ہوئی۔

"سر! سنیل گیٹ سے برآمد ہو رہا ہے، کیا میں اسے پکڑ

دیا لہذا اس کے پیچھے تیمور اپنی بھاری ہائیک دوڑاتا ہوا
نسبتاً تنگ سی کمرشل اسٹریٹ میں جا گھسا۔ ہیوی ہائیک کی
زوردار گڑگڑاہٹ سے پوری مصروف نگلی میں جیسے بمبوچال
آ گیا۔

سنیل نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ اس نے مڑ کے
عقب میں دیکھا اور غصے سے دانت چیں لیے۔

اس نے ایکسپریٹ گھمایا اور اپنی دہلی پھٹکی ہائیک کو
ایک وہیل پر دوڑاتا ہوا سڑک پر لے آیا۔ ٹھیک اسی
وقت انسپکٹر حارث کی جیب بھی اس کے سر پر آن پہنچی۔
سنیل نے ہینڈل گھما کر اپنی ہائیک موڑنے کی کوشش کرنی
چاہی مگر عقب سے دندناتی ہوئی تیمور کی ہیوی ہائیک نے
اس کی دہلی پٹی اسمارٹ ہائیک کو ٹکڑ ماری۔ سنیل کو
زبردست جھٹکا لگا اور وہ فضا میں اڑتا ہوا سیدھا انسپکٹر
حارث کی جیب کے یونٹ پر گرا۔ اس کے بعد باقی کام
تیزی کے ساتھ انجام پایا۔

جیب میں سوار پانچوں سپاہی بجلی کی سی تیزی کے
ساتھ اترے اور سنیل کو چند لمحوں میں کس دیا۔ انسپکٹر حارث
نے خوشی سے اپنے ہونہار اسسٹنٹ تیمور کی پیچھے تھپتھپائی اور
توصیفی لہجے میں بولا۔

”شاہاش! اس طرح بہادری دکھایا کرو۔ تمہاری ٹکر
سے سنیل بے بس ہو کر گر پڑا تھا ورنہ بھاگ چکا ہوتا۔ تمہیں
ٹھکے سے جرأت مندی پر انعام دلوادوں گا۔“

جواباً تیمور سر کھاتے ہوئے بولا۔ ”ضرور سر! اس
انعام کی رقم سے میں سب سے پہلے اپنی پرانی ہائیک کے
بریک ٹھیک کروادوں گا۔“

”دھت تیرے کی۔۔۔ سارا عزم کر کر کر دیا۔“ انسپکٹر
حارث ہولے سے بڑبڑاتا ہوا اپنی جیب کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

سنیل کو لاک اپ کرنے کے بعد حارث نے کچھ
سکون کا سانس لیا۔ اب وہ بڑے آرام سے سنیل سے بہت
کچھ اگلا سکتا تھا چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہ سنیل کو اپنے کمرے
میں بلانے والا تھا۔ اس سے پہلے وہ چند ضروری نوعیت کے
کام نمٹانے لگا۔

اس دوران میں ایک ماتحت نے بتایا کہ آج ٹھیک کی
ملاقات آئی تھی۔ حارث کی ہدایت تھی کہ ٹھیک سے جو بھی
ملاقات کے لیے آئے اس کے بارے میں اسے ضرور آگاہ
کیا جائے۔

ماتحت سپاہی نے بتایا کہ غزالہ نای ایک لڑکی ملزم

لوں؟ اور! ”
”ہرگز نہیں، تم محض اس کا تعاقب کرو اور ساتھ ساتھ
مجھے بھی بتاتے چلو اپنی کوٹھین کہ تم کس راستے پر اس کا۔
تعاقب جاری رکھے ہوئے ہو، سمجھ گئے؟ اور!“

”جی سر، میں سمجھ گیا۔ اور!“
”او کے اب تم اپنا دائرہ ایس مسلسل آن رکھو گے،
اور۔“

”ٹھیک ہے سر۔ اب میں اس کے تعاقب میں روانہ
ہو رہا ہوں۔ اور۔“

”گڈ! اب مجھے بتاتے چلو کہاں سے کس طرف
جار ہے ہو تم؟ اور۔“

”سر! گاندھی گارڈن کے آخری بڑے پلازا کو کراس
کرنے والا ہوں، اور۔“

”او کے۔“ حارث نے کہا اور جیب کو فوراً ایک
شارٹ کٹ راستے پر ڈال دیا۔

☆☆☆

تیمور اپنی جنگ عظیم کے دور کی ڈبل سائٹس سرکاری
ہائیک پر تھا جبکہ بقول اس کے سنیل بھی ایک ہائیک پر سوار
تھا۔ انسپکٹر حارث نے ہل ہل کا حساب نکالا۔

ایک آخری شارٹ کٹ مارا اور گاندھی گارڈن کے
آخری پلازا... کے مصروف چوراہے پر آ گیا جو بڑا چوک
کہلاتا تھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ سامنے سے ہی سنیل
ایک تیز رفتاری ہائیک پر آتا دکھائی دیا۔

پولیس کی جیب کو بچ چوراہے پر ٹکڑا دیکھ کر وہ پہلے تو
بری طرح بوکھلا گیا مگر پھر فوراً سمجھنے ہوئے اس نے دائیں
جانب ہائیک کو موڑ دیا۔ جیب سائرن بجاتی اس کے تعاقب
میں دوڑی۔

سنیل کے عقب میں تیمور اپنی ہائیک پر تیزی سے
چلا آ رہا تھا۔ بھاری بھر کم ہائیک پر اس کا سختی سا وجود یوں
معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک موٹے تازہ تیل پر کوئی بندر اس کے
سینگ پکڑے بیٹھا ہو۔ بہر حال تعاقب جاری تھا۔

سنیل کی ہائیک آگے تھی۔ حارث کی جیب اس کے
تعاقب میں اور سب سے آخری میں تیمور نے ہائیک جیسی
آسان سواری کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بجائے
کھلی سڑک پر دوڑانے کے نسبتاً تنگ اور کمرشل اسٹریٹ پر
اپنی ہائیک موڑ دی۔ حارث اس کی چال سمجھ گیا۔ اس نے
جیب دوسری جانب گھمادی اور دائرہ ایس کے ذریعے تیمور کو
سنیل کی ہائیک کے پیچھے بدستور تعاقب جاری رکھنے کا حکم

سکتے ہیں

”اس کیسٹ میں ساحل سمندر پر موجود چند جڑوں کے قابل اعتراض مناظر تھے۔“
 ”ایسے نہیں مانو گے تم؟“ حارث غصے سے پہنکارا۔
 ٹھیک اسی وقت ایک اردلی نے آکر بتایا کہ کوئی جوگندر پال نامی شخص اس سے ملنے کے لیے آیا ہے۔
 ”ابھی میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا، اس سے کواقتدار کرے میرا۔“

”سرورہ کہہ رہا ہے کہ میں نے تمہارے صاحب سے اسی وقت...“

”سٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔“ حارث نے اردلی کو غصے سے ڈانٹ دیا۔ وہ فوراً لے پاؤں باہر چلا گیا۔
 حارث چند قدم چلتا ہوا سیٹیل کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا اور غصے سے ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

”شرافت کے ساتھ وہ کیسٹ میرے حوالے کر دو ورنہ مجھے پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کرنا آتا ہے۔“

جواباً سیٹیل اسی اطمینان سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا آپ کون سی کیسٹ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔“ یہ سن کر حارث آپے سے باہر ہونے ہی لگا تھا کہ اچانک فون کی کھنٹی بجی۔ یہ اس کے پرسنل فون کی کھنٹی تھی، اس نمبر پر اعلیٰ افسران بہ وقت خاص اس سے رابطہ کرتے تھے۔ وہ عام نمبر کے فون کی کھنٹی کو خاطر میں نہ لاتا اور اپنا غبار سیٹیل پر ضرور نکالتا اب مجبوراً اسے غصہ پینا پڑا اور وہ سیٹیل کو گھورتا ہوا اپنی میز کی طرف بڑھا۔ ریسیور اٹھایا اور بولا۔

”ہیلو“

”انسپکٹر حارث، کرائم برانچ؟“ دوسری جانب سے گنجیہرا استغھامیہ آواز ابھری۔

”یس سر۔“ حارث نے مؤدبانہ کہا۔ وہ شاید اپنے اعلیٰ افسر کی آواز پہچان نہ سکا تھا۔

”جوگندر پال نامی ایک شخص تم سے ملنے آیا ہے۔ اس سے ابھی اور فوراً ملاقات کرو۔ تم نے کسی سیٹیل سکینر نامی شخص کو لاک اپ کر رکھا ہے۔ یہ اسی شخص کی ضمانت لے کر آیا ہے۔“ اعلیٰ افسر نے کہا اور حارث کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

حارث جانتا تھا اس طرح کہہ کر دوسری طرف سے فوراً رابطہ منقطع کرنے کا مطلب حکم کی بے پروی کرنا ہی تھا۔ وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اپنے ہونٹ بھیج کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا پھر بیل دے کر اردلی کو اندر بلا یا۔ اور اسے باہر پھٹک کھڑے کسی جوگندر پال کو اندر

کھیل سے ملنے آئی تھی۔ ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ حارث پھر الجھ سا گیا۔ غزالہ کا جھکاؤ کھلیل کی طرف بڑھ رہا تھا مگر کیوں جبکہ وہ جانتی تھی کہ اسے اس کے محبوب کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ غزالہ یہ نہیں مانتی تھی کہ کھلیل اس کے محبوب مدثر کا قاتل ہو سکتا ہے۔

بہر حال حارث نے کچھ سوچ کر ایک گہری سانس لی پھر سیٹیل کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اب وہاں انسپکٹر حارث، سیٹیل اور اسٹنٹ تیور کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

سیٹیل کے دونوں ہاتھوں میں آٹھکڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور اسے کمرے کے وسط میں کھڑا کیا گیا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا وہاں پریشانی کا ڈرہ بھر شائبہ تک نہیں تھا۔ انسپکٹر حارث ہاتھ میں سیاہ رول پکڑے اپنی چیئر سے اٹھا اور سامنے آکر میز پر ٹک گیا۔

چند ثانیے کھڑے سپاٹ چہرہ لیے سیٹیل کو گھورتا رہا پھر ہولے ہولے اپنے رول کو دوسرے ہاتھ کی پھلی پر مارنے لگا پھر بولا۔ ”سیٹیل سکینر! میں نے تمہیں مقتول مدثر کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا اور پھر حکم کا فائدہ دیتے ہوئے تمہیں رہا بھی کر دیا تھا۔ اس کے بعد تمہیں قانون سے تعاون کرنا چاہیے تھا مگر اس روز تم نے میرے ساتھ جو حرکت، اس کے باعث تم نے ایک بار پھر خود کو قانون کی نظروں میں مشکوک بنالیا ہے۔“

حارث اتنا کہہ کر ڈرار کا ہی تھا کہ سیٹیل نے سپاٹ لیجے میں کہا۔ ”میں نے مدثر کا قتل نہیں کیا ہے۔“

”میں نے تم سے ابھی یہ نہیں پوچھا ہے۔“ حارث نے بہ دستور اسے گھورتے ہوئے درشت لیجے میں کہا۔ ”زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ تم جانتے ہو میں تم سے کیا پوچھتا چاہتا ہوں۔“ لحظہ بھر کے توقف کے بعد بالآخر حارث نے اس سے وہ اہم اور پہلا سوال کیا۔ ”وہ کیسٹ کہاں ہے؟“

”کون سی کیسٹ؟“ سیٹیل فوراً انجان بن گیا۔

حارث اس کی ڈھٹائی پر دانت تیس کر بولا۔ ”وہ کیسٹ جو تم کسی گتے کی طرح اپنے منہ میں دبا کر بھاگے تھے جس میں مدثر کے قتل کی تم نے پوری مووی ریکارڈ کر رکھی تھی؟“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ایسی مووی نہیں تھی۔“

سیٹیل نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

”تو پھر تم اسے گتے کی طرح اپنے منہ میں دبا کر

کیوں بھاگے تھے؟“

لانے کا حکم دیا۔
 تھوڑی دیر بعد جو شخص اندر داخل ہوا، اسے دیکھ کر
 حارث ذرا چونکا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس شخص کو پہلے بھی
 کہیں دیکھ چکا ہے مگر کہاں... یہ اسے سردست یاد نہیں آ رہا
 تھا۔
 ”میرا نام جوگندر پال ہے۔“ اس شخص نے
 کھرکھرائی آواز میں اپنا تعارف کروایا اور مصافحے کے
 لیے حارث کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ حارث نے شخص چھونے
 کے انداز میں اس سے مصافحہ کیا۔
 ”میں اس کی ضمانت لے کر آیا ہوں۔“ جوگندر پال
 نے سنیل کی طرف اشارہ کر کے کہا پھر کچھ کاغذات حارث
 کی طرف بڑھائے۔ حارث بے بسی سے تھلا کر رہ گیا۔
 اسے سنیل کو چھوڑنا پڑا۔
 اس کے جانے کے بعد حارث نے قریب کھڑے
 تیمور کو فوراً ان کے پیچھے جانے کا حکم دیا پھر خود پُرسوج انداز
 میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ آیا
 اس نے جوگندر پال کو کہاں اور کب دیکھا تھا۔
 ذہن پر خاصا زور دینے کے بعد اچانک اس کے اندر
 روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ جوگندر پال کو اس
 نے ایک نئے ماڈل کی سفید لیٹ کار میں سینٹھ عادل ترمذی
 کی کوئی سے ٹکلتے دیکھا تھا۔
 ”تو گویا یہ سینٹھ عادل ترمذی کا آدمی ہے۔“
 حارث کو گمگماتے انداز میں بڑبڑایا کہ اس نے سنیل کی
 ضمانت کس کے ایما پر کرائی تھی؟ کیا سینٹھ عادل ترمذی کے
 کہنے پر؟ یا پھر سنیل کا جوگندر پال سے کوئی اپنا ذاتی تعلق
 تھا؟ اور سینٹھ عادل کا سرے سے اس معاملے سے کوئی تعلق
 ہی نہیں ہو۔ ایسے ان گنت سوالات اس کے ذہن میں گزرتے
 ہونے لگے۔
 یہ بات بھی اس کے لیے ایک عرصے سے باعث
 الجھن بنی ہوئی تھی کہ آخر سنیل کیوں اکثر و بیشتر سینٹھ عادل
 کے ہاں جاتا رہتا تھا۔ کیا اس کا مقصد سینٹھ عادل سے
 ملاقات ہوتی تھی یا اس کی بیٹی غزالہ سے ملنا؟
 مدثر سر ڈر گیس اسے پُراسرار انداز میں الجھتا ہوا
 محسوس ہونے لگا تھا۔ معاً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔
 اس نے قریب کھڑے تیمور سے تمکسانہ کہا کہ ملزم شکیل کو
 پیش کرے۔
 ذرا دیر بعد شکیل اس کے سامنے تھا۔ حارث نے اس
 بار اس کے ساتھ نرم رویہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول مدثر کی کسی اور لڑکی
 سے بھی دوستی تھی۔“
 ”جی ہاں میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ وہ
 غزالہ کو دھوکا دے رہا تھا اور میں یہی بات غزالہ کو سمجھانا
 چاہتا تھا مگر وہ اسے خیریت قرار دے کر شاکسانہ سمجھتی تھی پھر میں
 نے مدثر کو بھیجی۔“
 ”اس لڑکی کا نام بتا سکتے ہو؟“ حارث نے اس کی
 بات کاٹ کر کہا۔
 ”ستارہ نام تھا اس کا۔“ شکیل نے بتایا۔ یہ سن کر
 حارث کو صاف محسوس ہونے لگا کہ شکیل بے گناہ ہے۔
 اگرچہ وہ قتل سے چند منٹ پہلے مدثر سے ملا ضرور تھا مگر قتل کی
 درودات کسی اور نے کی تھی کیونکہ شکیل کی یہ بات بہر حال
 درست ثابت ہوئی تھی کہ مقتول مدثر، ستارہ کو بھی چاہتا تھا اور
 غزالہ سے فطرت کر رہا تھا مگر کیوں؟
 ”ستارہ نامی وہ لڑکی یہاں آئی تھی۔“ حارث نے
 شکیل کو بتایا۔ ”وہ بے چین تھی کہ مدثر کے قاتل کا اب تک
 کیوں نہیں سراغ لگا یا جاسکا۔ میں نے تمہارے بارے میں
 اسے بتایا تھا مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔“ بالآخر حارث کو
 شکیل کے سامنے سچی بات کہنا پڑی۔
 شکیل بھی ستارہ کے آنے کے ذکر پر قدرے چونکا،
 وہ بولا۔ ”اسپیکٹر صاحب! اب تو آپ کو کافی حد تک یقین
 ہو جانا چاہیے تھا کہ میرا مقصد مدثر کو صرف سمجھانا تھا۔ قتل کرنا
 نہیں میں کبھی انتہائی قدم اٹھانے کا۔۔۔ سوچ بھی نہیں سکتا۔
 میں غزالہ سے سچی محبت کرتا ہوں اگر مدثر کو غزالہ چاہتی تھی
 تو میں ایسا ہرگز نہیں کہ غزالہ یا مدثر کا جانی دشمن بن جاتا
 بلکہ اگر مدثر واقعی غزالہ سے سچی محبت کرتا ہوتا تو میں خود ہی
 خاموشی سے دونوں کے راستے سے ہٹ جاتا لیکن مجھے قلق
 اس بات کا تھا کہ وہ غزالہ کو محبت کے نام پر دھوکا دے رہا
 تھا۔“
 ”کیوں...؟ وہ غزالہ کو دھوکا کیوں دے رہا تھا؟“
 حارث نے بے چینی سے پوچھا۔
 ”میں نہیں جانتا کہ ایسا کرنے میں اس کا کیا مقصد
 تھا۔“ شکیل نے تذبذب سے لہجہ میں کہا۔
 ”ایک بات بتاؤ مجھے شکیل، تمہارے خیال میں مدثر
 کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟ کسی پر شبہ ہے تمہیں؟“
 ”یہی میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اسپیکٹر صاحب کہ
 مدثر کا معاملہ کم از کم میری نظر میں اس قدر سنگین تو نہیں تھا کہ
 اس بے چارے کو قتل ہی کر دیا جاتا۔ یہ معاملہ کچھ اور ہی لگتا

تھا۔ ایک بات پر مجھے اس پر شبہ ہوا تھا مگر سنبیل کو گرفتار کرنے کے فوراً بعد ایک جوگندر پال نامی شخص نے اس کی ضمانت کر دالی تھی۔ جوگندر پال آپ کے والد سیٹھ عادل ترنڈی کے ہاں آتا جاتا دیکھا گیا ہے اور یقیناً آپ جوگندر پال کو بھی جانتی ہوں گی۔ میرا خیال ہے اتنی باتوں کے باوجود آپ جھوٹ نہیں بول سکتیں۔“ حارث اتنا کہہ کر خاموش ہوا اور جانچتی ہوئی نظریں... غزالہ کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ غزالہ کچھ پریشان اور ہراساں سی نظر آنے لگی۔ سنبیل کے چہرے پر بھی الجھن آمیز تاثرات ابھر آئے تھے۔

”ان ساری باتوں کے تناظر میں مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ... کچھ بلکہ بہت کچھ چھپا رہی ہیں۔“ انسپکٹر حارث نے پہلو بدل کر گویا اپنی بات مکمل کرنا چاہی تھی، اس کا لہجہ از حد سنجیدہ تھا۔

”مس غزالہ مجھے اب ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ آپ قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں لیکن جانے کیوں آپ اس کا نام ظاہر کرنے سے کتر رہی ہیں۔ ممکن ہے قاتل نے آپ کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دے کر آپ کو اب تک خاموش رہنے پر مجبور کر رکھا ہو یا پھر...“ اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ اسی دقت تیمور کی کال موصول ہوئی۔ کال اینڈ کرنے کے بعد حارث کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور سنبیل اور غزالہ کو وہیں حیران و پریشان چھوڑ کر باہر نکلا اور اپنی جیب میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

تیمور نے کال کر کے حارث کو فوراً کالی گھاٹ پہنچنے کا کہا تھا۔ حارث وہاں پہنچا تو اسے بے چینی کے ساتھ اپنا منظر پایا۔

”سر میں نے دونوں کا تعاقب کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سنبیل ایک چوراہے پر اتر گیا تھا اور جوگندر پال آگے بڑھ گیا تھا۔ وہاں سے سنبیل ایک رکشے میں بیٹھ کر یہاں پہنچا اور سامنے والے گھر میں داخل ہوا ہے۔“ تیمور نے تفصیل بتائی۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ حارث نے کہا پھر دونوں اس گھر کی طرف بڑھے۔ حارث نے سرکاری ہسپتال نکال لیا اور دروازے پر زوردار لات رسید کر دی۔ دروازہ ٹوٹ کر گرا۔

اس دقت سنبیل باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ بری طرح ٹھکا گرد و سرے لے کر اترتا ہوا غصیلے لہجے میں بولا۔

”سنبیل نے جواب دیا۔

معا اردولی اندر داخل ہوا اور منو دبانہ بولا۔ ”سر کوئی غزالہ نامی خاتون آپ سے ملنے آئی ہے۔“ غزالہ کے نام پر انسپکٹر حارث بلکہ سنبیل بھی چونکا تھا۔ حارث نے ایک نظر سنبیل پر ڈالی لہجہ بھر کچھ سوچا پھر اردولی کو سر کی جنبش سے اٹھائی جواب دیا۔

غزالہ اندر داخل ہوئی۔ سنبیل اور غزالہ کی سب سے پہلے آنکھیں چار ہوئیں۔ سنبیل کو ہتھکڑیوں میں جکڑا دیکھ کر اس کے چہرے کا کرب اور آنکھوں میں اتری ہوئی ندامت و شرمندگی مزید گہری ہونے لگی جبکہ سنبیل کی آنکھوں میں حسرت تیر رہی تھی۔

”بیٹھیں غزالہ صاحبہ۔“ حارث نے اس سے کہا۔ وہ آگے بڑھی اور حارث کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی پھر ایک دکھ بھری نگاہ سنبیل پر ڈال کر حارث سے مخاطب ہوئی۔

”انسپکٹر صاحب ایسے بے گناہ ہے۔ اسے چھوڑ دیجیے۔ کیا میں اس کی ضمانت دے سکتی ہوں... پلیز؟“ اس کے کرب سے کپکپاتے لہجے میں دکھ بھری التجا تھی۔

حارث نے کہا۔ ”میں پہلے آپ سے کچھ ضروری سوالات کرنا چاہوں گا۔ میں دوسری بار آپ کی رہائش گاہ پر بھی گیا تھا مگر آپ نہیں ملی تھیں۔“

”جی پوچھیے۔“ غزالہ یہ کہہ کر ذرا سنبیل کر بیٹھ گئی۔ حارث نے سوال کیا۔ ”سنبیل کو تو آپ جانتی ہیں اچھی طرح۔“

”جی۔“ اور جہاں تک میرے علم میں یہ بات ہے کہ آپ کو اس روئے زمین پر جس شخص سے شدید نفرت ہے، وہ یہی شخص ہے؟“

”جی ہاں، وہ ہے ہی قاتل نفرین آدی۔“ غزالہ نے یہ بتاتے ہوئے نفرت سے اپنے ہونٹ سیڑ لے۔

”تو پھر وہ آپ سے اکثر ملنے کیوں آتا ہے؟“ حارث نے جیسے دھماکا کیا۔

غزالہ بری طرح چونک پڑی، اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”کب... کیا... کس... سنبیل مجھ سے ملنے آتا ہے؟“

”جی ہاں، غزالہ صاحبہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے دوسری بار جب وہ آپ کی رہائش گاہ سے نکل رہا تھا تو ہم نے اس کا تعاقب کر کے اسے گرفتار بھی کر لیا

”یہ پولیس کر دی نہیں چلے گی اسپیکٹر۔ میں ضمانت پر رہا ہو چکا ہوں۔“

حادثہ..... غصے سے دانت پیس کر خون رنگ لہجے میں بولا۔ ”تیرے جیسے بد معاشوں کے ساتھ پولیس گردی ہی ہونی چاہیے۔“ کہتے ہوئے حادثہ نے تیمور کو مخصوص اشارہ کیا۔ تیمور نے آگے بڑھ کر سنیل پر گن تان کر اسے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ اسپیکٹر حادثہ کا انداز سونی صد درست ثابت ہوا۔ سنیل کے سنے خفیہ ٹھکانے پر تھوڑی سی تلاشی کے بعد وہ مطلوبہ کیسٹ اس کے ہاتھ لگ گئی۔ اس نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔

☆☆☆

ہیڈ کوارٹر... پہنچ کر اس نے کیسٹ چلا کے دیکھی اور اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ سنیل کو وہ ایک بار پھر ہتھکڑی لگا کے لاک اپ کر چکا تھا۔

سنیل کے قبضے سے برآمد ہونے والی کیسٹ دیکھنے کے بعد اسپیکٹر حادثہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ مدثر کا قاتل ایک ایسا شخص بھی ہو سکتا تھا جو اکثر اس کی نظروں کے سامنے ہی رہتا تھا چنانچہ اسپیکٹر حادثہ بیگ نے سنیل کو جکڑی ہوئی حالت میں یہ کیسٹ چلا کر دکھا دی تاکہ اب وہ اگلی پچھلی ساری تفصیل بلا کم و کاست پولیس کے سامنے بیان کر دے۔

سنیل بہر حال مدثر کا قاتل تھا نہ ہی اس جرم کا شریک کار تھا مگر اس کا جرم کچھ اور نوعیت کا تھا جس کی تفصیل وہ دھیرے دھیرے بیان کرنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

سنیل نے پہلے ٹھکیل اور مدثر کو آپس میں لڑا دیا اور یوں کسی حد تک وہ اپنی سازش میں کامیاب رہا لیکن جلد ہی اسے یہ احساس ہونے لگا کہ غزالہ اور مدثر کی دوستی سے ٹھکیل کے خارج ہونے کے بعد غزالہ اور مدثر کی دوستی رفتہ رفتہ محبت میں بدل رہی تھی تو سنیل نے غزالہ کا دل بھی مدثر سے خراب کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

سنیل ایک بلیک میلر بھی تھا، ساحل سمندر کے کنارے اٹھکیلیاں کرتے بلیک میل کی وہ خفیہ مودی بناتا تھا پھر اس کے ذریعے انہیں بلیک میل کر کے پیسے بٹورتا تھا۔ درنہ دم کی دیتا تھا کہ یہ ویڈیو کلپ وہ سوشل ویب سائٹ پر چلا دے گا۔

بہر طور وہ مدثر کی ٹوہ میں رہنے لگا۔ اس اثنا میں ٹھکیل

اور مدثر کے درمیان اکثر کسی بات پر بحث و مباحثہ اور ہلکی پھلکی ہاتھ پائی بھی ہوتی رہتی تھی۔ ٹوہ لینے پر سنیل کو معلوم ہوا کہ ٹھکیل، مدثر پر غزالہ کو دھوکا، فریب، فکرت کرنے کا الزام لگایا کرتا تھا۔ سنیل نے جب باقاعدہ اس سلسلے میں ٹوہ لگائی تو اس نے بالآخر کھوج لگالیا کہ ٹھکیل کا مدثر پر غزالہ کو محبت کے نام پر دھوکا دینے کا الزام غلط نہ تھا۔ یہ درست تھا کہ مدثر کی دوستی ستارہ ٹائی لڑکی سے تھی جو ایک معمولی نوکری کرتی تھی۔ مدثر درحقیقت اس سے محبت کرتا تھا۔

اب سنیل کے ہاتھ ترپ کا پتا لگ چکا تھا۔ اس نے کئی ایسے مقامات پر مدثر اور ستارہ کی خفیہ ملاقاتوں کی اپنے مودی کیمرے کے ذریعے عکس بندی کر لی جسے غزالہ کو دکھا کر وہ بڑی آسانی سے اس کو مدثر سے متنفر کر سکتا تھا اور یہی ہوا۔

اس نے مودی اور اسٹل فوٹو گراف غزالہ کو دکھا دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ مدثر درحقیقت غزالہ کو محبت کے جال میں پھانس کر اس سے شادی کے بعد اس کی ساری دولت و جائیداد اپنے نام کروانے کے بعد غزالہ سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑا کر ستارہ سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ وہ دونوں بڑے سکون و چین سے زندگی گزار سکیں۔

یہ سب جاننے اور دیکھنے کے بعد غزالہ کو مدثر سے اس قدر نفرت ہوئی کہ وہ اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ سنیل نے... مودی سے اسٹل فوٹو بنا کر غزالہ کو دے دی تھیں کہ ثبوت کے طور پر وہ مدثر کا اصل چہرہ بے نقاب کر سکے۔

ایک موقع پر جب دونوں ساؤتھ سی کے مقام پر پہنچے تو غزالہ نے مدثر کو آڑے ہاتھوں لیا اور سخت برا بھلا کہا مگر مدثر اس کی بات ماننے کو پھر بھی تیار نہیں تھا اور اسے ٹھکیل کی سازش قرار دینے لگا مگر جب غزالہ نے سنیل سے حاصل کردہ ستارہ اور مدثر کی وہ تصاویر اسے دکھائیں تو مدثر کا چہرہ فق ہو گیا۔ جرم اس کی آنکھوں اور چہرے سے ظاہر تھا۔ اس دوران میں سنیل بھی جو اکثر ان دونوں کی ٹوہ میں آخری تماشا دیکھنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی ڈرامے کا ڈرامہ سین دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ یوں بھی اس کا اصل دھندا یہی تھا۔

گیلے پتھروں کے عقب سے وہ حسب معمول دونوں کی تلخ کلائی کی مودی بنانے میں مصروف تھا۔ ادھر مدثر اور غزالہ کی تلخ کلائی عروج پر پہنچ چکی تھی جب مدثر نے دیکھا

سنگ زن

اور سنیل کو بلیک میلنگ کے جرم میں جیل میں ڈال دیا۔ سیٹھ عادل اور اس کی بیٹی تک یہ حقیقت پہنچی تو دونوں باپ بیٹی خوف زدہ ہو گئے۔

حادثے نے اتنی رعایت ضرور برتی کہ قانونی تقاضا پورا کرتے ہوئے غزالہ پر عام سا چارج لگا کے اسے گرفتار کر لیا جبکہ اس کے باپ سیٹھ عادل کو کچھ قانونی گائیڈنس فراہم کر دیں۔

سیٹھ عادل نے اسپیکٹر حادثہ کا تہ ول سے شکریہ ادا کرتے ہوئے فوراً عمل کیا اور کسی اچھے وکیل کی خدمات حاصل کر کے اپنی بیٹی کا کیس لڑا اور بدست اسے ضمانت پر رہا کر دیا۔

☆☆☆

”سوری نکلیں، میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ نکلیں نے ہولے سے کہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”غزالہ کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ تم بہت پہلے مجھ پر بھروسہ کر لیتیں؟“

”ہاں نکلیں... مجھے اس بات کا قلق رہے گا ساری عمر۔ بھروسہ کرنے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے، وہ ہاتھ سے نکل جائے تو پھر اعتبار کرنے کا کیا فائدہ؟ تم نے میری خاطر بہت تکلیفیں اٹھائیں۔“

”تمہاری خاطر نہیں... تمہاری محبت کی خاطر۔“ نکلیں نے محبت پاش نظروں اور دل کی گہرائیوں سے غزالہ کی ندامت بھری مگر دلکش آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ دونوں اس وقت ساؤتھ سی کے اسی لونگ اسپاٹ پر موجود تھے اور ڈوبتے سورج کا دلفریب نظارہ کر رہے تھے۔

”غزالہ ادیہ تمہاری بات صحیح ہے لیکن بھروسے کے ساتھ احساس شامل ہو جائے تو گزرے وقت کا زیاں رائگاں نہیں جاتا جس کا ثبوت ہم دونوں کی یہاں موجودگی ہے۔“ اس کی بات غزالہ کے ندامت بھرے چہرے پر نقش بن کے پھوٹی۔ ”غزالہ کیا ہم کل اس وقت یہاں دوبارہ آ سکتے ہیں؟“

غزالہ کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ ابھری اور اس نے نگاہیں جھکا کر ہولے سے پوچھا۔ ”محبت کے ساتھ؟“

”نہیں بھروسے کے ساتھ۔“ نکلیں نے کہا۔ غزالہ نے دھیرے سے اپنے سر کو شائقی جنبش دے دی۔

کہ غزالہ اس کا اصل چہرہ دیکھ چکی ہے تو نا کای اور احساس شکست نے اسے شیطان بنا ڈالا۔ اس نے غزالہ کے ساتھ دست درازی شروع کر دی۔

غزالہ اس کا ایک اور بھیاںک روپ دیکھ کر بیک وقت خوف اور غرور کا شکار ہو گئی پھر ایک موقع پر غزالہ کے ہاتھوں ایک بڑا سا کیلا پتھر آن لگا اور وہ اس نے بڑے زور سے مدثر کے سر پر دے مارا۔ ضرب شدید ثابت ہوئی، مدثر موقع پر ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

غزالہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ سنیل اس سارے سنسنی خیز منظر کی فلم اپنے کمرے سے بنا چکا تھا۔ بعد میں اس نے غزالہ کو یہ فلم دکھا کر اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا اور اس سے اکثر ایک بڑی رقم ہتھیانے لگا۔

اس نے غزالہ کو یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ وہ اس فلم کی کیسٹ پولیس کے حوالے کر دے گا اور پولیس اسے یعنی غزالہ کو مدثر کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لے گی۔

غزالہ کو یہ بات اپنے باپ سیٹھ عادل ترڈی کو بتانا پڑی۔ اس نے سنیل سے ڈیل کرنا چاہی کہ وہ یہ کیسٹ ایک تخلیق رقم کے عوض اس کے حوالے کرے اس کی بیٹی کو بلیک میل کرنے کا یہ سارا کھیل ختم کر دے مگر مکار سیل سونے کا انڈا اپنے والی مرغی کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ویسے بھی ایک بڑی رقم اس سے ہتھیاتا رہتا تھا۔ اسے یہ سودا منظور نہ تھا۔

سیٹھ عادل نے اپنے آدمی جو گندہ پال کے ذریعے سنیل کو موت کے گھاٹ اتارنے کی بھی کوشش کرنا چاہی تھی مگر سنیل بھی بڑا کانیاں تھا، کیسٹ وہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا تھا اور یہ بات وہ بھی جانتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ جب سنیل دوسری بار گرفتار ہوا تو سیٹھ عادل کو ہی اپنے آدمی جو گندہ پال کے ذریعے ضمانت پر فوراً رہا کر دانا پڑا۔ کہ کہیں پولیس سنیل سے اس کیسٹ کے بارے میں نہ اگوالے۔

حادثے نے سوچا کہ اب مدثر کے قتل میں غزالہ کس حد تک قصور دار تھی کیونکہ انصاف کی رو سے دیکھا جاتا تو غزالہ نے اپنے تحفظ اپنی عزت بچانے کے لیے ہی مدافعتی قدم اٹھایا تھا۔ کسی باقاعدہ ہتھیار سے یا سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اس نے مدثر کا قتل بہر حال نہیں کیا تھا جبکہ متوکل مدثر اپنا مجرم خود تھا۔

بہر حال حادثے نے سب سے پہلے تو نکلیں کو رہا کر دیا

شرفروش

سليم ساروق

کھیل میں شمولیت کے بعد ہر فرد صرف کھلاڑی رہتا ہے... اس وقت کوئی رشتہ... بندھن اور ناتا مد نظر نہیں رہتا... سوانے حریف کے... فراڈ اور جعل سازی کے فن میں یکتائی رکھنے والے کھلاڑیوں کا سنسنی خیز ٹکرائو... ایک پانسے کے بعد دوسرا پانسا... اور پھر تیسرا... ٹاٹس کے پتوں کی طرح بٹے ہوئے ذہنوں میں صرف جیت کا نشہ سوار تھا... کسی ایک کے حصے میں فتح تھی اور باقی مات کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے... اچانک ہی ایک کھیل کے بعد دوسرا خونی کھیل شروع ہو گیا... تمام شہ سوار یکا یک فرش نشیں ہوتے چلے گئے... اور فرش نشیں کے حصے میں مسند نشینی کا منصب تفویض ہو گیا۔

لحمہ بلحمہ رنگ بدلتا سرورق..... ہر موڑ پر ایک نئی کہانی منتظر تھی

”خرم صاحب!“ ارشد نے کہا۔ ”کیا آپ کے پاس جوکر کی ٹریل آگئی ہے؟“
ارشد ہمارے ساتھ پہلی دفعہ کھیل رہا تھا۔ میں اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ارشد صاحب! اگر آپ کو میرے پتے دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شوکر الیں۔“

جواب میں ارشد مسکرایا اور چال کی رقم دگنی کر دی۔ ایک چال حنیف نے بھی چل دی۔

کھیل بہت لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے کھیل ختم کرنے کے لیے چال کی رقم مزید دگنی کر دی۔ بورڈ چھوٹے بڑے ٹوٹوں سے بھر گیا تھا۔

ارشد نے گھور کر مجھے دیکھا اور بورڈ پر ٹوٹ پھینک دیے۔ گویا اس نے ایک چال اور چل دی۔

حنیف نے جھنجھلا کر اپنے پتے پھینک دیے۔

میں نے پھر ایک چال چل دی۔

اس مرتبہ ارشد بھی جھنجھلا گیا اور اس نے مطلوبہ رقم

بورڈ پر رقم بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کھیلنے والے تین آدمی میدان چھوڑ چکے تھے لیکن ارشد اور حنیف اب تک ڈٹے ہوئے تھے۔ پتے میں نے بانٹے تھے اس لیے مجھے معلوم تھا کہ ارشد کے پاس چھوٹی سی ایک ٹریل ہے اور حنیف کے پاس راؤنڈ۔ میرے پاس بیگم کی ٹریل بھی اور وہ پتے ان دونوں سے بہر حال بڑے تھے۔

میں نے باقاعدہ شارپنگ سیکھی تھی اور میں اپنے فن میں اتنا ماہر تھا کہ دوسروں کو اپنی مرضی کے پتے بانٹ سکتا تھا۔

ارشد نے غور سے میرے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے مایوسی ہوئی ہوگی۔ میں ایسے موقع پر اپنا چہرہ بالکل ساٹ رکھتا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر کچھ ٹوٹ ٹیبل پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”ایک اور چال۔“

حنیف نے الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔ وہ کسٹم میں افسر تھا اور دونوں ہاتھوں سے حرام کھاتا تھا۔ اس نے بھی ایک چال چل دی۔ میں نے اس کے جواب میں ایک چال اور چل دی۔



بورڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”شو کریں خرم صاحب۔“

میں نے ہنستے ہوئے اس کے سامنے اپنے پتے پھینکے اور بورڈ پر پڑی ہوئی رقم سمیٹنے لگا۔

”اتنی جلدی مت کریں خرم صاحب۔“ ارشد نے طنزیہ لہجے میں کہا اور اپنے پتے میرے سامنے پھینک دیے۔ بادشاہ کی ٹریل میرا منہ چڑا رہی تھی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ کیسے ہو گیا؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ میں نے تو ارشد کو چھوٹے پتے دیے تھے۔ کیا مجھ سے بانٹنے میں غلطی ہو گئی تھی؟ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے ایسی رک پھٹی تھی۔

ارشد بہت مسرور انداز میں تمام نوٹ سمیٹ کر اپنے سامنے رکھ رہا تھا۔ وہ نوٹ سمیٹتے ہوئے بولا۔ ”پارانوٹوں کے بجائے جیس ہونا چاہئیں۔ اب اتنے نوٹ...“

سمجھتے تھے۔ بہت کم لوگ اس بات سے واقف تھے کہ جینی کا

اکے سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ محض پارٹنر تھے۔ جینی تاش کی نئی گڈی لے آئی۔ پتے بانٹنے کی باری ارشد کی تھی۔ اس لیے اس نے گڈی کھولی اور اس میں سے تاش نکال کر انہیں اتنی مہارت سے پھینکا کہ میں بھی اس کے کراٹھا۔ وہ بھی شاید شار پر تھا۔ میں بہت توجہ سے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پتے بانٹے اور کھیل شروع ہو گیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر دیکھے بغیر سیل فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو۔“

”خرم! میں جینی بول رہی ہوں... نہیں، میرا نام مت لینا۔ تم کسی بہانے سے باہر آؤ، تمہیں ایک ضروری بات بتانا ہے۔“

”ایسی کیا بات ہے کہ...“

”پلیز، بحث مت کرو۔“ جینی نے کہا۔

”یہ کوئی باقاعدہ کیسینو نہیں ہے۔“ میں نے سرزد لہجے میں کہا۔ ”ہم چند دوست ہفتے کی رات کو یہاں مل بیٹھتے ہیں۔“ اسی وقت جینی جائے لے آئی، میں نے اس سے کہا۔ ”جینی! تاش کی ایک نئی گڈی بھجوا دینا۔“ وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ وہ اکرم کا اسٹیک بار اور ریٹورنٹ تھا۔ وہ اکی کے نام سے مشہور تھا۔ جرائم پیشہ شخص تھا اور اپنے جرائم اور دو نمبر وینڈوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے کلفٹن کے پوش علاقے میں یہ ریٹورنٹ کھول لیا تھا۔ اس سے بھی اسے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اکی کو میں نے قتل کے ایک کیس سے بچایا تھا، ویسے بھی اس کی مدد کرتا رہتا تھا اس لیے وہ میرا احسان مند تھا۔

ریٹورنٹ کے اوپر ایک پورشن میں اکی خود رہتا تھا اور دوسرا پورشن اس نے جوئے کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ وہاں اعلیٰ سول و پولیس کے افسران، بزنس مین اور اسی قسم کے لوگ آتے تھے۔

جینی، اکی کی پارٹنر تھی لیکن لوگ اسے اکی کی بیوی

میں نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون جیب میں رکھا اور سگریٹ سلا کر بولا۔ ”میں ذرا واش روم تک جا رہا ہوں۔“ اپنے پتے احتیاط سے رکھنے کے بعد میں اٹھ گیا۔

جینی دوسرے کمرے میں بے چینی سے میری منتظر تھی۔ وہ چھتیس سیستیس سال کی پختہ عورت تھی لیکن چہرہ اور جسم اب تک پُرکشش تھا۔ وہ چہرے سے پچیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس نے اس وقت بھی اسکن ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

”ہاں بولو جینی، ایسی کیا ایرجنسی ہو گئی؟“

”میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے خرم کہ ارشد سے ہوشیار رہنا۔ مجھے ابھی ابھی اکی نے بتایا ہے کہ وہ جھگڑے۔“

”جھگڑے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں، اکی نے اس سے کیلشن طے کیا ہے۔ جیتی ہوئی رقم کا چالیس فیصد اکی لے گا۔“

”مائی ڈیئر جینی!“ میں نے فس کر کہا۔ ”تم یہ بات مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“

”میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے، تم جانتے تو ہو کہ۔۔۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

میں جانتا تھا کہ اب جینی مجھ سے مشق بکھارتا شروع کر دے گی۔ وہ ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ میں اس کی ان حرکتوں سے اتنا ہی چڑتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو ڈیئر اب میں محتاط رہوں گا۔“

”اور سنو، پلیز یہاں کوئی ہنگامہ مت کرنا ورنہ۔۔۔“

”تم فکر مت کرو، میں اسے ریٹورنٹ سے باہر لے جا کر ماروں گا۔“

میں واپس اپنی سیٹ پر آ گیا اور پتے اٹھا لیے۔ میرے پاس زیادہ اچھے پتے نہیں تھے۔ دو بادشاہ اور ایک وکی تھی۔ اس کے باوجود میں نے چہرے سے مایوسی ظاہر نہیں کی اور مسکرا کے ایک چال چل دی۔

دوسرے لوگوں نے ایک ایک کر کے اپنے پتے پھینک دیے۔

حنیف نے کہا۔ ”میرے لیے آج کا دن ہی خراب ہے۔“

اس کے برعکس ارشد نے چال و گنی کر دی۔ میں نے جھنجھلا کر بورڈ پر رقم سمیٹ لی اور ارشد سے کہا۔ ”شو۔“

ارشد نے فاتحانہ انداز میں سہتے پھیٹے اور بورڈ پر پھیلی ہوئی رقم سمیٹنے لگا۔

”ایک منٹ۔“ میں نے سرو لہجے میں کہا اور جھپٹ کر گڈی اٹھالی۔

”گڈی واپس رکھ دیں خرم صاحب۔“ ارشد نے ناگواری سے کیا۔

میں اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پتے گنتا رہا۔ گڈی میں سے صرف چھ پتے باہر تھے۔ اب جو کہ سمیت اس میں سینتالیس پتے ہونا چاہیے تھے۔ اس میں تینتالیس ہی پتے تھے۔

میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”ارشد صاحب امیرا خیال ہے کہ تاش کی ایک گڈی میں چار بادشاہ ہوتے ہیں؟“ میں نے ارشد کو گھورا۔ ”پھر یہ پانچواں بادشاہ کہاں سے آیا؟“

”میں کیا جانوں؟“ ارشد نے شانے اچکائے۔

”اپنا کوٹ اتار دو۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”تم کون ہوتے ہو مجھے حکم دینے والے؟“ وہ بھی آپ سے تم پر آ گیا۔

ارد گرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنا کھیل چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

میں نے اچانک اٹھ کر ارشد کی ٹائی پکڑ لی اور اسے جھٹکا دے کر بولا۔ ”اپنا کوٹ اتار دو۔“

جینی نے مداخلت کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ میری نظریں ارشد کے ہاتھوں پر تھیں کہ وہ پتے فرش پر نہ گرا دے۔

میں نے اچانک خود ہی اس کا کوٹ اتار لیا۔ اس کی آستین میں سے دو پتے لکل کر فرش پر گر گئے۔ ارشد کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ میں نے اس کی ٹائی چھوڑ کر نہ صرف بورڈ پر پڑی ہوئی تمام رقم سمیٹ لی بلکہ ارشد کے سامنے لوٹوں کا جودھیر تھا، وہ بھی سمیٹ لیا اور سچ پالہجے میں بولا۔ ”یہاں اعلیٰ سوسائٹی کے معزز افراد اپنا دل بہلانے آتے ہیں۔ اس قسم کی بے ایمانی کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”خرم پلیز۔“ جینی نے کہا۔ ”اسے معاف کر دو۔“

”ایک شرط پر۔“ میں نے کہا۔ ”یہ آئندہ کبھی مجھے یہاں نظر نہ آئے۔“

”اتنی بے عزتی کے بعد تو میں خود بھی یہاں آنا پسند نہیں کروں گا۔“ ارشد نے آہستہ سے کہا۔

میں نے وہ سب رقم جینی کے حوالے کی اور کہا میں یہ رقم بعد میں تم سے لوں گا پھر میں گاڑی کی چابیاں اٹھا کر

شوق و ش

چکر اکر گرا تو میں نے دیکھا کہ اس پر حملہ کرنے والا اکی تھا۔
ارشاد کے کرتے ہی وہ میری طرف آیا اور بولا۔
”خرم اتم ٹھیک تو ہو؟“

میں نے اسے جواب دینا چاہا لیکن زبان بھی اکڑ کر رہ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہو۔
”کریم، رؤف۔“ اکی نے اپنے ملازموں کو آواز دی۔

”خرم صاحب کو اٹھا کر اندر لے چلو۔ میں اس منحوس کو لے کر اندر آتا ہوں۔“ اس نے ارشد کی طرف اشارہ کیا۔

وہ منحوس بے ہوش نہیں ہوا تھا بلکہ وقتی طور پر چکر اکر گر گیا تھا۔ اکی نے اچانک اپنی جیب سے بٹل نکال لیا اور بولا۔ ”اگر بھاگنے کی کوشش کی تو میں گولیاں تیرے سینے میں اتار دوں گا۔ تو نے خرم کے ساتھ کیا کیا ہے؟“
پھر مجھے اکی کے ملازمین اٹھا کر اندر لے جانے لگے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میری توانائی لوٹ رہی ہے اور میرے حواس بحال ہو رہے ہیں۔

میں نے ان لوگوں سے کہا۔ ”میں... اب ٹھیک ہوں، مجھے نیچے اتار دو۔“
ان لوگوں نے مجھے نیچے اتار دیا۔ اب میرے ہاتھ پیر پہلے کی طرح کام کر رہے تھے۔ میری توانائی بہت تیزی سے واپس آرہی تھی۔

”یہ معمولی سا ایک شعبہ تھا۔“ ارشد نے کہا۔ ”میں خرم صاحب کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا... اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ مجھے ضرور گولی مار دیتے۔“

اکی اسے لے کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں تھا۔ میں ایک فیمل پر جا کے بیٹھ گیا اور اکی سے گرما گرم کافی لانے کو کہا۔ پھر میں نے اکی سے کہا۔ ”اس شعبہ کے بازو کو میرے پاس بھیج دو۔ اس نے واقعی مجھے متاثر کر دیا تھا۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں نے اتنی بے بسی محسوس کی تھی۔“

ارشاد میرے پاس آ گیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور اس کے لیے بھی کافی منگوائی پھر میں ہنس کر بولا۔
”یار اتم تو بہت کام کے آدمی ہو۔ تم تو مجھے پیشہ ور شعبہ کے بازو لگتے ہو؟“

”میں پیشہ ور شعبہ کے بازو ہی ہوں۔“ ارشد نے کہا۔ ”میں ایک فائو اسٹار ہوٹل میں شعبہ کے بازی کے کمالات دکھایا کرتا تھا۔ ایک دن غلطی سے ہوٹل کے منیجر کی

باہر نکل گیا لیکن میں اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی آدمی سے زیادہ رقم اس کی جیبوں میں ہوگی۔

میں اسٹیک بار سے نکل کر ایک تاریک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ارشد اسٹیک بار کے دروازے سے نکل کر باہر کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے لپک کر اسے جالیا اور بولا۔ ”جانے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی تو تم سے مزید حساب بے باقی کرتا ہے۔“

”تم سب کچھ تو مجھ سے لے چکے ہو۔“ ارشد نے کچھ سرد لہجے میں کہا۔ ”اب مزید فری ہونے کی کوشش مت کرنا۔“

اس کی بات پر میری کھوپڑی ایک مرتبہ پھر الٹ گئی اور میں نے اس کی گردن دیوچ لی۔ اس نے اپنی گردن چمڑانے کے لیے میرے پیٹ میں کہنی مارنا چاہی لیکن میں نے پیچھے ہٹ کر اس کے جڑے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔

اچانک ایک فائر ہوا تو میں پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ میں نے ارشد کی ٹانگ گھسیٹ کر اسے بھی نیچے گر لیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تمہارے مزید ساتھی بھی یہاں موجود ہیں۔“ میں نے گزشت لہجے میں کہا اور اچانک اپنا ریو اور نکال لیا۔ ”تم کس کے لیے کام کرتے ہو اور تمہارے کتنے ساتھی یہاں ہیں؟“ میں نے ریو اور کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف کر دیا۔ ”جلدی بولو ورنہ میں تمہاری کھوپڑی آڑا دوں گا۔“

”مم... میرا کوئی... ساتھی نہیں ہے۔“ وہ بوکھلا کر بولا۔ ”یہ فائر کی آواز بھی میں نے ہی نکالی تھی۔“

”تم نے نکالی تھی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم مسلح بھی ہو۔“

”میں ایک شعبہ کے بازو ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اس قسم کے چند چٹکے ہر وقت میری جیب میں رہتے ہیں۔“

پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی ٹھنڈی پھواز میرے چہرے سے ٹکرائی ہو۔ اچانک میرا ذہن شل ہو کر رہ گیا۔ میں ہوش میں تھا، سب کچھ نظر آ رہا تھا لیکن ہاتھ پیر کام نہیں کر رہے تھے۔ میں اگر زمین پر پڑا ہوا نہ ہوتا تو اب تک زمین پر گر چکا ہوتا۔

ارشاد اطمینان سے پلٹا لیکن کسی نے اسے جکڑ لیا۔ پھر تباہ توڑ کئی گھولنے اس کے چہرے پر رسید کر دیے۔ ارشد

فاسطے پروردگار۔ میرا خاندان خاصاً معزز ہے۔ میرے بھائی اعلیٰ فوجی اور رسول عہدوں پر فائز ہیں۔ ڈیڈی انتہائی تعلیم یافتہ اور نفیس انسان ہیں۔ وہ ایک کالج میں پرنسپل تھے اور حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔

انہوں نے مجھے ارفورس میں بھیجنا چاہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ بڑے بھائی نے چاہا کہ میں آری جوائن کر لوں لیکن مجھے آرمی کی قید و بند کی زندگی پسند نہیں تھی۔ میں نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں ایم اے کیا تو ڈیڈی نے چاہا کہ میں کسی کالج میں لیچرار شپ کر لوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔

پھر گھر والوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ میں راتوں کو دیر تک گھر سے باہر رہتا۔ اس زمانے میں میری ملاقات آصف سے ہو گئی۔ وہ اسکول میں میرے ساتھ پڑھتا تھا پھر وہ لاہور چلا گیا اور وہیں سے ہاس کیونٹیکیشن میں ایم اے کرنے کے بعد ایک کثیر الاشاعت اخبار میں ملازمت کر لی۔ اس کو دیکھ کر مجھے بھی کرائم رپورٹنگ کا شوق پیدا ہوا۔ پھر آصف ہی نے مجھے کرائم رپورٹنگ سکھائی اور ایک چھوٹے اخبار میں ملازمت بھی دلادی۔

میں نے بہت محنت اور تندہی سے کام کیا تو ایک دوسرے اخبار نے مجھے وگنی تنخواہ کی پیشکش کی۔ میں نے وہ ملازمت قبول کر لی۔

اس وقت تک میں اپنا کام نہایت ایمان داری سے کرتا تھا۔ اب آصف سے بھی کم کم ملاقات ہوتی تھی کیونکہ وہ رپورٹنگ چھوڑ کر ڈسک پر کام کر رہا تھا۔ میرے پاس پرانی سی ایک موٹر سائیکل تھی۔

ایک دن پریس کلب میں آصف سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”خرم! تم ابھی تک اسی کھٹارا موٹر سائیکل سے کام چلا رہے ہو۔ تم دو سال سے کرائم رپورٹنگ کر رہے ہو۔ اب تک تو تمہارے پاس جدید ماڈل کی بہترین گاڑی ہونی چاہیے تھی۔“

”یار! میرا اخبار مجھے صرف اتنی ہی تنخواہ دیتا ہے کہ اس میں موٹر سائیکل کا خرچ بھی بہ مشکل پورا ہو سکے۔“

میری بات پر آصف نے مجھے حیرت سے دیکھا پھر بولا۔ ”تو کیا یہ بھی تمہیں بتاؤں کہ کرائم رپورٹرز پیسا کیسے کماتے ہیں؟“ پھر اس نے مجھے محل کر بتایا کہ تم لوگوں کی کمزوریاں پکڑو اور انہیں بلیک میل کرو۔ سال بھر میں کروڑ پتی ہو جاؤ گے۔

جیتنی گھڑی شعبہ کے دوران میرے ہاتھ سے ضائع ہو گئی۔ غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے کھڑے کھڑے مجھے ہوٹل سے نکال دیا۔“

”آج کل تم کیا کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بس کہیں داؤ لگتا ہے تو شارپنگ کر لیتا ہوں۔ یوں ایک آدھ مہینہ گزر جاتا ہے۔ میں نے بہت چھوٹی عمر سے شارپنگ سیکھ لی تھی۔“

”تم واقعی بہت اچھے شارپر ہو۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”تمہارا... پتہ پھینکنے کا انداز ہی متاثر کن ہے۔“

”ویسے خرم صاحب، آپ بھی کم نہیں ہیں۔ آپ اگر شارپنگ نہ کرتے تو مجھے بھی پتہ اپنی آستین میں چھپانے کی ضرورت نہ پڑتی۔“

”یار! تم تو بہت کام کے آدمی ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں تمہیں کہیں نہ کہیں کام دلوا دوں گا، بس مجھ سے رابطے میں رہنا۔“ میں نے اسے اپنا سیل نمبر دیا اور اس کا سیل نمبر لے لیا۔

وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ ”گھر وہ، میں نے تم سے ساری رقم چھین لی تھی، یہ کچھ پیسے رکھ لو۔“

میں نے جیب سے برس نکالا تو وہ ہنس کر بولا۔ ”خرم صاحب! آپ شاید بھول گئے کہ میں شعبہ کے باز ہوں اور شعبہ کے باز تو ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہی ہے۔ میں نے جیتی ہوئی رقم میں سے آدمی سے زیادہ اپنی جیبوں میں منتقل کر لی تھی۔“

”تم تو واقعی میں باکمال فنکار ہو۔“ میں نے ہنستے ہوئے اسے الوداع کیا۔

میں نے سوچا کہ جینی سے تم لے لوں، پھر خیال آیا کہ رات کے وقت اتنی رقم لے کر کیا کروں گا، کل دن میں دیکھوں گا۔“ یہ سوچ کر میں پارکنگ لائٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں ایک دوسرے درجے کے اخبار میں کرائم رپورٹر ہوں۔ میں کوئی نیک یا پارسانہ نہیں ہوں۔ دنیا کا ہر عیب مجھ میں ہے۔ میں جو اٹھتا ہوں، شراب پیتا ہوں، پویس اور اعلیٰ سول افسران کے ساتھ بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کو بلیک میل کرتا ہوں۔ ہاں، صرف ایک عیب نہیں ہے۔ میں عورتوں سے دور رہتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں حسن کو پسند نہیں کرتا۔ خوب صورت لڑکیوں سے میری دوستی بھی ہے۔ ان سے میں ہنسی مذاق بھی کرتا ہوں لیکن ایک

باہر نکال دیا اور بولا۔ ”کوئی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔ رشید صاحب نے خود کشی کر لی ہے۔ میں ایسبونس اور پولیس کے دوسرے عملے کو بلا رہا ہوں۔“ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور۔۔۔ فون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت اس کی پشت میری طرف تھی۔ رشید الدین صاحب کے بائیں ہاتھ میں ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔ میں نے آنکھ بچا کر وہ کاغذ نکال لیا۔ اس وقت مجھے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ جائے واردات سے کوئی بھی چیز اٹھانا جرم ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے اس طرح میرے اخبار کو کوئی خبر مل جائے۔ میں نے وہ کاغذ جیب میں رکھ لیا۔

”تم ابھی تک یہیں ہو؟“ ایس پی ورشت لہجے میں بولا۔ ”چلو لگو یہاں سے۔ اب تمہیں رشید صاحب سے ملاقات کے لیے اوپر جانا پڑے گا۔“

اس کے تھک آمیز رویے پر میری کھوپڑی بھی گھوم گئی۔ مجھے یاد تھا کہ گزشتہ ہفتے اس نے شراب کی ایک بھٹی پر چھاپا مارا تھا۔ وہ خبر میں نے ہی اخبار کو دی تھی۔

میں نے ہمت کر کہا۔ ”اپنا لہجہ درست کریں ایس پی صاحب! میں جانتا ہوں کہ شراب کی بھٹی پر چھاپے سے آپ کو کتنا فائدہ ہوا ہے۔“ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

”تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟“ وہ چونک کر بولا۔

”جتنا میں اس بارے میں جانتا ہوں، کوئی بھی کرائم رپورٹر نہیں جانتا۔“ میں مسلسل بلف کر رہا تھا۔

”دیکھو خرم! اگر تم کچھ جانتے بھی ہو تو اسے اپنی ذات تک محدود رکھو۔“ اس کے لہجے میں رعونت کے بجائے اب خوشامد تھی۔

میں مزید شیر ہو گیا۔ ”کیوں! اس سے مجھے یا میرے اخبار کا کیا فائدہ ہوگا؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اخبار کے فائدے کو چھوڑو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اپنے فائدے کی بات کرو۔“

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ ”چلو اپنا فائدہ ہی سہی۔“ اس مرتبہ میں نے آپ جناب کا تکلف بھی چھوڑ دیا۔

”تم بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟“ اس نے یوں پوچھا جیسے کوئی دکان دار سووے بازی کرتا ہے۔

اسی وقت ایسبونس اور دوسرا عملہ آ گیا۔

میں نے اس کی بات پر زیادہ دھیان نہ دیا اور اسی کھبازہ موٹر سائیکل پر گھومتا رہا۔

ایک دن میں نے شہر کے معروف بزنس مین رشید الدین سے ملاقات کا وقت لیا۔ وہ خاصے نیک نام آدمی تھے لیکن مجھے ان کے خلاف کچھ ایسی خبریں ملی تھیں جو انہیں جیل بھی پہنچا سکتی تھیں۔ میں ذاتی طور پر انہیں اچھا انسان سمجھتا تھا اس لیے مجھے ان خبروں پر یقین نہ آیا اور میں نے ذاتی طور پر ان سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو پولیس کا ایک راشی انسروہاں سے نکل رہا تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے خلاف کئی خبریں بھی لگا چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا اور وہ تھوک نکل کر بولا۔ ”خرم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کیا اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

وہ مجھ سے یوں بھی خار کھاتا تھا۔ اس وقت تک اس کی کوئی بڑی کمزوری... میرے ہاتھ میں نہیں تھی اس لیے وہ مجھ سے انتہائی توہین آمیز لہجے میں بات کرتا تھا۔ میں خود بھی دروی اور قانون کا احترام کرتا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں رشید الدین صاحب سے ملنے آیا ہوں۔“

”ان سے تمہیں کیا کام پڑ گیا؟“ اس نے پوچھا لیکن اب بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

”آپ اچھے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”میں پریشان تو نہیں ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”رشید صاحب اس وقت ایک میٹنگ میں مصروف ہیں۔“

”میں انتظار کر لوں گا۔“ میں نے کہا اور اندر کی طرف قدم بڑھایا۔

اچانک اندر سے فائر کی آواز سنائی دی تو میں چونک اٹھا۔ ایس پی تیزی سے اندر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اندر کا منظر خوش گووار ہرگز نہیں تھا۔ رشید الدین صاحب صوفے پر ایک طرف لڑھکے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں پستل تھا اور کن پٹی سے خون بہہ رہا تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے خود کشی کر لی ہے۔

ایس پی مزید بوکھلا گیا۔ فائر کی آواز سن کر گھر کے جو ملازم وہاں آئے تھے، ایس پی نے ان سب کو کمرے سے

ایس بی نے مجھ سے کہا۔ ”ایسا کرو غم! شام کو چھ بجے میرے آفس آ جاؤ۔“

”اگر تمہیں بات کرنا ہے تو میرے آفس آؤ۔“ میں نے کہا۔ اس کے دفتر جانے میں خطرہ تھا۔ ممکن ہے بات نہ بنے اور وہ براہم ہو کے مجھے حالات میں بند کر دے۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اس مرتبہ سرگوشی میں کہا کیونکہ متعلقہ پولیس اسٹیشن کا عملہ اندر آ گیا تھا۔ ”میں شام کو سات بجے تک تمہارے آفس آ جاؤں گا۔“ پھر وہ آنے والے پولیس اہلکاروں کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے بھی اپنے اخبار ٹیلی فون کر کے فوٹو گرافر کو بلا لیا۔

وہاں سے فارغ ہو کر میں پریس کلب چلا گیا۔ میں مسلسل بھی سوچ رہا تھا کہ ایس بی میری بات پر اتنا ڈر کیوں کیا تھا؟ شاید میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیرنٹا نے پر لگا تھا۔

پریس کلب پہنچ کر میں نے کافی منگوائی اور ایس بی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اچانک مجھے اس کاغذ کا خیال آیا جو میں نے رشید الدین کے ہاتھ سے لگا لیا تھا۔ وہ فل اسکیل کاغذ تھا۔ جسے کئی جیس کرنے کے بعد ہاتھ میں دبایا گیا تھا۔

میں نے اس کاغذ کی تحریر پڑھی تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ رشید الدین صاحب نے ان تمام جرائم کا اعتراف کیا تھا جن کے بارے میں مجھے شبہ تھا۔ آخر میں انہوں نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا تھا کہ ایس بی احسان نے ان جرائم کو چھپانے کے لیے مجھ سے پچاس لاکھ کا چیک لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سلسلہ رکے گا نہیں۔ بات میرے بیٹے تک پہنچی تو میں اسے کیا منہ دکھاؤں گا۔ وہ بھی تعلیم سے فارغ ہو کر آئندہ ماہ پاکستان لوٹنے والا ہے۔ پھر آج ایک پریس رپورٹر بھی مجھ سے ملنے کا وقت مانگ رہا تھا۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ بات پریس تک پہنچ گئی ہے۔ ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ میں اپنی جان خود لے رہا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس راشی پولیس افسر کو نہ چھوڑا جائے جس نے مجھ سے رشوت لی ہے۔

پچھے رشید الدین صاحب کے دستخط تھے۔ اس کے نیچے تاریخ اور وقت بھی لکھا ہوا تھا۔

وہ شاید ایس بی کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ ممکن ہے، وہ ایس بی بھی ان تمام غیر قانونی کاموں میں ان کا معاون ہو۔

شام کو ایس بی احسان واقعی میرے دفتر آ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پولیس کا کوئی افسر میرے پاس آیا تھا۔ میں

نے چائے منگوانا چاہی تو اس نے انکار کر دیا۔ ”وقت ضائع کرنے کے بجائے ڈائریکٹ بات کرو۔“ اس نے کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”پانچ لاکھ۔“ میں نے یہ سوچ کر کہا کہ اگر معاملہ اہم نہ ہوتا تو احسان ابھی بھر جائے گا۔

”پانچ لاکھ؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”اتنی رقم تو میرے پاس نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ اس سے کہیں زیادہ رقم آپ کے پاس موجود ہے۔“

ایس بی نے طویل سانس لی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں تمہیں پانچ لاکھ دوں گا۔“

”مجھے رقم کل صبح تک چاہیے، وہ بھی کیش۔“ ”مل جائے گی۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ میری زندگی کی پہلی بلیک میلنگ تھی جس سے میں راتوں رات لکھ پتی بن گیا تھا۔ میں نے احسان سے رشید الدین کے خط کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ چیک کیش کرالے تو میں اس سے بات کروں۔ رشید الدین صاحب نے اتنا بڑا چیک اس کے نام ہی سے دیا ہوگا اور اس قسم کا چیک اگر پیریز بھی ہو تو وصول کرنے والے کے قومی شناختی کارڈ کی کاپی بھی چیک کے ساتھ دینا پڑتی ہے۔

ایک ہفتے بعد میں نے ایس بی احسان سے دوبارہ رابطہ کیا اور اسے رشید الدین کے خط کے بارے میں بتایا۔ وہ بری طرح بوکھلا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”تم جانتے ہو غم و جائے واردات سے کوئی اہم ثبوت غائب کرنا بھی سنگین جرم ہے۔ میں اس کیس میں تمہیں جیل بھجوا سکتا ہوں۔“

”بھجوا دو۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”پھر رشید الدین صاحب کا وہ خط منظر عام پر آئے گا۔ تمہارے خلاف تحقیقات ہوں گی کہ تم نے پچاس لاکھ روپے ان سے کیوں لیے تھے۔ مجھے ان غیر قانونی سرگرمیوں کا کبھی علم ہے جن کی وجہ سے رشید الدین کو خودکشی کرنا پڑی۔ ایس بی صاحب! اس پورے کیس میں کلیدی کردار آپ کا ہے۔ آپ ہی نے رشید الدین کو وہ سب کرنے پر مجبور کیا تھا۔“ میں نے پھر اندھیرے میں تیر چلایا جو شاید نشانے پر بیٹھا کیونکہ احسان کے چہرے پر مردنی چھائی تھی۔ اس نے شکستہ لہجے اور مری مری آواز میں پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

میں نے فاتحانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”تم خود

شرف و ش

اس نے حال ہی میں گلشن اقبال میں ایک لکڑی نلیٹ خریدا ہے۔

یوں میں اس کے نلیٹ میں شفٹ ہو گیا اور اسے تسلی دی کہ جیسے ہی مجھے کوئی معقول مکان ملا، میں اس کا نلیٹ خالی کر دوں گا۔ نہ مجھے آج تک کوئی معقول مکان ملا تھا، نہ میں نے وہ نلیٹ خالی کیا تھا۔

☆☆☆

ارشاد سے رخصت ہو کر میں پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے محتاط انداز میں ارد گرد کا جائزہ لیا، پھر سیل فون کی ٹارچ روشن کر کے گاڑی کا جائزہ لیا اور ہر طرف سے مطمئن ہو کر میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے کرائم رپورٹنگ کے دوران میں اتنے دشمن بنا لیے تھے کہ مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا ورنہ اب تک تو میں کب کا کسی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا ہوتا۔

میں نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے باہر نکالی اور روانہ ہو گیا۔ رات کے اس پہر سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ میں ایف ٹی سی کے سامنے سے گزرتا ہوا سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف بڑھا اور شاہراہ قائدین پر آ گیا۔ آج تک مجھے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ کوئی لڑکی بری طرح چنچ رہی تھی۔ "ہیلپ... ہیلپ!"

میں نے بے اختیار بریک پیدل پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی ایک جھکے سے رک گئی۔

دوسرے ہی لمحے ہائیں جانب سے ایک لڑکی وحشت زدہ انداز میں دوڑتی ہوئی میری گاڑی کے سامنے آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے دو آدمی بھی تھے۔ ان میں سے ایک پختہ عمر اور گینڈے جیسے بدن کا آدمی تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا سر اس کے شانوں پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کے جسم پر سوٹ تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس نے زندگی میں پہلی دفعہ سوٹ پہنا ہے۔ دوسرا شخص جوان العمر اور ورازدہ تھا۔ اس نے جینز اور لیڈر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ دونوں شکل ہی سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔

ان دونوں نے انتہائی سبے رحمی سے لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کی گرفت سے پھسل کر میری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گئی اور بولی۔ "ہیلپ، مجھے ان بد معاشوں سے بچائیں۔"

"جا بھئی، تو اپنا کام کر۔" کوتاہ گردن بلنگی آواز میں بولا۔

"بکومت۔" میں دباؤ کر بولا۔ "تم اس لڑکی کے

بہت ذہین بلکہ شاطر ہو۔ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کیا چاہتا ہوں؟" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "فوری طور پر تو میں ان پچاس لاکھ میں اپنا حصہ چاہتا ہوں جو تم نے رشید الدین سے وصول کیے ہیں۔"

"کتنا حصہ؟" احسان نے چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو نشوونما سے خشک کرتے ہوئے پوچھا۔ "اور یہ فوری طور کا کیا مطلب ہے؟"

"مسٹر ایس پی! مجھے اس رقم میں سے نفٹی پرسنٹ چاہیے۔"

"دہاٹ؟" ایس پی بھتا کر بولا۔

"اس وقت ہم فائیو اسٹار ہوٹل کے ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اپنی آواز نیچی رکھیں۔ یہ پبلک پلس ہے، تھانہ نہیں ہے۔ نفٹی پرسنٹ منظور نہیں تو میں چلا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہاں، ایک بات ذہن میں رکھنا۔ یہ خط اور دیگر تمام ثبوت میرے وکیل کے پاس موجود ہیں۔ میری موت کی صورت میں وہ تمام ثبوت میڈیا اور انتظامیہ کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ میری موت سے تمہیں فائدے کے بجائے نقصان ہوگا، اس لیے مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

"بیٹھے جاؤ، خرم!" ایس پی نے ٹکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں نفٹی پرسنٹ دوں گا۔"

"اور وہ جو تم نے کھیلے کیے ہیں، ان میں بھی میرا حصہ نکالنا ہوگا۔"

یوں میں آہستہ آہستہ بلیک میلنگ کی راہ پر چل نکلا۔ میں بھی ایسی خبروں کی تلاش میں رہنے لگا جو پولیس اور رسول افسران کی کمزوری بن سکیں۔

میری ان سرگرمیوں کی بہتک ڈیڈی کے کان میں پڑی تو انہوں نے مجھ پر شدید لعن طعن کی اور بہت دیر تک سمجھاتے رہے لیکن میں نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی۔

انہوں نے تنگ آ کر مجھے گھر سے نکال دیا اور چنچ کر بولے۔ "خرم! آج کے بعد میرے گھر میں قدم بھی مت رکھنا۔ میرے لیے تو حرام کھانا ہے، جو ابھی کھیلنا ہے اور شراب بھی پیتا ہے۔" ان کے لہجے میں نفرت تھی۔ میں نے غصے میں آ کر اسی وقت گھر چھوڑ دیا اور فوری طور پر ایک ہوٹل میں منتقل ہو گیا۔

میں نے ایک راشی افسر سے رابطہ کیا اور اس سے کہا۔ "مجھے فوری طور پر ایک گھر چاہیے۔" میں جانتا تھا کہ

حسک پر تھی۔ ہمارے نزدیک سے کئی گاڑیاں گزری تھیں لیکن کسی نے بھی رکنے کی جرات نہیں کی تھی۔ شہر کے حالات ہی ایسے تھے لیکن ایسی بھی کیا بے حسی؟

ان کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں نے ان دونوں کو اٹھا کر گاڑی میں ٹھونسا اور اینجن سے چابی نکالنے کے بعد لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ”تم کون ہو اور اتنی رات گئے کہاں جا رہی تھیں یا پھر یہ لوگ تمہیں گھر سے اغوا کر کے لائے ہیں؟“

”میں کالج کے فنکشن سے واپس آرہی تھی۔ دایسی میں میری گاڑی خراب ہو گئی۔ میں ٹیکسی کی تلاش میں کھڑی تھی کہ یہ دونوں آ گئے۔ پہلے تو ان لوگوں نے مجھے لفٹ کی آفر کی، پھر میرے انکار پر زبردستی مجھے اپنی گاڑی میں بٹھانے لگے۔ اس کے بعد آپ یہاں پہنچ گئے۔“

لڑکی کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم کس کالج میں پڑھتی ہو؟“

”میں سی بی ایم کی اسٹوڈنٹ ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”چلو، میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم رہتی کہاں ہو؟“

”میں ڈیفنس میں رہتی ہوں لیکن آپ زحمت نہ کریں، میں چلی جاؤں گی۔ بس مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کر دیں جہاں سے کوئی سواری مل جائے۔“

”اور تمہاری گاڑی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ میں ڈرائیور سے منگوالوں گی۔“

لڑکی مسلسل جھوٹ بول رہی تھی۔ میں دنیا بھر کو چلانے کی کوشش کرتا تھا، وہ مجھ کو چلا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ سی بی ایم کالج کورنگی میں ہے۔ وہ ڈیفنس میں رہتی تھی تو شاہراہ قائدین... پر کیا گزر رہی تھی؟ کورنگی سے تو ڈیفنس بہت نزدیک تھا۔ وہاں سے بہ مشکل بیس پچیس منٹ کی ڈرائیو ہوگی۔

”چلو، پھر میں تمہیں کسی ایسی جگہ چھوڑ دوں جہاں سے ٹیکسی وغیرہ مل جائے۔ ویسے تمہاری گاڑی ہے کہاں؟ شاید میں اس کی خرابی دور کر سکوں۔ گاڑیوں کے بارے میں تھوڑا بہت تو میں بھی جانتا ہوں۔“

”رات بہت ہو گئی ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”آپ زیادہ تکلیف نہ کریں۔“

میرا خیال ہے کہ کسی گاڑی کا وجود نہیں تھا۔ درنہ وہ

پچھے کیوں پڑے ہو؟ چلو وقفہ ہو جاؤ یہاں سے۔“ یہ کہہ کر میں نے گاڑی سے اترنا چاہا۔

وہ دروازے کے سامنے جم گیا اور بولا۔ ”گاڑی سے اترنے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اب مزید زندہ نہیں رہنا چاہتے۔“

اسی وقت مجھے اس کے ہاتھ میں گن کی جھلک نظر آئی لیکن نیم اجالے میں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کون سی گن ہے۔ لڑکی کو نوجوان نے پکڑ رکھا تھا۔ وہ خاصی حسین لڑکی تھی، جسم پر لباس بھی بہت قیمتی تھا لیکن مجھے اس کے خوب صورت چہرے پر وحشت نظر آرہی تھی۔ وہ ابھی تک ڈرائیونگ سیٹ کے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے مصالحہ نہ لہجے میں کہا۔ ”تم اس وقت من مانی کر لو لیکن میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔“ میں نے گاڑی کا دروازہ بند کر لیا۔

لڑکی بری طرح چیخی۔ ”پلیز، مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔“

”بھوت سامنے ہو تو بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ اس نے تو شاید ماؤزر کی شکل ہی پہلی دفعہ دیکھی ہے۔“ کوتاہ گروں کے لہجے میں تھکیک تھی۔ ”جاؤ باپو جاؤ، امی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

میں نے اچانک دروازہ کھولا اور پوری قوت سے گینڈے کے جسم سے ٹکرا دیا۔ اسے مجھ سے اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ دروازہ خاصی قوت سے اس کے پیٹ اور گھٹنوں سے ٹکرایا تھا۔ اس کا ماؤزر جھٹکے سے دور جا پڑا۔ میں نے گینڈے پر جست لگائی اور اسے لیے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

نوجوان نے لڑکی کو چھوڑ کر مجھ پر چھلانگ لگائی لیکن میں گینڈے کو چھوڑ کر قلابازی کھا گیا۔ نوجوان کی جولاں میری پسلیوں میں گئی، وہ زوردار انداز میں گینڈے کی کھوپڑی پر پڑی۔ موٹے کے حلق سے ایک کراہ بلند ہوئی اور اس کے ہاتھ ہیر ڈھیلے پڑ گئے۔ نوجوان مجھ پر دوبارہ حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے زمین پر لیٹنے ہی لیٹے اپنے بغلی ہولسٹر سے پستل نکالا اور بولا۔ ”بس ختم کرو۔“ وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پستل کا دستہ مار کے نوجوان کو بھی ناک آؤٹ کر دیا۔

حیرت تو مجھے وہاں سے گزرنے والے لوگوں کی بے

شوگر و ش

میں موجود نہیں تھی۔ میں نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ مجھے یکدم ہی شدید غصہ آنے لگا کہ آخر وہ لڑکی کیا چاہتی تھی اور اس حرکت کا مطلب کیا تھا؟ میں بھتا کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کر ہی رہا تھا کہ پولیس کی ایک موبائل دین میرے پاس آ کر رکی۔ اس میں سے دو کانسٹیبل اترے اور میری طرف بڑھے۔ ایک کانسٹیبل اکھڑ لہجے میں بولا۔ ”اس وقت آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”اوائے، کہیں واردات کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے؟“

دوسرا سپاہی طنزیہ لہجے میں بولا۔

میں ویسے ہی بھٹایا ہوا تھا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اویار، جاؤ اپنا کام کرو۔ ویسے بھی تم لوگ وارداتوں کو پکڑتے کب ہو؟“

”کب اس کرتا ہے؟“ ایک کانسٹیبل پھر کر بولا۔

”نیچے اتر گاڑی سے۔“

میں نے گاڑی گیتز میں ڈالی اور سامنے کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا۔ ”سامنے سے ہٹو ورنہ میں گاڑی چلا دوں گا۔“

سامنے سے ہٹنے کے بجائے اس نے اچانک مجھ پر رائل سیدھی کر لی اور بولا۔ ”نیچے اتر۔ میں تیری طرم خانی نکالتا ہوں۔“

یہ صورت حال دیکھ کر دوسرے دو سپاہی بھی وہاں آگئے اور انہوں نے بغیر کسی پوچھ کچھ کے اپنی رائفلیں مجھ پر سیدھی کر لیں۔

”کیا بکواس ہے؟“ میں نے گاڑی کا انجن بند کیا اور نیچے اتر آیا۔ میں نے پھر کر پوچھا۔ ”تمہارا افسر کون ہے؟“

بلاؤ اسے۔“

افسر ایک سب انسپکٹر تھا جو ابھی تک گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔

ہنگامی صورت حال دیکھ کر وہ بھی گاڑی سے اتر آیا۔ اسے میں پہلی ہی نظر میں پہچان گیا۔ وہ سب انسپکٹر لاکھانی تھا اور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ حیرتی سے آگے بڑھا اور بولا۔ ”خرم صاحب! آپ... اور...“

”اسپنے آویسوں کو سنبھالو لاکھانی ورنہ ان کا تو کچھ نہیں بکڑے گا، تم ضرور لائن حاضر ہو جاؤ گے۔“

”اوائے، تم لوگ پہچانتے نہیں ہو خرم صاحب کو؟“

وہ دہاڑ کر اپنے ماتحتوں سے بولا۔ ”تم سب کی بیٹیاں اترو

یوں بوکھلا کر جواب نہ دیتی۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت اسے کوئی بھی سواری نہیں ملے گی۔ میں نے گاڑی کو پی ای سی ایچ کے قبرستان کے پاس سے ٹرن کیا اور دوبارہ شاہراہ فیصل پر آ گیا۔

وہاں بھی اس وقت ہوا کا عالم تھا۔ سڑک پر کچھ گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری سے گزر رہی تھیں لیکن ٹیکسی، رکشا کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

”تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”آپ نے ابھی تک نہ اپنا نام بتایا ہے، نہ میرا نام پوچھا ہے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میرا نام ماریہ ہے۔“

”میرا نام خرم ہے، خرم عظیم، میں ڈیلی نیوز ٹائم میں کرائم رپورٹر ہوں۔“

میرا نام سن کر لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولی۔

”تو آپ پریس رپورٹر ہیں؟ آپ تو بہت خطرناک آدمی ہیں۔“

”ارے بھئی، میں بالکل بھی خطرناک نہیں ہوں۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”ہاں خطرناک لوگوں کے لیے میں خطرناک ہوں۔“

میں زسری کے اسٹاپ پر کھڑا تھا اور ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا۔

جب کافی دیر گزرنے کے بعد بھی کوئی ٹیکسی نہ آئی تو میں نے کہا۔ ”ماریہ اب ٹیکسی کا خیال چھوڑ دو۔ میں تمہیں گھر لے چلا ہوں۔ ویسے بھی اس وقت جرائم پیشہ ٹیکسی والے ہی ملیں گے۔“

اسی وقت ایک ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکی اور ٹیکسی ڈرائیور ہونٹ کھول کر اس پر جھک گیا۔

میں نے ماریہ سے کہا۔ ”ایک ٹیکسی آئی تو ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ میں دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی ڈالاریڈی ایئر میں پانی ڈال رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کہاں جاؤ گے خان صاحب؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”میں اتر پورٹ جا رہا ہوں صاحب۔ وہاں سے مجھے ایک سواری کو لینا ہے۔ آپ کدھر جا رہے ہیں؟“

”مجھے ڈینٹن جانا ہے۔“ میں نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف لوٹ گیا۔

وہاں پہنچ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ماریہ گاڑی

وہیں گے۔“

مذرم رات کو پولیس حراست میں مر گیا ہے یا پھر بھی کسی اور جگہ میں چھس گیا ہے۔ میں نے مٹن دیا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو، کیا حال ہیں؟ کیا پھر کسی مصیبت میں پھنس گئے؟“

”خرم صاحب! آپ فوراً پولیس اسٹیشن پہنچیں۔“ بھیٹی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”اور مصیبت میں آپ پہنچنے والے ہیں، میں نہیں۔“

”اچھا مذاق ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں خرم صاحب۔“ بھیٹی کا لہجہ اب بھی سنجیدہ تھا۔ ”آپ فوراً پولیس اسٹیشن پہنچیں۔“ ”میں ابھی دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ اس کے لہجے پر میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔

پھر میں نے بہت عجلت میں تیاری کی اور پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

بھیٹی میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا پر اہم ہے؟ میں کیسی مصیبت میں پہنچنے والا ہوں؟“ ”تم پر قتل اور اغوا کے الزامات ہیں۔“ دروازے کی طرف سے آواز آئی۔

میں نے گھوم کے پیچھے دیکھا۔ علاقہ ایس ایس پی درانی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

بھیٹی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایس ایس پی نے میرے ساتھ والی کرسی سنبھالی اور مجھ سے بولا۔ ”کل رات تم دو اور تین بجے کے درمیان کہاں تھے؟“ ”صاف صاف بات کرو درانی۔“ میں نے بہتا کر کہا۔ ”پہیلیاں مت بھجواؤ۔“

”صاف بات سننا چاہتے ہو تو سنو۔“ درانی نے کہا۔ ”اے اے کے (AAK) گروپ آف کپینز کے سیکرٹریز اقبال نے تمہارے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے کہ رات تم نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اسے لوٹنے کی کوشش کی۔ ان کی مزاحمت پر تم نے اسے اور اس کے ڈرائیور کو اتنی بری طرح مارا کہ ڈرائیور موقع پر ہی مر گیا۔ تم اور تمہارا ساتھی اس وقت شراب کے نشے میں دھست تھے۔ پھر تم نے اس کی اسٹنٹ ماریہ کو جبرا اپنی گاڑی میں بٹھایا اور وہاں سے چلے گئے۔“

”کہانی میں دم ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”یہ کہانی نہیں ہے بلکہ اے اے کے گروپ آف کپینز کے سیکرٹریز اقبال کی رپورٹ ہے۔“ درانی نے کہا۔

ان لوگوں نے بھی شاید میرا نام سن رکھا تھا۔ راہ گلیں ایک دم ان کے شانوں پر چلی گئیں اور ان میں سے ایک حوالدار خوشامد انہ لہجے میں بولا۔ ”معاف کرنا صاحب! میں نے آپ کو اندھیرے میں بالکل نہیں پہچانا۔“

”چلو ادئے، سب گاڑی میں بیٹھو۔“ لاکھانی پھر چنچا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”خرم صاحب! ان سب کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔“

”تم سے تو کل میں پولیس اسٹیشن آ کر بات کروں گا۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کل ہمارے بچے تھانے میں موجود رہتا۔“ یہ کہہ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

میں اپنے فلیٹ پر پہنچا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں لفٹ سے اتر کر حسب عادت محتاط انداز میں فلیٹ کی طرف بڑھا۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے دو دفعہ میرے دھن دھن میرے ہی فلیٹ میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اس دن میری حاضر دماغی کام آگئی تھی ورنہ میں آج زندہ نہ ہوتا۔

میں نے بے آواز انداز میں دروازے کا لاک کھولا اور اپنا بٹل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر میں دروازہ کھول کر ایک دم نیچے بیٹھ گیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے چند لمحوں انتظار کیا، پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر ایک دم لائٹ کا سوچج آن کر دیا۔ دروازے سے ڈرائنگ روم تک ایک کوریڈور تھا پھر وہ انگریزی کے حرف ”L“ کی طرح دائیں جانب گھوم گیا تھا۔ میں نے باری باری چکن، ہاتھ روم، ٹیبرس ہر جگہ کی تلاشی لی اور اطمینان کرنے کے بعد اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ کھانا میں اکی کے ریشورٹ میں کھا چکا تھا۔ میں نے بیڈ روم کی الماری سے دوڑ کا کی ایک بوتل نکالی اور ایک لارج پیگ معدے میں اتار لیا۔

صبح میں ناشتے سے فارغ ہو کر ٹی وی پر میوزیشن دیکھ رہا تھا۔ کافی کاگ میرے ہاتھ میں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آج میں آفس کی چھٹی کر لوں۔ دو چار ضروری کام تھے، جو میرا اسٹنٹ سعید بھی کر سکتا تھا۔

میں نے اسے ہدایات دینے کو سیل فون اٹھایا تو اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر علاقے کے ایس ایچ او بھیٹی کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اسے صبح میری کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید کوئی

شہر و شہ

کیا ہے۔ ”دُرانی نے کہا۔“ لیکن ہم تمہیں دوست سمجھتے ہیں۔“

”اسی لیے تمہیں یہاں بلوایا۔“ بھٹی نے کہا۔ ”دردن اب تک پولیس تمہیں گرفتار کر چکی ہوتی۔“

”ایسا کون سا پولیس والا پیدا ہو گیا جو مجھے گرفتار کرے گا؟“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”کسی خوش فہمی میں مت رہنا خرم۔“ ایس ایس پی دُرانی نے کہا۔ ”اس کیس میں تمہیں آئی جی صاحب تو کیا ہوم سیکریٹری بھی نہیں بچا سکتے۔ اس کیس کی ایف آئی آر خود

اے اے کے گروپ کے سی ای او (CEO) عارف علی خان یعنی اے اے کے نے درج کروائی ہے۔ تم یقیناً

عارف خان کو جانتے ہو گے؟“

میں عارف خان کو بہت اچھی طرح بلکہ کچھ زیادہ ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ بظاہر وہ بہت نیک نام آدمی تھا۔ کئی

فلاحی ادارے اس کی سرپرستی میں چلتے تھے لیکن اس کا باطن اتنا ہی میلّا تھا۔ وہ میری لسٹ پر تھا کہ اس کی کوئی کمزوری مع

ٹھوس ثبوت کے میرے ہاتھ نہیں آئے تو میں اسے بھی شکار کر سکوں۔

میرے حلق سے یہ بات بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ اپنی سہیلی کی ایک معمولی ملازمہ کی گمشدگی یا اغوا کی رپورٹ

درج کرانے عارف خان جیسا ارب بیتی شخص بہ نفس نفیس پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ ملک اور بیرون ملک اس کا کاروبار

پھیلا ہوا تھا۔ اس کی سہیلی میں سات آٹھ ہزار افراد کا اسٹاف تو ہوگا۔ ان میں سیکڑوں لڑکیاں بھی ہوں گی۔ مجھے یقین تھا

کہ عارف خان اپنے اسٹاف کے ہر رکن کو پہچانتا بھی نہیں ہو گا۔

”کیا عارف خان صاحب اغوا کی رپورٹ درج کرانے خود پولیس اسٹیشن آئے تھے؟“ میں نے دُرانی سے پوچھا۔

”ان فضول سوالات کے بجائے تم اپنے بچاؤ کا بندوبست کرو۔“ دُرانی نے کہا۔ ”عارف صاحب کو بھلا خود

پولیس اسٹیشن آنے کی کیا ضرورت تھی، ان کا پی اے آیا تھا۔ عارف خان نے صرف ٹیلی فون پر آئی جی صاحب اور

سیکریٹری داخلہ سے بات کی تھی۔“

مجھے لگ رہا تھا کہ میرے خلاف خوب زبردست سازش تیار ہو رہی ہے۔ اغوا اور قتل کے الزام میں پھنسا

کر مجھے راستے سے ہٹایا جا رہا تھا لیکن کیوں؟ عارف خان کو مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ میں تو آج تک اس سے ملا بھی نہیں تھا،

وہ اندر سے بہت خوش تھا لیکن ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ دُرانی سے بھی میں سب تک کئی لاکھ روپے اینٹھ چکا تھا۔ ”اسی لیے

پوچھ رہا ہوں کہ کل دو اور تین بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟“

”میں کنفشن کے اس ریسٹورنٹ میں تھا جہاں اکثر و بیشتر آپ بھی جاتے رہتے ہیں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں

کہا۔

دُرانی کو جوئے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ شراب اور شباب کا شوقین تھا اور جینی ان خدمات میں خوب طاق

تھی۔

”پھر تم وہاں سے کب نکلے تھے؟“

”نکلے ہوئے میں نے وقت نہیں دیکھا تھا۔ ہاں، میں شاہراہ قائدین پر پہنچا تو دو آدمی ایک لڑکی کو زبردستی اپنی

گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو مارا پٹا ضرور تھا ورنہ وہ مجھے مار دیتے۔ پھر میں اس

لڑکی کو گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔“

”ویسے کہانی تو تمہاری بھی پرنیکٹ ہے۔“ دُرانی کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ”اب وہ لڑکی کہاں ہے؟“

میں نے اسے بتایا کہ کیسے وہ لڑکی مجھے بھی نچل دے کر نکل گئی۔ میں نے اسے سب اسپیکٹر لاکھائی اور اس کے

سپاہیوں کے بارے میں بھی بتا دیا۔

”اب تمہاری کہانی میں جھول آ گیا ہے وہ لڑکی...“

”دُرانی صاحب اتم سمیت پولیس کا ہراسہ جانتا ہے کہ میں ڈکیتی اور اغوا جیسے گھٹیا کام نہیں کرتا ہوں۔ یہ کام

کرنے کے لیے تم جیسے لوگ ہیں تو مجھے یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت عمل کیا ہے؟ سب لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے

لڑکیوں سے بھی دلچسپی نہیں رہی ورنہ لڑکیاں تو اب بھی بہت ہیں اور میرے ایک اشارے پر آ بھی سکتی ہیں۔“

”یہ بات اہم تو جانتے ہیں خرم لیکن عدالت کو کون یقین دلائے گا؟“

”عدالت؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہارے خلاف قتل اور اغوا کی ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ پولیس اب تک گرفتار کرنے کے لیے تمہارے گھر کاچ چکی ہوگی۔“

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا لیکن میرے اعصاب بہت مضبوط تھے۔ میں فوراً ہی سنبھل گیا اور بولا۔ ”پھر تم مجھے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے؟“ میرے انداز میں ٹپ تھی۔

”حالانکہ تم نے ہمارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں

ہاں ٹی وی اور اخبارات میں اس کی تصویریں ضرور دیکھی گئیں۔ ٹی وی چینلز پر بھی دیکھا تھا لیکن براہ راست اس سے ملاقات نہیں تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو خرم؟“ ذرانی نے کہا۔ ”میں تمہیں موقع دے رہا ہوں کہ یہاں سے نکل جاؤ۔“

”نکل جاؤں؟“ میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ ”پھر زندگی بھر پولیس سے چھٹا پھروں؟“ میں نے ایک لمحہ توقف کیا پھر کہا۔ ”یہ کوئی کرپشن اور رشوت خوری کے الزامات نہیں ہیں بلکہ اغوا اور قتل جیسے سنگین جرائم کے الزامات ہیں۔“

”پھر یہیں بیٹھ کر پولیس کا انتظار کرو۔“ بھٹی نے کہا۔ ”اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ شہر کے کسی بھی تھانے میں تمہارے ساتھ بدترین سلوک ہوگا۔“

”اؤکے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“

”اور یہ یاد رکھنا کہ تم یہاں نہیں آئے تھے۔“ ذرانی نے کہا۔

ان دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

میں جاتے جاتے پلٹ آیا اور بولا۔ ”میں ذرا واش روم تک جاؤں گا۔“

میں جاتا تھا کہ واش روم تھانے کے عقبی حصے میں ہے۔ میں سیدھا ادھر بڑھ گیا۔ وہ حصہ گویا اصل عمارت سے الگ تھلک تھا۔ وہاں ایک طرف پانی کا ٹل لگا تھا۔ دائیں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں پولیس والے ”استراحت“ فرماتے تھے۔ انہی پر دھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے۔

میں نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں سوائے ایک پولیس والے کے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بھی ایک چارپائی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کا رخ بھی میری طرف نہیں تھا۔

عقبی دیوار بلند تھی لیکن اتنی بلند نہیں تھی کہ میں اسے پھلانگ نہ سکوں۔ میں نے ایک جست میں اچھل کر دیوار کی گھر کو پکڑ لیا۔ پھر اپنے ہاتھوں کے سہارے اپنا جسم اوپر کھینچا اور پلک جھپکتے میں دیوار پھلانگ گیا۔ مجھے شبہ تھا کہ ذرانی اور بھٹی مجھے اتنی فراغ ذلی سے فرار کا مشورہ دے رہے ہیں تو دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ وہ دونوں بھی کئی دفعہ مجھ سے زک اٹھا چکے تھے۔ اتنی آسانی سے مجھے کیسے نکلنے دے سکتے تھے۔

دوسری طرف کودنے کے بعد میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ سرے کی طرف بڑھا۔

میرے اندازے کے عین مطابق پولیس اسٹیشن کے باہر تین سوبائل دین کھڑی تھیں۔ وہاں بھی زیادہ رنگا خطرناک تھا کیونکہ ذرانی اور بھٹی میری طرف سے مشتبہ ہو کر پولیس والوں کو اس طرف بھیج سکتے تھے۔

میں کچھ دور تک تیزی سے چلتا رہا، پھر ایک گلی آتے ہی میں اس میں گھس گیا۔ اسے عبور کر کے دوسری طرف پہنچا۔ اسی وقت مجھے ایک رکشا مل گیا۔ میری گاڑی ابھی تک پولیس اسٹیشن کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے رکشا والے سے کلفٹن چلنے کو کہا۔ فوری طور پر اکی ہی کے پاس مجھے پرسکون ہو کر سوچنے کا موقع مل سکتا تھا۔

اکی اس وقت سو رہا تھا۔ اس کا چوکیدار بھی مجھے جانتا تھا اور دوسرے ملازم بھی۔

چوکیدار نے کچھ کہے بغیر گیٹ کھول دیا اور مجھے سلام بھی کیا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی کہ میں اتنی صبح یہاں کیوں آیا ہوں؟ ریسٹورنٹ اس وقت بند تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زینہ اوپر کی منزل کی طرف جاتا تھا۔

میں زینہ چڑھنے لگا تو پیچھے سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ اکی ہی کا ایک ملازم تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرت سے بولا۔ ”صاحب! آپ اس وقت یہاں؟“

”ہاں، مجھے اکی سے بہت ضروری کام ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن صاحب تو ابھی سو رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”سو رہا ہے تو اسے جگا دو۔“ میں نے سرد لہجہ میں کہا۔

”آپ میرے ساتھ آئیے صاحب، میں دیکھتا ہوں۔“ اس نے دروازے کا۔۔۔ قفل کھولا اور مجھے اندر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی اور بولا۔ ”صاحب ابھی آرہے ہیں۔“

آپ چائے نہیں گئے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، تم مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔“ میں نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

مزید دس منٹ بعد مجھے اکی کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی نیند کا خمار تھا اور ہونٹوں میں سلگتا ہوا

شرف و ش

ضمانت قبل از گرفتاری نہیں ہوتی ہے، ممکن ہے اور کوئی گنجائش ہو اگر ایسا ہوا تو نعیم سب سے پہلا کام یہی کرے گا۔

اچانک مجھے ڈرائنگ روم کے دروازے پر جینی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بھی شاید ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔ اس دن مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ جینی بہت ہلکا پھلکا میک اپ کرتی ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا لیکن وہ مجھے پہلے سے زیادہ تر دنازہ اور گھڑی گھڑی لگ رہی تھی۔

”اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو بند سم۔“ جینی نے کہا۔ ”کیا مجھے نظر لگانے کا ارادہ ہے؟“ پھر وہ میرا موڈ دیکھ کر بولی۔ ”تم اتنی صبح کیسے؟“

”اکی سے ایک ضروری کام تھا۔“ میں نے اسے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”جینی ا“ اکی نے کہا۔ ”بشارت سے گیسٹ روم صاف کرادو، خرم صاحب کچھ دن ہمارے مہمان رہیں گے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ یہ صرف ہمارے مہمان ہیں، دوسروں کے لیے یہاں موجود ہی نہیں ہیں۔“

جینی کی آنکھیں جھپکنے لگیں، وہ مسکرا کر بولی۔ ”وہ ہمارے گھر میں آئے۔۔۔“

”جینی پلیز۔“ میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”غلط شعر تو میں پریشانی کی حالت میں بھی برداشت نہیں کروں گا۔“

میری بات پر جینی اور اکی دونوں ہنسنے لگے۔

”ہاں، میرے کمرے میں کمپیوٹر ضرور رکھوا دینا۔“

یہاں انٹرنیٹ بھی ہوگا؟

”آپ لگومت کریں۔“ اکی نے کہا۔ ”سب کچھ ہو جائے گا۔“

جینی اچانک بولی۔ ”رات کو تمہارے جانے کے بعد اس جگر کا ٹیلی فون آیا تھا۔“

”کون جگر؟“ اچھا وہ ارشد، اسے تو میں بھول ہی گیا تھا، کیا کہہ رہا تھا وہ؟

”مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں آپ کی ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔“

”للیش میں روز جتنا جیتوں گا، اس کا میں فیصد میرا ہو گا۔“

”تم نے مجھے بتایا نہیں۔“ اکی نے کہا۔

”تو میں کون سا اسے ملازم رکھ رہی ہوں۔“ جینی نے کہا۔

”اسے ملازمت دے کر تم لوگ فائدے میں رہو گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”وہ تمہیں لاکھوں روپے روز کماتا

سگریٹ دیا ہوا تھا۔

”خرم صاحب! خیریت تو ہے؟“ اس نے ہمرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے یار۔“ میں نے کہا اور اسے تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

اکی کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار پیدا ہو گئے۔

میں نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔ ”اکی اگر کوئی پرابلم ہے تو کوئی بات نہیں، میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو خرم، میں گھٹیا اور کمینہ ضرور ہوں لیکن احسان فراموش نہیں ہوں۔ جب تک آپ کا دل چاہے یہاں رہے۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کو اس مشکل سے کیسے نکالا جائے؟“ پھر اس نے آواز دے کر ملازم کو بلایا اور بولا۔ ”دیکھو بشارت! تم بھی سمجھ لو اور چوکیدار کو بھی سمجھا دو کہ یہاں کوئی نہیں آیا ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“ اس نے مستعدی سے کہا۔

”ہاں، ہمارے لیے کافی لے آؤ اور سگریٹ کے دو چار پیکٹ بھی لیتے آنا۔“

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اپنے ایک، وکیل دوست ایڈووکیٹ نعیم سموں کا نمبر ملایا۔ میں جانتا تھا کہ سموں اس وقت کورٹ میں ہوگا یا کورٹ جانے والا ہوگا۔ دوسری ہی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کر لی۔ ”خیریت ہے خرم؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

میں نے اسے بھی سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

”جسٹیس فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ نعیم نے کہا۔

”میں فرار نہیں ہوا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ان لوگوں نے مجھے گرفتار نہیں کیا تھا تو پھر فرار کا کیا سوال؟“

”اب ذرا آئی اور بھٹی کا بیان کچھ اور ہوگا۔“ نعیم نے کہا۔

”اس وقت تم کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”اپنے ایک دوست کے پاس ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ اس کیس میں کیا ہو سکتا ہے۔“

”نعیم نے کہا۔“ ایسا کرو، تم شام کو سات بجے تک میرے گھر آ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”یار اتم وکیل سے ضمانت قبل از گرفتاری کی بات کرتے۔“ اکی نے کہا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے، قتل اور اغوا کے کیس میں

کر دے گا۔“ پھر میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”تم اسے ابھی بلا لو۔ مجھے اس سے کام ہے۔ ویسے وہ بہت کام کا آدمی ہے۔“

”تم اسے خود ہی بلاؤ۔“ جینی نے کہا۔

اکی وہاں سے اٹھ گیا۔ میں نے جیب سے فون نکالا اور ارشد کا نمبر ملائی رہا تھا کہ جینی نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”کیا پر اہم ہے؟“

”کبھی دو ہاتھ مجھ سے بھی کر لیا کرو۔“ اس نے ایک ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکے سے پیچھے ہٹایا۔

”جینی ڈیرا“ میں نے اس کا ہاتھ آہستگی سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”جہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ میں کس مصیبت میں مبتلا ہوں۔“

”مجھے کچھ بتاؤ گے تو معلوم ہو گا نا؟“

”میں پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

میری بات پر جینی بے اختیار ہنسنے لگی اور بولی۔ ”اس سال کا سب سے بڑا لطیفہ... تم پولیس سے چھپ رہے ہو، تم؟“

”ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

جینی اٹھ کر میرے پاس آگئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”آئی ایم سوری ڈیرا! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ...“

اسی وقت باہر قدموں کی آہٹ گونجی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”جینی شاید کی آرہا ہے۔“

وہ بھی کچھ فاصلے پر ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ اکی کی قانونی بیوی نہیں تھی لیکن ان دونوں کے درمیان گہرا تعلق تھا۔

اکی کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ”خرم صاحب! آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کر لیں۔ میں نے آپ کا کمر اتیار کرادیا ہے۔ ہاں، الماری میں کپڑے بھی ہیں۔ میرے کپڑے آپ کو کچھ ڈھیلے ہوں گے لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔“

☆☆☆

کمرے میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ سب سے زیادہ ضروری تو وہ لیپ ٹاپ تھا جو میز کے ساتھ رکھی ہوئی رائٹنگ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔

میں نے پہلے تو ارشد کو ٹیلی فون کیا اور اس سے وہاں پہنچنے کو کہا پھر میں نے اپنے اسسٹنٹ کو ٹیلی فون کیا۔ اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کرنی اور بولا۔ ”خرم صاحب!

آپ کہاں ہیں؟“

میں جہاں بھی ہوں، ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم بتاؤ، کوئی خاص خبر؟“

”پولیس نے پہلے آپ کے گھر پر چھاپا مارا، پھر وہ لوگ آفس بھی آگئے۔ ان لوگوں نے شاید ایڈیٹر صاحب کو اطلاع دے دی تھی کیونکہ وہ بھی آفس پہنچ گئے تھے اور انہوں نے مجھے بھی بلا لیا تھا۔ پولیس والوں نے آپ کی الماری اور میز کی درازوں کی تلاشی لی اور کچھ کاغذات وہاں سے لے گئے۔“

”ان میں میری کوئی ایسی خاص چیز نہیں تھی، بس ایک یو ایس بی کام کی تھی، اس کا مجھے افسوس ہے۔“

”آپ کی یو ایس بی محفوظ ہے سر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں پولیس والوں سے پہلے آفس پہنچ گیا تھا۔ آپ کی الماری اور دراز کی چابیوں کا ایک سیٹ میرے پاس بھی ہے۔ میں نے سب سے پہلے دراز سے وہ یو ایس بی اور الماری سے کئی ڈی ڈی ڈیز نکال کر اپنے بیگ میں رکھ لی تھیں۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”ہاں، میرا لیپ ٹاپ بھی تھا۔“

”میں نے آپ کے لیپ ٹاپ پر پاس ورڈ بھی لگا دیا تھا لیکن پولیس والے اسے کھول لیں گے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیپ ٹاپ میں ایسی کوئی خاص چیز بھی نہیں ورہ میں اسے یوں آفس میں نہ چھوڑتا۔“ پھر میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”میں نہیں کچھ ضروری سیلو بیجوں کا کوشش کرنا کہ میری بیٹی کی خبریں شائع ہو سکیں۔ مجھے حالات سے باخبر رکھنا۔ میں خود ہی کہیں کال کر لوں گا کیونکہ یہ سم اب میں تبدیل کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت بشارت نے آکر بتایا کہ کوئی ارشد صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر نیگم صاحبہ مجھے پہلے سے ان کے بارے میں بتانہ دیتیں تو میں انہیں اندر نہیں گھسنے دیتا۔“

”ٹھیک ہے، انہیں یہاں بھیج دو۔“ میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد ارشد کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جینز اور جیکٹ پہن رکھی تھی، چہرے پر پشیمردگی کے تاثرات تھے اور وہ اس ارشد سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔

”کیسے ہو ارشد؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

278

شرف و شہ

کھل جائے گی۔ اس میں خاکی رنگ کے دولٹافے ہوں گے۔ وہ لفافے لے آؤ۔“
”یہ کام تو بہت آسان ہے خرم صاحب۔“ ارشد مسکرا کر بولا۔

”ہاں لفافے لے کر یہاں مت آنا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں یہاں سے جانے والا ہوں۔ تم وہ لفافے نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ تو مجھے کال کر لیتا۔“
”ٹھیک ہے خرم صاحب۔“ ارشد نے کہا۔ ”لیکن آپ نے مجھ پر ابھی تک اعتبار نہیں کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ کچھ دن یہیں رہیں گے۔“
”ایسی بات نہیں ہے ارشد۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے اپنے وکیل کے پاس جانا ہے۔ وہ میرا بہت اچھا دوست بھی ہے اس لیے مجھے وہاں دیر بھی لگ سکتی ہے۔ تم پر اعتبار نہ ہوتا تو تم سے اتنے اہم کاغذات نہ منگواتا۔“
”مجھے اس کے لیے تھوڑی بہت تیاری کرنا پڑے گی۔“ ارشد نے کہا۔ ”اگر...“

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اپنے پرس سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ اسے دے دیے۔
اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے سیل فون کے تمام نمبرز لیپ ٹاپ میں ٹرانسفر کیے اور سیل فون کی سم نکال لی۔ پولیس موبائل ٹریکنگ کے ذریعے میرا ٹھکانا معلوم کر سکتی تھی۔

اجانک بشارت بوکھلایا ہوا آیا اور بولا۔ ”صاحب! باہر پولیس کی دو گاڑیاں آئی ہیں۔“
میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بشارت سے کہا۔ ”اکی کہاں ہے، اسے فوراً میرے پاس بھیجو۔“
اس سے پہلے ہی اکی میرے پاس آ گیا اور بولا۔ ”خرم صاحب! آپ عقی دروازے سے باہر نکل جائیں۔ اس طرف پولیس نہیں ہے۔“

اسی وقت عجلت میں جینی بھی وہاں آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ اس نے وہ بریف کیس مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”اس میں وہ رقم ہے جو تم نے کل میرے پاس رکھوائی تھی۔“

میں نے بریف کیس لیتے ہوئے اکی سے کہا۔ ”وہ لیپ ٹاپ میرے کمرے سے ہٹاؤ اور پولیس والوں سے جھوٹ مت بولنا کہ خرم یہاں نہیں آیا تھا ورنہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ تم صرف یہ بتانا کہ خرم یہاں آیا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے نکل گیا ہے۔ وہ تلاشی لینے پر اصرار

”مجھے گئی دن سے شدید بخار ہے خرم صاحب۔“
ارشد نے کہا۔ ”کل رات کو میرا پرس بھی نہ جانے کیسے گر گیا۔ دو اتو دور کی بات ہے میں نے تو کل رات سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔“

میں نے بشارت کو بلایا اور اس سے کھانا لانے کو کہا۔
ارشد واقعی بھوکا تھا۔ وہ کھانا کھا چکا تو اس کے چہرے پر طمانیت سی آ گئی۔ میں نے اس کے لیے چائے بھی منگوائی تھی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔
”ارشد! میں تم پر کس حد تک اعتبار کر سکتا ہوں؟“

”خرم صاحب! میں بہت برا آدمی ہوں۔“ ارشد نے کہا۔ ”لیکن میرے بھی کچھ اصول ہیں۔ جب میں کسی کی برتری تسلیم کر لیتا ہوں تو پھر اسے کبھی دھوکا نہیں دیتا لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“
”میں بہت پر اہلم میں ہوں اور اپنی یہ پر اہلم کسی بے اعتبار آدمی کو بتا بھی نہیں سکتا۔“

”آپ اور پر اہلم؟“ ارشد نے حیرت سے کہا۔
”آپ سے ملاقات تو کل ہوئی تھی، میں غائبانہ طور پر تو آپ کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ آپ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ نے پولیس کے بڑے بڑے افسران کو ٹیکل ڈال رکھا ہے۔ میں زندگی میں کسی آدمی سے مرعوب نہیں ہوا لیکن غائبانہ طور پر آپ سے مرعوب تھا۔ کل رات آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میرے ہاتھوں زخمی ہو جاتا۔ جب میڈم جینی نے آپ کا نام لے کر پکارا تو میں چونک اٹھا۔“

”ارشد! کل رات تک حالات واقعی میرے حق میں تھے لیکن اب نہیں ہیں۔“
”مجھے بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“
ارشد نے کہا۔

”میری گاڑی پولیس اسٹیشن کے باہر کھڑی ہے۔ اس کے ایک خفیہ خانے میں میرے کچھ ضروری کاغذات ہیں۔ اگر لا سکتے ہو تو وہ لے آؤ۔“ میں نے اسے گاڑی کا رجسٹریشن نمبر بتاتے ہوئے کہا کہ وہ اسی سال کا ماڈل ہے، بلیک ہنڈا ہے۔

”گاڑی لانی ہے یا صرف کاغذات لانے لیتا؟“
اس نے اعتماد سے پوچھا۔

”گاڑی کو چھوڑو، وہ تو مجھے مل ہی جائے گی۔ تم فوری طور پر خاکی رنگ کا وہ لفافہ لا سکتے ہو تو لے آؤ۔“
میں نے اسے بتایا کہ پنجر سیٹ کی پشت کو تین دفعہ اوپر کی طرف کھینچو گے تو وہ بچوں کے اسکول بیگ کی طرح

باہر کی طرف آیا۔ میں مزید گھنی شاخوں میں چھپ گیا۔ مجھے وہاں سے ہٹنے کا مین گیٹ بھی نظر آ رہا تھا اور اس کا اقامتی حصہ بھی۔ اس طرف سے کوئی عورت مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ تقریباً پینتالیس سال کی ہادقا عورت تھی۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی، جسم پر قیمتی ادنی شال تھی۔ وہ مین گیٹ کے پاس جا کر ایک مرتبہ پھر درشت لہجے میں بولی۔ ”کون ہے؟“

”دروازہ کھولیں، پولیس۔“ باہر سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔

”پولیس؟“ عورت نے ناگواری سے کہا۔ ”پولیس کا یہاں کیا کام؟“

”آپ دروازہ تو کھولیں۔“ اس مرتبہ باہر سے قدرے نرم لہجے میں کہا گیا۔

عورت نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا اور اطمینان کرنے کے بعد دروازہ کھول دیا۔

فوراً ہی پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی اندر آ گئے۔

”کیا بات ہے؟“ عورت نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”ہم ایک مفرد ملزم کی تلاش میں ہیں۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”وہ بہت خطرناک ملزم ہے میڈم اجیل سے فرار ہوا ہے۔“ سب انسپکٹر نے مجھے جیل سے بھاگا ہوا مجرم بنا دیا۔ ”ہمارا خیال ہے کہ وہ اس طرف آیا ہے۔“

”یہاں تو کئی دن سے کوئی نہیں آیا۔ میں یہاں اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی ہوں لیکن اس وقت وہ بھی آئیں گئی ہوئی ہے۔ آپ چاہیں تو تلاشی لے لیں۔ میں آپ سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔“

سب انسپکٹر کچھ سوچا رہا، اس نے مین گیٹ اور اس کے اوپر لگی ہوئی مضبوط گرل کا جائزہ لیا۔ ہٹنے کی پابندی والی بھی بہت ادنی تھی اور اس پر خاردار تار بھی لگے ہوئے تھے۔ گھر والوں کی مرضی کے بغیر باہر سے کوئی آدمی اندر داخل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”میں تلاشی تو نہیں لوں گا۔“ سب انسپکٹر شاید اس عورت کی شخصیت اور اس کے مجرا عہد لہجے سے مرعوب ہو گیا تھا۔ ”ہاں، آپ کو محتاط رہنے کا مشورہ ضرور دوں گا۔ وہ بہت خطرناک مجرم ہے اور کئی لوگوں کو قتل کر چکا ہے۔“ اس کم بخت نے مجھے خطرناک مجرم بنا دیا۔

”شکریہ آفیسر۔“ خاتون نے کہا۔ ”میں محتاط رہوں

کریں تو انہیں روکنا مست۔“

”کسی نے تمہارے بارے میں خبری کی ہے خرم۔“

جینی نے کہا۔ ”وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”اس پر بعد میں غور کروں گا۔“ میں نے عقبی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور سیڑھیاں اتر کے نیچے چلا گیا۔

اسی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ نیچے بھی دو تین کمرے تھے۔ وہ ریسٹورنٹ کا عقبی حصہ تھا۔ اس میں پرانا فرنیچر اور دوسرا کٹھ گہاڑ تھا۔

اسی نے بیرونی دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور بولا۔ ”ابھی تک اس طرف کوئی پولیس والا نہیں آیا ہے۔ یہاں سے نکل کر تم ہائیں طرف جاؤ گے تو ایک چوڑی گلی آجائے گی۔ وہ گلی آگے جا کر مین روڈ پر نکلے گی، جاؤ خدا حافظ۔“

میں پولیس کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا کہ وہ عقبی راستہ کھلا چھوڑ دے گی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے گلی میں جھانکا۔ وہاں دور دور تک سناٹا تھا۔ اس طرف لوگوں کی آمدورفت نہیں تھی۔

میں دل کڑا کر کے باہر نکل گیا اور وہاں رے کے بغیر تیزی سے ہائیں طرف بڑھا۔

اسی وقت گلی کے کنارے پر مجھے پولیس کی دردی کی جھلک دکھائی دی۔ میں تیزی سے چوڑی گلی میں داخل ہو گیا۔

گلی میں دائیں طرف ایک ادھ کھلا گیٹ تھا۔ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اس گھر میں داخل ہو گیا اور گیٹ اندر سے بند کر دیا۔

اسی وقت مجھے گیٹ کے سامنے سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

وہ پرانی طرز کا بنگلا تھا۔ میرے سامنے وسیع دیرینہ لان تھا، پھر کافی فاصلے پر کارپورج اور برآمدہ تھا۔ میں تیزی سے لان میں داخل ہوا اور نیم کے ایک گھنے درخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

اچانک کسی نے زور زور سے دروازہ دھڑکھڑایا۔ میں دستک کے انداز ہی سے سمجھ گیا کہ وہ پولیس والے ہیں۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں جس درخت کے نیچے کھڑا تھا، وہ خاصا گھٹا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنی ٹائی کھول کر بریف کیس اس میں باندھا اور پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔

دروازہ دوسری مرتبہ زیادہ قوت سے پیٹا گیا۔ دور سے کوئی نسوانی آواز آئی۔ ”کون ہے؟“ پھر اندر سے کوئی

کی۔

پولیس والے واپس چلے گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

خاتون نے مین گیٹ دوبارہ لاک کیا، چند لمحوں میں گھبراہٹ کے آواز گونجنے لگا۔

میں درخت کی ایک گیلی شاخ پر بہت تکلیف میں بیٹھا تھا۔ اگر پولیس والے دس پندرہ منٹ مزید رک جاتے تو شاید میں نیچے گر پڑتا۔

میں آہستہ آہستہ نیچے اترا، اپنے بالوں اور کپڑوں سے گرد اور نیم کے پتے جھاڑے۔ بریف کیس کے ہینڈل سے ٹانگی کھول کے کوٹ کی جیب میں رکھی اور لان کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ وہاں میں قدرے محفوظ تھا لیکن جھاڑیاں اتنی گھنی نہیں تھیں کہ میں مکمل طور پر چھپ سکتا۔ کوئی اگر مجھے خاص طور پر تلاش کرتا ہوا اس طرف آتا تو میں اسے نظر آجاتا۔

میں نے کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اپنا سانس درست کیا، پھر باہر جانے کے ارادے سے اٹھا۔ میرا اندازہ تھا کہ پولیس اب تک وہاں سے چلی گئی ہوگی۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ پولیس اتنی جلدی وہاں پہنچ کیسے گئی؟ اس بات پر غور کرنے کا یہ موقع نہیں تھا۔

پنکٹ کی مالکن اندر جانے کے بعد ایک دفعہ بھی باہر نہیں نکلی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنے بڑے پنکٹ میں وہ تنہا رہتی ہے۔ ابھی تک مجھے کوئی ملازم یا چوکیدار بھی نظر نہیں آیا تھا۔

”ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پنکٹ کے بیرونی دروازے پر کوئی گاڑی آکر رکے۔ پولیس شاید ابھی گئی نہیں تھی پھر کسی نے باہر سے مین گیٹ کھولا اور گاڑی اندر پورچ میں لانے کے بعد دوبارہ گیٹ بند کر دیا۔

وہ شخص شلوار قمیض اور واسکٹ میں ملبوس تھا اور حلیے سے ملازم لگ رہا تھا۔

اس نے گاڑی سے کچھ شاپرز نکالے اور اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ وہی عورت ایک مرتبہ پھر برآمدے میں لکل آئی اور بولی۔ غفور اتم نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟“

”بیکم صاحبہ! کئی جگہ ٹریفک جام تھا۔ میں نے پہلے بی بی صاحبہ کو پونڈر سٹی چھوڑا، پھر سودا خریدنے کے بعد آیا ہوں۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”یہ چوکیدار ابھی تک چھٹی سے واپس نہیں آیا۔ مجھ سے کہا تھا کہ سب تک آ جاؤں گا۔“ عورت نے کوئی جواب نہیں دیا اور واپس چلی گئی۔

مشہور و مشہور

غفور بھی سامان اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور پنکٹوں کے بل جھکا جھکا چلتا ہوا مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحوں میں پنکٹ سے باہر تھا۔ گیٹ بند کرنے سے بلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں تیزی سے مین روڈ کی طرف بڑھ گیا۔

میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اب کہاں جاؤں؟ میں نے تو اس شہر میں اب تک دھن ہی بنائے تھے۔ دوست تو محض چند تھے۔ دوستوں پر مجھے آصف کا خیال آیا۔ میں اپنا سیل فون آن کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پولیس سم کے ذریعے مجھے کھوج لیتی۔

میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اس سے ملیر چلنے کو کہا۔ جب ٹیکسی ایف ٹی سی سے آگے گزر گئی تو میں نے سیل فون آن کر دیا۔ ہماری پولیس کی کار کردگی ایسی بھی نہیں ہے کہ وہ فوری طور پر سم کے ذریعے لوکیشن معلوم کر سکے۔ میں تو حرکت میں تھا۔ میں نے آصف کا نمبر ملا لیا۔

وہ چھوٹے ہی بولا۔ ”خرم! تم کہاں ہو؟ میں تمہاری طرف سے بہت فکر مند ہوں۔“

”یار! اس وقت تو میں بہت مصیبت میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”پورے شہر کی پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔“ ”الحق ہو تم۔“ آصف نے کہا۔ ”تمہیں بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے پاس تو۔۔۔۔۔ بہت سے پولیس آفیسرز کی کمزوریاں ہیں۔ انہیں دھمکی دو کہ گرفتاری کی صورت میں تمہارے ساتھ ساتھ وہ بھی مارے جائیں گے۔ تم سب کچھ میڈیا کو بتا دو گے۔ پھر دیکھنا، ہر پولیس آفیسر کی یہی کوشش ہوگی کہ تمہاری گرفتاری عمل میں نہ آئے۔“

”بہت اچھا مشورہ ہے یار! میری تو عقل ہی خطہ ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے یہ سامنے کی بات کیوں نہ سوچھی۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا شکریہ ادا کر کے سلسلہ منقطع کر دیا اور ڈی آئی جی کراٹمز کا نمبر ملا لیا۔ اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کر لی۔ ”خرم! تم کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”تمہارا ٹھکانا ختم ہو گیا ہے۔ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔“

”کھیل تو اب شروع ہوا ہے ڈی آئی جی صاحب۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”میں تو کب کا خود کو قانون کے حوالے کر دیتا۔ میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں ہے۔ مجھے تو آپ کا خیال ہے۔ میں نے اگر میڈیا کے سامنے زبان کھول دی تو نہ صرف آپ کی ملازمت جائے گی بلکہ آپ کو سزا بھی ہو سکتی ہے۔“

ڈی آئی جی چند لمبے کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔
میں سمجھا کہ شاید لائن کٹ گئی ہے۔ وہ چند لمبے بعد بھرائی
ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم اب بھی مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟
ایک دفعہ تم پولیس کے ہاتھ آگئے تو کسی کو تمہارا سراغ بھی
نہیں ملے گا۔“

میں نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”آپ کیا
مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہیں؟ تمام ثبوت میرے وکیل
کے پاس محفوظ ہیں۔ میری موت یا گمشدگی کی صورت میں
وہ تمام ثبوت میڈیا کے حوالے کر دے گا۔“
”تم انتہائی خبیث اور کمینے آدمی ہو خرم۔“ ڈی آئی
جی نے شاید دانت... پستے ہوئے کہا تھا۔

”وہ تو میں ہوں لیکن آپ سے کم ہوں۔“ میں نے
طنز سے کہا۔ ”اب پولیس کو میرا پیچھا کرنے سے روکیں یا پھر
میں آئی جی صاحب سے رابطہ کر دوں؟“ یہ کہہ کر میں نے
لائن ڈراپ کر دی۔

دوسری کال میں نے ایس ایس پی احسان کو کی۔ وہ
میری آواز سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

”زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے احسان
صاحب! میں اگر ڈوہا تو کئی نام نہاد یا انت دار افسروں کو لے
کر ڈوبوں گا۔ تم تو بہت بری طرح مارے جاؤ گے۔ بہتری
اسی میں ہے کہ اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔“

”لیکن مجھ پر ادھر سے پریش ہے۔“ احسان شکست
لجھ میں بولا۔ ”عارف خان صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں
ہیں۔“

”وہ معمولی ہوں یا غیر معمولی۔“ میں نے سرد لہجہ
میں کہا۔ ”یہ تمہارا درنہ ہے۔ بس تم یہ سوچو کہ میری گرفتاری
کے بعد تمہارا کیا بنے گا؟“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر
دیا۔ پھر میں نے مزید تین چار رشوت خور افسران کو ٹیلی فون
کیے اور مطمئن ہو کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔
میں جانتا تھا کہ اب مجھے پولیس سے کوئی خطرہ نہیں

ہے۔
”بلیئر میں کہاں جانا ہے صاحب؟“ ڈرائیور نے
پوچھا۔ اس وقت ہم اسٹار گیٹ کے پاس سے گزر رہے
تھے۔

میں نے چونک کر ڈرائیور کو دیکھا پھر بولا۔ ”مجھے
واپس کلفٹن لے چلو۔“
جیسی ڈرائیور نے کچھ کہے بغیر جیسی کا رخ پرانے
ایئر پورٹ کی طرف موڑ کے آگے سے یوٹرن لیا اور دوبارہ

شاہراہ فیصل پر آ گیا۔

میں نے سیل فون دوبارہ نکالا اور اکی کا نمبر ڈائل کیا۔
اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔ ”خرم صاحب! آپ خیریت
سے تو ہیں؟“

”ہاں، میں بالکل خیریت سے ہوں۔“ میں نے
جواب دیا۔ ”تم بتاؤ پولیس ابھی موجود ہے یا چلی گئی؟“
”بیس پچیس سنٹ پہلے تک تو پولیس کا ایک سب
انسپکٹر اور تین سپاہی یہاں موجود تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ
تھانے لے جانے کی دھمکی دے رہے تھے۔“
”پولیس کو کیسے معلوم ہوا کہ میں وہاں موجود تھا؟“
میں نے پوچھا۔

”ان کے پاس آئی ٹی کے ماہرین ہیں خرم صاحب! ان
لوگوں نے آپ کے سیل فون کی ٹریکنگ سے معلوم کر لیا
کہ آپ کہاں ہیں۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔
”اچانک سب انسپکٹر کو کسی افسر کی کال موصول ہوئی۔ وہ
”سیرس، سیرس سر“ کرتا رہا پھر اپنے آدمیوں کو لے کر روانہ
ہو گیا۔

”اب وہ وہاں آئے گا بھی نہیں۔“ میں نے ہنس کر
کہا۔

”آپ ہیں کہاں؟“ اکی نے پوچھا۔
”میں ابھی آدھے گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ رہا
ہوں۔ پریشان مت ہو۔ اب پولیس کا کوئی آدمی وہاں کا
رخ بھی نہیں کرے گا۔“

☆☆☆

”آپ نے تو کمال کر دیا خرم صاحب۔“ اکی ہنس کر
بولا۔

میں ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں پہنچا تھا اور اس وقت
اس کمرے میں بیٹھا تھا جو اکی نے مجھے دیا تھا۔
”میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ارشد نے آپ کے بارے میں
پولیس کو بتایا ہے۔“ اکی نے کہا۔

”مجھے بھی یہ شک گزرا تھا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔
پھر میں نے سیل فون پر اپنے اسسٹنٹ سعید سے
رابطہ کیا۔ ”ہاں سعید! کیا خبر ہے؟“

”ایڈیٹر صاحب بہت غصے میں ہیں۔“ سعید نے
کہا۔ ”وہ کافی دیر آپ کا ٹیلی فون ملا رہے لیکن آپ کا
سیل فون بند تھا۔“

”میں ان سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔ تم وہ یو ایس بی
اور میرے دوسرے کاغذات لے کر پریس کلب آ جاؤ۔“

شرف و شوش

”بس فائر کر لیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”چلو میرے ساتھ۔“ میں نے کہا۔ ”(AAK)“

اے اے کے گروپ آف کمپنیز کے ایک منیجر اقبال سے کچھ پوچھ گچھ کرنا ہے۔“

”پوچھ گچھ کہاں کریں گے؟“ ارشد نے پوچھا۔

”تمہارے پاس کوئی ٹھکانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، ایک ٹھکانا ہے تو لیکن وہ بہت دور ہے۔“

ارشد نے کہا۔ ”میرے کھوکھرا پار کے علاقے میں میرے ایک دوست کا مکان ہے۔ وہاں...“

”ٹھکانا تو یہاں بھی ہے۔“ جینی نے کہا۔ ”میرے

پاس وہ فلیٹ ہیں اور دونوں آج کل خالی ہیں۔ ایک فلیٹ تو

سی ویو کے علاقے میں ہے۔ وہاں ابھی زیادہ فلیٹ آباد نہیں

ہیں۔“

”ٹھیک ہے، وہ فلیٹ چلے گا لیکن تمہیں بھی ہمارے

ساتھ چلنا ہوگا۔“

اکی کے بچے سے پہلے میں باہر نکل گیا۔ ممکن ہے

پولیس اب بھی وہاں کی نگرانی کر رہی ہو۔

کچھ فاصلے پر ایک پیٹرول پمپ تھا۔ میں پیٹرول

لینے کے بہانے وہاں کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جینی اور ارشد بھی دوسری گاڑی میں

وہاں پہنچ گئے۔

اے اے کے گروپ آف کمپنیز کا دفتر آئی آئی

چندر نگر روڈ کی ایک کثیر الحمرہ بلڈنگ میں تھا۔ وہاں اقبال

جیسے بیسیوں منیجر ہوں گے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ

اقبال کس شعبے میں ہے۔

بلڈنگ کے دروازے کے سامنے بے شمار گاڑیاں

تھیں۔ وہاں تو گاڑی پارک کرنا بھی ایک عذاب تھا۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ارشد کو اقبال کی تلاش

میں آفس کے اندر بھیجوں کہ میری مشکل خود ہی آسان ہو

گئی۔ بلڈنگ کے مرکزی دروازے سے اقبال نکل رہا تھا۔

اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ میں نے ارشد سے کہا۔

وہ جس آدمی نے براؤن پیٹ اور سفید شرٹ پہن رکھی ہے،

وہی اقبال ہے۔

ارشد فوراً گاڑی سے اتر گیا اور اس کی طرف بڑھا۔

اس نے جینی کو بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر دیا۔

میں نے دیکھا، ارشد اس سے کچھ بات کر رہا تھا۔

اقبال نے ایک طرف اشارہ کیا، پھر جینی بھی وہاں پہنچ گئی اور

میں اس کے اقبال سے باتیں کرنے لگی۔

میں وہاں سے لے لوں گا۔ مجھے اگر دیر ہو جائے تو تم وہ چیزیں ایک لفافے میں بند کر کے وہاں کے ڈیڑا اسلم کو دے دیتا۔“

”آ... آپ... پر میں کلب...“

”ہاں، میں پر میں کلب آؤں گا۔“ میں نے سلسلہ

منقطع کر دیا۔

جینی نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ میں نے بھی صبح صرف دو

سلاکس کھائے تھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ کھانے سے

قاریغ ہونے کے بعد میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں لمبی تان کر سو

جاؤں لیکن یہ وقت سونے کا نہیں تھا۔

اچانک جینی کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ”ارشد

کی کال ہے تمہارے لیے۔“

”بات کراؤ۔“ میں نے کہا۔

”مخرم صاحب!“ ارشد کی آواز سنائی دی۔ ”میں

نے آپ کی گاڑی سے وہ لفافہ نکال لیا ہے۔ اب بتائیے

آپ کو کہاں پہنچاؤں؟“

”تم یہیں آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارا انتظار

کر رہا ہوں۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عارف خان کو مجھ سے کیا

دشمنی ہے؟ وہ لڑکی ماریہ اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ اس کے

غائب ہونے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سب سوچ

مجھے منصوبے کا حصہ تھا۔ عارف خان کے ایک منیجر اقبال

نے بھی میرے خلاف گواہی دی تھی۔ میں پہلے اسی سے

پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد وہاں پہنچ گیا۔ پہلی نظر میں تو

میں اسے پہچان ہی نہ سکا۔ اس کے چہرے پر کھنی موم نہیں

تھیں اور بالوں کا رنگ بھی براؤن ہو گیا تھا، آنکھوں پر

بہترین فریم کا چشمہ تھا۔

اس نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ میرے حوالے کر

دیا۔ میں نے ایک نظر لفافے کے کاغذات پر ڈالی اور

منظم ہو کر اسے اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔

پھر میں نے ارشد سے پوچھا۔ ”تم کوئی اتھتیار چلا

سکتے ہو؟“

ارشد نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولا۔ ”میں پہلے

اور ریو اور چلا سکتا ہوں۔ کوئی بھاری اتھتیار آج تک نہیں

چلایا۔“

میں جنہیں کسی جنگ پر نہیں بھیج رہا ہوں۔“ میں نے

کہا۔ ”تمہارا نشانہ کیا ہے؟“

تھوڑی دیر بعد اقبال کو میں نے ان دونوں کے ساتھ چینی کی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اقبال کو کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔ ان کی گاڑی آگے بڑھ گئی تو میں نے بھی اپنی گاڑی ان کے پیچھے لگا دی۔

☆☆☆

وہ علاقہ ڈیفنس کے فیز 8 کا علاقہ تھا۔ وہاں ابھی آہادی بہت کم تھی۔ یوں بھی وہ علاقہ خاصا دور تھا۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔

اقبال کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں اور وہ بار بار اپنی آنکھوں کو نشوونما سے صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب ارشد اس کا ہاتھ پکڑ کے اس غیر آباد پولیس کی طرف بڑھا تو وہ تشویش سے بولا۔ ”یہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”لگومت کرو۔“ ارشد نے کہا۔ ”یہاں بہت اچھا آئی اسپیشلسٹ بیٹھتا ہے۔ وہ مشکل سے ٹائم دیتا ہے لیکن لو رین کا دوست ہے اس لیے تمہیں فوراً دیکھ لے گا۔“

”میری آنکھوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔“ اقبال نے پریشان ہو کر کہا۔

”ایسا ہوتا ہے۔“ ارشد نے کہا۔ ”ویسے آپ رہتے کہاں ہیں۔ اپنے گھر کا ٹیلی فون نمبر ویسے تاکہ آپ کے گھر تو اطلاع کر دی جائے۔“

”گھر میں صرف میری والدہ ہیں۔ انہیں صرف یہ اطلاع دے دیں کہ میں دیر سے آؤں گا۔ میری آنکھوں کے ہارے میں نہ بتائیے گا، وہ پریشان ہو جائیں گی۔“

وہاں ابھی تک لفٹ بھی نہیں لگی تھی۔ ہمیں سیر میوں ہی سے اوپر جانا پڑا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ وہ فلیٹ دوسرے ہی فلور پر تھا۔

اور پہنچ کر چینی نے دروازہ کھولا اور ہم لوگ اندر داخل ہو گئے۔ وہ ڈرائنگ روم تھا۔ چینی ہم لوگوں کو بیڈ روم میں لے گئی۔ میری سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اقبال کی آنکھوں کو اچانک کیا ہوا ہے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ اس میں بھی ارشد کے کسی شعبہ کے کا ہاتھ ہے۔

ارشد نے اقبال کو بیڈ پر لٹا دیا اور جیب سے چھوٹی سی ایک شیش نکالی اور اقبال پر جھک گیا اور اس سے آنکھیں کھولنے کو کہا پھر اس نے باری باری اس کی آنکھوں میں اس حلول کے ڈراپ ڈال دیے۔

اقبال تکلیف کی شدت سے بری طرح چیخا۔ ارشد نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بولا۔ ”بس چند منٹ کی

تکلیف ہے پھر تمہیں سب کچھ نظر آنے لگے گا۔“ چند منٹ بعد واقعی اقبال نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پہلے ارد گرد کا جائزہ لیا پھر اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ ارشد اور چینی کو دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”یہ... یہ... کسی ڈاکٹر کا کلینک تو نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”واقعی یہ ڈاکٹر کا کلینک نہیں ہے۔“ میں نے اس کی پشت سے کہا۔

اس نے چونک کے سر گھمایا اور مجھے دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گیا۔

پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ارشد نے درشت لہجے میں کہا۔ ”بیٹھے رہو اقبال، ورنہ ایک مرتبہ پھر اندھے ہو جاؤ گے۔“

”تو... کیا... تم نے... مجھے...“

”ہاں۔“ ارشد طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”میں نے ہی تمہیں واقعی طور پر اندھا کر دیا تھا۔“

”دیکھو اقبال!“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے جو کچھ پوچھوں، وہ سچ سچ بتانا۔ میرا وقت ضائع مت کرنا۔“

”مم... مجھے... جو کچھ معلوم ہوگا، میں ضرور بتاؤں گا۔“ اقبال نے کہا۔

”مار یہ کہاں ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”کون مار یہ؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے اچانک اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ ”تم مار یہ کو بھول گئے؟“

”اچھا وہ... لڑکی جو...“

”ہاں، وہی لڑکی جسے تم لوگ اغوا کرنے کا ڈراما کر رہے تھے؟“

”مجھے... نہیں معلوم... وہ کہاں ہے؟“ اقبال نے کہا۔

میں نے اچانک اس کے بال پکڑ لیے اور اسے زوردار جھکادیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ جھوٹ مت بولنا۔“ میں نے اس کے چہرے پر دوسرا تھپڑ اتنی زور سے مارا کہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ ”مار یہ کہاں ہے؟“ میں نے پھر غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”اسے کیا معلوم کہ مار یہ کہاں ہے؟“ باہر سے ایک آواز آئی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ دروازے سے ایک شخص اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ لوگ نہ جانے کیسے یہاں تک پہنچے تھے۔ اس کے چہرے پر غمی وارمی اور موہنیت تھیں اور اس نے تاریک شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ پریشانی

پھر آنکھیں سوند لیں۔

اچانک وہاں قدموں کی آہٹ گونجی لیکن میں آنکھیں سوندیں لیکن ہا پھر کوئی کرخت لہجہ میں بولا۔ ”اڑے یہ لوگ ابھی تک کن ہے۔ یہ مروت نہیں کیا؟“

”اگر تار نے زوردار ہاتھ مارا ہوگا تو مر بھی سکتا ہے۔“
”اگر یہ مر گیا تو باس... ہم لوگ کا بھی کھال کھینچ لے گا... ان کو دیکھو۔“ پہلی آواز سنائی دی۔
سردی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ مجھے شدید سردی کا احساس ہو رہا تھا۔

”اڑے، ان لوگ کے منہ پر پانی ڈالو... انہیں ہوش میں لاؤ۔“

پانی کا نام سن کر ہی مجھے مزید سردی کا احساس ہوا، میں نے گراہ کر آنکھیں کھول دیں۔
پھر مجھے جینی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی ہوش میں آرہی تھی۔

”یار اہم لوگ ایسے مرنے والے نہیں ہیں۔“ مجھے ارشد کی آواز سنائی دی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی میرے بعد ہی ہوش میں آ گیا تھا۔

”ان لوگ کو اوپر پہنچاؤ۔ یہاں تو پھنسی بھرا جائے گا۔“ پہلے والے آدمی نے کہا۔

گو یادہ کوئی ماہی گیری کا ٹریلر تھا۔ میں پہلے بھی کئی مرتبہ ایسے جہازوں پر آچکا تھا۔ پولیس کے کئی افسران اس قسم کے جہازوں کے مالک تھے۔ وہ اکثر مجھے پھنسی کے شکار کے لیے ان جہازوں میں کھلے سمندر میں لے جاتے تھے۔ مقامی سمجھیرے اسے ”ہوڑا“ کہتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد دو آدمی آئے۔ انہوں نے صرف میرے ہاتھ کھولے اور انتہائی بے رحمی سے کھینچ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ سر میں اچانک دھمک سی ہوئی۔ چکر آیا لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ لوگ مجھے تھپتھپاتے ہوئے اس کیمین سے باہر لے گئے اور لوہے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ انہوں نے مجھے ایک دوسرے کیمین میں پھینک دیا اور ایک مرتبہ پھر میرے پاؤں باندھ دیے۔

یہ کیمین پھنسی کے اس اسٹور روم سے قدرے بہتر تھا یہاں فرش پر دبیز قالین تھا، گودہ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ وہاں پرانا سا ایک صوفہ سیٹ اور چھوٹی میز موجود تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے کونے میں دو کرسیاں تھیں۔ تمام فرنیچر لوہے کا تھا اور کیمین میں فکس تھا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پہلے ہی اس لالچ میں

کی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں پتلی نال والا نائن ایم ایم کا پستل بھی تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو آدمی مزید اندر آ گئے۔ ان کے چہرے بھی مفلک میں چھپے ہوئے تھے لیکن وہ بھی مسلح تھے۔

”میں بتاتا ہوں ماریہ کہاں ہے؟“ داڑھی والے نے ہنس کر کہا۔ ”بلکہ تمہیں بھی اس کے پاس لے چلا ہوں۔“ پھر وہ چپ کر ارشد سے بولا۔ ”نہیں، اپنے ہاتھ اوپر ہی رکھو ورنہ میں فائر کر دوں گا۔“

ارشد نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔
داڑھی والے نے آگے بڑھ کر اچانک ارشد کے سر پر پستل کے دستے سے وار کیا۔ وہ آگے پیچھے ڈولا پھر فرش پر گر گیا۔

”تم دونوں بھی اپنے ہاتھ سر پر رکھو اور دیوار کی طرف گھوم جاؤ۔“ اس نے مجھے اور جینی کو حکم دیا۔

ہم دونوں دیوار کی طرف گھوم گئے۔
”تم لوگ کیا سمجھتے تھے کہ ہم بالکل اُلو کے پٹھے ہیں؟ جب تم نے اقبال کو اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا تو ہم نے تمہاری گاڑیوں کا پیچھا کیا تھا۔“

پھر اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن فرش تیزی سے میری طرف آیا یا میں فرش کی طرف گیا اور دھم سے فرش پر گر گیا۔ میں نے آخری آواز داڑھی والے کی سنی، وہ کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو باندھ دو۔ پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھے ہوش آیا تو پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں، پھر آہستہ آہستہ ذہن سے وحند جھٹنے لگی اور مجھے یاد آ گیا کہ میں جینی اور ارشد کے ساتھ ڈیفنس فیز آٹھ کے ایک فلیٹ میں موجود تھا۔ ہم وہاں اقبال کو لائے تھے پھر... پھر... وہاں کچھ لوگ آگئے تھے اور...“

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور مجھے ابھی تک چکر آ رہے تھے۔ کمرے کا فرش ڈول رہا تھا۔ لٹا میں پھنسی کی بساند پھنسی ہوئی تھی۔ پھر مجھے لبروں کا شور سنائی دیا اور کمرے کا فرش پھر بری طرح ڈولا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کسی بوٹ والا لالچ میں ہوں۔

میں نے گردن کھما کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ارشد بھی بندھا پڑا تھا اور جینی بھی۔ وہ دونوں ابھی تک بے ہوش تھے۔

میرے سر میں بھی نیپیں... اٹھ رہی تھیں۔ میں نے

ہمکن رکھی تھی۔ اس کا رنگ گورا تھا اور سیاہ بال کن پٹیوں پر سے سفید ہو چلے تھے۔ وہ عارف خان تھا۔ ملک کا معروف صنعت کار۔ میں نے اسے تصویروں میں دیکھا تھا لیکن وہ حقیقت میں زیادہ باوقار اور پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی مزید اندر آئے تھے۔ وہ دونوں رائفلوں سے مسلح تھے۔ عارف خان نے انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا، پھر بولا۔ ”تم دونوں میں خرم کون ہے؟“

ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ ”اس کی نظر جینی پر پڑی تو جم کر رہ گئی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس کی خوب صورت اور دھکتی ہوئی جلد دکھائی دے رہی تھی۔ وہ طنزیہ لہجہ میں بولی۔ ”مجھے کیوں گھور رہے ہو، میں تو خرم ہونے سے رہی۔“

”میں ہوں خرم۔“ میں نے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے، ہو جائے۔

”تم نے پولیس کو سگنی کا ناچ مچا رکھا ہے؟“ وہ حقیر آمیز لہجہ میں بولا۔

”صرف پولیس ہی کو نہیں بلکہ ان میں آپ جیسے کئی بڑے بزنس مین اور صنعت کار بھی شامل ہیں۔“

”آج میں تمہیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں گا نہ ہوگا ہانس، نہ سچے کی بانسری۔“

”لیکن میں نے تمہیں تو سبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ میں تو تمہیں ذاتی طور پر جانتا بھی نہیں ہوں۔“

”تم نے نہ جانتے ہوئے بھی مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔“ وہ نفرت سے بولا۔ ”اور مجھے یقین ہے کہ آج یا کل میری بھی کوئی کمزوری تمہارے ہاتھ آجانی اور میں بھی دوسروں کی طرح بلیک میل ہونے لگا لیکن مجھے بلیک میل ہونا ٹھکسی پسند نہیں ہے۔“

”تم تو بہت نیک نام ہو۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ شہر میں دو اسپتال، کئی اسکول اور کئی فلاحی ادارے چلا رہے ہو۔“

”تو اتنا سیدھا تو نہیں جتنا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔“

عارف خان کو اچانک غصہ آ گیا۔ اسے نہ جانے میری کون سی بات بری لگ گئی تھی۔

”تیری کوئی آخری خواہش ہے تو بتا دے۔“ عارف خان نے ورشت لہجہ میں کہا۔

”یار اتمہارا انداز تو بالکل گئے وقتوں کے بادشاہوں

آچکا ہوں لیکن کب اور کس کے ساتھ، یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہاں ارشد اور جینی بھی آ گئے۔ جینی کی حالت تباہ تھی۔ وہ چہرے سے برسوں کی چار لگ رہی تھی۔ ارشد نے البتہ خود کو سنبھال رکھا تھا۔

وہ لوگ ہمیں وہاں چھوڑ کر چلے گئے تو ارشد نے مجھ سے کہا۔ ”بس میں ایک موقع کا منتظر ہوں۔ وہ موقع ملتے ہی میں خود کو آزاد کرالوں گا۔“

”ابھی ایسی کوئی حماقت نہ کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”اور آہستہ بولو۔ وہ لوگ ہم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔“

وہ لوگ واقعی ہم سے زیادہ دور نہیں تھے۔ باہر سے اچانک جیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ تعداد میں کئی تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”کیا بڑا صاحب بھی اس ہوڑے پر آئے گا؟“

”بڑا صاحب اس ہوڑے پر کیوں آئے گا؟“ دوسرے نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ ”وہ ابھی تھوڑی دیر میں اپنی لالچ پر آئے گا۔“

”تو کیا ان لوگوں کو ادھر لے جانا پڑے گا؟“ تیسری آواز سنائی دی۔

”یہ تو جابر ہی بتائے گا۔“ پہلی آواز آئی۔

”یہاں ایک لڑکی اور ایک آدمی پہلے سے قید ہے۔“ دوسری آواز سنائی دی۔ بڑا صاحب ان لوگوں کو یہاں جمع کیوں کر رہا ہے؟

اسی وقت قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ خاموش ہو گئے۔ ”اڑے ان لوگوں کو کچھ کھانے کو بھی دیا؟“ شاید آنے والا بولا تھا۔ یہ آواز میں نے فیچے اسٹور روم میں بھی سنی تھی۔

”جائے ابھی تیار ہو رہا ہے جابر بھائی۔“ دوسرا آدمی بولا۔ ”ابھی جلدی سے اس لالچ کا صفائی کر دو۔“ جابر نے کہا۔ ”بڑا صاحب ایدھر ہی آئے گا۔“

تھوڑی دیر بعد ایک شخص چائے اور بسکٹ لے کر آ گیا اور ہمیں اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔ چائے بد مزہ اور بسکٹ می سے نرم پڑ گئے تھے۔ میں نے ایک بسکٹ کھا کر مزید کھانے سے انکار کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہاں عجیب سی چہل پہل شروع ہو گئی۔ کوئی جمع کر بولا۔ ”بڑا صاحب آ رہا ہے۔“

چند منٹ بعد باوقار اور ہارعب سا ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سفید براق شلوار سوٹ پر سیاہ واسکٹ

والا ہے۔" میں نے تھیک آمیز لہجہ میں کہا۔ "میری آخری خواہش تو یہ ہے کہ تو مجھے چھوڑ دے۔" میں نے بھی اسی کے لہجہ میں اور الفاظ میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تیری کوئی آخری خواہش ہی نہیں ہے۔"

"اچھا، یہ ہی بتا دو کہ تمہاری مجھ سے دشمنی کیا ہے؟ ماریہ کون ہے اور وہ کہاں ہے اور تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟"

"ہاں، یہ تمام باتیں میں تجھے ضرور بتاؤں گا۔" عارف خان نے کہا۔ مرنے سے پہلے سب کچھ جانتا تیرا حق بھی ہے۔ "پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ "جابر! ماریہ اور اس پولیس افسر کو یہاں لے کر آؤ۔"

"پولیس افسر؟" میں نے دل ہی دل میں دہرایا۔ "تو اس کی قید میں کوئی پولیس افسر بھی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد جابر اور اس کا آدمی ماریہ اور ایک شخص کو دھکیلتے ہوئے وہاں لے آئے۔ اس پولیس افسر کو کچھ کمر میں چونک اٹھا۔ وہ کرائم برانچ کے ایس ایس پی سلطان احمد صاحب تھے۔ پورے پولیس کے چمکے میں وہ واحد افسر تھے جن کی میں دل سے عزت کرتا تھا۔ مجھے آج تک ان کے خلاف کوشش کے باوجود کچھ نہیں ملا تھا۔ پولیس کے دوسرے افسران ان سے بیزار تھے۔ وہ خود کھاتے تھے، نہ دوسروں کو مال حرام کھانے دیتے تھے اس لیے ہر جگہ سے ان کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ گزشتہ تین سال سے کرائم برانچ میں تھے۔

وہ دراز قد اور کسرتی جسم کے مالک تھے۔ ہاتھ ہر مضبوط تھے اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ اس وقت تو وہ خود اپنی ہی پرچھائیں لگ رہے تھے۔ جسم سوکھ کر ہڈیوں کے مانند ہو گیا تھا۔ چہرے کی شادابی ختم ہو گئی تھی لیکن آنکھوں میں اب بھی وہی چمک تھی۔

ماریہ کا حال بھی تباہ تھا۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جس لباس میں وہ مجھے ملی تھی۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شائستگی کا تاثر نمودار ہوا۔ ایس ایس پی سلطان نے پہلے نفرت سے عارف خان کو دیکھا، پھر زیادہ حقارت سے مجھے دیکھا اور بولے۔ "تم جیسے لوگ ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔"

میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

"خرم! تمہیں رشید الدین یاد ہے؟" عارف خان

نے کہا۔ "تم نے شاید اس کے گیس پر مزید محنت نہیں کی اور نہ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس سے میں بھی کام لے رہا تھا۔ تم صرف پولیس کے ایک ایس ایس پی کو بلیک میل کر کے مطمئن ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ تم اپنی فطرت سے مجبور ہو کر رشید الدین کے بارے میں مزید جھان بین کرو گے اور تم مجھ تک پہنچ جاؤ گے۔"

"تم نے صرف اس مفرد منے کی بنیاد پر میرے خلاف اتنی بڑی سازش کر دی۔"

"یہ میرا مفرد منہ نہیں ہے۔" عارف خان نے کہا۔ "ابھی تو رشید الدین کا کس چل رہا ہے تم کسی بھی وقت اس میں دخل اندازی کر سکتے تھے۔ تا جبر برادری کے بہت سے لوگ بھی اس بارے میں تمہیں بہت کچھ بتا سکتے تھے اور پولیس کے کچھ افسران بھی ان سے معلومات حاصل کرتے تو تمہارے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ سر اٹھانے سے پہلے ہی سانپ کا سر چل دینا چاہیے۔"

"ماریہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ماریہ میرے دفتر میں کام کرتی ہے۔ غریب گھرانے کی ضرورت مند لڑکی ہے اس لیے اسے اس پلان کا حصہ بنانے میں کوئی وقت پیش نہیں آئی۔ اسے میں نے ہماری انعام کا لالچ دیا تھا لیکن اس بے چاری کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے آدمی اسے وہاں سے غائب کر دیں گے۔ یہ موقع تم نے خود دیا تھا۔ تم اگر اسے تنہا گاڑی میں نہ چھوڑتے تو میرے آدمی کسی دوسرے طریقے سے ماریہ کو لے جانے کی کوشش کرتے۔"

"اور وہ آدمی جو مارا گیا ہے....؟"

"وہ بھی میرا ایک ذرا تیار تھا۔ اسے بھی میرے ہی آدمیوں نے ہلاک کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہاری بے چینی ختم ہو گئی ہوگی۔ یہ لالچ تم لوگوں کو کھلے سمندر میں لے جائے گی پھر تم سب کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔ تمہاری لاشیں منٹوں میں پھیلیاں کھا جائیں گی۔ میں یہ کام اپنے آدمیوں کے سپرد کر دیتا لیکن اس ایس ایس پی کو میں خود مارنا چاہتا ہوں۔ اس کم بخت نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ میرے کئی قیمتی آدمیوں کو ہلاک کرایا اور کئی کو جیل میں پہنچا دیا۔" پھر اس نے جابر سے کہا۔ "اب جن اشارت کرو اور لالچ کو کھلے سمندر میں لے چلو۔"

"تم جانتے ہو کہ میری موت کے بعد بہت سے چہرے بے نقاب ہو جائیں گے۔ خاص طور پر پولیس کے کئی افسران تو اپنی ملازمت سے جائیں گے اور جیل کی ہوا

شوفو ش

میں نے جھپٹ کر اس کے شانے پر لگی ہوئی خود کار رائفل اتار لی۔ وہ روسی ساختہ ہلکی پھلکی رائفل تھی۔ جسے بار بار لوڈ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں چند لمحوں کے لیے اس کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اچانک وہ چونک کر طرح طرح سے لپٹ گیا اور رائفل چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس چھینا چھٹی میں ٹریگر دب گیا اور گولی جابر کا جڑا توڑتی ہوئی سر کی طرف گھس گئی۔ وہ کئے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے فرش پر گر پڑا اور بری طرح تڑپنے لگا۔

فائر کی آواز سن کر جابر کے دو ساتھی بھاگتے ہوئے وہاں آئے۔ ارشد نے انہیں گن پوائنٹ پر لے لیا پھر وہی رسیاں ان دونوں کو باندھنے کے کام آئے جن سے ان لوگوں نے ہمیں باندھا تھا۔

”اس لالچ پر اور کتنے آدمی ہیں؟“ ایس ایس پی سلطان نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ہاتھ پیر کھلتے ہی اس کی شخصیت ہی بدل گئی تھی اور وہ ایک دم پولیس افسر بن گیا تھا۔

”یہاں ایک آدمی اور ہے صاحب۔“ ان میں سے ایک بولا۔ ”وہ انجن روم میں ہے۔“

”ریوالور مجھے دو۔“ اس نے تحکمانہ لہجہ میں ارشد سے کہا۔

ارشد نے میری طرف دیکھا، میں نے اشارے سے ریوالور اسے دینے کو کہا۔

سلطان، ارشد کے ساتھ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ارشد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا وہی شاید انجن کو کنٹرول کر رہا تھا۔ ارشد نے اس کے بھی ہاتھ پاؤں باندھے اور ایک طرف ڈال دیا۔

”سلطان صاحب کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ لالچ کے انجن کو کنٹرول کر رہے ہیں اور لالچ کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ارشد نے جواب دیا۔

”ہمیں بندرگاہ سے نکلے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی اس لیے واپسی کا سفر بھی مختصر تھا۔“

سلطان صاحب نے ٹیلی فون کر کے پولیس کو وہیں طلب کر لیا تھا۔ وہ مجھ سے بولے۔ ”یہ عارف نہ صرف ہتھیاروں کی اسمگلنگ کرتا ہے بلکہ ملک میں ہنگامے کرائے کے لیے مختلف تنظیموں کو فنڈنگ بھی کرتا ہے۔“

”لیکن یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ یہ پاکستان کا دشمن ہے، مسلمانوں کا دشمن ہے۔“

جاسوسی ڈائجسٹ 289 - دسمبر 2014ء

کہا میں گے۔“ میں نے کہا۔

”میری طرف سے سب جہنم میں جائیں۔“ عارف خان پھر کر بولا۔

اس وقت لالچ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور جابر کے آدمیوں نے لنگر اٹھا لیا۔ لالچ آہستہ آہستہ کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگی۔

اچانک ارشد زور زور سے کراہنے لگا۔ میرے ساتھ ساتھ عارف خان اور جینی نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ عارف خان نے پوچھا۔ ”تم تو مرنے سے پہلے ہی مرے جا رہے ہو۔“

”میں کالے کوٹے کھا کے اترا ہوں کینے آدمی۔“ ارشد نے کہا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ عارف خان کچھ سمجھ سکتا، اس نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور عارف خان کے سر پر پانچ گیارہ جھٹکے سے اس کا ریوالور نکال لیا اور اس کی ٹال عارف خان کے سر پر رکھ کر بولا۔

”اپنی جگہ سے حرکت کرنا، نہ آواز نکالنا ورنہ...“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ”اٹھو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“ ارشد نے ڈپٹ کر کہا۔

عارف خان لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور کیمین کی دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

ارشد نے بہت پھرتی سے میرے ہاتھ کھولے، پھر ریوالور میرے ہاتھ میں دے دیا اور خود ایس ایس پی کی طرف بڑھ گیا۔

چند منٹ میں ہم... آزاد ہو گئے۔ اب دوسرا مرحلہ لالچ پر موجود دوسرے لوگوں سے نمٹنے کا تھا۔ میں نے عارف خان کو دوبارہ اسی جگہ بٹھا دیا اور اس سے کہا کہ جابر کو آواز دے کر یہاں بلائے، صرف آواز دینا، کچھ اور کہو گے تو ارشد تمہاری کھوپڑی میں گولی اتار دے گا۔

میں نے دیکھا ہے کہ جتنا بڑا مجرم ہوتا ہے، اتنا ہی بزدل ہوتا ہے۔ عارف خان بھی اس وقت کسی بھک منگے کی طرح سہا ہوا تھا۔ اس نے جابر کو آواز دی تو میں کیمین کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جابر خان جو کئی اندر داخل ہوا، میں نے پیچھے سے اس کی گردن دیوچی۔ اس نے لپٹ کر اپنے شانے سے لگی ہوئی رائفل اتارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے پیٹ کے نچلے حصے پر پوری قوت سے گھٹنا مار دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے دھرا ہو گیا لیکن آدمی جاندار تھا اس لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”لیکن کیوں؟“ میرے ذہن میں اب بہت سے سوالات تھے۔

”اس لیے کہ یہ سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔ یہ بھارت کا ایجنٹ ہے اور نہ جانے کتنے برس سے یہاں سرگرم ہے۔ میں گزشتہ دو سال سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دو سال کی عرق ریزی کے بعد میرے ہاتھ بہت سے ثبوت گھر گئے۔ اسے بھی سن کن مل گئی۔ اس نے مجھے گھر سے آفس جاتے ہوئے راستے ہی میں اغوا کر لیا۔ یہ تو مجھے کبھی کا مار دیتا لیکن اسے ان ثبوتوں کی فکر تھی جو میرے قبضے میں تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں اس کے ان گوداموں سے بھی واقف ہوں جہاں... بظاہر ایکسپورٹ کے لیے چینی کی بوریاں اور ادون کی گاڑیاں رکھی جاتی ہیں لیکن اصل میں وہ ہتھیاروں اور بارودی مواد رکھنے کے ٹھکانے ہیں۔“

”آپ سے اگلو انے کے لیے تو اس نے بہت تشدد کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”تشدد؟“ سلطان صاحب کا چہرہ غصے سے مسخ ہو گیا۔ ”اس نے تو میری آنکھوں کے سامنے میری بیوی اور بیٹی کو قتل کر دیا تھا، اس کے باوجود میں نے زبان نہیں کھولی۔ اس نے مجھ پر ظلم کی انتہا کر دی لیکن میری زبان کھلوانے میں کامیاب نہ ہوا۔“

ان کی باتیں سن کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ ایک طرف سلطان صاحب جیسے محب وطن افسر تھے اور دوسری طرف مجھ جیسے ابن الوقت اور رشوت خور، مجھے اپنی ذات سے کھن آنے لگی۔ میں نے خلوص دل سے کہا۔ ”سلطان صاحب! آج تک میں نے لوگوں کو بیک میل کر کے برائی کا ساتھ دیا ہے لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب کوئی دشمن ہمارے ملک میں نقب لگانے کی کوشش کرے گا تو میں پوری قوت سے اسے رد کروں گا، قانون کے ہاتھ مضبوط کروں گا۔“

”یہ وعدہ تم مجھ سے نہیں بلکہ خود سے کر دو۔“ سلطان صاحب نے کہا۔ ”تم بلا کے ذہن آدی ہو۔ عارف خان... بلکہ ارجن سیوا اس کو بھی اعزازہ تھا کہ تم اپنی ذہانت کے ثل بولتے پر اس کی حقیقت تک پہنچ جاؤ گے۔“

”ارجن سیوا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں ارجن سیوا! اس کا اصل نام عارف خان نہیں بلکہ ارجن سیوا ہے۔ رشید الدین کو بھی اس کی اصلیت کا علم ہو گیا تھا، ان سے کچھ لغزشیں ہو گئی تھیں۔ عارف خان نے انہیں ایسی پی احسان کے ذریعے بیک میل

کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں خود کشی کرنا پڑی۔“ اسی وقت پولیس کے چاق بہو بند کمانڈوز وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے سلطان صاحب کو سیلوٹ کیا اور ارجن، اس کے آدمیوں اور جابر کی لاش کو اٹھا کر وہاں سے لے گئے۔ نہ جانے ان میں کتنے مسلمان تھے اور کتنے ہندو۔

☆☆☆

دوسرے دن کا اخبار ارجن سیوا اس کی گرفتاری کی خبروں اور اس کے بارے میں دیگر حقائق سے بھرا ہوا تھا۔ ہر ٹی وی چینل پر سہی بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اسے میرا کارنامہ سمجھا جا رہا تھا۔ صبح سے اب تک کئی ٹی وی چینلز اور اخبارات میرا انٹرویو کر چکے تھے۔ میرے اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کے ایک بہت بڑے میڈیا گروپ کی طرف سے بھی مجھے چیف کرائم رپورٹر کی بھی آفر تھی۔

ماریہ ابھی تک پولیس کی تحویل میں تھی۔ ارشد اور جینی بھی غائب تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں یہی سمجھا کہ پھر کوئی پریس رپورٹر انٹرویو کے لیے آیا ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو ارشد کے ساتھ وہاں جینی اور ماریہ کھڑی تھیں۔

ماریہ نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور بولی۔ ”مجھے معاف کر دیں۔ میری وجہ سے آپ کو بہت اذیت اٹھانا پڑی ہے۔ مجھے اس کی سزا بھی مل گئی ہے۔ میری گمشدگی کے مددے نے میری ماں کی جان لے لی۔ اب اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے غم صاحب۔“

”معافی کیسی ماریہ؟“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تمہاری وجہ سے تو اتنا بڑا مجرم پکڑا گیا ہے اور تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تمہارا کوئی نہیں ہے؟ اللہ تو موجود ہے نا۔“

”اور میں بھی تو ہوں۔“ ارشد نے کہا۔

”تم... یعنی... تم...“ میں نے ماریہ کی طرف دیکھا۔

اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ جینی نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور نظریں چرائیں۔

شام کو ڈیڈی اور میرے بھائی میرے پاس آئے اور مجھے بہت اصرار کر کے گھر واپس لے گئے۔ زندگی اچانک ہی خوج صورت ہو گئی اور دنیا میں ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔